تمہید

چار پانچ سال ہوئے میں نے اپنے عزیزوں رفیقوں کے کہنے سے اپنی زندگی کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا۔ ابتداء تو میں نے کردی، مگر ابھی پہلا ورق الٹنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ بمبئی میں بلوے شروع ہوگئے اور یہ کام رک گیا۔ اس کے بعد اور واقعات پیش آئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں قید ہوکر یراودا کی جیل میں پہنچ گیا۔ اسی جیل میں میرے ساتھی جیرام داس بھی قید تھے۔ انہوں نے فرمائش کی کہ تم سب کام چھوڑ کر آپ بیتی کو ختم کردو۔ میں نے کہلا بھیجا کہ میں اپنے مطالعے کا پروگرام بنا چکا ہوں، اور جب تک اسے پورا نہ کرلوں کسی اور کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اگر میں قید کی معیاد یراودا میں گزارتا تو آپ بیتی ضرور ختم ہوجاتی۔ کیونکہ جب میں چھوٹا ہوں تو ایک سال اس کام کے لئے باقی تھا۔ اس سوامی انند جی نے پھر اسرار شروع کیا، اور میں بھی جنوبی افریقہ کی ستیا گری کی تاریخ سے فارغ ہوگیا ہوں۔ اور اس لیے جی چاہتا ہے کہ نوجوانوں میں چھاپنے کے لئے آپ بیتی لکھنا شروع کردوں، سوامی جی یہ چاہتے تھے کہ میں اسے الگ لکھوں اور کتاب کی صورت میں چھپواؤں مگر مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا کرسکتا ہوں کہ ہفت وار ایک باب لکھتا جاؤں۔ آخر تو جیون کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ پھر آپ بیتی ہی کیوں نہ لکھ دیا کروں، سوامی جی اس پر راضی ہو گئے۔ لیجیے میں نے بھی محنت سے کام شروع کردیا۔۔

مگر میرے ایک باخدا دوست کو اس بارے میں کچھ شبہ ہے۔ جو انہوں نے

میری خاموشی کے دن تھے مجھ سے بیان کیے، انہوں نے مجھ سے کہا، یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ بیتی لکھنا مغربی ملکوں کا دستور ہے۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ مشرق میں سوا ان لوگوں کے جن پر مغرب کا اثر ہو گیا ہے۔ کسی نے آپ بیتی لکھی ہو، اور آپ لکھیں گے کیا؟۔ فرض کیجیے آپ آج جن اصولوں کے قائل ہیں، انہیں کل ترک کر دیجیے۔ یا اب جو تجویزیں آپ کے سامنے ہیں، وہ آئندہ بدل جائیں تو کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ جو لوگ آپ کی تحریر اور تقریر پر عمل کرتے ہیں، وہ دھوکے میں پڑ جائیں گے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ابھی اس قسم کی کتابیں نہ لکھیں بلکہ کبھی نہ لکھیں۔

ان دلیلوں کا مجھ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا۔ لیکن اصل میں میرا مقصد اس قسم کی کتاب لکھنا نہیں ہے۔ جو آپ بیتی کہلاتی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں جو تجربے کیے ہیں، ان کی کہانی سنا دوں، اور یہ سچ ہے کہ ساری عمر انہی تجربوں میں گزری ہے۔ اس لیے یہ کہانی آپ بیتی بن جائے گی۔ لیکن اگر کتاب کے ہر صفحہ میں سوا ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو، تو میں ایسی آپ بیتی لکھنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ اب چاہے یہ میرے نفس کا فریب ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا ایک **مسلسل** بیان پڑھنے والوں کے لئے فائدے سے خالی نہ ہو گا۔ سیاست کے میدان میں جو تجربے میں نے کیے ہیں، وہ ہندوستان میں بلکہ ایک حد تک مہذب دنیا میں مشہور ہو گئے ہیں۔ میری نظر میں نہ ان تجربوں کی کوئی وقعت ہے۔ اور نہ مہاتما کے لقب کی، جو ان کی بنا پر لوگوں نے مجھے دے رکھا ہے۔ مجھے اکثر اس لقب سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس نے میرے دل کو نہیں لبھایا، البتہ ان روحانی تجربوں کو

میں خوشی سے بیان کروں گا، جو صرف مجھ ہی کو معلوم ہیں۔ اور جن کی بدولت مجھے سیاسی میدان میں کام کرنے کے لئے تھوڑی بہت قوت حاصل ہوئی۔ اگر یہ تجربے واقعی روحانی ہیں۔ تو خودستائی کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ ان کا کچھ اثر میری ذات پر ہوسکتا ہے۔ تو یہی کہ میری عاجزی اور بڑھ جائے۔ گزرے ہوئے زمانہ پر میں جتنا غور کرتا ہوں، اتنی ہی مجھ پر اپنی نارسائی کھلتی جاتی ہے۔

وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے۔ جس کی آرزو اور سعی میں میں تیس سال سے بے چین ہوں، معرفت نفس، دیدالٰہی، حصول موکشا ہے۔ یہی تلاش، یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہی میری زندگی ہے۔ میری تحریر وتقریر کا میری ساری سیاسی جد وجہد کا یہی مقصد ہے۔ لیکن چونکہ ہمیشہ سے یقین ہے کہ جو کام ایک شخص کے لئے ممکن ہے۔ وہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس لیے میں نے جتنے تجربے کیے وہ خلوت کی تاریکی میں نہیں، بلکہ جلوت کی روشنی میں کیے۔؟ اور میرے خیال میں اس سے ان کی روحانی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

بعض معاملے بندے اور خدا کے درمیان ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی اور کو خبر نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے یہ چیزیں بیان میں نہیں آسکتیں۔ جن تجربوں کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایسے نہیں ہیں، مگر ہیں یہ بھی روحانی، بلکہ یوں کہیے کہ اخلاقی تجربے، کیونکہ اخلاق ہی مذہب کی جان ہے۔

اس کہانی میں صرف ان مذہبی باتوں کا ذکر ہوگا، جنہیں بچے اور بوڑھے دونوں اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر میں ان کو جذبات سے الگ ہوکر سچائی اور عجازی سے بیان کرسکا تو ان سے اور بہت سے تجربے کرنے والوں کو روحانی ترقی میں مدد ملے گی۔ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تجربے مکمل ہیں۔ میں انہیں اس سے زیادہ قابل

وثوق نہیں سمجھتا، جتنا ایک دیانت دار سائنس دان اپنے تجربوں کو سمجھتا ہے۔ وہ بہت زیادہ صحت کے ساتھ خوب سوجھ بوجھ کر ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا ہوئے تجربے کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ جو نتیجے اسے حاصل ہوئے ہیں، وہ قطعی اور آخری ہیں، بلکہ وہ ان میں ترمیم اور اصلاح کی گنجائش سمجھتا ہے۔ میں نے بہت گہرے مشاہدہ باطن سے کام لیا ہے، اور اپنے نفس کو اچھی طرح ٹٹولا ہے۔ اور ہر نفسیاتی حالت کی تحلیل کی ہے۔ لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے۔ کہ میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں، وہ آخری اور قطعی ہیں۔ یا خطا سے بری ہیں۔ البتہ اتنا دعویٰ مجھے ضرور ہے کہ میری ذات کے لئے یہ نتیجے بظاہر بالکل صحیح اور فی الحال قطعی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان پر اپنے عمل کی بنیاد نہ رکھتا۔ لیکن میں نے ہمیشہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے غور کیا ہے۔ کہ کس نتیجے کو قبول کروں، اور کسے رد کروں، اور اس کے بعد جو رائے قائم ہوئی اس پر عمل کیا۔ جہاں تک میرے افعال میری عقل اور میرے دل کو مطمئن کر سکیں، میرا فرض ہے کہ اپنے پچھلے فیصلوں پر مضبوطی سے قائم رہوں۔

اگر مجھے محض علمی اصولوں پر بحث کرنا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مجھے آپ بیتی لکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ چونکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں پر جس طرح مختلف صورتوں میں عمل کیا گیا، اس کا حال سناؤں، اس لئے میں ان چند ابواب کا جو میں لکھ رہا ہوں، یہ نام رکھا ہے'' ۔ ان تجربوں کی کہانی جو میں نے تلاش حق میں کیے یہ ظاہر ہے کہ اس میں عدم تشدد، تجرد کی زندگی وغیرہ اخلاقی اصولوں کے تجربے بھی شامل ہیں۔ جنہیں لوگ حق سے جدا سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک حق اصل اصول ہے۔ جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں۔ جنہیں لوگ حق سے جدا سمجھتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک حق اصل اصول ہے۔ جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں۔ یہاں حق سے مراد محض لفظوں کی سچائی نہیں، بلکہ خیال کی سچائی بھی اور سچائی بھی ہمارے ادراک کی اعتباری سچائی نہیں، بلکہ حق محض، جو ہر ابدی، یعنی خدا کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں۔ کیونکہ اس کے نور کی تجلیاں بے شمار ہیں۔ ان کے تصور سے مجھ پر رعب اور حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ اور میں ایک لمحے کے لئے ان میں محو ہو جاتا ہوں۔ لیکن خدا کی پرستش میں اسے حق محض سمجھ کر کرتا ہوں۔ میں نے اسے اب تک نہیں پایا، مگر میں اسے برابر ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں اس کی جستجو کی راہ میں ان سب چیزوں کو قربان کرنے کو تیار ہوں، جو مجھے عزیز ہیں۔ یہاں تک کہ اگر میری جان کی قربانی بھی طلب کی جائے تو انشا اللہ مجھے اس میں بھی تامل نہیں ہو گا۔ لیکن جب تک میری رسائی حق محض تک نہ ہو، اس وقت تک مجھے بھی لازم ہے کہ اعتباری حق کا جو تصور میرے ذہن میں ہے۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہوں۔ اس وقت تک یہی اعتباری حق میرے لیے شمع ہدایت ہے۔ اور یہی میرا زرہ بکتر ہے۔ اگر چہ یہ راہ کٹھن ہے۔ اور تنگ اور تلوار کی دھار کی طرح تیز ہے۔ مگر میرے لئے یہی سب سے سیدھی اور سہل ثابت ہوئی ہے۔ میری ہمالیہ کے برابر غلطیاں بھی میری نظر میں ہیچ ہیں۔ کیونکہ میں نے اس کی راہ سے ذرا بھی قدم نہیں ہٹایا۔ اسی راہ نے مجھے اس سفر سے بچایا، اور میں اپنے ایمان کی روشنی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اکثر مجھے اس سفر میں حق یعنی خدائے برحق کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے۔ کہ صرف اس کی ذات حقیقی وجود رکھتی ہے۔ اور سب چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ جس کا جی چاہے دیکھے کہ مجھے یہ یقین کیوں کر حاصل ہوا ہے۔ آئے اور میرے تجربوں میں شریک ہو۔ اور اگر اس سے ہو سکے تو میرے اس یقین میں بھی اس کے

علاوہ مجھے یہ بھی یقین ہوتا جاتا ہے کہ جو چیز میرے لیے ممکن ہے۔ اور میرے اس قول کی معقول وجوہات ہیں۔ تلاش حق کی راہیں دشوار بھی ہیں۔ اور آسان بھی۔ ممکن ہے کہ ایک مغرور آدمی کے لئے ان راہوں پر چلنا ناممکن ہو، اور ایک معصوم بچے کے لئے ممکن ہو۔ طالب حق کو خاک راہ سے بھی زیادہ خاکسار ہونا چاہیئے۔ دنیا خاک کو پیروں سے کچلتی ہے۔ لیکن طالب حق کو ایسی اعجازی اختیار کرنی چاہیئے کہ خاک بھی اسے کچل سکے۔ تبھی اس کو حق کی جھلک دکھائی دے گی۔ بے اس کے کبھی نہیں، داسشتا اور وشواستر کی گفتگو میں یہ بات خوب ثابت کی گئی ہے، عیسائیت اور اسلام بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

جو کچھ میں ان صفحوں میں لکھ رہا ہوں، اگر اس میں سے کسی چیز میں غرور کا شائبہ نظر آئے تو انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ میری تلاش میں کوئی کھوٹ ہے۔ اور جو جھلک مجھے نظر آیا کرتی ہے۔ وہ محض ایک سراب ہے۔ چاہے مجھ جیسے سینکڑوں کی شہرت خاک میں مل جائے، مگر حق کا بول بالا رہے۔ مجھ جیسے فانی انسانوں کے اعمال کا محاسبہ کرنے میں آپ کو حق کے معیار سے بال برابر بھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔

مجھے امید ہے کہ کوئی شخص ان نصیحتوں کو جو آئندہ ابواب میں جابجا کی جائیں گی۔ محض میرے قول یا فعل کی سند پر قبول نہ کرے گا۔ اور میری دعا ہے کہ کوئی ایسا نہ کرے، جن تجربات کا میں نے ذکر کیا ہے۔ انہیں مثال کے طور پر سمجھنا چاہیئے۔ اور ان کی روشنی میں ہر شخص کو اپنی خواہش اور اپنی استعداد کے مطابق خود تجربے کرنے چاہییں۔ انشا اللہ یہ تھوڑی سی مدد میرے تجربات سے لوگوں کو ضرور ملے گی۔ کیونکہ میں کسی ناگوار بات کو جس کا بیان کرنا ضروری ہے۔ نہ تو چھپاؤں اور نہ گھٹا کر بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں پڑھنے والوں کو اپنے سارے عیبوں اور ساری

خطاؤں سے آگاہ کر دوں گا۔میرا مقصد لوگوں کو یہ بتانا نہیں کہ دیکھو میں کتنا اچھا ہوں۔بلکہ فن ستیاگرہ کے تجربوں کو بیان کرنا ہے۔میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کے لئے حق کی طرح سخت گیر ہونے کی کوشش کروں گا اور یہی میں دوسروں سے چاہتا ہوں، جب میں اپنے آپ کو اس پیانے پر ناپتا ہوں تو مجھے بے اختیار سورداس کا ہم زبان ہو کر کہنا پڑتا ہے۔

کہاں سے کوئی ایسا کم بخت
قابل نفرت گنہ گار میں ہوں ؟
میں نے چھوڑ دیا اپنے خالق کو
یہ حال ہے میری بے وفائی کا

کیونکہ یہ خیال ہمیشہ میرے لیے سوہان روح رہتا ہے۔کہ میں اب تک اپنے خدا سے اتنا دور ہوں، جو مجھے خوب معلوم ہے۔میری زندگی کی ہر سانس کا مالک ومختار ہے، جس کے دریا کا میں ایک قطرہ ہوں، مجھے معلوم ہے کہ یہ میری ہوائے نفس ہی ہے، جو مجھے اس سے دور رکھتی ہے۔لیکن پھر بھی مجھ سے یہ نہیں ہوتا کہ اس سے دامن چھڑا لوں۔

اب یہ تمہید مجھے ختم کر دینی چاہیئے ،اصل کہانی آئندہ باب میں شروع ہو گی۔

م۔ک۔گاندھی

سابرمتی آشرم

26 نومبر 1925ء

حصہ اول

پیدائش اور نسب

گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنیے تھے۔اور ابتدا ءمیں پنساری کی دکان کرتے تھے۔لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاوار کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ میرے دادا اتم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصولوں کے بڑے پکے تھے۔ریاست کی سازشوں سے مجبور ہو کر انہیں پور بندر سے جہاں وہ دیوان تھے،جونا گڑھ جانا پڑا۔وہاں انہوں نے نواب صاحب کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا۔کسی شخص کی نظر اس حرکت پر پڑ گئی،جو بظاہر بے ادبی معلوم ہوتی تھی۔اس نے اس کی وجہ پوچھی تو میرے دادا نے کہا ''سیدھا ہاتھ پور بندر کے راجہ کی خدمت کا پابند ہو چکا ہے۔''اوتا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔اور انہوں نے دوسری شادی کی،پہلی بیوی سے ان کے چار لڑکے تھے،اور دوسری سے دو لڑکے تھے۔جہاں تک مجھے یاد ہے،بچپن میں مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ اوتا گاندھی کے یہ سب لڑکے ایک ماں سے نہیں ہیں۔ان چھ بھائیوں میں تلسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے۔اور ان سے بڑے کرم چند گاندھی عرف کبا،گاندھی تھے۔یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پور بندر کے دیوان رہے۔کبا گاندھی میرے والد تھے۔وہ راجستانی عدالت کے رکن بھی تھے۔یہ عدالت بھی اب ٹوٹ گئی ہے۔مگر ان دونوں والیان ریاست اور ان کی برادری

والوں کے باہم جھگڑوں کو نبٹانے کے لئے یہ ایک بڑی با اثر جماعت تھی۔ کیا گاندھی کچھ دن راج کوٹ میں دیوان رہے۔ اور اس کے بعد ونکانیر میں بھی، جب ان کا انتقال ہوا، اس زمانے میں وہ ریاست راجکوٹ سے پینشن پاتے تھے۔

انہوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ کیونکہ ان کی تین بیویاں ایک ایک کر کے مر گئیں، ان ہوئے جن میں سب سے چھوٹا میں تھا۔

میرے والد اپنی برادری کے بڑے خیر خواہ، بہادر اور فیاض آدمی تھے۔ لیکن نازک مزاج بھی بہت تھے۔ شاید وہ کسی حد تک جسمانی لذتوں کے دل دادہ تھے۔ کیونکہ چالیس برس کی عمر سے زیادہ میں انہوں نے چوتھی شادی کی۔ لیکن وہ کبھی رشوت نہیں لیتے تھے۔ اور اپنوں اور بیگانوں میں ان کی منصف مزاجی کی دھوم تھی۔ ریاست کے ساتھ ان کی وفا داری مشہور تھی۔ کسی اسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ نے ان کے سردار ٹھاکر صاحب راج کوٹ کا ذکر توہین آمیز الفاظ میں کیا، تو انہوں نے کہا معافی مانگو۔ کیا گاندھی نے صاف انکار کیا۔ اس لئے وہ چند گھنٹے تک حراست میں رکھے گئے۔ لیکن جب ایجنٹ نے ان کی ثابت قدمی دیکھی تو اسے رہائی کا حکم دینا پڑا۔

میرے والد کو دولت جمع کرنے کی ہوس نہ تھی۔ اور انہوں نے ہمارے لئے بہت کم جائیداد ترکے میں چھوڑی۔ انہوں نے سوائے تجربے کے کسی مدرسے میں تعلیم نہ پائی۔ زیادہ سے زیادہ ان کی لیاقت گجراتی کے پانچویں درجے کے برابر ہوگی۔ تاریخ اور جغرافیہ سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ لیکن عملی کاموں میں بہت وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ جس سے انہیں بڑی بڑی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور سینکڑوں آدمیوں سے نبٹنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ ان کی مذہبی تعلیم بہت کم تھی۔ لیکن ان میں وہ دین داری موجود تھی۔ جو مندروں میں آنے جانے اور مذہبی تقریروں کے سننے

سے بہت سے ہندوؤں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آخری عمر میں وہ ایک عالم برہمن کے کہنے سے جو ہمارے خاندان کے دوست تھے۔ بھگوت گیتا کی تلاوت کرنے لگے تھے۔ اور پوجا کے وقت اس کے چند شلوک زور سے پڑھا کرتے تھے۔

والدہ صاحبہ کے متعلق میرے حافظہ میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت اور پرہیزگاری کا ہے۔ وہ بڑی پکی دین دار تھیں۔ ناممکن تھا کہ وہ ان دعاؤں کے جو وہ روز پڑھا کرتی تھیں، کھانا کھالیں۔ ''حویلی یعنی وشنو مندر میں جانا'' ان کے روزمرہ فرائض میں شامل تھا۔ جہاں تک میری راد کاء کرتی ہے۔ انہوں نے کبھی ''چز ماس'' قضا نہیں کی۔ وہ سخت سے سخت ریاضتوں کی نذر مان لیتی تھیں۔ اور انہیں انتہائی ثابت قدمی سے پورا کرتی تھیں، بیماری کے سبب وہ کبھی اس میں ڈھیل نہیں ڈالتی تھیں۔ بیمار ہونا ان کے لئے کوئی عذر نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ ''چندریانہ ئے'' ناکلے کی نذر ماننے کے بعد بیمار ہو گئیں، مگر انہوں نے اپنی نذر میں خلل نہ پڑنے دیا۔ دو تین دن روزے پر روزہ رکھنا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ''چتر ماس'' میں دن میں ایک بار کھانا کھانا ان کی عادت میں داخل تھا۔ ایک چتر ماس میں انہیں اس سے تسکین نہ ہوئی تو انہوں نے ایک دن پورا روزہ رکھنے کی نذر مان لی۔ ایک بار انہوں نے یہ نذر مان لی کہ جب تک سورج نہ دیکھ لوں گی، کھانا نہ کھاؤں گی۔

ہم سب بچے ان دنوں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ سورج نکلتے دیکھیں تو والدہ کو خبر دیں، سب جانتے ہیں کہ جب برسات کا موسم شباب پر ہوتا ہے تو سورج اکثر بے التفاتی سے منہ چھپا لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ یک بیک سورج کو بادلوں سے نکلتے دیکھ کر ہم لوگوں نے دوڑ کر انہیں خبر دی۔ وہ دوڑی ہوئی آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں، مگر اتنی دیر میں

سیماب وش سورج غائب ہو گیا تھا۔ اور انہیں کھانا نصیب نہ ہوا، مگر وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے یہی کہتی تھیں "کوئی ہرج کی بات نہیں خدا کی یہی مرضی تھی۔ کہ میں آج کھانا نہ کھاؤں۔" اور جا کر روزمرہ کے دھندوں میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

میری والدہ بڑی سمجھ دار تھیں۔ انہیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھیں، اور محل کی خواتین ان کی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔ میں اکثر بچپن کے حقوق سے فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ محل میں جایا کرتا تھا۔ اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ان سے اور ٹھاکر صاحب کی والدہ سے بارہا خوب بحثیں ہوئیں۔

میں ان ماں باپ کے گھر میں 2 اکتوبر 1869ء کو بمقام پوربندر جسے سدا میری بھی کہتے ہیں۔ پیدا ہوا، میرا بچپن کا زمانہ پوربندر ہی میں گزرا، مجھے یاد ہے کہ میں مدرسے میں بٹھایا گیا تھا۔ مجھے پہاڑے یاد کرنے میں کس قدر دقت ہوئی، مجھے اس زمانے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے استاد کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر کہ میرا ذہن کند تھا اور حافظہ کمزور۔

☆☆☆☆☆☆

بچپن

میری عمر سات برس کی ہوگی کہ میرے والد ر اجھستانی عدالت کے رکن ہو کر پور بندر سے راج کوٹ گئے۔ وہاں میں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں، اور استادوں کی باتیں اور ان کے نام بہت باتیں ذہن میں محفوظ ہیں۔ پور بندر کی طرح یہاں بھی میری پڑھائی کی کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میں معمولی سا طالب علم تھا۔ اس مدرسے سے میں مضافات کے ایک اسکول میں اور وہاں سے بارہ برس کی عمر میں ہائی سکول گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس قلیل عرصے میں میں نے کبھی اپنے استادوں اور ہم مکتبوں سے جھوٹ نہیں بولا۔ میں بہت شرمیلا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ سوا میری کتابوں اور میرے کام کے کوئی میرا رفیق نہ تھا۔ گھنٹہ بجتے ہی سکول پہنچ جاتا اور چھٹی ہوتے ہی گھر بھاگ آنا میرا روزمرہ زندگی کا معمول تھا۔ میں سچ مچ بھاگتا ہوا جاتا تھا۔ کیونکہ مجھے کسی سے بات کرنے کی تاب نہ تھی، یہ بھی خوف رہتا تھا کہ کوئی میری ہنسی نہ اڑائے۔

ہائی سکول میں پہلے سال امتحان کے موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا جو قابل ذلر ہے۔ مسٹر جائس اسکول انسپکٹر سکول کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہجے کی مشق کے لئے پانچ الفاظ لکھوائے تھے۔ ان میں سے ایک لفظ (Cristle) کے تھا۔ میں نے اس کے ہجے غلط لکھے، استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھکرا کر آگاہ کرنا چاہا، مگر میں باخبر نہ ہوا، یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ وہ

چاہتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجے نقل کرلوں، کیونکہ میرے خیال میں استاد وہاں تھے ہی اس لئے کہ بچے نقل نہ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب لڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے ہجے صحیح نکلے۔ ایک میں ہی بے وقوف ثابت ہوا۔ بعد میں استاد نے میری یہ بے وقوفی سمجھانا چاہی، مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مجھے نقل کرنے کا فن کبھی نہ آیا۔

تاہم استاد کی جو عزت میرے دل میں تھی۔ اس میں اس واقعے سے کوئی فرق نہ آیا۔ مجھ میں یہ قدرتی بات تھی کہ بڑھوں کی برائی نظر نہ آتی تھی۔ آگے چل کر مجھے ان استاد کی اور کمزوریاں بھی معلوم ہوئیں، مگر میں اسی طرح ان کا ادب کرتا رہا۔ کیونکہ میں نے بڑوں کی فرمانبرداری سیکھی تھی۔ ان کے کاموں پر نکتہ چینی کرنا نہیں سیکھا تھا۔

اس زمانے کے دو اور واقعات میرے حافظے میں ہمیشہ نقش رہے۔ عام طور سے سوائے سکول کی کتابوں کے اور کسی کتاب میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ مجھے اپنا روزانہ سبق چار و ناچار یاد کرنا پڑتا تھا۔ مجھے استاد کی خفگی بری لگتی تھی۔ اور انہیں دھوکا دینا مجھے پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں سبق تو یاد کرلیتا مگر بے دلی سے، غرض جب سبق ہی جیسا چاہے یاد نہ ہوتا تھا تو اور کتابوں کے پڑھنے کا کیا ذکر ہے۔ مگر خدا جانے کیوں کر میری نظر ایک کتاب پر پڑی جو میرے والد نے خریدی تھی۔ "شرون پتری ناٹک (شرون کے احترام والدین کا ناٹک تھا۔) میں نے اسے بے حد شوق سے پڑھا۔ اس زمانے میں ہمارے ہاں سفری ناٹک والے آئے تھے۔ میں نے جو سین دیکھے، ان میں سے ایک سین یہ تھا کہ شرون اپنے کاندھے پر ایک بہنگی رکھے اپنے اندھے ماں باپ کو جاترا کے لئے لے جارہا تھا۔ یہ کتاب اور یہ منظر میرے دل پر

ایسے نقش ہوگئے کہ مٹائے نہ مٹے۔ میں نے اپنے دل میں کہا، دیکھ یہ مثال ہے، جس کی تجھے تقلید کرنی چاہیئے۔ شرون کے مرنے پر اس کے ماں باپ نے جو دردناک بین کیے تھے، ان کی یاد بھی اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ اس دل گداز لے نے مجھے تڑپا دیا۔ اور میں اسے اپنے ارگن باجے پہ جسے میرے باپ نے مجھے خرید کر دیا تھا۔ بجایا کرتا تھا۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ ایک اور ناٹک کا ہے۔ اسی زمانے میں اپنے والد کی اجازت سے میں ایک ناٹک کمپنی میں تماشا دیکھنے گیا۔ اس تماشے ''ہرش چندر'' نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں اسے بار بار دیکھتا تھا اور نہ تھکتا تھا۔ آخر مجھے کب تک جانے کی اجازت ملتی۔ یہ تماشا میرے جی میں بس گیا تھا۔ اور خدا جانے کتنی بار میں نے ہریش چندر جی کا پارٹ کیا ہوگا۔

سب لوگ ہریش چندر جی کی طرح سچے کیوں نہ ہو جائیں؟۔ یہ سوال میں اپنے دل میں دن رات کیا کرتا تھا۔ حق کی پیروی کرنا اور وہ سب کچھ سہنا جو ہریش چندر جی نے سہا تھا، بس یہی ایک نصب العین تھا۔ جس کی لگن اس تماشے نے میرے دل کو لگا دی تھی۔ میں ہریش چندر جی کے قصے کو لفظ بہ لفظ سچ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال کر کے میں رونے لگتا تھا۔ آج میری عقل مجھ سے کہتی ہے کہ ہریش چندر جی کوئی تاریخی شخص نہیں ہوسکتا۔ مگر میرے لئے ہریش چندر جی اور شرون دونوں جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اب ان ناٹکوں کو پھر پڑھوں تو مجھ پر اتنا ہی اثر ہوگا جتنا پہلے ہوا تھا۔

☆☆☆

بچپنے کی شادی

میرا بہت جی چاہتا ہے کہ مجھے یہ باب لکھنا پڑے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کہانی کے دوران میں مجھے بہت سے ایسے تلخ گھونٹ پینا ہے۔ اور اگر مجھے حق کی پرستاری کا دعویٰ ہے تو سوا اس کے چارہ بھی نہیں کہ۔ میرا دردناک فرض ہے کہ میں اپنی شادی کا قصہ بیان کروں۔ جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی، جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں، جو میری نگرانی میں ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ انہیں مبارک باد دوں، کہ وہ اس مصیبت سے محفوظ رہے ہیں، جو مجھ پر پڑی تھی۔ مجھے اتنی کم سنی کی شادی کے لئے کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

کہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔ میری منگنی نہیں، بلکہ شادی ہوئی تھی۔ کاٹھیاوار میں منگنی اور شادی دو الگ الگ رسمیں ہیں۔ منگنی اسے کہتے ہیں کہ لڑکی اور لڑکے کے والدین ان کی شادی کا وعدہ کرلیں اور یہ ہونے کے بعد چھوٹ بھی سکتی ہے۔ منگنی کے بعد لڑکا مر جائے تو لڑکی بیوہ نہیں ہوتی۔ یہ معاہدہ دونوں کے والدین آپس میں کر لیتے ہیں لڑکے لڑکی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ اکثر انہیں اس کی اطلاع تک نہیں دی جاتی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میری منگنی تین بار ہوئی، حالانکہ مجھے مطلق خبر نہیں کہ یہ کب ہوا؟۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا کہ جو لڑکیاں میرے لئے پسند کی گئی تھیں مر گئیں۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت تین بار ہوئی۔ مجھے کچھ خفیف سا یاد ہے کہ میری تیسری منگنی اس وقت ہوئی جب میں ساتویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔ مگر جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے،

کسی نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔اس باب میں اپنی شادی کا ذکر کر رہا ہوں، جو مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔

آپ کو یاد ہوگا، میرے دو بھائی تھے۔بڑے بھائی کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اب بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ میرے منجھلے بھائی کا جو مجھ سے دو تین سال بڑے تھے، میرے ایک رشتے کے بھائی کا جو شاید ایک سال بڑے تھے اور میرا بیاہ ساتھ ساتھ کر دیا جائے۔اس فیصلے میں ہماری بہتری کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔اور ہماری مرضی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔انہیں تو محض اپنی آسانی اور کفایت سے بحث تھی۔

ہندوؤں کے یہاں شادی کوئی کھیل نہیں ہے۔اکثر دولہا اور دلہن کے والدین اس میں تباہ ہو جاتے ہیں۔وہ اپنا دھن دولت برباد کرتے ہیں۔اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔مہینوں تیاری ہوا کرتی ہے۔کپڑے اور زیور بنائے جاتے ہیں۔ دعوتوں کے خرچ کا حساب لگایا جاتا ہے۔ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اتنے بہت سے اور اتنے قسم کے کھانے پکوائے کہ اوروں سے بڑھ جائے۔عورتیں چاہے ان کی آواز اچھی ہو یا نہ ہو اتنا گاتی ہیں کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔اور ہمسایوں کی جان عذاب میں پڑ جاتی ہے۔لیکن یہ لوگ چپ چاپ سارا شور وغل برداشت کرتے ہیں۔ان کے گھروں میں دعوت کا بچا کھچا سڑا گلا کھانا پھینکا جاتا ہے۔اور وہ دم نہیں مارتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک دن خود انہیں بھی یہی حرکتیں کرنا ہیں۔

میرے بزرگوں نے سوچا کہ بہتر ہے کہ سارا بکھیڑا ایک ہی مرتبہ ہو جائے۔اس میں خرچ کم ہے، اور شہرت زیادہ، کیونکہ اگر تین بار خرچ کرنے کی بجائے ایک بار خرچ کرنا ہو تو آدمی خوب جی کھول کر خرچ کر سکتا ہے۔میرے باپ اور چچا دونوں بوڑھے تھے۔اور ہم تینوں کے سوا انہیں کسی اور بچے کی شادی کرنا باقی نہ تھا۔غالباً وہ

چاہتے تھے کہ اپنی زندگی کی آخری رنگ رلیاں منالیں۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اکٹھی تین شادیوں کا فیصلہ کیا گیا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مہینوں تیاری ہوتی ہے۔

ہمیں ان تیاریوں سے آنے والی تقریب کی خبر ہوئی، میرے نزدیک اس کی اہمیت بس اتنی تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے۔ ڈھولک بجے گی، بارات نکلے گی، عمدہ عمدہ کھانے پکیں گے، اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی۔ شہوانی خواہش آگے چل کر پیدا ہوئی۔ میں اپنی اس شرم ناک حال پر پردہ ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ البتہ دو ایک باتیں جن کا بیان کرنا ضروری ہے۔ آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن یہاں ان باتوں سے اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں۔

غرض مجھ کو اور میرے بھائی کو لوگ راج کوٹ سے پوربندر لے گئے۔ آخری ناٹک سے پہلے جو ابتدائی تماشے ہوئے۔ ان میں بعض باتیں دل چسپ ہیں، مثلاً ہمارے سارے جسم پر پانی میں پسی ہوئی ہلدی کا ملا جانا، لیکن انہیں نظر انداز کرنا پڑے گا۔

میرے والدین دیوان آہی، مگر پھر بھی نوکر تھے۔ اور چونکہ ان پر ٹھاکر صاحب کی خاص نظر عنایت تھی۔ اس لیے ان کی نوکری اور بھی سخت تھی۔ ٹھاکر صاحب نے انہیں آخر وقت تک جانے نہ دیا۔ پھر جب اجازت دی تو ان کے ساتھ گاڑیوں کی ڈاک بٹھا دی۔ کہ سفر میں دو دن کم لگیں، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پوربند سے راج کوٹ 120 میل دور ہے۔ بیل گاڑی میں پانچ دن کا سفر ہے۔ میرے والد نے یہ راہ تین دن میں طے کی، لیکن تیسری منزل میں گاڑی الٹ گئی اور انہیں بہت سخت چوٹ آئی۔ جب وہ آئے تو ان کے سارے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی

تھیں۔انہیں اور ہم سب کو شادی کی جو خوشی تھی، آدھی رہ گئی۔مگر رسم تو پوری کرنا ہی پڑی۔کیونکہ بھلا شادی کی تاریخ کیسے ٹل سکتی تھی۔شادی کی طفلانہ دلچسپیوں میں میں اپنے والد کے زخمی ہونے کا رنج بھول بھال گیا۔

مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی، اور دل وجان سے ان کی اطاعت کرتا تھا۔مگر اسی کے ساتھ ہی نفسیانی خواہشوں کا بندہ بھی تھا۔ابھی میں نے یہ نہیں سیکھا تھا کہ مجھے اپنے والدین کی بندگی اور خدمت کی خاطر اپنی راحت ومسرت قربان کر دینا چاہیئے، مگر ایک واقعہ جسے میری لذت پرستی کی سزا سمجھنا چاہیئے، ایسا ہوا کہ جس کی چبھن میرے دل سے آج تک نہیں گئی، اسے میں آگے چل کر بیان کروں گا۔نشکل آنند کا ایک دوہا ہے۔''دنیا کی چیزوں کو ترک کیے بغیر خواہشوں کا ترک کاغذ کی ایک ناؤ ہے۔''تھوڑی دری سے زیادہ نہیں چلتی، تم لاکھ کوشش کرو''میں جب کبھی اسے گاتا ہوا یا دوسروں کو گاتے سنتا ہوں تو یہ ناگوار تلخ واقعہ یاد آجاتا ہے۔اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

میرے والد کو بہت چوٹ آئی تھی، مگر انہوں نے ہمت اور ضبط سے کام لے کر ظاہر نہ ہونے دیا اور شادی میں بھرپور حصہ لیا۔آج بھی اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو ان جگہوں کی تصویر آنکھوں میں پھرتی ہے۔جہاں بیٹھ کر انہوں نے شادی کی مختلف رسمیں انجام دی تھیں۔اس وقت مجھے شان وگمان بھی نہ تھا کہ ایک دن اپنے والد پر سختی سے نکتہ چینی کروں گا۔کہ انہوں نے میری شادی بچپن میں کر دی۔اس روز تو مجھے ہر چیز درست، بجا اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔آج بھی وہ سماں میری نظر میں ہے۔ہمارا شادی کی چوکی پر بیٹھنا، اسپتبد''8''کی رسم ادا کرنا، دولہا دلہن کا ایک دوسرے کو میٹھا کنسر 9 کھلانا اور پھر ہم دونوں کی خلوت۔آہ وہ پہلی رات دو معصوم بچے بے جانے بوجھے

زندگی کے سمندر میں کود پڑے۔ میری بھاوج نے مجھے اچھی طرح سکھا دیا تھا کہ مجھے پہلی رات کیا کرنا چاہیئے؟۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری بیوی کو کس نے سکھایا تھا؟۔ میں نے اس سے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا؟۔ اور نہ اب پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے جاتے ہوئے کس قدر جھجکتے تھے۔ ہماری شرم حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ میں اپنی بیوی سے کیسے باتیں کروں گا اور کیا کہوں گا؟ جو کچھ مجھے سکھایا گیا تھا۔ اس سے کہاں تک کام چلتا۔ مگر سچ پوچھیے تو ان باتوں میں سکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہمارے پہلے جنم کے نقش اس قدر قوی ہیں کہ سکھانا پڑھانا بالکل فضول ہے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو گئے۔ بے تکلف بات چیت کرنے لگے۔ ہم دونوں کم سن تھے، مگر میں نے بہت جلد شوہرانہ حکومت سے کام لینا شروع کر دیا۔

☆☆

شوہری کے ٹھاٹھ

جب میری شادی ہوئی اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے ایک پیسہ یا ایک پائی کے (مجھے ٹھیک یاد نہیں) بکا کرتے تھے۔ جن میں بیوی میاں کی محبت، کفایت شعاری، بچپن کی شادی، اور اسی قسم کی اور باتوں پر بحث ہوتی تھی۔ جب مجھے کوئی اس قسم کا رسالہ ملتا تھا تو میں اسے شروع سے آخر تک پڑھتا تھا۔ اور میری عادت تھی کہ جو بات پسند نہ آتی، اسے بھول جاتا تھا۔ اور جو پسند آتی، اس پر عمل کرتا تھا۔ ان رسالوں میں شوہر کا فرض یہ بتایا گیا تھا کہ عمر بھر بیوی کا وفادار رہے۔ اور یہ بات ہمیشہ کے لئے میرے دل میں نقش ہوگئی۔ اس کے علاوہ حق کا عشق میرے خمیر میں تھا۔ اور یہ کس طرح ممکن نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو دھوکا دوں۔ پھر اس چھوٹی سی عمر میں مجھے بے وفائی کا موقع ملنا بھی مشکل تھا۔

مگر اس وفاداری کے سبق کا ایک برا نتیجہ بھی نکلا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اپنی بیوی سے وفاداری کرنے کا پابند ہوں، تو انہیں بھی اس کا پابند ہونا چاہیئے کہ مجھ سے وفاداری کریں۔ اس خیال نے مجھے بدگمان شوہر بنا دیا۔

وفاداری کرنا ان کا فرض تھا۔ مگر میں نے اسے اپنا حق بنا لیا۔ کہ ان سے وفاداری کا مطالبہ کروں اور اس مطالبے کو پورا کرانے کے لئے ہر وقت چوکسی رکھنا ضروری سمجھا۔ میرے پاس اپنی بیوی کی پاک دامنی پر شبہ کرنے کی مطلق کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن بدگمانی وجہ اور سبب کی پابند نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی کرنے لگا۔ اس لئے وہ بغیر میری اجازت کے کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے

ہمارے آپس میں سخت نزاع کا بیج بو دیا۔ میری نگرانی اصل میں ایک طرح کی قید تھی۔ اور کستورا بائی وہ لڑکی نہ تھی جو ان چیزوں کو چپ چاپ برداشت کر لے۔ انہوں نے اوبدا کر کہنا شروع کیا۔ جس وقت جی چاہا چلی گئیں۔ میں نے زیادہ سختی کی تو انہوں نے اور بے باکی سے کام لیا۔ اور میری جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں شادی شدہ بچے اکثر ایک دوسرے سے بول چال ترک کر دیتے تھے۔ سچ پوچھیے تو میری بندشوں کی خلاف ورزی کرنے میں کستورا بائی پر کوئی الزام نہیں آتا۔ بھلا ایک صاف دل لڑکی یہ کیوں کر گوارا کر سکتی ہے کہ اس کے مندر جانے یا ہم جولیوں کے ساتھ ملنے جلنے پر روک، ٹوک کی جائے۔ اگر مجھے ان پر بندشیں عائد کرنے کا حق تھا۔ تو کیا انہیں نہیں تھا۔؟ آج میں یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھتا ہوں، مگر اس زمانے میں تو مجھے شوہرانہ اختیارات برتنے کا خبط تھا۔

مگر یہ نہ سمجھیے کہ ہماری زندگی میں سوائے تلخی اور ناکامی کے کچھ نہ تھا۔ میں اپنی بیوی کو زبردستی زوجیت کا مکمل نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ میں انہیں اس پر مجبور کرنا چاہتا تھا کہ عفت کی زندگی بسر کریں۔ جو میں سیکھوں، وہ بھی سیکھیں اور اپنی زندگی کو میری زندگی میں اور اپنے خیالات کو میرے خیالات میں ضم کر دیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ کستورا بائی کی بھی یہ آرزو تھی یا نہیں۔ وہ ان پڑھ تھیں، ان کے مزاج میں خلقی طور پر سادگی، کم سخنی، خودداری اور استقلال تھا۔ وہ مجھ سے کم یا زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ انہیں اپنی جہالت کا کوئی غم نہیں تھا۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی انھوں نے میری دیکھا دیکھی لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں ہوا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرے حوصلے یک طرفہ تھے۔ میرے سارے جوش الفت کا مرکز یہی ایک عورت تھی، اور میں چاہتا تھا کہ ادھر سے بھی ایسی ہی محبت کا اظہار ہو۔ جانبین

سے گرم جوشی نہ سہی، پھر بھی ہمارے تعلقات سراسر رنج وکلفت پر مبنی نہ تھے۔ کیونکہ کم سے کم ایک طرف سے تو بے قراری محبت تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں ان پر دل وجان سے فریفتہ تھا۔سکول میں بھی انہی کے خیال میں محو رہتا تھا۔اور آنے والی رات اور خلوت کا تصور ہر وقت میرے دل و دماغ پر مسلط رہتا تھا۔ان کی جدائی نا قابل برداشت تھی۔رات کو میں بڑی دیر تک فضول باتیں کر کے ان کی نیند حرام کرتا تھا۔اگر اس جوش جنون کے ساتھ ساتھ میرے دل میں فرض شناسی کی لگن نہ ہوتی تو یا تو میں قبل از وقت بیماریوں میں مبتلا ہو کر موت کا شکار ہو جاتا۔یا میری زندگی ایسی ہو جاتی کہ جس سے موت بہتر ہے۔مگر روزمرہ کے فرائض ادا کرنا ضروری تھا۔اور یہ مجھ سے ناممکن تھا کہ جھوٹ بولوں۔اسی آخری چیز نے مجھے بہت سے گڑھوں میں گرنے سے بچایا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کستورا بائی ان پڑھ تھی۔میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انہیں پڑھاؤں، مگر شہوانی محبت سے فرصت نہ ملتی تھی۔پھر ایک وقت یہ تھا کہ مجھے ان کی مرضی کے خلاف پڑھانا پڑتا تھا۔اور وہ بھی رات کے وقت۔بزرگوں کے سامنے گفتگو تو در کنار میری اتنی مجال نہ تھی کہ ان کی طرف دیکھ بھی سکوں۔ان دنوں کاٹھیاوار میں ایک خاص قسم کا بےکار اور وحشیانہ پردہ رائج تھا۔اور ایک حد تک اب بھی ہے۔غرض پڑھائی کے لئے صورت حال ہر طرح ناموافق تھی۔مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں میں نے کستورا بائی کو پڑھانے کی جتنی کوشیش کیں۔وہ زیادہ تر ناکام رہیں۔جب میں ہوائے نفس کی نیند سے چونکا تو میری قومی خدمت کی زندگی شروع ہو چکی تھی۔جس سے مجھے بہت کم فرصت ملتی تھی۔میں نے چاہا کہ اتالیق رکھ کر انہیں پڑھواؤں، مگر اس میں بھی کامیابی نہ

ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کستورا بائی کو سیدھے سادے خط لکھنے اور آسان گجراتی سمجھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ محبت جو مجھے ان سے تھی ہوائے نفس سے پاک ہوتی تو وہ آج ایک تعلیم یافتہ خاتون ہوتیں۔ کیونکہ اس صورت میں ان کی بدشوقی دور کرنے میں کام یاب ہو جاتا۔ مجھے معلوم ہے کہ پاک محبت کے آگے کوئی چیز ناممکن نہیں۔

میں نے ایک چیز کا ذکر کیا ہے، جس نے مجھے شہوانی محبت کے مہلک نتیجوں سے کم وبیش محفوظ رکھا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بہت سی مثالیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ جس شخص کی نیت خالص ہو اسے خدا ایک نہ ایک دن ضرور نجات دیتا ہے۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادی کی ظالمانہ رسم کے ساتھ ایک اور رسم ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے برے نتائج میں ایک حد تک کمی ہو جاتی ہے۔ والدین نوجوان میاں بیوی کو زیادہ دیر تک ایک ساتھ نہیں رہنے دیتے۔ کم سن بیوی سال کے آدھے سے زیادہ دن میکے بسر کرتی ہے۔ یہی صورت ہمیں بھی پیش آئی۔ یعنی شادی کے پانچ سال میں (تیرہ سے اٹھارہ برس) کی عمر تک ہم دونوں سب ملا کر تین سال سے زیادہ اکٹھے نہ رہے ہوں گے۔ ہماری یکجائی کو چھ مہینے بھی نہ ہونے پاتے تھے کہ میری بیوی کے میکے سے بلاوا آ جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بہت گراں گزرتا تھا۔ لیکن اسی نے ہم دونوں کو بچالیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں میں انگلستان چلا گیا۔ اس طرح ایک عرصہ کے لئے جدائی ہو گئی۔ جو ہم دونوں کی صحت کے لئے بہت مفید تھی۔ انگلستان سے میری واپسی کے بعد بھی ہم دونوں کا ساتھ چھ مہینے سے زیادہ نہیں رہا۔ کیونکہ مجھے اکثر راجکوٹ سے بمبئی آنا جانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد مجھے جنوبی افریقہ سے بلاوا آیا، اور وہاں سے واپسی کے بعد میں بڑی حد تک نفسانی خواہشوں سے نجات پا چکا تھا،

ہائی سکول کی تعلیم

میں کہہ چکا ہوں کہ جس زمانے میں میری شادی ہوئی میں سکول میں پڑھتا تھا۔ہم تینوں بھائی ایک ہی سکول میں تھے۔ بڑے بھائی بہت اونچے درجے میں تھے اور جن بھائی کی شادی میری شادی کے ساتھ ہوئی وہ مجھ سے صرف ایک درجہ آگے تھے۔شادی کے سبب سے ہم دونوں کا ایک ایک سال ضائع ہوا۔ بلکہ میرے بھائی کے لیے اس کا نتیجہ اور بھی برا ہوا کیونکہ انہوں نے پڑھنا بالکل چھوڑ ہی دیا۔ خدا جانے کتنے لڑکوں پر یہ مصیبت آتی ہے جوان پر آئی۔ یہ صرف آج کل کی ہندو سماج ہی کا دستور ہے کہ طالب علمی اور شادی کی زندگی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

میری پڑھائی جاری رہی۔ہائی سکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا۔میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی تعلیمی ترقی اور چال چلن کے سرٹیفکیٹ ہر سال لڑکوں کے والدین کے پاس بھیجے جایا کرتے تھے مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا۔ بلکہ دوسرا درجہ پاس 10 کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے۔ پانچویں درجے میں مجھے چار روپے کا اور چھٹے میں دس روپے کا وظیفہ ملا۔اس میں میری قابلیت سے زیادہ میری خوش قسمتی کو دخل تھا کیونکہ وظیفے عام نہ تھے بلکہ کاٹھیاوار کے علاقہ سورٹھ کے لڑکوں میں جو سب سے اچھے طالب علم تھے ان کے لیے مخصوص تھے اور ان پچاس ساٹھ طالب علموں کی جماعت میں سورٹھ کے لڑکے زیادہ نہ ہوں گے۔

مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میرا خیال اپنی قابلیت کے متعلق کچھ اچھا نہ تھا۔ مجھے انعام اور وظیفہ پا کر بہت تعجب ہوا کرتا تھا لیکن اپنے چال چلن کی دیکھ بھال میں بہت سختی

سے کیا کرتا تھا۔اس پر اگر عفیف سا دھبہ بھی آجایا کرتا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جب کبھی میری کوئی حرکت واقعی یا استاد کے خیال میں قابل سرزنش ہوتی تو مجھے ایسا دکھ ہوتا تھا کہ میں برداشت نہیں کرسکتا تھا مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے جسمانی سزا دی گئی سزا کی مجھے اتنی پروا نہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں سزا کا مستحق ٹھہرا۔میں اس رنج میں بہت رویا۔یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں پہلی یا دوسری جماعت میں تھا۔ساتویں جماعت میں مجھے اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ان دنوں داراب جی ایڈل جیمی ہیڈ ماسٹر تھے وہ ادب قاعدے میں بہت سخت اور اپنے اصول کے بڑے پابند تھے اور پڑھاتے بھی خوب تھے۔اس لیے لڑکے ان سے خوش رہتے تھے انہوں نے اونچی جماعتوں کے لڑکوں کے لیے کرکٹ اور جمناسٹک کو لازمی کر دیا تھا۔ مجھے دونوں چیزیں ناپسند تھیں میں کسی ورزش یا کرکٹ فٹ بال میں ان کے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔اس علیحدگی کی جس کے نیچا ہونے کا مجھے اب احساس ہے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں چھپتا تھا۔ان دنوں میں اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ جمناسٹک کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔اب مجھ پر روشن ہو گیا ہے کہ نصاب تعلیم میں جسمانی تربیت کا بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہیے جتنا دماغی تربیت کا۔

مگر ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے فوائد پڑھے تھے اور یہ ہدایت مجھے پسند آگئی تھی اس لیے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی جو اب تک چلی جاتی ہے۔پابندی سے ٹہلنے کی وجہ سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

میں جمناسٹک کو اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ مجھے اپنے والد کی تیمارداری کی دل

سے خواہش تھی سکول بند ہوتے ہی میں سیدھا گھر پہنچتا تھا اور ان کی خدمت میں مصروف ہو جاتا تھا۔ لازمی ورزش اس خدمت میں حائل ہونے لگی۔ میں نے جیمی صاحب سے درخواست کی کہ مجھے جمناسٹک سے مستثنیٰ کر دیں کہ میں اپنے والد کی تیمارداری کر سکوں مگر انہوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ ہر سنیچر کو صبح کا مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ ایک سنیچر کو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے سہ پہر کو چار بجے جمناسٹک کرنے گھر سے سکول جانا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور بادل کے سبب وقت کا اندازہ غلط ہوا جب میں سکول پہنچا تو دیکھا سب لڑکے جا چکے ہیں دوسرے دن جیمی صاحب نے حاضری رجسٹر دیکھا تو مجھے غیر حاضر پایا۔ جب مجھ سے انہوں نے غیر حاضری کا سبب پوچھا تو میں نے سارا واقعہ بیان کیا انہیں میری بات پر یقین نہ آیا اور انہوں نے مجھ پر ایک آنہ یا دو آنے (مجھے ٹھیک یاد نہیں) جرمانہ کر دیا۔

مجھ پر جھوٹ کا الزام! اس بات سے مجھے بہت سخت دکھ پہنچا۔ میں اپنی بے گناہی کیسے ثابت کرتا؟ کوئی صورت نظر نہ آئی تھی مجھے معلوم ہو گیا کہ سچے کو چوکس بھی رہنا چاہیے سکول میں میری غفلت کی یہ پہلی مثال تھی اور یہی آخری بھی تھی مجھے کچھ دھندلا خیال ہے کہ آخر میں میں نے جرمانہ معاف کرا لیا۔

میں ورزش سے مستثنیٰ کر دیا گیا کیونکہ خود میرے والد نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو لکھ دیا کہ انہیں مدرسے کے وقت کے بعد گھر پر میری ضرورت ہوتی ہے ورزش میں غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک اور غفلت کی سزا میں اب تک بھگت رہا ہوں خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آ گیا کہ خط اچھا ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جز نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ انگلستان جانے تک میں اس خیال پر قائم رہا۔ آگے چل کر خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب میں نے وہاں کے

وکیلوں اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوب صورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی اور اپنی غفلت پر بہت پچھتایا مجھے معلوم ہو گیا برے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا چاہیے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی کوشش کی لیکن وقت گزر چکا تھا لڑکپن کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہو سکی۔ ہر نوجوان مرد اور عورت کو میری مثال سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ اچھا خط تعلیم کا لازمی جزو ہے اب میری رائے یہ ہے کہ بچوں کو لکھنا سکھانے سے پہلے ڈرائنگ سکھانا چاہیے وہ حرفوں کو مشاہدے سے اچھی طرح پہچانیں جیسے چیزوں مثلاً پھولوں، چڑیوں وغیرہ کو پہچانتے ہیں اور لکھنا اس وقت سیکھیں جب انہیں چیزوں کی تصویر بنانا آجائے۔ تب ان کا خط خوبصورت ہوگا۔

مجھے سکول کے زمانے کی جو باتیں یاد ہیں ان میں دو اور قابل ذکر ہیں میں نے اپنی شادی کے سبب سے ایک سال ضائع کر دیا تھا اور میرے استاد کی خواہش تھی کہ میں اس کی تلافی میں ایک سال میں دو درجے بڑھا دیا جاؤں۔ یہ رعایت عموماً محنتی لڑکوں کے ساتھ کی جاتی ہے اس لیے میں تیسرے درجے میں صرف چھ مہینے رہا اور ششماہی امتحان پاس کر کے جس کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں، چوتھے درجے میں چڑھا دیا گیا۔ اس درجہ میں اکثر مضمون انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے میں بدحواس ہو گیا اقلیدس بالکل نیا مضمون تھا جس میں کمزور تھا اور چونکہ پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی اس لیے اور بھی دقت تھی استاد اپنے مضمون کو خوب پڑھاتے تھے مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اکثر میرا دل چھوٹ جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ پھر تیسرے درجے میں چلا جاؤں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو سال کی پڑھائی ایک سال میں سمیٹنا میرے بس کی بات نہیں مگر اس میں نہ صرف میری دقت

تھی بلکہ میرے استاد کی تھی سب کی ہوتی تھی کیونکہ انہوں نے میری محنت پر بھروسا کر کے میری ترقی کی سفارش کی تھی اس دوہری ذلت کے خوف سے میں میدان میں جما رہا۔ آخر جب بڑی کوشش سے میں اقلیدس کی تیرہویں شکل تک پہنچا تو مجھ پر یک بیک یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ مضمون بالکل سہل اور سادہ ہے جس مضمون میں انسان کو محض اپنی سمجھ سے کام لینا ہو وہ ہرگز مشکل نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد سے ہمیشہ اقلیدس مجھے سہل بھی معلوم ہوئی اور دلچسپ بھی۔

البتہ سنسکرت ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ اقلیدس میں کوئی چیز زبانی یاد کرنے کی نہ تھی اور سنسکرت میں میں سمجھتا تھا کہ سب کچھ یاد کرنا پڑتا ہے یہ مضمون بھی چوتھے درجے سے شروع ہوتا تھا چھٹے درجے میں پہنچ کر میری ہمت نے جواب دے دیا، جو استاد اس مضمون کو پڑھاتے تھے وہ کام لینے میں بہت سخت تھے اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکوں پر بڑا جبر کرتے ہیں سنسکرت اور فارسی کے استادوں میں باہم ایک طرح کی رقابت تھی۔ فارسی کے استاد لڑکوں کے ساتھ نرمی کرتے تھے۔ لڑکے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ فارسی بہت آسان ہے اور فارسی کے استاد بڑے اچھے آدمی ہیں اور طالب علموں کا بہت خیال رکھتے ہیں اس ''آسانی'' نے مجھے لبھا لیا اور ایک دن میں فارسی کی جماعت میں جا بیٹھا۔ سنسکرت کے استاد کو اس سے رنج پہنچا انہوں نے بلا کر کہا ''تم یہ بھول گئے کہ تم ویشنو باپ کے بیٹے ہو؟ اپنے مذہب کی زبان نہیں پڑھو گے؟ اگر تمہیں کوئی بات مشکل نظر آتی ہے تو میرے پاس آ کر کیوں نہیں پوچھتے؟ میں تم سب طالب علموں کو سنسکرت پڑھانے میں اپنی مقدور بھر کوشش کرتا ہوں جب تم آگے بڑھو گے تو اس میں بڑی دلچسپ چیزیں نظر آئیں گی دیکھو ہمت نہ ہارو۔ آؤ پھر سے سنسکرت کی جماعت میں شریک ہو جاؤ''

اس مہربان نے مجھے شرمندہ کر دیا بھلا کیسے ممکن تھا کہ مجھے استاد کی اس محبت کا لحاظ نہ ہو۔ اب میں کرشن شنکر پانڈیا کو ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ یاد کرتا ہوں کیونکہ جو تھوڑی بہت سنسکرت میں نے اس زمانے میں سیکھ لی اگر وہ نہ سیکھتا تو ہندو دھرم کی مقدس کتابوں میں میرا جی مشکل سے لگتا۔ بلکہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اس سے زیادہ استعداد حاصل نہیں کی کیونکہ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ہر ہندو لڑکے اور لڑکی کو سنسکرت اچھی طرح جاننی چاہیے۔

اب میری یہ رائے ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں مقامی زبان کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کی بھی جگہ ہونی چاہیے کوئی صاحب اس لمبی فہرست کو دیکھ کر نہ ڈریں مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے نظام پر زیادہ توجہ کی جائے اور لڑکوں پر سارے مضامین غیر زبان کے ذریعے پڑھنے کا بوجھ نہ ڈالا جائے تو ان زبانوں کے حاصل کرنے میں دقت نہ ہو گی بلکہ ہنستے کھیلتے سیکھ لی جائیں گی اگر کوئی شخص ایک زبان علمی اصول کے مطابق سیکھ لے تو اسے اور زبانیں آسانی سے آ جاتی ہیں۔

اصل میں ہندی، گجراتی اور سنسکرت کو ہم ایک زبان سمجھ سکتے ہیں اور اسی طرح عربی اور فارسی کو بھی اگرچہ فارسی آرسی اور عربی سامی خاندان السنہ ہے لیکن عربی اور فارسی دونوں کی پوری نشوونما اسلام کی ترقی کے طفیل ہوئی کیونکہ اس نے صرف ونحو ہندی کی اختیار کی ہے اور الفاظ زیادہ تر عربی فارسی سے لیے ہیں اس لیے جو شخص اچھی اردو سیکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ عربی اور فارسی پڑھے، اور جو شخص اچھی ہندی، گجراتی، بنگالی یا مرہٹی سیکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ سنسکرت پڑھے۔

☆☆☆☆☆

ایک المناک واقعہ

ہائی سکول میں جن لڑکوں سے مجھ سے مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جا سکتے ہیں ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی۔ میں نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس قصور پر کہ میں نے دوسرے سے میل جول پیدا کیا اس دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک المناک واقعہ سمجھتا ہوں یہ بہت دن قائم رہی میں نے اسے اصلاح کے جوش میں شروع کیا تھا۔

میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا یہ دونوں ہم سبق تھے میں اس کی کمزوریوں سے واقف تھا مگر وہ اسے وفادار دوست سمجھتا تھا۔ میری ماں نے، میرے بڑے بھائی نے، میری بیوی نے مجھے متنبہ کیا کہ تمہاری صحبت خراب ہے۔ بیوی کی بات تو میں شوہری کے غرور میں کب سنتا تھا لیکن ماں اور بڑے بھائی کی رائے کے خلاف عمل کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی پھر بھی میں نے ان سے عذر معذرت کی اور کہا ''میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ کمزوریاں ہیں جو آپ نے بتائیں مگر آپ کو اس کی اچھائیوں کی خبر نہیں وہ مجھے گمراہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے اس نیت سے ملتا ہوں کہ اس کی اصلاح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے اطوار درست کر لے تو بڑا اچھا آدمی ہو جائے گا۔ میری التجا ہے کہ آپ میری طرف سے تردد نہ کریں۔''

اس سے ان کا اطمینان تو نہیں ہوا مگر انہوں نے میری توجیہہ مان لی اور مجھے میری راہ پر چلنے دیا آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا جو شخص کسی کی

اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اس کے ساتھ شیر و شکر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ سچی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے جو اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے صرف انہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو، دوستی پوری طرح مکمل اور پائیدار ہو سکتی ہے۔ دوستوں میں ہر ایک کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے، اسی لیے دوستی میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں کسی ایک شخص سے ایک جان دو قالب ہو جانے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے اور جو شخص خدا کا دوست ہونا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ یا تو اکیلا رہے یا ساری دنیا سے دوستی کرے ممکن ہے میری رائے غلط ہو مگر مجھے تو قلبی دوستی پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

جن دنوں میں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی راجکوٹ میں ''ریفارم'' کا بڑا زور تھا اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں اس نے راجکوٹ کے بہت سے مشہور آدمیوں کے نام بھی لیے جو اس جماعت میں شریک تھے اس نے کہا کہ اس زمرے میں ہائی سکول کے بعض لڑکے بھی ہیں۔

مجھے یہ سن کر تعجب اور رنج ہوا میں نے اپنے دوست سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لیے کمزور ہے، انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں اسی لیے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں اس کا سبب یہی ہے کہ میری غذا گوشت ہے گوشت کھانے والوں کو پھوڑے پھنسی نہیں نکلتیں اور کبھی نکل بھی آئیں تو جلد ٹھیک ہو جاتی ہیں ہمارے استاد اور دوسرے بڑے آدمی جو گوشت کھاتے ہیں، احمق نہیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں تمہیں بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے آخر آزمائش

کرنے میں کیا ہرج ہے؟ تم آزما کر دیکھو کہ گوشت کھانے سے کیسی طاقت آتی ہے۔

گوشت کھانے کی تائید میں میں یہ ساری دلیلیں ایک ہی نشست میں پیش نہیں کی گئیں یہ اس طول طویل استدلال کا خلاصہ ہے جس سے میرا دوست مجھ پر وقتاً فوقتاً اثر ڈالتا رہا۔ میرے منجھلے بھائی پہلے ہی مغلوب ہو چکے تھے اس لیے وہ میرے دوست کی دلیلوں کی تائید کرتے تھے میں واقعی اپنے بھائی اور اس دوست کے مقابلہ میں بالکل مریل معلوم ہوتا تھا وہ مجھ سے زیادہ قوی اور جفاکش بھی تھے اور جری بھی اس دوست کے کارناموں نے مجھ پر جادو سا کر دیا وہ بہت دور تک اور بڑی تیزی سے دوڑ سکتا تھا، کود پھاند (Higher and Doing Jumping) میں بہت مشتاق تھا اور سخت سے سخت جسمانی سزا برداشت کر لیتا تھا۔ وہ مجھے اکثر اپنے کارنامے دکھایا کرتا تھا اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ انسان دوسروں میں وہ صفتیں دیکھ کر، جو اس میں نہ ہوں، دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد میرے دل میں ولولہ اٹھا کہ اس کا جیسا بنوں میں نہ کود سکتا تھا، نہ دوڑ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس کی طرح مضبوط کیوں نہ ہو جاؤں؟

پھر میں بزدل بھی تھا مجھے ہر وقت چوروں، بھوتوں اور سانپوں کا کھٹکا رہتا تھا۔ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اندھیرے سے میری روح فنا ہوتی تھی میرے لیے اندھیرے میں سونا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ مجھے وہم ہوتا تھا کہ ایک طرف سے بھوت چلے آرہے ہیں، دوسری طرف سے چور، تیسری طرف سے سانپ، بغیر کمرے میں روشنی رکھے مجھے سوتے نہ بنتا تھا میں اپنے خوف کو اپنی کمسن بیوی پر جو میرے پہلو میں سوتی تھی کیونکر ظاہر کرتا؟ میں جانتا تھا کہ ان میں

مجھ سے زیادہ ہمت ہے اور مجھے اپنے اوپر شرم آتی تھی انہیں سانپوں اور بھوتوں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ہر جگہ چلی جاتی تھیں۔ میرے دوست کو میری ان کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ ہاتھ پر رکھ سکتا ہوں چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں یہ گوشت کھانے کی برکت ہے۔

ہم سکول کے لڑکوں میں زندگی یہ تک بندی بہت مقبول تھی۔

ٹھنگنا	دیسی	پرجا	ہے
لمبا	فرنگی	راجا	ہے
کیونکہ	وہ	گوشت	لڑاتا ہے
اور	پانچ	ہاتھ	لمبا ہے

ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے۔ اس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائے گی اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز مغلوب ہو جائیں گے۔

اب تجربہ شروع کرنے کے لیے ایک دن مقرر رہوا۔ اسے پوشیدہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ سارا گاندھی خاندان ویشنو تھا اور میرے والدین تو بڑے پکے ویشنو تھے وہ پابندی سے ''حویلی'' جایا کرتے تھے بلکہ خود ہمارے خاندان کے جداگانہ مندر بھی تھے جین مت کا گجرات میں بہت زور تھا اور اس کا اثر ہر وقت ہر جگہ نظر آتا تھا گجرات کے جین اور ویشنو لوگوں کو گوشت کھانے سے جتنی سخت نفرت تھی اس کی مثال نہ ہندوستان میں ملتی ہے اور نہ کسی اور ملک میں میری ولادت اور پرورش اس ماحول میں ہوئی تھی اور مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی میں جانتا تھا کہ جس دم

وہ میرے گوشت کھانے کی خبر سن پائیں گے صدمے کے مارے مر جائیں گے۔ سچائی کی محبت نے مجھے اور بھی زیادہ احتیاط پر مجبور کر دیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس وقت اس کا احساس نہ تھا کہ اگر میں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تو والدین کو دھوکا دینا پڑے گا۔ لیکن میں نے دل میں ٹھان لی کہ ''ریفارم'' ضرور کروں گا اس میں زبان کی چاٹ کو دخل نہ تھا میں نے گوشت کے مزے کی کوئی خاص تعریف نہیں سنی تھی مگر میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر ہو جاؤں اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرا لیں ''سوراج'' کا لفظ میں نے اب تک نہیں سنا تھا مگر آزادی کے معنی جانتا تھا ''ریفارم'' کے جوش نے مجھے اندھا کر دیا میں نے اس بات کو مخفی رکھنے کا بندوبست کیا اور اپنے دل کو سمجھا لیا کہ محض اس فعل کو والدین سے چھپانا حق سے انحراف نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایک المناک واقعہ (2)

آخر وہ دن آ گیا اس وقت میرا جو حال تھا اسے پوری طرح بیان کرنا مشکل ہے ایک طرف تو ''ریفارم'' کا جوش اور زندگی میں ایک اہم تبدیلی کی جدت کا لطف تھا اور دوسری طرف اسی کام کو چوروں کی طرح چھپ کر کرنے کی شرم تھی میں نہیں کہہ سکتا دونوں میں سے کون سی چیز مجھ پر غالب تھی میں نے دریا کے کنارے جا کر ایک گوشہ تنہائی ڈھونڈا اور میں نے اپنی عمر میں پہلی بار گوشت ۔۔۔۔۔ دیکھا اس کے ساتھ تنوری روٹی بھی تھی۔ مجھے دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز پسند نہ آئی بکری کا گوشت چمڑے کی طرح سخت تھا۔ مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا مجھے قے ہوگئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔

اس کے بعد کی رات بڑی بری طرح گزری۔ مجھے بڑا ہولناک خواب نظر آیا۔ جب آنکھ لگتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ بکری میرے پیٹ کے اندر ممیا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کا کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔

میرا دوست آسانی سے ہار ماننے والا آدمی نہ تھا اب عمدہ مسالے ڈال کر گوشت کے مزیدار کھانے پکانے لگا کھانا کھانے کے لیے ہمیں اب دریا کے کنارے سونی جگہ ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ریاست کے مکان میں کھاتے تھے جس میں کھانے کا علیحدہ کمرہ میز کرسی سے سجا ہوا تھا۔ میرے دوست نے وہاں کے بڑے باورچی سے سازباز کر کے یہ انتظام کیا تھا۔

میں اس لالچ میں آ گیا مجھے روٹی سے کراہت تھی وہ دور ہو گئی، بکری پر ترس آتا تھا وہ جاتا رہا اور اب گوشت کی بوٹی میں تو نہیں مگر سالن میں مزا آنے لگا۔ یہ سلسلہ قریب قریب ایک سال تک چلتا رہا لیکن اس عرصہ میں گوشت کی دعوتیں سب ملا کر چھ سے زیادہ نہیں ہوئیں کیونکہ ریاست کا مکان روز روز نہیں ملتا تھا اور پھر یہ دقت بھی تھی کہ گوشت کے مزیدار کھانوں میں اکثر صرفہ بہت ہوتا تھا۔ میرے پاس اس ریفارم کی قیمت ادا کرنے کے لیے دام نہ تھے۔ اس لیے ہر مرتبہ خرچ کا انتظام میرے دوست ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے اتنا روپیہ لاتا ہے مگر کسی نہ کسی طرح وہ لے ہی آتا تھا کیونکہ وہ اس پر تلا ہوا تھا کہ مجھے گوشت کھانے کا عادی کر دے، مگر آخر اس کی آمدنی بھی محدود ہی ہو گی اس لیے بہت کم دعوتیں ہو سکیں اور وہ بھی طویل وقفوں کے بعد۔

جب کبھی میں یہ چوری کی دعوتیں اڑاتا تھا تو ظاہر ہے کہ گھر آ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ میری والدہ قدرتی طور پر کھانے کے لیے اصرار کرتی تھیں اور خواہش نہ ہونے کا سبب پوچھتی تھیں میں ان سے کہہ دیتا تھا ''آج مجھے بھوک نہیں ہے میرے ہاضمے میں کچھ خرابی ہے یہ بہانے کرنے پر میرا دل مجھے ملامت کرتا تھا میں جانتا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہوں اور وہ بھی اپنی والدہ سے مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر میرے باپ کو میرے گوشت کھانے کی خبر ہو گئی تو انہیں بہت سخت صدمہ ہو گا۔ یہ خیال میرے لیے سوہان روح تھا''

اس لیے میں نے اپنے دل میں کہا ''اگر چہ گوشت کھانا بہت ضروری چیز ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے لیکن اپنے ماں باپ کو دھوکا دینا اور اس سے جھوٹ بولنا گوشت نہ کھانے سے بھی بدتر ہے جب تک وہ زندہ

ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں جب وہ نہ رہیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گا تو کھلم کھلا گوشت کھاؤں گا لیکن اس وقت تک میں اس سے پرہیز کروں گا۔''

اس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کر دی۔ اس دن سے آج تک میں نے پھر کبھی گوشت نہ کھایا میرے والدین کو مرتے دم تک معلوم نہیں ہوا کہ ان کے دو لڑکوں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس پرخلوص خواہش کی وجہ سے کہ اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولوں میں نے گوشت چھوڑ دیا مگر اپنے دوست کی صحبت نہ چھوڑی۔ اس کی اصلاح کرنے کے جوش نے مجھے برباد کر دیا تھا مگر مجھے اس کا بالکل احساس نہ تھا۔

اس شخص کی صحبت نے مجھے بیوی سے بیوفائی کرنے پر اکسایا میں بال بال بچ گیا یہ دوست مجھے ایک بار ایک قہوہ خانے میں لے گیا۔ اس نے مجھے ضروری ہدایتیں دے کر اندر بھیجا سب باتیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں روپیہ پہلے ہی ادا کر دیا گیا تھا میں گناہ کے منہ میں جا چکا تھا مگر خدا نے اپنی رحمت کاملہ سے مجھے میرے نفس سے بچا لیا۔ میں اس بدکاری کے گھر میں پہنچ کر قریب قریب اندھا اور گونگا ہو گیا۔ میں پلنگ پر اس عورت کے قریب بیٹھ گیا مگر گم سم ظاہر ہے کہ اسے غصہ آ گیا اور اس نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری مردانگی کو بٹہ لگ گیا اور شرم کے مارے جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں لیکن اس کے بعد میں نے ہمیشہ خدا کا شکر کیا کہ اس نے مجھے بچا لیا مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کے چار واقعات یاد ہیں اور ان میں سے اکثر میں اپنی کوشش سے نہیں بلکہ خوش قسمتی سے محفوظ رہا۔ خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے تو چاروں مرتبہ میں لغزش کا مرتکب قرار پاؤں گا کیونکہ شہوانی خواہش موجود تھی اور یہ ارتکاب فعل سے کم نہیں لیکن عام خیال

ہے کہ جو شخص جسم کو گناہ میں آلودہ ہونے دے وہ گویا گناہ سے بچ گیا۔ میں بھی بس اسی حد تک بچا بعض فعل ایسے ہوتے ہیں جن سے محفوظ رہنا خود انسان کے لیے اور آس پاس کے لوگوں کے لیے لطیفہ غیبی سے کم نہیں جیسے ہی اس کا اخلاقی احساس جاگتا ہے وہ خدا کا شکرا دا کرتا ہے کہ اس نے اپنے فضل سے بچالیا جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان اکثر انتہائی کوشش کے باوجود خواہش گناہ سے مغلوب ہو جاتا ہے اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ خود گناہ کی طرف راغب ہوتا ہے مگر خدا کی قدرت سے محفوظ رہتا ہے یہ کیونکر ہوتا ہے انسان کس حد تک فاعل مختار ہے اور کس حد تک واقعات کا کھلونا ہے، تدبیر کہاں تک چلتی ہے اور تقدیر کہاں تک دخل دیتی ہے۔ یہ سب باتیں بھید ہیں اور ہمیشہ بھید ہی رہیں گی۔

آمدم برسر مطلب اس واقعے کے بعد بھی میری آنکھیں نہیں کھلیں اور مجھے اپنے دوست کی بدکاری کا احساس نہیں ہوا۔ اس لیے مجھے اور بہت سے کڑوے گھونٹ پینا پڑے۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس کی وہ حرکتیں دیکھیں جن کا مجھے شان وگمان بھی نہ تھا مگر اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا کیونکہ میں واقعات سلسلہ وار بیان کروں گا۔

البتہ ایک بات یہیں کہہ دینا چاہیے کیونکہ اسی زمانے سے ہے مجھ میں اور میری بیوی میں جو ناچاقی تھی اس کی ایک وجہ یقیناً اس دوست کی صحبت بھی تھی میں اپنی بیوی کا عاشق تھا مگر اس کے ساتھ بدگمان بہت تھا اور اس دوست نے میری بدگمانی کی آگ کو اور بھڑکایا مجھے اس کی راست گوئی میں بھی شبہہ نہیں ہوا اکثر میں نے اس کی چغل خوری کی بناء پر اپنی بیوی کو دکھ دیا ہے۔ جس پر مجھے آج تک ندامت ہے۔ صرف ایک بیوی ہی ان سختیوں کو سہہ سکتی ہے اس لیے میں عورت کو مجسم صبر و تحمل سمجھتا

ہوں اگر کسی نوکر پر بیجا شبہ ہو تو وہ نوکری چھوڑ سکتا ہے اگر بیٹے پر ہو تو وہ باپ کا گھر چھوڑ سکتا ہے اگر دوست پر ہو تو وہ دوستی ترک کر سکتا ہے بیوی کو شوہر پر شبہہ ہو تو وہ خاموش رہتی ہے لیکن جہاں شوہر کو اس پر شبہہ ہوا تو اس بے چاری کی موت ہی آ جاتی ہے۔ وہ جائے تو کہاں جائے؟ ہندو کو یہ حق نہیں کہ عدالت میں طلاق کی درخواست دے اس غریب کے لیے قانون نے کوئی تدبیر نہیں بتائی مجھے یہ ہمیشہ یاد رہے گا اور عمر بھر پچھتاتا رہوں گا کہ میں نے اپنی بیوی کو اس مصیبت میں ڈالا جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔

بدگمانی کا ناسور میرے دل سے اس وقت گیا جب میں نے ''اہمسا'' [11] کے سب پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لیا اس وقت مجھے ''برہمچاریہ'' [12] کی عظمت اور شوکت کی خبر ہوئی اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ بیوی شوہر کی لونڈی نہیں بلکہ اس کی رفیق اور مددگار اور اس کی رنج و راحت میں برابر کی شریک ہے وہ بھی اپنے راہ عمل کے انتخاب میں اسی طرح آزاد ہے جیسے اس کا شوہر جب کبھی وہ شک اور شبہے کے بھیانک دن یاد آتے ہیں تو مجھے اپنی حماقت اور اپنی شہوانی ظلم سے انتہائی نفرت ہوتی ہے اور اپنے دوست کی اندھی تقلید پر سخت افسوس ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چوری اور اس کا کفارہ

مجھے ابھی اپنی چند اور لغزشوں کا ذکر کرنا ہے جو گوشت کھانے کے زمانے میں اور اس سے پہلے مجھ سے سرزد ہوئیں ان کا سلسلہ میری شادی کے وقت سے یا اس کے تھوڑے ہی دن بعد شروع ہوتا ہے۔

میرے ایک عزیز کو اور مجھے سگریٹ پینے کا چسکا لگ گیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس عادت کو اچھا سمجھتے ہوں یا سگریٹ کی خوشبو پر ریجھے ہوں ہمیں تو صرف منہ سے دھواں نکالنے میں ایک خیالی لطف آتا تھا میرے چچا اس کے عادی تھے اور جب ہم انہیں سگریٹ پیتے دیکھتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ ان کی طرح ہم بھی پئیں مگر ہمارے پاس دام تو تھے نہیں اس لیے ہم نے ابتداء اس طرح کی کہ ہم سگریٹ کے ٹکڑے جو ہمارے چچا پی کر پھینک دیتے تھے، چرالاتے تھے۔

مگر یہ ٹکڑے ہر وقت نہیں مل سکتے تھے اور ان سے دھواں بھی زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ اس لیے ہم نے نوکروں کے جیب خرچ میں سے پیسے چرانا شروع کیے کہ ہندوستانی سگریٹ خریدیں مگر مصیبت یہ تھی کہ انہیں رکھیں کہاں کیونکہ ظاہر ہے کہ ہم بڑوں کے سامنے تو سگریٹ پی نہیں سکتے تھے چند ہفتہ تک تو ہم کسی نہ کسی طرح ان چرائے ہوئے پیسوں سے کام چلاتے رہے اس عرصے میں ہم نے سنا کہ ایک درخت کی ڈال میں مسامات ہوتے ہیں اور اس کے ٹکڑے سگریٹ کی طرح پئے جا سکتے ہیں ہم انہیں لے آئے اور پینا شروع کر دیا۔

لیکن ان چیزوں سے ہماری تسلی نہ ہوتی تھی، آزادی نہ ہونا ہمیں کھلنے لگا ہم

سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا کہ ہم بغیر بڑوں کی اجازت کے کچھ نہ کر سکیں آخر زندگی سے متنفر ہو کر ہم نے خودکشی کی ٹھان لی۔

مگر اب یہ سوال تھا کہ خودکشی کیسے کی جائے؟ زہر کھائیں تو زہر کہاں سے لائیں؟ ہم سے کسی نے کہا کہ دھتورے کے بیج زہر قاتل ہیں۔ ہم دوڑے ہوئے جنگل میں گے اور یہ بیج لے آئے ہم نے شام کے وقت کو اس کام کے لیے مبارک سمجھا۔ ہم ''کیدار جی مندر'' میں گئے وہاں کے چراغ میں گھی ڈالا ''درشن'' لیے اور کوئی سونی جگہ ڈھونڈ نے لگے مگر ہماری ہمت نے جواب دے دیا فرض کرو کہ ہم فوراً نہ مرے؟ اور آخر مرنے سے فائدہ ہی کیا؟ آزادی نہیں ہے تو نہ سہی اسی حالت کو کیوں نہ برداشت کریں؟ پھر بھی ہم دو تین بیج نگل ہی گئے ہم دونوں موت سے ڈر گئے اور ہم نے طے کیا کہ ''رام جی مندر'' جا کر حواس درست کرے اور خودکشی کا خیال چھوڑ دیں۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ خودکشی کرنا اتنا سہل نہیں جتنا اس کا ارادہ کرنا اور اس دن سے جب کبھی میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے تو مجھ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

خودکشی کے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے سگریٹ کے ٹکڑے پینا اور سگریٹ کے لیے نوکروں کے پیسے چرانا چھوڑ دیا۔ جب سے میں بالغ ہوا ہوں مجھے کبھی تمباکو پینے کی خواہش نہیں ہوئی اور میں اس عادت کو تہذیب کے خلاف، صفائی کے خلاف اور مضر سمجھتا ہوں یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ ساری دنیا میں لوگ تمباکو پر کیوں جان دیتے ہیں مجھ سے تو ریل کے ڈبے میں جہاں تمباکو پینے والے بھرے ہوں نہیں بیٹھا جاتا۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

لیکن اس سے کہیں بڑی چوری کا میں کچھ دن بعد مرتکب ہوا جب میں نے پیسے چرائے تو میری عمر بارہ تیرہ سال کی بلکہ اس سے بھی کم تھی دوسری چوری کے وقت میں پندرہ برس کا تھا اس بار میں نے اپنے گوشت کھانے والے بھائی کے بازو بند سے ایک سونے کا ٹکڑا چرا لیا۔ میں ان دنوں پچیس روپے کا مقروض تھا وہ بازو پر خالص سونے کا بازو بند باندھا کرتے تھے اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹ لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

چنانچہ ایسا کیا گیا اور قرض ادا ہو گیا لیکن اتنا سنگین جرم تھا کہ مجھ سے کسی طرح برداشت نہیں ہو سکتا تھا میں نے عہد کر لیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا میرا یہ بھی ارادہ ہوا کہ اپنے والد کے سامنے جرم کا اعتراف کر لوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی یہ بات نہ تھی کہ مجھے والد کے ہاتھ سے مار کھانے کا ڈر ہو جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے ہم لوگوں کو کبھی نہیں مارا خوف تھا تو یہ کہ انہیں بہت دکھ ہو گا۔

آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ میں اعتراف نامہ لکھ کر اپنے والد کو دوں اور ان سے معافی کی درخواست کروں۔ میں نے سارا واقعہ ایک کاغذ پر لکھا اور خود لے جا کر انہیں دیا۔ اس رقعے میں میں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ مجھے اس کی کافی سزا دی جائے اور آخر میں ان سے درخواست کی کہ میرے قصور کے بدلے وہ اپنا دل نہ کڑھائیں۔ میں نے اس بات کا عہد کیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا۔

میں نے اعتراف نامہ انہیں دیا تو میں کانپ رہا تھا وہ ان دنوں ناسور میں مبتلا تھے اور صاحب فراش ہو گئے تھے ایک کھرے تخت پر لیٹے رہتے تھے میں نے رقعہ انہیں دے دیا اور چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

انہوں نے اسے اول سے آخر تک پڑھا اور موتیوں کے قطرے ٹپ ٹپ ان کے رخساروں پر اور کاغذ پر گرنے لگے دم بھر وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے اس

کے بعد انہوں نے رقعہ پھاڑ کر پھینک دیا وہ اسے پڑھنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔

اب وہ پھر لیٹ گئے میں بھی رونے لگا میں دیکھ رہا تھا کہ انہیں کیسا دکھ ہے اگر میں نقاش ہوتا تو آج اتنے دن کے بعد بھی پورے منظر کی تصویر کھینچ دیتا۔ اس واقعے کی یاد میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔

ان محبت کے موتیوں نے میرے دل کو پاک کر دیا اور میرے گناہ کو دھوڈالا اس محبت کو وہی خوب جانتا ہے جس نے اس کا لطف اٹھایا ہے جیسا اس بھجن میں ہے:

صرف وہ شخص .... جس نے محبت کے تیر کھائے ہیں

اس کی قوت کا اندازہ کرسکتا ہے

یہ میرے لیے ''اہمسا'' کا عملی سبق تھا اس وقت تو مجھے اس میں سوائے باپ کی محبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا مگر آج میں جانتا ہوں کہ یہ خالص ''اہمسا'' تھا جب یہ ''اہمسا'' ہمہ گیر ہو جاتا ہے تو جس چیز کو چھوتا ہے اس کی کایا پلٹ دیتا ہے اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس طرح کا شاندار عفو میرے والد کی طبیعت سے بعید تھا میرا خیال تھا کہ وہ خفا ہو جائیں گے، سر پیٹ لیں گے، مجھے سخت سست کہیں گے، لیکن ان کا سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے صاف صاف اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔ گناہ کا پورا اعتراف اور آئندہ اس سے باز رہنے کا عہد ایسے شخص کے سامنے جو انہیں قبول کرنے کا اہل ہے، توبہ کی خالص ترین صورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف سے والد کو میری طرف سے پورا اطمینان ہو گیا اور انہیں مجھ سے جو محبت تھی وہ بے انتہا بڑھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆

میرے والد کی وفات اور میری دوہری فضیحت

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں مجھے سولھواں برس شروع ہو گیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میرے والد ناسور میں مبتلا اور صاحب فراش تھے زیادہ تر میری والدہ، گھر کا ایک پرانا نوکر اور میں ان کی خدمت کرتے تھے میرے سپرد تیمارداری کا کام تھا جو زخم کی مرہم پٹی کرنے، دوا پلانے اور جب ضرورت ہو، دوا تیار کرنے پر مشتمل تھا روز رات کو میں اپنے والد کے پیر دبایا کرتا تھا اور اس وقت تک نہ اٹھتا تھا جب تک وہ خود نہ کہیں یا انہیں نیند نہ آ جائے۔ میں یہ خدمت بڑے شوق سے کرتا تھا جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی روزمرہ کے فرائض سے جو وقت بچتا تھا وہ میں کچھ تو سکول میں اور کچھ اپنے والد کی خدمت میں صرف کرتا تھا شام کو ٹہلنے میں صرف اسی وقت جایا کرتا تھا جب وہ اجازت دیں یا جب ان کی طبیعت اچھی ہو۔

اسی زمانے میں میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات میرے لیے دو طرح سے شرمناک تھی ایک تو یہ کہ میں نے طالبعلمی کے زمانے میں ضبط نفس سے کام نہیں لیا دوسرے یہ کہ شہوانی خواہش تحصیل علیم کے مشغلے پر جسے میں اپنا فرض سمجھتا تھا اور اس سے بڑے فرض یعنی والدین کی خدمت پر جسے میں نے شرون کی تقلید میں بچپن سے اپنا نصب العین بنایا تھا، غالب آ گئی۔ روز رات کو میرے ہاتھ تو والد کے پیر دبانے میں مشغول رہتے تھے مگر میرا دل سونے کے کمرے میں لگا رہتا تھا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب مذہب، طب اور عقل سب کی

رو سے جماع کی ممانعت تھی۔ مجھے اپنی خدمت سے چھٹی ملنے کی بڑی خوشی ہوتی تھی اور اپنے والد کو سلام کر کے میں سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچتا تھا۔

ادھر میرے والد کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی وید اپنے سارے مرہم، یونانی طبیب اپنے ضماد، مقامی نیم حکیم اپنی عطائی دوائیں آزما چکے تھے ایک انگریز سرجن بھی اپنی قابلیت ختم کر چکا تھا۔ آخری تدبیر اس نے یہ بتائی تھی کہ آپریشن کیا جائے لیکن ہمارے خاندانی طبیب نے مخالفت کی انہوں نے کہا کہ اس ضعیفی میں آپریشن ٹھیک نہیں یہ بڑے قابل اور مشہور طبیب تھے اس لیے ان کی رائے مانی گئی آپریشن کا خیال ترک کر دیا گیا اور اس کے لیے جو دوائیں خریدی جا چکی تھیں وہ بیکار گئیں میرا خیال ہے کہ اگر طبیب آپریشن کی اجازت دے دیتے تو زخم آسانی سے اچھا ہو جاتا۔ آپریشن کے لیے سرجن بھی وہ تجویز ہوا تھا جس کی ان دنوں بمبئی میں بڑی شہرت تھی، مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی جب موت ہی آ جائے تو صحیح علاج کیسے سوجھتا؟ میرے والد بمبئی سے لوٹ آئے تھے ان کے ساتھ سارا آپریشن کا سامان تھا جو اب کسی مصرف کا نہ تھا وہ اب زندگی سے مایوس ہو گئے تھے کمزوری روز بروز بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ آخر ان سے یہ کہنا پڑا کہ بستر ہی پر ضروری حاجتوں سے فارغ ہو لیا کریں لیکن انہوں نے آخر وقت تک انکار کیا اور بستر سے اٹھ کر جانے کی تکلیف برداشت کرتے رہے ویشنو دھرم میں ظاہری صفائی کے قاعدے اتنے سخت ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ صفائی بہت ضروری ہے لیکن مغربی طب نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ انتہائی صفائی کا خیال رکھتے ہوئے حاجتیں بستر ہی پر پوری ہو سکتی ہیں مریض کو مطلق تکلیف نہیں ہوتی اور بستر پر خفیف سا دھبہ بھی نہیں آنے پاتا۔ میرے نزدیک

یہ صفائی ویشنو دھرم کے بالکل مطابق ہے لیکن اس زمانے میں اپنے والد کا بستر سے اٹھنے پر یہ اصرار دیکھ کر دنگ رہ گیا اور میرا دل ان کی تعریف سے معمور ہو گیا۔

آخر وہ خوفناک رات آ گئی میرے چچا اس دن راجکوٹ ہی میں تھے مجھے خفیف سا خیال ہے کہ وہ یہ بری خبر سن کر کہ میرے والد کی طبیعت گرتی جاتی ہے، راجکوٹ آئے گے دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی میرے چچا دن بھر والد کی پٹی کے پاس بیٹھے رہتے تھے اور بڑے اصرار سے ہم سب کو سونے کے لیے رخصت کر کے خود وہیں سوتے تھے کسی کو شان و گمان بھی نہ تھا کہ آج کی رات قیامت کی رات ہے البتہ خطرہ تو روز ہی رہتا تھا۔

کوئی ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا میں پیر دبا رہا تھا میرے چچا نے کہا اب تم جاؤ میں دباتا ہوں میں خوش ہوا سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچا میری بیوی بیچاری غافل سو رہی تھی مگر بھلا جب میں پہنچ گیا تو وہ کب سونے پاتی تھیں؟ میں نے انہیں جگا دیا۔ ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے ہوں گے کہ نوکر نے دروازہ پر دستک دی میں ڈر سے چونک پڑا نوکر نے کہا ''اٹھو! ابا کی طبیعت بہت خراب ہے'' میں جانتا تھا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے اس وقت ''بہت خراب'' کے جو معنی تھے میں سمجھ گیا میں اچھل کر بستر سے اٹھا اور دروازے کی طرف جھپٹا۔

''کیا ہو گیا؟ خدا کے لیے بتا دو''

''ابا گزر گئے''

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا! اب میں تھا اور کف افسوس ملنا! میرا دل شرم اور درد سے معمور تھا میں دوڑ کر والد کے کمرے میں گیا مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر شہوانی خواہش مجھے اندھا نہ کر دیتی تو میں اس روحانی کرب سے بچ جاتا جو آخری لمحوں میں

اپنے والد کے پاس حاضر نہ رہنے سے مجھے ہوا۔ میں ان کے پیر دباتا ہوتا اور میری گود میں ان کا دم نکلتا۔ مگر اب یہ عزت میرے چچا کو نصیب ہوئی انہیں اپنے بڑے بھائی سے ایسی محبت تھی کہ آخری وقت ان کی خدمت کرنے کے وہی مستحق قرار پائے میرے والد کو ہونے والے واقعے کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا انہوں نے اشارے سے کاغذ اور قلم دوات مانگ کر یہ الفاظ لکھے تھے ''دفن کفن کی تیاری کرو'' پھر انہوں نے اپنے بازو سے بازو بند اور گلے سے تلسی کے دانوں کی طلائی مالا کھول کر پھینک دے اس کے ایک لمحے کے بعد ان کا دم نکل گیا۔

وہ فضیحت جس کا میں نے اس باب کی ابتداء میں ذکر کیا ہے یہی شرمناک واقعہ ہے کہ شہوانی خواہش نے اس نازک وقت بھی مجھے نہ چھوڑا جب میرے والد جاں بلب تھے اور مجھے ان کی خدمت میں رہنا چاہیے تھا یہ وہ دھبہ ہے جسے میں نہ کبھی مٹا سکا، نہ بھول سکا اور میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اگرچہ مجھے اپنے والدین سے بے حد محبت تھی اور میں اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا لیکن جب وہ خدا کی ترازو میں تولی گئی تو بہت کم نکلی، کیونکہ اس کے ساتھ ہی میرے دل پر شہوانی خواہش کا قبضہ تھا، اس لیے میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ میں اس زمانے میں وفادار مگر شہوت پرست شوہر تھا مجھے شہوانی خواہش کے پنجے سے چھوٹنے میں بہت دن لگے اور اسے مغلوب کرنے سے پہلے بڑے بڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا۔

قبل اس کے کہ میں اس باب کو جس میں دوہری فضیحت کا ذکر ہے ختم کروں یہ بھی بتا دوں کہ میری بیوی نے جو چوہے کا سا بچہ جنا وہ تین چار دن سے زیادہ نہیں جیا اس کے سوا اور کیا توقع ہوسکتی تھی؟ جن لوگوں کی شادی ہوگئی ہے وہ میری مثال سے عبرت حاصل کریں۔

مذہب کی جھلک

چھ سات برس کی عمر سے سولہ برس کے سن تک میں سکول میں رہا اس عرصہ میں مجھے دنیا بھر کی چیزیں سکھائی گئیں سوائے مذہب کے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ان کی صحبت سے بغیر ان کی کوشش کے، جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ میں نے حاصل کیا البتہ اپنے ماحول سے میں (مذہب کے متعلق) ادھر ادھر کی باتیں سیکھتا رہا۔ میری مراد یہاں مذہب کے لفظ سے اس کا وسیع ترین مفہوم معرفت نفس ہے۔

میں ویشنو ماں باپ کے یہاں پیدا ہوا اس لیے مجھے اکثر ''حویلی'' جانا پڑتا تھا لیکن یہ مندر میرے دل کو نہیں لگتا تھا اس کی شان وشوکت اور چمک دمک مجھے پسند نہ تھی میں نے یہ افواہیں بھی سنیں کہ وہاں بدکاری ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ رہی اس وقت سے میں ''حویلی'' سے کوئی روحانی فیض حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن جو چیز مجھے وہاں نہیں ملی وہ اپنی کھلائی سے حاصل ہوئی یہ ہمارے خاندان کی بڑی پرانی خادمہ تھی جس کی محبت مجھے آج تک یاد ہے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں بھوت پریت سے ڈرتا تھا رمبھا (یہ کھلائی کا نام تھا) نے اس خوف کو دور کرنے کی ایک سہل سی تدبیر بتائی یعنی ''رام نام'' 14 کا جپنا مجھے اس کی بتائی تدبیر پر اتنا عقیدہ نہ تھا جتنا خود اس پر اس لیے اس کمسنی میں میں نے ''رام نام'' جپنا شروع کیا کہ بھوت پریت کے خوف سے نجات ملے ظاہر ہے کہ یہ خوف تھوڑے دن کے بعد جاتا رہا لیکن جو بیج بچپن میں بویا گیا تھا وہ ضائع نہیں گیا میرا خیال ہے کہ یہ اسی نیک

عورت رمبھا کے بوئے ہوئے بیج کا اثر ہے کہ اب ''رام نام'' میرے لیے حکمی تدبیر کا اثر رکھتا ہے اسی زمانے میں میرے ایک رشتہ کے بھائی نے جو رامائن پر بڑا گہرا عقیدہ رکھتے تھے میرے اور میرے بھائی کے لیے رام رکشا سیکھنے کا انتظام کیا۔ ہم نے اسے زبانی یاد کر لیا اور روز صبح اشنان کے بعد اسے پڑھنے کا ورد کر لیا جب تک ہم پور بندر میں رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔ راجکوٹ پہنچنے کے بعد ہم اسے بھول بھال گئے مجھے اس پر کچھ عقیدہ بھی نہ تھا میں تو اسے ایک حد تک اس لیے پڑھتا تھا کہ مجھے رام رکشا صحیح تلفظ سے ادا کرنے پر گھمنڈ تھا۔

البتہ جس چیز نے میرے دل پر گہرا اثر کیا وہ رامائن کی تلاوت تھی جو والد صاحب کے سامنے ہوا کرتی تھی اپنی بیماری کے کچھ دن میرے والد نے پور بندر میں بسر کیے۔ وہاں وہ روز شام کو رامائن سنتے تھے۔ پڑھتے بلیشور کے لدھ مہاراجہ تھے جو رام چندر جی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کوڑھ کا علاج کسی دوا سے نہیں کیا بلکہ ''بلوا'' کی پتیاں لگانے سے بلیشور کے مندر میں مہادیو کی مورت پر چڑھا کر پھینک دی جاتی تھیں اور ''رام نام'' جپنے سے اور ان کے عقیدے سے ان کے مرض کو اچھا کر دیا۔ خدا جانے یہ صحیح ہے یا غلط بہر حال لوگ اس قصے کو سچ سمجھتے تھے اور یہ تو واقعہ ہے کہ جس زمانے میں لدھ مہاراج رامائن پڑھتے تھے ان کا کوڑھ بالکل جا چکا تھا۔ ان کی آواز سریلی تھی وہ دوہے اور چوپائی گاتے تھے اور ان کا مطلب اس ذوق وشوق سے بیان کرتے تھے کہ انہیں اپنی کچھ خبر نہ رہتی تھی اور سننے والے بھی بے خود ہو جاتے تھے میری عمر اس زمانے میں تیرہ برس کی ہوگی مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہیں رامائن پڑھتے سن کر میں وجد کیا کرتا تھا اسی سے اس گہری عقیدت کی بنیاد پڑی جو مجھے رامائن سے ہے آج میں تلسی داس

کی رامائن کو دعا اور وظیفے کی کتابوں میں سب سے بڑھ کر سمجھتا ہوں۔

اس کے چند مہینے بعد ہم لوگ راجکوٹ آئے۔ یہاں رامائن نہیں پڑھتی جاتی تھیں البتہ ہر اکاوشی 15 کو بھگوت گیتا کی تلاوت ہوتی تھی میں شریک ہوتا تھا مگر پڑھنے والا ایسا نہ تھا جو سننے والوں میں جوش پیدا کر سکے اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھگوت گیتا وہ کتاب ہے جو دلوں میں مذہبی ذوق وشوق پیدا کرتی ہے میں نے اسے گجراتی میں بڑے شوق سے پڑھا ہے لیکن جب میں نے اپنے اکیس دن کے روزہ کے دوران میں اصل سنسکرت کتاب کے کچھ حصے پنڈت مدن موہن مالوی کی زبان سے سنے تو دل میں کہا کاش میں اسے بچپن میں ایسے بھگت کی زبان سے سنتا کہ مجھے کمسنی ہی میں اس کا شوق پیدا ہو جاتا اس عمر میں انسان جو سنتا یا دیکھتا ہے اس کے نقش دل میں بہت گہرے ہوتے ہیں اور میں ہمیشہ افسوس کرتا رہتا کہ بدقسمتی سے مجھے اس زمانے میں اس قسم کی اور کتابیں سننے کا موقع نہیں ملا۔

البتہ راجکوٹ میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ابتدا ہی سے ہندو مذہب کی تمام شاخوں اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تربیت ملی کیونکہ میرے والدین ''حویلی'' میں بھی جاتے تھے اور شیو اور رام کے مندر میں بھی اور ہم سب لڑکوں کو ساتھ لے جاتے تھے میرے والد کے پاس جین سادھو بھی آیا کرتے تھے وہ میرے والد سے دینی اور دنیوی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ان کے مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جو ان سے اپنے اپنے مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ادب سے اور اکثر دلچسپی سے سنا کرتے تھے، میں ان کا تیماردار تھا اس لیے مجھے اکثر یہ گفتگوئیں سننے کا موقع ملتا تھا ان سب باتوں نے مل کر مجھے سب مذہبوں سے رواداری کرنا سکھایا۔

صرف عیسائیت اس زمانے میں اس سے مستثنیٰ تھی میں اسے ایک لحاظ سے نا پسند کرتا تھا اور اس کی معقول وجہ تھی اس زمانے میں عیسائی مشنری ہائی سکول کے قریب ایک نکڑ پر کھڑے ہو کر وعظ کہتے تھے اور ہندوؤں کو اور ان کے دیوتاؤں کو دل کھول کر گالیاں دیتے تھے میں یہ سن کر بہت بد خط ہوا میں نے ان کی تقریر صرف ایک بار کھڑے ہو کر سنی۔ مگر یہ بھی اس بات کے لیے کافی تھی کہ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی یہ تجربہ نہ کروں گا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک مشہور ہندو کے عیسائی ہو جانے کی خبر سنی۔ سارے شہر میں چرچا تھا کہ بپتسمہ کے وقت اسے شراب پلائی گئی اور گائے کا گوشت کھلایا گیا۔ اس کا لباس تبدیل کر دیا گیا اور اب وہ ہمیشہ یورپی کپڑے پہنتا ہے اور ہیٹ لگاتا ہے۔ ان باتوں سے میرے دل میں خلش پیدا ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ جو مذہب گائے کا گوشت کھانے پر شراب پینے پر اور لباس دینے پر مجبور کرتا ہے وہ مذہب کہلانے کا مستحق نہیں میں نے یہ بھی سنا کہ ایک نو عیسائی نے اپنے باپ دادا کے مذہب ان کے رسم و رواج اور ان کے ملک کو گولیاں دینا شروع کر دیا ہے۔ ان سب چیزوں نے میرا دل عیسائیت سے پھیر دیا۔

لیکن میرے دوسرے مذہبوں سے رواداری کرنے کے یہ معنی نہیں تھے کہ میں خدا پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا تھا اس زمانے میں میری نظر سے منوسمرتی 16 گزری جو میرے والد کے کتب خانے میں تھی اس میں تخلیق اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا ذکر پڑھ کر میں زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اسکے برعکس میرا رجحان دہریت کی طرف ہو گیا۔

ان دنوں میں اپنے ایک رشتے کے بھائی (جو اب بھی زندہ ہیں) کی قابلیت کا بہت قائل تھا۔ میں نے ان سے اپنے شبہے بیان کئے۔ مگر وہ انہیں دور نہ کر سکے۔ انہوں نے مجھے یہ جواب دے کر ٹال دیا "جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تم خود ان شبہوں

کو رفع کر سکو گے۔ اس عمر میں تمہیں اس قسم کے سوال نہیں کرنا چاہیں'' میں خاموش ہو گیا مگر میری تشفی نہیں ہوئی ''منوسمرتی'' کے جو باب غذا، وغیرہ کے متعلق ہیں وہ مجھے روزمرہ کے عمل کے خلاف معلوم ہوتے تھے اس بارے میں میں نے اپنے شبہے بیان کے تو وہی جواب ملا۔ میں نے اپنے جی میں کہا ''جب میرے ذہن میں پختگی آ جائے گی اور میرا مطالعہ وسیع ہو جائے گا تو یہ باتیں میری سمجھ میں آ جائیں گی۔''

بہر حال ''منوسمرتی'' سے مجھے اس زمانے میں ''اہمسا'' کا سبق نہیں ملا۔ میں اپنے گوشت کھانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں ''منوسمرتی'' سے بظاہر اس فعل کی تائید ہوتی تھی میرا یہ بھی خیال تھا کہ سانپ، کھٹمل وغیرہ کو مارنا بالکل جائز ہے مجھے یاد ہے کہ میں نے اس زمانے میں بارہا کھٹمل اور دوسرے کیڑے فرض سمجھ کر مارے ہیں۔

لیکن ایک عقیدے نے میرے دل میں گہری جڑ پکڑ لی کہ اخلاق ساری زندگی کی بنیاد ہے اور حق اخلاق کا لب لباب ہے حق ساری کوششوں کا مرجع بن گیا یہ میری نظر میں روز بروز بلند تر اور برتر ہوتا گیا اور اس کی جو تعریف میرے ذہن میں تھی وہ بھی وسیع تر ہو گئی۔

اسی طرح چند گجراتی اشعار نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا ان میں بدی کے بدلے نیکی کرنے کی تلقین تھی جو میرے لیے شمع ہدایت بن گئی اس کا میرے دل میں اتنا جوش تھا کہ میں نے اس کے مطابق عملی تجربے شروع کر دیئے وہ اشعارج میری نظر میں لاجواب ہیں یہ ہیں:

جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلا
جو کوئی تجھ سے ہنس کر بولے اس کے آگے سر کو جھکا

تانبے کا جو پیسہ دے تو اس کو کیسہ زر دے دے
جان بچائے جو تیری تو اس کی خاطر سر دے دے

ہے یہ قول حکیموں کا اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں
ایک کے بدل دس دیتے ہیں، نیکی کا دم بھرتے ہیں

پر جو سچے داتا ہیں، ہے ان کا سب سے ایک سلوک
پاپ کے بدلے پن کرنا اور بد سے کرنا نیک سلوک

☆☆☆☆☆☆☆☆

انگلستان کی تیاریاں

میں نے انٹرلیس کا امتحان 1887ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں یہ امتحان دو جگہ ہوا کرتا تھا احمد آباد میں اور بمبئی میں ملک کے عام افلاس کی وجہ سے کاٹھیاوار کے طلبہ احمد آباد جایا کرتے تھے کیونکہ یہ قریب بھی پڑتا تھا اور یہاں خرچ بھی کم ہوتا تھا۔ میرا خاندان بھی مفلس تھا اس لیے میں بھی یہی صورت اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ یہ پہلا سفر تھا جو میں نے راجکوٹ سے احمد آباد تک کیا اور وہ بھی بغیر کسی ساتھی کے میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں انٹرلیس پاس کرنے کے بعد کالج میں پڑھوں۔ کالج بھاول نگر میں تھا اور بمبئی میں بھی مگر چونکہ بھاول نگر میں خرچ کم تھا اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ وہاں جا کر اس کالج میں داخل ہو جاؤں۔ جانے کو تو میں چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لیے مشکل تھی پروفیسروں کے لیکچروں میں دلچسپی ہونا تو درکنار میں انہیں سمجھ بھی نہ سکتا تھا اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کالج کے پروفیسر اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے تھے یہ میری ہی خامی تھی کہ میں ان کے درس سے استفادہ نہ کر سکا۔ پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔

ماوجی دیو ایک عالم اور دانشمند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے۔ ان کے تعلقات ہم لوگوں سے والد کے انتقال کے بعد بھی باقی رہے۔ اتفاق سے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن تشریف لائے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے میری تعلیم کا

حال پوچھا جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ساملدا س کالج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا ''اب زمانہ بدل گیا ہے اور تم میں سے کوئی بغیر معقول تعلیم حاصل کیے اپنے والد کی گدی پانے کی توقع نہیں کرسکتا۔ اس لڑکے کی تعلیم ابھی جاری ہے اس لیے اسی کی ذات سے تمہیں یہ امید ہوسکتی ہے کہ یہ گدی کو قائم رکھے گا بی اے پاس کرنے میں اسے چار پانچ سال لگیں گے اور سندھ ملنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ساٹھ کی نوکری ملے گی۔ دیوان کا عہدہ ملنے سے رہا۔ اگر میرے لڑکے کی طرح اس نے قانون پڑھا تو اور بھی زیادہ دن لگیں گے اور اتنے عرصے میں خدا جانے کتنے آدمی وکالت پاس کرکے اس عہدے کے امیدوار ہو جائیں گے میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے تین سال میں یہ لوٹ آئے گا خرچ بھی چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہو گا۔ ذرا اس بیرسٹر کو دیکھو جو ابھی انگلستان سے آیا ہے کیسی شان سے رہتا ہے! وہ جس دن چاہے دیوان ہو جائے۔ میں تو تمہیں بہت اصرار کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ موہن داس کو اسی سال انگلستان بھیج دو۔ کیول رام کے بہت سے دوست وہاں ہیں وہ ان کے نام تعارف کے خطوط دے دے گا اور موہن داس وہاں بڑے آرام سے رہے گا۔''

جوشی جی (اسی لقب سے ہم لوگ ماؤ جی دیو کو پکارتے تھے) پورے اطمینان کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے پوچھا ''کیا تم انگلستان جانے کو یہاں پڑھنے پر ترجیح نہیں دیتے؟'' میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوسکتی تھی میں اپنی مشکل پڑھائی سے یوں ہی جی چراتا تھا جھٹ سے اس تجویز پر راضی ہو گیا میں نے کہا ''مجھے کل کے بھیجتے آج بھیج دیجیے مگر اتنی جلدی جلدی قانون کے

امتحان پاس کرنا مشکل ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ڈاکٹری پڑھنے جاؤں۔''

میرے بھائی نے میری بات کاٹ کر کہا ''والد کو یہ پیشہ بالکل پسند نہیں تھا تمہارا ہی خیال کر کے انہوں نے کہا تھا کہ ہم ویشنو لوگوں کو مردوں کی چیر پھاڑ کے پاس نہ پھٹکنا چاہیے وہ یہی چاہتے تھے کہ تم قانون پڑھو۔''

جوشی جی بولے'' میں گاندھی جی کی طرح ڈاکٹری پیشہ کا مخالف نہیں ہوں ہمارے شاستروں نے اس کی ممانعت نہیں کی لیکن ڈاکٹری پڑھ کر تم دیوان نہیں بن سکتے اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں دیوان کا عہدہ بلکہ اس سے بڑھ کر رتبہ ملے۔ یہی ایک صورت ہے کہ تم اتنے بڑے خاندان کی پرورش کر سکو۔ زمانہ روز بروز بدل رہا ہے اور بڑے سخت دن آ رہے ہیں۔ اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم بیرسٹر بنو''میری ماں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا ''جو بات میں نے کہی ہے مہربانی سے اس پر غور کیجئے اب کی بار جب میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔''

جوشی جی چلے گئے اور میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے لگا۔

میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں؟ یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کمسن لڑکے کو تنہا پردیس میں بھیجنا مناسب ہے یا نہیں ادھر میری والدہ عجب شش و پنج میں تھیں انہیں میری جدائی بہت ناگوار تھی انہوں نے اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی کہنے لگیں ''اب تمہارے چچا گھر بھر میں سب سے بڑے ہیں پہلے ان سے صلاح لینا چاہیے اگر وہ راضی ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔''

میرے بھائی کو ایک اور خیال آیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا ''ریاست پوربندر پر

ہمارا حق ہے۔ لیلیٰ صاحب آج کل ریاست کے منتظم ہیں۔ وہ ہمارے خاندان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور چچا سے بہت خوش ہیں۔ ممکن ہے وہ ریاست میں سفارش کر دیں کہ تمہیں انگلستان میں تعلیم دلانے کے لیے کچھ مدد دی جائے۔''

مجھے یہ بات پسند آئی اور میں پور بندر جانے کے لیے تیار ہو گیا ان دنوں ریل نہ تھی بیل گاڑی میں پانچ دن کا راستہ تھا میں کہہ چکا ہوں کہ میں بزدل تھا لیکن اس وقت انگلستان جانے کا شوق میں جس سے میرا دل مغمور تھا یہ بزدلی کافور ہو گئی میں نے دھوراجی تک جانے کے لیے بیل گاڑی کرایہ پر لی اور دھوراجی سے اونٹ پر سفر کیا کہ ایک دن پہلے پور بندر پہنچ جاؤں مجھے اونٹ پر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

غرض کسی نہ کسی طرح میں پہنچ گیا۔ چچا کو آداب کر کے میں نے سارا ماجرا سنایا۔ انہوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا ''مجھے یقین نہیں کہ آدمی انگلستان میں رہ کر اپنے دھرم پر قائم رہ سکتا ہے جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے بہت شبہہ ہوتا ہے جب میں ان بڑے بڑے بیرسٹروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی یورپیوں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ انہیں کسی چیز کے کھانے پینے میں باک نہیں، سگار ان کے منہ سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ لباس ویسا کہ انگریزوں کا یہ سب باتیں ہمارے خاندان کے رواج سے میل نہیں کھاتیں میں چند روز میں جاترا کے لیے جا رہا ہوں اور میری زندگی تھوڑی رہ گئی ہے بھلا ایسے وقت میں کہ موت سر پر ہے میں تمہیں کیونکر سمندر پار انگلستان جانے کی اجازت دوں؟ مگر میں تمہیں روکنا بھی نہیں چاہتا اصل میں اجازت جو کچھ ہے تمہاری ماں کی ہے اگر وہ کہہ دیں تو شوق سے سدھارو اللہ نگہبان ان سے کہہ دینا کہ میں دخل نہیں کروں گا اگر تم گئے تو میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی۔''

میں نے کہا کہ ''میں جانتا تھا کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہ کریں گے اب میں والدہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا مگر کیا آپ لیلیٰ صاحب سے میری سفارش بھی نہ کریں گے؟''

انہوں نے کہا ''میں یہ کیسے کر سکتا ہوں مگر وہ بڑے اچھے آدمی ہیں تم انہیں اپنے خاندانی تعلقات بتاؤ اور ملنے کی درخواست کرو وہ یقیناً تم سے ملیں گے بلکہ ممکن ہے کہ مدد بھی کریں۔''

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے چچا نے سفارش کا خط کیوں نہیں دیا کچھ خفیف سا خیال ہے کہ شاید وہ میرے انگلستان جانے میں جو ان کے خیال میں دھرم کے خلاف تھا براہ راست مدد دیتے ہوئے رکتے تھے۔

میں نے لیلیٰ صاحب کو لکھا اور انہوں نے مجھے اپنے گھر بلایا وہ جب مجھ سے ملے تو سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے انہوں نے مجھے دوٹوک جواب دے دیا ''پہلے بی اے پاس کرو پھر میرے پاس آنا اس وقت تمہیں کوئی مدد نہیں دی جا سکتی'' میں نے ان سے ملنے کی بڑی تیاریاں کی تھیں بہت سوچ سمجھ کر چند ملے یاد کیے تھے اور سب ان کے سامنے آیا تو زمین دوز ہو کر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا مگر یہ سب بیکار گیا۔

مجھے اپنی بیوی کے زیور کا خیال آیا اور اپنے بھائی کا خیال آیا جن پر مجھے بڑا بھروسہ تھا ان کی فیاضی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور مجھ سے وہ اپنے بیٹے کی طرح محبت کرتے تھے۔

میں پوربندر سے راجکوٹ آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا میں نے جوشی جی سے مشورہ لیا ظاہر ہے کہ انہوں نے جانے پر اصرار کیا اور کہا کہ اگر ضرورت ہو تو قرض لینے

میں تامل نہ کرنا چاہیے میں نے اپنی بیوی کا زیور بیچنے کی تجویز پیش کی جس سے دو تین ہزار روپیہ مل جاتا میرے بھائی نے کہا کہ کسی نہ کسی طرح روپے کا بندوبست کر دیں گے۔

مگر میری والدہ اب تک راضی نہ تھیں انہوں نے لوگوں سے کھود کھود کے انگلستان کے حالات پوچھے کسی نے ان سے کہہ دیا کہ نوجوان وہاں بگڑ جاتے ہیں کسی نے کہا کہ وہ گوشت کھانے لگتے ہیں کسی نے کہا وہاں بغیر شراب کے گزر نہیں ہوتا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''جب یہ حال ہے تو کیسے کام چلے گا؟'' میں نے کہا ''آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا اگر ایسا خطرہ ہوتا تو بھلا جوشی جی مجھے جانے دیتے؟''

انہوں نے کہا مجھے تم پر اعتبار ہے مگر پردیس میں کیسے اعتبار کروں؟ میں حیران ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ اچھا بچارجی سوامی سے پوچھوں گی۔

بچارجی سوامی اصل میں مودھی بنئے تھے مگر اب جین سادھو ہو گئے تھے وہ بھی جوش جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے انہوں نے میری مدد کی اور کہا ''میں اس لڑکے سے تین باتوں کا پکا عہد لوں گا پھر اسے اجازت دینے میں کوئی ہرج نہیں'' انہوں نے مجھ سے قسم کھلوائی اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ جب یہ ہو گیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دے دی۔

ہائی سکول میں مجھے رخصت کرنے کے لیے جلسہ کیا گیا۔ راجکوٹ کے ایک نوجوان کا انگلستان جانا ایک غیر معمولی بات تھی میں نے چند لفظ شکریے کے لکھ لیے تھے مگر بڑی دقت سے ہکلا ہکلا کر میری زبان سے نکلے مجھے یاد ہے جب میں انہیں

پڑھنے کھڑا ہوا تو میرے سر میں چکر تھا اور میرا بدن کانپ رہا تھا۔

بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ میں بمبئی روانہ ہوا راجکوٹ سے بمبئی تک میرا پہلا سفر تھا میرے بھائی مجھے پہنچانے گئے تھے لیکن مثل ہے کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا ابھی بمبئی میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

برادری سے خارج

اپنی ماں سے اجازت اور دعائیں لے کر، اپنی بیوی اور تین چار مہینے کے بچے سے رخصت ہو کر میں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوا لیکن وہاں میرے بھائی کے دوستوں نے ان سے کہا جون اور جولائی میں بحر ہند میں طلاطم رہتا ہے اور یہ اس لڑکے کا پہلا بحری سفر ہے اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ یہ نومبر سے پہلے روانہ ہو کسی نے یہ خبر سنائی کہ حال ہی میں کوئی جہاز طوفان میں ڈوب گیا ہے۔ میرے بھائی یہ سن کر گھبرا گئے اور انہوں نے میری فوری روانگی میں خطرہ سمجھ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا وہ مجھے بمبئی میں ایک دوست کے پاس چھوڑ کر راجکوٹ چلے گئے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے انہوں نے میرا سفر خرچ اپنے نسبتی بھائی کے پاس رکھوا دیا اور اپنے دوستوں سے کہہ دیا کہ مجھے جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو دیتے رہیں۔

بمبئی میں مجھ سے وقت کاٹے نہ کٹتا تھا میں ہمیشہ انگلستان جانے کے خیال میں رہا کرتا تھا اس عرصہ میں ذات برادری کے لوگوں میں میرے سمندر پار جانے کی خبر سے بے چینی پھیل گئی کوئی مودھ بنیا اب تک انگلستان نہیں گیا تھا لوگ میری اس جرأت کا مواخذہ کرنے پر تل گئے برادری کا ایک عام جلسہ ہوا اور میں اس کے سامنے طلب کیا گیا میں نے تعمیل کی خدا جانے مجھ میں ایک دم سے کہاں کی جرأت آ گئی جلسے کے سامنے جانے میں میں ذرا بھی نہیں ڈرا۔ مجھے خفیف سی جھجک بھی محسوس نہ ہوئی برادری کے سردار سیٹھ صاحب نے جو میرے دور کے رشتہ دار اور میرے والد کے دوست تھے، مجھ سے اس طرح خطاب کیا:

’’برادری کی نظر میں تمہارا انگلستان جانا ٹھیک نہیں ہے، ہمارے دھرم میں سمندر پار جانے کی ممانعت ہے ہم نے سنا ہے کہ وہاں آدمی دھرم کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے اسے انگریزوں کے ساتھ کھانا پڑتا ہے!‘‘

میں نے اس کا یہ جواب دیا: میرے خیال میں انگلستان جانا ہرگز دھرم کے خلاف نہیں ہے، میں وہاں آگے پڑھنے کے لیے جارہا ہوں اور میں اپنی والدہ سے عہد کرچکا ہوں کہ ان تین چیزوں سے جن کا آپ لوگوں کو زیادہ ڈر ہے پرہیز کروں گا مجھے یقین ہے کہ یہ عہد مجھے برائی سے محفوظ رکھے گا۔

سیٹھ جی نے فرمایا مگر میں جو تم سے کہتا ہوں کہ وہاں دھرم پر قائم رہنا ممکن نہیں تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے باپ کے مجھ سے کیا تعلقات تھے تمہارا فرض ہے کہ میری بات مانو۔

میں نے کہا: ’’مجھے ان تعلقات کا حال معلوم ہے اور میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں، مگر میں اس معاملے میں مجبور ہوں میں انگلستان جانے کا عزم کرچکا ہوں اور اسے ترک نہیں کرسکتا میرے والد کے دوست اور مشیر نے جو ایک عالم برہمن ہیں میرے انگلستان جانے کو جائز رکھا ہے اور میری والدہ اور بھائی نے بھی اجازت دے دی۔‘‘

’’مگر تمہیں برادری کے حکم کا لحاظ نہیں؟‘‘

’’میں سچ مچ مجبور ہوں میرے خیال میں برادری کو اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔‘‘

اس پر سیٹھ جھنجھلا گئے وہ مجھے سخت سست کہنے لگے میں چپ بیٹھا رہا۔ آخر سیٹھ نے حکم دیا: ’’آج سے یہ لڑکا برادری سے باہر سمجھا جائے گا جو کوئی اس کی مدد کرے گا

اسے پہنچانے کھاڑی جائے گا وہ سوا روپیہ جرمانہ کا مستوجب ہوگا۔''

مجھ پر اس حکم کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میں سیٹھ سے رخصت ہو کر چلا آیا مگر مجھے یہ فکر تھی کہ میرے بھائی کیا کہیں گے خوش قسمتی سے وہ ثابت قدم رہے اور انہوں نے اپنے خط میں یقین دلایا کہ باوجود سیٹھ کے حکم کے ان کی اجازت بدستور قائم ہے۔

اس واقعے سے مجھے اور بے چینی پیدا ہوگئی کہ کسی طرح جلدی چلا جاؤں۔ اگر ان لوگوں نے میرے بھائی پر دباؤ ڈالا تو خدا جانے کیا صورت ہو؟ اور فرض کرو ناگہانی حادثہ پیش آ گیا میں اس الجھن میں تھا کہ میں نے سنا ایک جونا گڑھ کے وکیل بیرسٹری کرنے انگلستان جا رہے ہیں اور 4 ستمبر کے جہاز سے روانہ ہو جائیں گے میں اپنے بھائیوں کے دوستوں سے جن کے سپرد وہ مجھے کر گئے تھے ملا ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے ایسے شخص کی ہمراہی کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے وقت بہت کم تھا میں نے اپنے بھائی کو تار دے کر اجازت مانگی اور انہوں نے دے دی، میں نے اپنے نسبتی بھائی سے روپیہ مانگا۔ انہوں نے سیٹھ کے حکم کا حوالہ دیا اور کہا مجھ میں برادری سے خارج ہونے کی ہمت نہیں تب میں اپنے خاندان کے ایک دوست کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے اتنا روپیہ قرض دے دیں جو کرایہ اور اوپر کی ضروریات کے لیے کافی ہو اور میرے بھائی سے وصول کر لیں انہوں نے مہربانی سے نہ صرف میری درخواست منظور کر لی بلکہ مجھے بہت تسلی بھی دی میں نے فوراً جہاز کا ٹکٹ لیا اب مجھے سفر کا سامان تیار کرنا تھا ایک اور دوست کو ان باتوں کا تجربہ تھا انہوں نے میرے کپڑے بنوا دیئے اور دوسری چیزیں فراہم کر دیں۔ بعض کپڑے مجھے پسند تھے اور بعض ناپسند نکٹائی سے جسے میں آگے چل کر شوق سے باندھنے لگا اس وقت مجھے سخت نفرت تھی چھوٹا کوٹ پہننا مجھے بے حیائی

معلوم ہوتی تھی لیکن انگلستان جانے کی لگن میرے دل میں ایسی تھی کہ یہ ناپسندیدگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی راستے کے کھانے پینے کا سامان میرے ساتھ بہت زیادہ تھا میرے دوستوں نے اسی کیبن میں ایک برتھ محفوظ کر لی تھی جس میں جونا گڑھ کے وکیل تری امیک رائے جی مضمون دار تھے انہوں نے مجھے مضمون دار جی کی حفاظت میں دیا اور کہا یہ ابھی اٹھارہ برس کا لڑکا ہے جسے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں مضموندار جی نے کہا آپ اس لڑکے کی طرف سے مطمئن رہیے۔

خدا خدا کر کے ہم 4 ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

لندن میں داخلہ

مجھے سمندر کے سفر میں متلی بالکل نہیں ہوئی لیکن کچھ دن کے بعد میری طبیعت میں الجھن اور بے چینی پیدا ہونے لگی میں سٹورڈ تک سے باتیں کرنے جھیپتا تھا۔ مجھے انگریزی بولنے کی بالکل عادت نہ تھی اور دوسرے درجے میں سوا مضموندار جی کے سب مسافر انگریز تھے میں نے ان سب سے باتیں نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ جب وہ مجھ سے مخاطب ہوتے تو میں ان کے الفاظ کم سمجھتا تھا اور اگر سمجھ بھی گیا تو جواب نہیں دے سکتا تھا مجھے بولنے سے پہلے ایک ایک لفظ سوچنا پڑتا تھا میں چھری کانٹے کے استعمال سے ناواقف تھا اور مجھ میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ کسی سے پوچھوں کن کن کھانوں میں گوشت نہیں ہے۔

اس لیے میں لوگوں کے ساتھ میز پر کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ اپنے کیبن میں کھالیا کرتا تھا اور میری غذا زیادہ تر مٹھائی اور پھل تھے جو میں ساتھ لایا تھا۔ مضموندار جی کو اس قسم کی کوئی دقت نہ تھی اور وہ سب سے ملتے جلتے تھے۔ وہ بے تکلف ڈیک پر پھرتے تھے اور میں کیبن میں چھپا بیٹھا رہتا تھا اور ڈیک پر صرف اس وقت جاتا تھا جب وہاں دو چار آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں مضموندار جی مجھے برابر سمجھاتے تھے کہ مسافروں سے ملا کرو اور ان سے بے تکلف باتیں کیا کرو وہ کہتے تھے کہ وکیل کی زبان تیز ہونا چاہیے اور اپنے پیشے کے تجربے سنایا کرتے تھے۔ ان کی نصیحت تھی کہ انگریزی بولنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور غلطیوں کی پروانہ کرو۔ غیر زبان میں غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں لیکن میں اپنی جھیپنے کی عادت کسی طرح دور نہ کرسکا۔

ایک انگریز مسافر مجھ سے اتنی مہربانی سے پیش آیا کہ مجھے گفتگو کرنا ہی پڑی وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں تم کون ہو، کیا کام کرتے ہو، کیا کھاتے ہو، کہاں جا رہے ہو، اتنا جھجکتے کیوں ہو وغیرہ وغیرہ مجھے مشورہ دیا کہ میز پر آیا کرو وہ میرے اتنی سختی سے گوشت سے پرہیز کرنے پر بہت ہنسا اور ایک دن جب ہم بحر قلزم میں تھے اس نے دوستانہ لہجہ میں کہا۔

''ابھی تو خیر کام چلتا ہے مگر جب خلیج بسکے میں پہنچو گے تو تمہیں اپنے فیصلہ پر پھر سے غور کرنا پڑے گا اور انگلستان میں تو اتنی سردی پڑتی ہے کہ کوئی بے گوشت کھائے زندہ نہیں رہ سکتا۔''

میں نے کہا ''مگر میں نے سنا ہے کہ لوگ وہاں بے گوشت کھائے بھی رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔''

وہ بولا ''یقین جانو یہ من گھڑت ہے جہاں تک مجھے یاد ہے وہاں کوئی شخص نہیں رہتا جو گوشت نہ کھاتا ہو دیکھو آخر میں تم سے شراب پینے کو تو نہیں کہتا حالانکہ میں پیتا ہوں مگر یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ تمہیں گوشت کھانا چاہیے کیونکہ بغیر اس کے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔''

''آپ کے ہمدردانہ مشورہ کا شکریہ لیکن میں اپنی ماں سے صدق دل سے وعدہ کر چکا ہوں کہ گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ اس لیے میں اس کے کھانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اگر میں دیکھو گا کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا تو میں ہندوستان واپس چلا جاؤں گا مگر یہاں رہنے کے لیے گوشت کھانا قبول نہ کروں گا۔''

ہم خلیج بسکے میں داخل ہو گئے لیکن مجھے نہ تو گوشت کی ضرورت پیدا ہوئی۔ نہ شراب کی وطن میں مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ میں لوگوں سے تصدیق کرا لوں کہ میں

نے گوشت نہیں کھایا۔ میں نے اس انگریز دوست سے تصدیق نامہ مانگا۔ اس نے خوشی سے دے دیا اور میں نے اسے بہت دن تک احتیاط سے رکھا لیکن جب میں نے آگے چل کر دیکھا جو لوگ کھاتے ہیں انہیں بھی ایسے تصدیق نامے مل جاتے ہیں تو میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ اگر کسی کو میری بات کا اعتبار نہ ہو تو تصدیق نامے سے کیا فائدہ۔ غرض ہم ساؤتھمپٹن پہنچ گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سنیچر کا دن تھا جہاز میں کالا سوٹ پہنتا تھا۔ سفید فلالین کا سوٹ جو میرے دوستوں نے بنوایا تھا اس لیے اٹھا رکھا گیا تھا کہ جہاز سے اتر کر پہنا جائے۔ میرا خیال تھا کہ جب ساحل پر اتروں گا تو سفید کپڑے پہننا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے میں نے فلالین کا سوٹ پہنا۔ یہ ستمبر کے آخری دنوں کا ذکر ہے میں نے دوسروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوائے میرے کوئی سفید کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہے میں نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا سامان بمع کنجیوں گرنڈ لے کمپنی کے ایک ایجنٹ کے سپرد کر دیا اس لیے میں نے بھی یہی کیا۔

میرے پاس چار تعارف کے خط تھے ڈاکٹر پ ج مہتا کے نام، دلپت رام جی شکل کے نام، پرنس رنجیت سنگھ جی کے نام اور دادا بھائی نوروجی کے نام جہاز پر کسی نے ہمیں یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن میں وکٹوریہ ہوٹل میں ٹھہریں۔ اس لیے مضموندار جی نے اور میں نے وہاں قیام کیا مجھے پہلے ہی کیا کم شرم تھی کہ میں اکیلا سفید کپڑے پہنے ہوں۔ جب ہوٹل میں مجھے معلوم ہوا کہ گرنڈ لے کے ہاں سے میرا اسباب کل اتوار کے سبب سے نہیں مل سکتا تو میں بے حد پریشان ہوا ابھی دن شام کو آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر مہتا جنہیں میں ساؤتھمپٹن سے تار دیا تھا تشریف لائے۔ انہوں نے نہایت گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا وہ میرے سفید کپڑوں کو دیکھ کر ہنسے ان سے باتیں

کرتے کرتے میں نے شغل کے طور پر ان کی ٹاپ ہیٹ اٹھالی اور اس پر الٹی طرف ہاتھ پھیرنے لگا جس سے اس کے بال ادھر ادھر ہٹ گئے ڈاکٹر مہتا نے میری اس حرکت کو کس قدر غصے کی نظر سے دیکھا اور مجھے روک دیا لیکن جو نقصان ہونا تھا ہو ہی گیا۔ اس واقعے سے مجھے آئندہ کے لیے عبرت ہوگئی یہ میرا یورپی آداب مجلس کا پہلا سبق تھا جس کی باریکیاں ڈاکٹر مہتا نے مجھے دل لگی کے پیرائے میں سمجھا دیں انہوں نے کہا کہ ''دوسروں کی چیزیں نہ چھوا کرو، پہلی ملاقات میں اس قسم کے سوال نہ کیا کرو جیسے ہم ہندوستان میں کرتے ہیں، چلا کر بات نہ کیا کرو، لوگوں سے گفتگو کرتے وقت انہیں ''سر'' نہ کہا کرو، یہ ہندوستان کا دستور ہے یہاں تو صرف نوکر چاکر اپنے آقا کو ''سر'' کہتے ہیں'' اور اسی قسم کی بہت سی باتیں انہوں نے مجھے بتائیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہوٹل کے رہنے میں بہت خرچ ہے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی خاندان کے ساتھ رہوں ہم نے یہ فیصلہ کے اکہ اس معاملہ کو پیر تک ملتوی رکھیں۔

مضموندار جی کو اور مجھے ہوٹل میں تکلیف تھی اور خرچ بھی بہت تھا۔ مالٹا سے ہمارے ہمسفر ایک سندھی تھے جن سے مضموندار جی کی دوستی ہوگئی تھی وہ لندن میں اجنبی نہ تھے اس لیے انہوں نے کہا کہ اگر کہو تو تمہارے لیے کمرے تلاش کر دوں ہم راضی ہو گئے اور پیر کے دن جیسے ہی اسباب آیا ہم نے ہوٹل کا بل ادا کر دیا اور ان کمروں سے اٹھ گئے جو سندھی دوست نے ہمارے لیے کرایہ پر لیے تھے مجھے یاد ہے کہ میرے ہوٹل کا بل تین پاؤنڈ کے قریب تھا جسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے اتنا روپیہ دینا پڑا اور لطف یہ کہ میں تقریباً فاقہ سے رہا، کیونکہ مجھے کوئی کھانا پسند نہیں آتا تھا اگر مجھے ایک چیز ناپسند ہوتی تو میں دوسری منگاتا تھا اور دونوں کے دام دینا پڑتے تھے۔ اصل میں میرا گزارا اب تک ان چیزوں پر تھا جو میں بمبئی سے ساتھ لایا تھا۔

نئے کمروں میں بھی میں پریشان تھا۔ مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتا تھا۔ ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ رات کو میرے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور گھر کی ایک ایک چیز کی یاد نیند حرام کر دیتی تھی کسے اپنا درد پنہاں سناتا اور فرض کیجئے سناتا بھی تو فائدہ کیا ہوتا؟ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی جس سے تسکین ہو۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ لوگ، ان کے طور طریقے یہاں تک کہ ان کے گھر بھی میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا اور مجھے ہر وقت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی جو کھانے میں کھا سکتا تھا، وہ بے مزہ اور پھیکے تھے غرض میں عجب مخمصے میں پھنسا تھا نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن انگلستان میں رہنا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور ہندوستان واپس جانا محال تھا میرا ضمیر کہتا تھا کہ اب تو تم آ ہی گئے ہو، کسی نہ کسی طرح یہ تین سال پورے کرو۔

میرے ایک عقیدے کی تبدیلی

ڈاکٹر مہتا پیر کے دن وکٹوریہ ہوٹل پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ میں وہیں ملوں گا۔ یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ جا چکے ہیں۔ وہ ہمارا نیا پتہ معلوم کر کے ہمارے مکان پہنچے۔ مجھے جہاز پر محض حماقت سے داد کی شکایت ہو گئی تھی۔ وہاں ہمیں منہ دھونے اور نہانے کے لیے سمندر کا پانی ملتا تھا جس میں صابن حل نہیں ہوتا۔ مگر میں صابن کو تہذیب کی نشانی سمجھ کر استعمال کرتا تھا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جلد بجائے صاف ہونے کی بجائے چکنائی سے آلودہ ہو جاتی تھی اسی سے میں داد میں مبتلا ہو گیا میں نے ڈاکٹر مہتا کو دکھایا تو انہوں نے کہا سرکہ کا تیزاب لگاؤ۔ مجھے یاد ہے کہ تیزاب کی جلن سے میں بلبلا اٹھا تھا ڈاکٹر مہتا نے میرے کمرے کو اور اس کے سامان کو دیکھا تو ناپسندیدگی سے سر ہلا کر بولے اس سے کام نہیں چلے گا انگلستان آنے میں ہمارا مقصد پڑھنے لکھنے سے زیادہ یہاں کی زندگی اور معاشرت کا تجربہ حاصل کرنا ہے اور اس کے لیے تمہارا کسی خاندان کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن اس سے پہلے یہ مناسب ہے کہ تم کچھ دن 18۔۔۔۔۔۔ کے ساتھ بطور امیدوار کے رہو میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔

میں نے اس رائے کو شکریئے کے ساتھ قبول کیا اور ان کے دوست کے یہاں اٹھ گیا۔ وہ مجھ سے بہت مہربانی اور اخلاق سے پیش آئے انہوں نے مجھے اپنے بھائی کے برابر سمجھا۔ مجھے انگلستان کے طور طریقے سمجھائے اور انگریزی بولنے کی مشق کرائی۔ مگر میری غذا کا مسئلہ بہت پیچیدہ تھا مجھے بغیر نمک مسالے کے ابلی ہوئی

ترکاری پسند نہ آئی تھی مکان والی حیران تھی کہ میرے لیے کیا چیز پکائے صبح ناشتے میں ہم جئی کا دلیہ کھاتے تھے جس سے پیٹ بھر جاتا تھا لیکن دوپہر اور شام کے کھانے سے میں ہمیشہ بھوکا اٹھتا تھا۔ میرے دوست مجھے اکثر سمجھاتے تھے کہ گوشت کھایا کرو مگر میں ہمیشہ اپنے عہد کا عذر پیش کر کے خاموش ہو رہتا تھا دوپہر اور شام پالک ڈبل روٹی اور مربہ ملتا تھا میری خوراک اچھی تھی اور معدہ بڑا تھا۔ لیکن میں شرم کے مارے ڈبل روٹی کے دو تین ٹکڑوں سے زیادہ نہ مانگ سکتا تھا کیونکہ یہ بدتمیزی معلوم ہوتی تھی اس پر یہ طرہ کہ دودھ نہ دوپہر کو ملتا تھا نہ شام کو میرے دوست یہ حالت دیکھتے دیکھتے ایک دن اکتا کر کہنے لگے اگر تم میرے سگے بھائی ہوتے تو میں تمہیں کھڑے کھڑے نکال دیتا۔ وہ عہد بھی کوئی چیز ہے جو ایک جاہل ماں کے سامنے کیا گیا ہو اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ یہاں کی حالت سے متعلق واقفیت نہ تھی؟ یہ میرے لیے عہد ہی نہیں ہے قانون اسے ہرگز عہد تسلیم نہ کریگا ایسے وعدے کی پابندی محض ضعیف الاعتقادی ہے اور میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اس طرح کی ضد سے تمہیں یہاں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ تم اس سے پہلے گوشت کھا چکے ہو اور تمہیں اس کا مزا پسند آیا تھا۔ جہاں کوئی ضرورت نہ تھی وہاں تک تم نے کھایا اور جہاں سخت ضرورت ہے وہاں نہیں کھاتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے!

مگر میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔

روز میرے دوست یہی بحث کرتے تھے مگر میری طرف سے ہمیشہ ایک جواب تھا قطعی انکار جتنی زیادہ وہ بحث کرتے تھے اتنا ہی میں اپنے عقیدے میں سخت ہوتا جاتا تھا میں روز خدا سے دعا کرتا تھا کہ وہ مجھے بچائے اور وہ مجھے بچاتا تھا اس کے یہ معنی نہیں کہ میں خدا کو پہچانتا تھا۔ یہ محض عقیدے کا کھیل تھا وہ عقیدہ جس کا بیج میری

کھلائی رمبھا نے میرے دل میں بویا تھا۔

ایک دن میرے دوست نے مجھے بینتھم کا ''نظریہ افادیت'' پڑھ کر سنانا شروع کیا میں نے بہت چکرایا۔ عبارت اتنی مشکل تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی میرے دوست اس کا مطلب سمجھانے لگے میں نے کہا ''مجھے تو معاف ہی رکھیے یہ پیچیدہ مسئلے میرے بس کے نہیں میں مانتا ہوں کہ گوشت کھانا ضروری ہے مگر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔ اس میں بحث کی گنجائش نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بحث میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر خدا کے لیے آپ مجھے بے وقوف اور ضدی سمجھ کر چھوڑ دیجیے میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ میری ہمدردی کے سبب سے مجھ سے بار بار یہ بات کہتے ہیں مگر میں مجبور ہوں جو عہد کر لیا وہ کر لیا اب اسے توڑ نہیں سکتا۔''

میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا انہوں نے کتاب بند کر دی اور کہا ''بہت اچھا اب میں کبھی بحث نہ کروں گا'' مجھے بڑی خوشی ہوئی انہوں نے پھر کبھی اس مسئلے پر بحث نہیں کی مگر انہیں میری طرف سے جو تشویش تھی وہ بدستور رہی وہ سگریٹ اور شراب پیتے تھے مگر انہوں نے مجھ سے ان چیزوں کے استعمال کے لیے کبھی نہیں کہا، بلکہ ان دونوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی انہیں صرف اس بات کی فکر تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو میں گوشت نہ کھانے سے کمزور ہو جاؤں اور انگلستان نے میرا دل اچاٹ ہو جائے۔

اس طرح میں نے ایک مہینہ امیدواری کا زمانہ بسر کیا۔ میرے دوست کا گھر رچمنڈ میں تھا۔ وہاں سے ہفتہ میں ایک دفعہ سے زیادہ لندن جانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ڈاکٹر مہتا اور دلپت رام جی شکل کی رائے ہوئی کہ میں کسی خاندان میں رکھا

جاؤں۔ شکل جی نے مغربی کینزنگٹن میں ایک اینگلو انڈین کا گھر تجویز کیا اور وہاں میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ گھر کی مالکہ ایک بیوہ تھیں۔ میں نے ان سے اپنے عہد کا حال بیان کیا بڑی بی نے وعدہ کیا کہ میری خبر گیری اچھی طرح کریں گی اور میں ان کے مکان میں رہنے لگا۔ یہاں بھی مجھے قریب قریب فاقہ ہی رہتا تھا میں نے گھر سے مٹھائی اور دوسری کھانے کی چیزیں منگوائی تھیں مگر ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا مجھے ہر چیز بدمزہ معلوم ہوتی تھی مالکہ مجھ سے روز پوچھتی تھیں کہ کھانا پسند آیا یا نہیں؟ مگر وہ بیچاری کیا کرسکتی تھیں؟ میرے حجاب کا اب تک بھی وہی حال اور جو کچھ بھی میرے سامنے آتا تھا اس سے زیادہ مانگنے کی مجھ میں جرأت نہ ہوتی تھیں ان کی دولڑکیاں تھیں یہ بڑے اصرار سے مجھے ڈبل روٹی کے تین ٹکڑے اور دے دیتی تھیں مگر انہیں کیا خبر تھی کہ میرا پیٹ بھرنے کے لیے ایک پوری روٹی چاہیے۔

مگر اب لندن میں میرے قدم ذرا ذرا جم گئے تھے ابھی باقاعدہ پڑھائی کی ابتداء نہیں ہوئی تھی البتہ میں نے حال ہی میں شکل جی کے کہنے سے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا۔ ہندوستان میں میں نے کبھی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ لیکن یہاں پابندی سے پڑھتے پڑھتے مجھے شوق پیدا ہوگیا۔ میں روزانہ ڈیلی نیوز، ڈیلی ٹیلیگراف اور پیل میل گزٹ کا سرسری مطالعہ کرلیا کرتا تھا اس میں مجھے مشکل سے ایک گھنٹہ لگتا تھا اس لیے میں نے شہر کے چکر لگانا شروع کیا۔ میں نباتاتی ریستوران کی تلاش میں نکلا۔ مالکہ مکان نے مجھ سے کہا تھا کہ شہر میں ایسی کئی جگہیں ہیں۔ میں روز دس بارہ میل چلتا تھا اور کسی سستے ریستوران میں جا کر روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ مگر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی اس روزانہ گشت کے دوران مجھے فیرنگڈن سٹریٹ میں ایسا ریستوران مل گیا اسے دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے کسی بچے کو اپنی من بھاتی چیز پانے سے ہوتی

ہے اس میں داخل ہونے سے پہلے مجھے دروازہ کے قریب ایک شیشے کی کھڑکی کے نیچے کچھ کتابیں نظر آئیں جو بکنے کے لیے رکھی تھیں ان میں سے سالٹ کی کتاب ''نباتی مشرب 19 کی حمایت'' میں نے ایک شانگ میں خریدی اور سیدھا کھانے کے کمرے میں پہنچا انگلستان آنے کے بعد سے یہ پہلا دن تھا کہ میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا خدا نے میری مدد کی۔

میں نے سالٹ کی کتاب اول سے آخر تک پڑھی اور مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ جس تاریخ سے میں نے یہ کتاب پڑھی میں دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں نے اپنی مرضی سے نباتاتی مشرب اختیار کیا۔ میں نے اس دن کو دعائیں دیں جب میں نے اپنی ماں کے سامنے گوشت نہ کھانے کا عہد کیا تھا۔ اب تک گوشت سے صرف سچائی کی خاطر اور اس عہد کے خیال سے پرہیز کرتا تھا جو میں نے اپنی والدہ کے سامنے کیا تھا مگر میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی گوشت کھانا اختیار کرلے اور مجھے انتظار تھا کہ ایک دن ایسا آئے جب میں کھلم کھلا گوشت کھاؤں اور دوسروں کو اس مبارک کام میں شریک کرلوں اب میں نے نباتاتی مشرب اختیار کرلیا اور آئندہ سے اس کے پھیلانے کو اپنا دھرم بنالیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

انگریز مآبی

میرا عقیدہ نباتاتی مشرب کے بارے میں روز بروز راسخ ہوتا گیا۔ سالٹ کی کتاب پڑھ کر مجھے غذا کے متعلق اور کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان میں سے ایک ہاورڈ ولیمس کی ''اخلاقیاتِ غذا'' جس میں 'غذائیات'' کی تاریخ عہدِ قدیم سے آج تک مشاہیر کی سیرت کے آئینے میں پیش کی گئی تھی مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فیثاغورث اور حضرت عیسیٰ سے لے کر آج تک جتنے فلسفی اور پیغمبر گزرے ہیں سب نباتاتی مشرب رکھتے تھے ڈاکٹر اینا کنگسفورڈ کی کتاب ''غذا کا مکمل دستور العمل'' بھی دلچسپ تھی ڈاکٹر ایلنس نے صحت اور حفظانِ صحت کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی مجھے بہت مدد ملی وہ اس طریقہ علاج کے حامی تھے جو محض مریضوں کی غذا کی دیکھ بھال تک محدود ہے وہ خود نباتاتی مشرب رکھتے تھے اور اپنے مریضوں کو سختی سے ہدایت کرتے تھے کہ محض نباتات استعمال کریں ان سب کتابوں کو پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ 'غذائیات'' کے تجربے میری زندگی کا ایک اہم جز بن گئے۔ ابتداء میں یہ تجربے زیادہ تر صحت کے نقطہ نظر سے کئے گئے۔ آگے چل کر ان کا اصل محرک مذہب بن گیا۔

مگر میرے دوست کو اب بھی میری طرف سے تشویش تھی میری محبت کے جوش میں انہیں یہ خیال ہوا کہ اگر میں اسی طرح گوشت کھانے کا مخالف رہا تو ایک تو میرا جسم کمزور ہو جائے گا دوسرے میں بالکل بے شعور رہوں گا کیونکہ انگریزوں کی صحبت میں میرا جی نہ لگے گا جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مجھے ''نباتاتی مشرب'' کی کتابوں

سے دلچسپی ہوگئی ہے تو وہ ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے مطالعہ سے میرا دماغ خراب ہو جائے۔ میں اپنا کام بھول کر ان تجربوں میں اپنا وقت ضائع کروں اور پورا مرافی بن جاؤں اس لیے انہوں نے میری اصلاح کی ایک آخری کوشش کی ایک دن انہوں نے مجھے تھیٹر دیکھنے کی دعوت دی تماشے سے پہلے ہم ہوبرن ریستوران میں کھانا کھانے لگے وکٹوریا ہوٹل سے رخصت ہونے کے بعد مجھے بڑے ریستوران میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور مجھے یہ جگہ ایک عالی شان محل معلوم ہوتی تھی ہوٹل میں رہ کر میں نے کوئی مفید تجربہ حاصل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک میرے حواس بجا نہ تھے۔ میرے دوست بظاہر مجھے اس ریستوران میں اس خیال سے لے گئے تھے کہ حجاب کے سبب سے میں کھانے کے متعلق پوچھ گچھ نہ کرسکوں گا۔ وہاں بہت سے لوگ کھانا کھانے کے لیے جمع تھے میرے دوست بھی مجھے لے کر ایک علیحدہ میز پر بیٹھ گئے پہلے شوربا آیا مجھے یہ فکر تھی کہ اس میں کیا کیا چیزیں پڑی ہیں مگر دوست سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اس لیے میں نے کھانا لانے والے ملازم کو بلایا میرے دوست میز کے دوسری طرف بیٹھے تھے مگر انہوں نے میرا اشارا دیکھ لیا اور سختی سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے بہت جھجکتے ہوئے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ شوربا ترکاری کا ہے یا نہیں میرے دوست نے غصے سے چلا کر کہا ''تم اتنے بے تکے ہو کہ مہذب صحبت کے قبل نہیں اگر تم تمیز سے نہیں بیٹھ سکتے تو بہتر ہے کے چلے جاؤ۔ کسی اور ریستوران میں جا کر کھانا کھا لو اور باہر میرا انتظار کرو'' میں بہت خوش ہوا فوراً اٹھ کر چلا گیا قریب ہی ایک ''نباتاتی ریستوران'' تھا مگر بند تھا اس لیے میں نے اس رات کو کھانا نہیں کھایا میں اپنے دوست کے ساتھ تھیٹر گیا مگر انہوں نے اس ناگوار واقعے کا جو میرے سبب سے پیش آیا، کوئی ذکر نہ کیا اور مجھے تو ظاہر ہے کہ

کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔

یہ آخری دوستانہ نزاع تھی جو ہم دونوں میں ہوئی اس کا ہمارے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے جو کچھ کیا محبت سے کیا اور میں اس کی قدر کرتا تھا جتنا زیادہ ہمارے خیالات اور طرز عمل میں اختلاف تھا اتنی ہی زیادہ میں ان کی عزت کرتا تھا۔

مگر میں نے یہ طے کیا کہ ان کی تشویش رفع کر دوں اور ان کو یقین دلا دوں کہ اب میں بے تکے پن کی حرکتیں نہیں کروں گا بلکہ کوشش کروں گا کہ شائستہ بنوں اور اپنے تر کاری کھانے کی تلافی میں اور آداب سیکھوں جو انسان کو مہذب صحبت کے قابل بنا دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے میں نے ایک ناممکن کام کا بیڑا اٹھایا یعنی انگریز جنٹلمین بننے کا۔

میں نے سوچا کہ بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے جو میں پہنے ہوں انگلستان کی سوسائٹی کے قابل نہیں ہیں اس لیے میں نے آرمی اینڈ نیوی کی کوٹھی سے نئے کپڑے خرید لیے۔ایک لمبی ریشمی ہیٹ بھی انیس شلنگ میں خریدی جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑی قیمتی تھی مجھے اس پر بھی قناعت نہ ہوئی بلکہ دس پاؤنڈ ضائع کر کے ایک ایوننگ سوٹ بونڈ اسٹریٹ سے سلوایا جو اس زمانے میں فیشن کا مرکز سمجھی جاتی تھی اور اپنے بھائی سے سونے کی دہری کھڑی زنجیر منگوائی، بندھی بندھائی ٹائی لگانا فیشن کے خلاف تھا اس لیے میں نے خود ٹائی باندھنے کی صنعت سیکھی۔

ہندوستان میں تو آئینہ میرے لیے بڑے تکلف کی چیز تھی مجھے آئینہ دیکھنا صرف اس دن نصیب ہوتا تھا جس دن گھر کا نائی میرے ڈاڑھی مونڈھتا تھا۔ یہاں میں روز دس منٹ ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی ٹھیک کرنے اور مانگ

نکالنے میں ضائع کرتا تھا بد قسمتی سے میرے بال بھی نرم نہ تھے اور انہیں جمانے میں برش سے خاصی کشتی لڑنا پڑتی تھی جب کبھی میں سر پر ٹوپی رکھتا یا اتارتا تھا تو میرا ہاتھ خود بخود بال درست کرنے کے لیے سر پر پہنچ جاتا تھا اس کے علاوہ ایک مہذب عادت یہ تھی کہ جب شائستہ سوسائٹی میں بیٹھنا ہوتا تھا تو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ سر پر جا کر مشین کے پرزے کی طرح یہی عمل کر آتا تھا۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی جنٹلمین بننے میں ایک انچ کی کسر تھی اس لیے میں نے دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی جو انگریز جنٹلمین کے لیے ضروری ہیں مجھ سے کہا گیا کہ ناچ، فرانسیسی زبان اور خطابت سیکھنا میرے لیے ضروری ہے فرانسیسی نہ صرف ہمسایہ ملک فرانس کی زبان تھی بلکہ سارے براعظم یورپ میں سمجھی جاتی تھی جس کی سیاحت کا میں قصد رکھتا تھا میں نے طے کیا کہ ایک رقاصی کی کلاس میں ناچ سیکھوں گا اور تین پاؤنڈ ایک ٹرم کی فیس ادا کر دوں گا میں تین ہفتہ میں کوئی چھ بار کلاس میں گیا لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی کہ جسم کی حرکت میں موزونیت پیدا کروں۔ میں پیانو سمجھ نہیں سکتا تھا اس لیے تال کے ساتھ قدم رکھنا میرے لیے نا ممکن تھا اب میں کرتا تو کیا کرتا ایک سادھو کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے چوہوں کو بھگانے کے لیے بلی پالی بلی کو دودھ پلانے کے لیے گائے رکھی گائے چرانے کے لیے آدمی رکھا غرض اسی طرح سلسلہ بڑھتا گیا میرے حوصلے بھی اس سادھو کے خاندان کی طرح بڑھتے گئے میں نے سوچا کہ مغربی موسیقی کا شوق پیدا کرنے کے لیے وائیلن بجانا سیکھوں۔ اس لیے میں نے تین پاؤنڈ کا ایک وائیلن خریدا اور سکھانے والے کی فیس میں بھی کچھ خرچ ہوا۔ میں ایک تیسرے استاد کے پاس خطابت سیکھنے گیا اور ایک گنی ابتدائی فیس ادا کی انہوں نے نبیل کی کتاب "کامل

خطیب'' نصاب کے طور پر مقرر کی اور میں نے اسے خرید لیا۔ پٹ کی ایک اسپیچ سے میں نے ابتداء کی۔

لیکن نبیل کی کتاب نے صدائے جرس بن کر مجھے خواب غفلت سے بیدار کیا میں نے دل میں کہا'' مجھے کچھ انگلستان میں اپنی عمر تو گزارنا نہیں پھر آخر خطابت سیکھنے سے کیا فائدہ؟ اور ناچ سیکھ کر میں جنٹلمین کیسے بن جاؤں گا؟ رہا وائیلن تو وہ میں ہندوستان میں بھی سیکھ سکتا ہوں میں طالب علم ہوں مجھے اپنی پڑھائی کی فکر کرنا چاہیے مجھے ''انس آف کورٹ'' میں داخل ہونے کی تیاری کرنا چاہیے اگر میں اپنی سیرت کی بدولت جنٹلمین بن جاؤں تو فبہا ورنہ مجھے اس حوصلہ سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔''

اس قسم کے خیالات کا میرے دل میں ہجوم تھا اور میں نے انکا اظہار اپنے خطابت کے استاد کے نام ایک خطب میں کیا جس میں ان سے یہ درخواست تھی کہ مجھے آئندہ حاضری سے معذور رکھیں میں نے اب تک صرف دو یا تین سبق لیے تھے اسی طرح کا خط میں نے ناچ سکھانے والی کو لکھا اور وائیلن سکھانے والی کے پاس خود جا کر میں نے درخواست کی کہ میرا وائیلن جس قیمت پر بکے بیچ دیں وہ مجھ پر مہربان تھیں اس لیے میں نے ان سے کہہ دیا کہ مجھے یکایک یہ محسوس ہوا ہے کہ میں ایک جھوٹے نصب العین کی پیروی کر رہا ہوں۔ انہوں نے میرے طرز عمل کی کامل تبدیلی میں میری ہمت افزائی کی۔

یہ سودا مجھے کوئی تین مہینہ رہا لباس میں اہتمام اور تکلف برسوں باقی رہا لیکن اس وقت سے میں طالب علم بن گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تبدیلیاں

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ زمانہ جس میں میں نے ناچ وغیرہ کے تجربے کئے میری زندگی میں عیش پرستی کا زمانہ تھا آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ان دنوں بھی میرے ہوش وحواس قائم تھے میں فیشن کی ترنگ میں مست سہی مگر کبھی کبھی مشاہدہ نفس سے بھی کام لیتا تھا میں پیسے پیسے کا حساب رکھتا تھا اور سمجھ بوجھ سے خرچ کرتا تھا چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً آمنی بس 20 کا کرایہ یا خط کے ٹکٹ یا اخبار کے پیسے بھی درج کر لیتا تھا اور شام کو سونے سے پہلے میزان دیکر باقی نکال لیتا تھا۔ یہ عادت مجھے ہمیشہ رہی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود یہ کہ میرے ہاتھ میں قومی کاموں کے لیے لاکھوں روپیہ رہا مگر میں نے اس کے خرچ کرنے میں نہایت کفایت شعاری برتی اور جتنی تحریکیں میری نگرانی میں تھیں ان میں سے کسی پر بھی قرض نہیں رہا بلکہ ہمیشہ بچت ہی رہی ہر نوجوان مجھ سے سبق حاصل کرے اور جتنا روپیہ اس کے ہاتھ میں آئے اور خرچ ہو سب کا حساب رکھے۔ اس سے آگے چل کر بڑا فائدہ ہوگا۔

میں اپنی زندگی کا سختی سے احتساب کرتا تھا اس لیے مجھے یہ محسوس ہو گیا کہ کفایت شعاری برتنے کی ضرورت ہے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا خرچ آدھا کردوں گا حساب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بس وغیرہ کے کرایہ میں کافی خرچ ہوتا ہے اس کے علاوہ خاندان کے ساتھ رہنے میں ہر مہینہ اچھی خاصی رقم کا بل ادا کرنا پڑتا تھا۔ پھر اخلاق کا تقاضا تھا کہ خاندان کے ارکان کو کبھی کبھی کھانا کھلانے لے جاؤں اور ان کے ساتھ دعوتوں میں جاؤں۔ ان باتوں میں سواری کا بہت خرچ تھا۔ خصوصاً

اگر کوئی خاتون ساتھ ہوتو دستور کے مطابق کل مصارف مجھ ہی کو ادا کرنا پڑتے تھے کھانے کے لیے باہر جانا ایک جداگانہ مد تھی کیونکہ گھر پر کھانے کی بنا پر ہفتہ وار بل میں کوئی رقم مجرا نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ سب رقمیں بچائی جا سکتی ہیں اور رسمی معاشرت کی بیجا پابندی سے جو بھار میرے جیب خرچ پر پڑتا ہے وہ روکا جا سکتا ہے۔

اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ الگ کمرے لے کر رہوں اور اپنے کام کے لحاظ سے مقام تبدیل کرتا رہوں تاکہ کفایت بھی ہو اور تجربہ بھی بڑھے۔ کمروں کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ جہاں مجھے کام کرنا ہو وہاں پیدل چل کر آدھ گھنٹے میں پہنچ جایا کروں اس سے پہلے جب مجھے باہر جانا ہوتو مجبوراً سواری پر جاتا تھا اور ٹہلنے کے لیے الگ وقت نکالنا پڑتا تھا نئے انتظام میں ورزش اور کفایت شعاری کا ساتھ ہو گیا کرائے کا کرایہ بچتا تھا اور آٹھ دس میل چل بھی لیتا تھا زیادہ تر اسی پیدل چلنے کی عادت کی بدولت میں قیام انگلستان کے زمانے میں بیماری سے محفوظ رہا اور میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

غرض میں نے دو کمرے کرائے پر لیے ایک سونے کا کمرہ اور ایک نشست کا کمرہ یہ میری زندگی کی تبدیلی کی دوسری منزل تھی تیسری ابھی آنے کو تھی۔

اس سے میرا خرچ آدھا ہو گیا اب یہ سوال تھا کہ وقت کو کس طرح کام میں لاؤں مجھے معلوم تھا کہ بیرسٹری کے امتحانوں کے لیے زیادہ مطالعہ کی ضرورت نہیں اس لیے میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی میری انگریزی کمزور تھی اور اس کی مجھے ہمیشہ فکر رہتی تھی لیلی صاحب (جو آگے چل کر سر فریڈرک کہلائے) کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونجتے تھے "پہلے بی اے پاس کر آؤ" میں نے سوچا کہ مجھے

بیرسٹری کے علاوہ کوئی ادبی سند بھی لینا چاہیے میں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب کے متعلق دریافت کیا اور چند دوستوں سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ اگر میں ان دونوں یونیورسٹوں میں سے کسی میں جاؤ تو بہت خرچ پڑے گا اور انگلستان میں بہت دن ٹھہرنا ہوگا اس کے لیے میں تیار نہ تھا۔ ایک دوست نے کہا کہ اگر تمہیں واقعی مشکل امتحان دینے کا شوق ہے تو لندن کا میٹریکولیشن پاس کرلو اس میں محنت بھی کافی ہے تمہاری عام استعداد بھی بڑھ جائے گی اور کچھ ایسا زائد خرچ بھی نہیں میں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا لیکن اس امتحان کے نصاب نے مجھے ڈرا دیا لاطینی اور کوئی جدید یورپی زبان (علاوہ انگریزی کے) لازمی تھیں۔ میں نے کہا بھلا میں لاطینی کیسے سیکھ پاؤں گا۔ میرے دوست نے اس کے فوائد پر بہت زور دیا ''لاطینی زبان وکیلوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے قانون کی کتابوں کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے اور بیرسٹری کے امتحان میں رومی قانون کا پورا پرچہ لاطینی میں ہوتا ہے اس کے علاوہ لاطینی جاننے سے انگریزی زبان پر عبور ہو جاتا ہے'' یہ بات میرے دل میں کھب گئی اور میں نے طے کرلیا کہ لاطینی چاہے جتنی مشکل ہو میں اسے سیکھ کر رہوں گا فرانسیسی میں پہلے ہی شروع کر چکا تھا میں نے سوچا کہ جدید زبان میں سے اسی کو لوں میں میٹریکولیشن کے ایک پرائیویٹ کلاس میں شریک ہو گیا۔ امتحان سال میں دو بار ہوا کرتا تھا اور اب اگلے امتحان کو پانچ مہینے باقی تھے اتنے عرصہ میں تیاری کرلینا میرے لیے قریب قریب ناممکن امر تھا مگر انگریز جنٹلمین بننے کا شائق اب محنتی طالب علم بننے پر تیار ہوگیا میں نے ایک ایک منٹ کا نقشہ اوقات بنایا لیکن نہ تو میری ذہانت سے اور نہ میرے حافظے سے یہ توقع تھی کہ اتنے دن میں امتحان کے دوسرے مضامین کے ساتھ لاطینی اور فرانسیسی دونوں قابو میں آ

جائیں گی نتیجہ یہ ہوا کہ لاطینی میں فیل ہوگیا مجھے بہت افسوس ہوا مگر میں نے ہمت نہ ہاری مجھے لاطینی کا شوق پیدا ہوگیا تھا میں نے سوچا کہ دوسری بار کوشش کروں گا تو فرانسیسی اور اچھی ہو جائے گی اور اب کے میں سائنس کے حلقے میں بھی کوئی نیا مضمون لے لوں گا کیمیا جو میرا مضمون تھی بہت دلچسپ ہونا چاہیے تھا لیکن تجربات کا موقع نہ ملنے سے اس میں جی نہیں لگتا تھا یہ میرے ہندوستان کے امتحان میں لازمی مضامین میں سے تھا اس لیے میں نے ضدن میٹریکولیشن میں بھی اسی کو لے لیا تھا مگر اس بار میں نے بجائے کیمیا کے روشنی اور حرارت کا انتخاب کیا لوگ کہتے تھے کہ یہ مضمون آسان ہے اور مجھے بھی آسان معلوم ہوا۔

دوبارہ امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ میں نے شروع کی کہ اپنی زندگی اور سادہ بناؤں مجھے یہ احساس تھا کہ میری زندگی کا معیار ابھی تک میرے خاندان کی محدود آمدنی کی نسبت بہت اونچا ہے جب بھی اپنے بھائی کی مشکلوں کا خیال آتا تھا جو دریا دل سے میرے متواتر مالی اداد کے مطالبے پورے کرتے تھے تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا میں نے دیکھا کہ جو لوگ آٹھ پاؤنڈ سے لے کر پندرہ پاؤنڈ ماہوار تک خرچ کرتے تھے ان میں سے اکثر کو وظیفے کی امداد ملتی تھی میرے سامنے انتہائی سادگی کی مثالیں تھیں مجھے متعدد غریب طالب علم ملے جو مجھ سے زیادہ تنگی سے بسر کرتے تھے ان میں سے ایک بے چارہ غریبوں کے محلے میں دو شلنگ 21 ہفتہ وار کے کمرے میں رہتا تھا اور لوکھارٹ کی سستی کوکو کی دکان میں دن میں چند بار دو پنی 22 کی کوکو اور روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا میں اس کا مقابلہ تو کیا کرتا لیکن مجھے یہ خیال ہوا کہ میں یقیناً دو کمروں کے بجائے ایک کمرے سے کام چلا سکتا ہوں اور دو ایک وقت کا کھانا گھر پر پکا سکتا ہوں اس میں چار پانچ پاؤنڈ ماہوار بچ جائیں گے۔ میں نے سادہ

زندگی کے متعلق بعض کتابیں بھی پڑھیں میں نے یہ کمرے چھوڑ کر ایک کمرہ کرایہ پر لیا ایک گیس کا چولہا خریدا اور اپنا کھانا گھر پر پکانا شروع کیا اس میں مجھے بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے کیونکہ صرف جئی کا دلیہ پکاتا تھا اور کوکو بناتا۔ دوپہر کا کھانا میں باہر کھاتا تھا اور شام کو گھر آ کر روٹی اور کوکو پر گزر کرتا تھا اس طرح میرا روزانہ خرچ ایک شلنگ تین پنس رہ گیا۔ یہی زمانہ محنت کی پڑھائی کا بھی تھا سادہ زندگی کے سبب میرا بہت وقت بچتا تھا اور میں اپنے امتحان میں پاس ہو گیا۔

پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ اس طرح رہنے میں میری زندگی بے لطفی سے گزرتی تھی بلکہ اس کے برعکس اس تبدیلی کی بدولت میری بیرونی اور اندرونی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی اور یہ طریقہ خاندان کی آمدنی کے لحاظ سے بھی مناسب تھا میری زندگی زیادہ سچی بن گئی اور میری روحانی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

غذائیات کے تجربے

جب میں نے اپنے نفس کا گہرا احتساب کیا تو مجھے روز بروز اندرونی اور بیرونی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی اپنے طرز زندگی اور اخراجات میں تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ہی، بلکہ اس سے بھی پہلے میں نے اپنی غذا میں تبدیلی شروع کر دی میں نے دیکھا کہ جن لوگوں نے ''نباتاتی مشرب'' پر کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس مسئلے کی باریکیوں پر مذہبی، علمی، عملی اور طبی پہلو سے غور کیا ہے اخلاقی نقطہ نظر سے وہ اسی نتیجے پر پہنچتے تھے کہ اشرف المخلوقات ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جانوروں پر ہاتھ صاف کرے بلکہ اعلیٰ مخلوق کو ادنیٰ مخلوق کی حفاظت کرنا چاہیے اور ان دونوں میں ویسا ہی اتحاد عمل ہونا چاہیے جیسا کہ انسانوں میں آپس میں ہوتا ہے انہوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا تھا کہ انسان کی اصلی غرض کھانے سے زبان کا مزا نہیں بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہے اس لیے ان میں سے بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ نہ صرف گوشت سے بلکہ انڈے اور دودھ سے بھی پرہیز کرنا چاہیے اور وہ خود اس پر عمل کرتے تھے سائنس کے نقطہ نظر ان کا خیال تھا کہ انسان کی جسمانی ساخت ہی سے ظاہر ہے کہ اس کے لیے غذا کو پکا کر کھانا مناسب نہیں بلکہ اسے کچے پھل اور ترکاریوں پر گزر کرنا چاہیے۔ طبی نقطہ نظر سے ان کی رائے تھی کہ ہر قسم کے مسالے سے پرہیز کرنا چاہیے اقتصادی اور عملی دلیلوں سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ نباتاتی غذا میں سب سے کم خرچ ہے۔ مجھ پر ان سب باتوں کا اثر ہوا اور مجھے نباتاتی ریستوران میں ان سب قسموں کے نباتاتی ملا کرتے تھے انگلستان میں ایک نباتاتی

انجمن تھی جس کا ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا میں اس اخبار کا خریدار اور انجمن کا رکن ہو گیا اور تھوڑے ہی دن میں اس کی مجلس انتظامی میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں مجھے ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نباتاتی مشرب کے رکن رکین سمجھے جاتے تھے اور میں نے غذائیات پر تجربے شروع کر دیئے۔

میں نے مٹھائی اور مسالے دار چیزیں جو گھر سے آئیں تھیں، کھانا چھوڑ دیں طبیعت کا رنگ بدل جانے سے چٹپٹی چیزوں کا شوق رفتہ رفتہ کم ہو گیا اور اب مجھے بغیر مسالے کی ابلی ہوئی پالک میں جو رجمنڈ میں سیٹھی معلوم ہوتی تھی مزا آنے لگا اس قسم کے بہت سے تجربوں سے میں نے دیکھا کہ ذائقہ کا تعلق اصل میں زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔

ظاہر ہے کہ اقتصادی مصلحت بھی ہمیشہ میری پیش نظر رہتی تھی اس زمانے میں لوگ چائے اور قہوے کو مضر سمجھتے تھے اور کوکو کے موافق تھے اور چونکہ میرا یہ عقیدہ ہو گیا کہ اب انسان کو صرف وہی چیزیں کھانا چاہیے جو جسم کی قوت کو قائم رکھتی ہیں اس لیے میں نے چائے اور قہوے کی عادت چھوڑ دی اور ان کی جگہ کوکو استعمال کرنے لگا۔

جس ریستوان میں جایا کرتا تھا اس کے حصے تھے ایک میں خوشحال لوگ جایا کرتے تھے یہاں بہت سے کھانے تیار رہتے تھے جس میں سے کھانے والا اپنی پسند کی چیزیں چن لیتا تھا اور ان کی قیمت دے دیتا تھا اس طرح ہر ایک کھانے کی قیمت ایک شلنگ سے دو شلنگ تک ہوتی تھی دوسرے حصے میں تین قسم کے کھانے اور ایک روٹی کا ٹکڑا ملتا تھا انتہائی کفایت شعاری کے زمانے میں میں اسی حصے میں کھانا کھایا کرتا تھا۔

اس بڑے تجربے کے ساتھ ساتھ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے تجربے بھی کر

رہا تھا۔ مثلاً کچھ دن نشاشتے دار چیزیں چھوڑ دی جائیں کچھ دن محض روٹی اور پھل دار چیزیں چھوڑ دیں، کچھ دن محض روٹی اور پھل پر گزارا کیا کچھ دن پنیر، دودھ اور انڈوں پر یہ آخری تجربہ قابل ذکر ہے وہ یہ دو ہفتہ سے بھی کم چلا جس مصلح نے بے نشاستے کی غذا پر زور دیا تھا اس نے انڈے کی بڑی تعریف کی تھی اور اس کی رائے تھی کہ انڈا گوشت میں داخل نہیں بقول اس کے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انڈا کھانے میں کسی زندہ مخلوق کو نقصان نہیں پہنچتا میں اس دلیل سے میں آگیا اور باوجود اس کے گوشت سے پرہیز کرنے کا عہد کر چکا تھا میں نے انڈے کھا لیے لیکن یہ لغزش عارضی تھی مجھے اس عہد کی تاویل کرنے کا کوئی حق نہ تھا مجھے اسی کے وہی معنی سمجھنا چاہتے تھے جو عہد لیتے وقت میری والدہ کے ذہن میں تھے میں جانتا تھا کہ ان کے نزدیک انڈے بھی گوشت میں شامل ہیں جیسے جیسے اس عہد کا صحیح مفہوم میری سمجھ میں آیا میں نے انڈے چھوڑ دیے اور اس تجربے سے بھی ہاتھ دھویا۔

اس دلیل میں ایک باریکی ہے جو غور کے قابل ہے میں نے انگلستان میں گوشت کی تعریفیں سنیں پہلی کی رو سے گوشت سے مراد محض پرندوں اور چوپایوں کا گوشت ہے، جو نباتاتی اس تعریف کے قائل تھے وہ پرندوں اور چوپاؤں کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے مگر مچھلی اور انڈا کھاتے تھے دوسری تعریف کی رو سے گوشت کے مفہوم میں ہر جانور کا گوشت آجاتا ہے اس لیے مچھلی کھانا ناجاءہے مگر انڈا جائز ہے تیسری تعریف کے مطابق گوشت میں سب جانوروں کا گوشت اور جو چیزیں ان سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً انڈا اور دودھ سب داخل ہیں اگر میں پہلی تعریف کو قبول کر لیتا تو میں نہ صرف انڈا بلکہ مچھلی بھی کھا سکتا تھا لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسی تعریف کا پابند ہوں جس کی قائل میری والدہ ہیں اس لیے اگر میں اپنے

عہد پر قائم رہنا چاہوں تو مجھے دونوں چیزیں چھوڑ دینا چاہیں چنانچہ میں نے یہی کیا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ نباتاتی ریستوران میں بھی بہت سے کھانوں میں بھی انڈا پڑتا ہے مثلاً بہت سی قسم کی پڈنگ اور کیک میں اس کے معنی یہ تھے کہ اگر مجھے خود نہ معلوم ہو تو پوچھنا پڑتا تھا کہ فلاں چیز میں انڈا ہے یا نہیں اور یہ بہت برا معلوم ہوتا تھا مجھے اپنے فرض کے احساس سے یہ دقت تو ضرور ہوتی مگر میرے کھانے کا مسئلہ اور بھی سہل ہو گیا البتہ بہت چیزیں جن کا مجھے شوق ہو گیا تھا، بادل ناخواستہ چھوڑنا پڑیں۔ یہ دقتیں عارضی تھیں کیونکہ اپنے عہد کی سختی سے پابندی کرنے سے مجھے ظاہری مزے کے بدلے باطنی روحانی مزا ملا جو صریحی طور پر زیادہ صحت بخش، زیادہ لطیف اور زیادہ پائیدار تھا۔

اصلی امتحان ابھی باقی تھا۔ یہ دوسرے عہد کے متعلق تھا لیکن جسے خدا بچانا چاہے کس کی مجال ہے کہ اسے گرا سکے۔

یہاں چند کلمے عہد و پیان کی تاویل کے متعلق کہنا بیجا نہ ہوگا عہدوں کی تاویل سے ساری دنیا میں سینکڑوں جھگڑے پیدا ہوئے ہیں چاہے جتنا ہی صاف عہد ہو لوگ اسے توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا بنا لیتے ہیں ایسے لوگ امیروں سے لے کر غریبوں تک اور راجا سے لے کر پرجا تک سماج کے ہر طبقے میں موجود ہیں خودغرضی انہیں اندھا کر دیتی ہے مبہم لفظوں سے غلط منطقی نتیجے نکال کر وہ اپنے آپ کو، دنیا کو اور خدا کو دھوکا دیتے ہیں ایک زریں اصول یہ ہے کہ وہی معنی سمجھے جائیں جو عہد لینے والا ایمانداری سے سمجھتا ہے دوسرا یہ کہ جب ایک عہد کے دو مفہوم ہوں تو اسے ترجیح دی جائے جو کمزور فریق کے نزدیک صحیح ہو ان اصولوں پر عمل کرنے سے فساد اور بے انصافی پیدا ہوتی ہے جس کی جڑ جھوٹ ہے وہ شخص جو صرف حق کا طالب ہے،

آسانی سے زریں اصول پر عمل کر سکتا ہے اسے تاویل کے لیے عالموں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں زریں اصول کے مطابق گوشت کے جو معنی میری والدہ سمجھتی تھیں صرف وہی میرے لیے سچے معنی ہو سکتے تھے نہ کہ وہ مفہوم جو میرے وسیع تر تجربے یا بہتر علم کے غرور نے مجھے سکھایا تھا۔ انگلستان میں جو تجربے میں نے کیے وہ کفایت شعاری اور حفظان صحت کے نقطہ نظر سے کیے اس مسئلے کے مذہبی پہلو پر میں نے اس وقت غور کیا جب میں جنوبی افریقہ گیا وہاں میں نے بڑی جفاکشی سے تجربے کیے جن کا ذکر آگے آئے گا مگر ان سب کی بنیاد انگلستان ہی میں پڑ گئی تھی۔

جو آدمی کوئی مذہب نیا نیا اختیار کرتا ہے اس میں اس شخص سے زیادہ جوش ہوتا ہے جس کا وہ آبائی مذہب ہے نباتاتی مشرب انگلستان والوں کے لیے ایک نیا عقیدہ تھا اور میرے لیے بھی کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ میں پہلے گوشت کھانے کا سخت سے قائل تھا اور نباتاتی مشرب ذہنی عقیدے کی حیثیت سے میں نے بعد میں اختیار کیا نئے عقیدت کے جوش میں میں نے لندن کے اس حصے میں جس میں رہتا تھا ایک نباتاتی کلب قائم کرنے کا ارادہ کیا سر ایڈون ارنلڈ کو جو وہیں رہتے تھے میں نے صدر بنایا اور رسالہ ''نباتاتی'' کے ایڈیٹر اولڈ فیلڈ کو نائب صدر میں خود اس کا ممبر بنا کلب کچھ دن چمکتا رہا مگر چند مہینے کے بعد بند ہو گیا کیونکہ میں اپنی تبدیلی مقام کی عادت کے مطابق اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ مگر اس مختصر اور محدود تجربے سے مجھے انجمنیں قائم کرنے اور چلانے کا تھوڑا بہت سلیقہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حجاب میری سپر بن گئی

میں نباتاتی انجمن کی مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب ہوا اور پابندی سے اس کے ہر جلسے میں شریک ہونے لگا۔ مگر ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا تھا ایک بار ڈاکٹر اولڈفیلڈ نے مجھ سے کہا ''تم مجھ سے تو خوب باتیں کرتے ہو مگر یہ کیا بات ہے کہ تم کمیٹی کے جلسے میں کبھی زبان نہیں کھولتے؟ نکھٹو کی طرح بیٹھے رہتے ہو'' میں اس پھبتی کو سمجھ گیا شہد کی مکھیاں ہمیشہ کام میں لگی رہتی ہیں مگر زپوراحدی ہوتا ہے اور واقعی یہ تعجب کی بات نہ تھی کہ میرا جی بولنے کو چاہتا ہو لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے خیالات کیونکر ظاہر کروں مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اور سب ارکان کی معلومات مجھ سے زیادہ ہے پھر اکثر یہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی میں نے ہمت کر کے بولنا چاہا کوئی نئی بات چھڑ جاتی تھی یہ صورت عرصہ تک رہی۔

اس اثناء میں ایک بہت اہم مسئلہ بحث کے لیے پیش ہوا میں نے غیر حاضر رہنا فرض شناسی کے خلاف سمجھا اور چپ چاپ رائے دے دینا بزدلی معلوم ہوئی حسب ذیل واقعے سے بحث چھڑی تھی انجمن کے صدر ہلس صاحب تھے جو ٹیمز ارن ورکس 24کے مالک تھے یہ پیورٹین 25مذہب رکھتے تھے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انجمن کا وجود ان کی مالی امداد پر منحصر تھا کمیٹی کے اکثر ممبران کے اور دبے تھے ڈاکٹر ایلنس بھی جن کی نباتاتی حلقوں میں بہت شہرت ہے مجلس انتظامیہ کے رکن تھے یہ انضباط ولادت کی تحریک کے جو اس زمانے میں نئی نئی چلی تھی، حامی تھے اور مزدوروں میں اس کے طریقوں کی تلقین کرتے تھے ہلس صاحب کا خیال تھا کہ ان طریقوں سے

اخلاق کی جڑ کٹ جائے گی ان کے نزدیک نباتاتی انجمن کا مقصد محض غذا کی اصلاح نہیں تھا بلکہ اخلاقی اصلاح بھی اور ڈاکٹر ایلنس جیسے شخص کو جو پیورٹین عقیدے کا مخالف تھا اس انجمن کا رکن رہنے دینا نامناسب تھا اس لیے ان کے اخراج کی تحریک پیش ہوئی۔

مجھے اس مسئلے میں گہری دلچسپی تھی میں ڈاکٹر ایلنس جیسے انضباط ولادت کے طریقوں کو خطرناک سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ ہلس صاحب کو یہ حیثیت پورٹین کے ان مخالفت کرنے کا حق ہے یوں بھی میں ہلس صاحب کی فیاضی کی بہت قدر کرتا تھا لیکن میرے نزدیک یہ بے انصافی تھی کہ کوئی شخص ایک نباتاتی انجمن سے محض اس بناء پر خارج کر دیا جائے کہ وہ پیورٹن اخلاق کو انجمن کے مقاصد میں سے نہیں سمجھتا۔ یہ ہلس صاحب کی ذاتی رائے تھی کہ پورٹین مذہب کے مخالف انجمن سے خارج کر دیئے جائیں اسے انجمن کے علانیہ مقصد سے کوئی تعلق نہ تھا اس کا مقصد تو محض نباتاتی مشرب کو فروغ دینا تھا نہ کہ کسی خاص نظام اخلاق کی حمایت کرنا۔ اس لیے میری رائے تھی کہ ہر شخص جو اس کا قائل ہے کہ سوائے نباتاتی غذا کے کچھ نہیں کھانا چاہیے اس انجمن کا رکن ہوسکتا ہے اس سے کبھی بحث نہیں کہ اور اخلاقی مسائل میں اس کا کیا عقیدہ ہے کمیٹی میں اور لوگ بھی میرے ہمراہ تھے لیکن میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں خود اپنے خیالات کا اظہار کروں اب سوال یہ تھا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے تقریر کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اس لیے میں نے طے کیا کہ اپنے خیالات قلمبند کرلوں جب میں جلسے میں گیا تو یہ کاغذ میری جیب میں تھا جہاں تک مجھے یاد ہے مجھ سے یہ نہ بن پڑا کہ اسے پڑھ کر سنا دوں۔ بلکہ صدر نے کسی اور سے پڑھوایا۔ ڈاکٹر ایلنس ہار گئے۔ یہ میری اداس قسم کی پہلی جنگ تھی اور

اس میں ہارنے والے فریق کے ساتھ تھا لیکن مجھے اس خیال سے تسکین تھی کہ ہم حق بجانب ہیں مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ اس کے بعد میں نے مجلس انتظامیہ سے استعفیٰ دے دیا جب تک میں انگلستان رہا اگر میں کسی سے ملنے بھی جاتا تھا وہاں پانچ چھ آدمی موجود ہوتے تھے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔

ایک بار میں مضموندار جی کے ساتھ ونیٹز گیا یہاں ہم ایک نباتاتی مشرب خاندان کے ساتھ ٹھہرے ''اخلاقیات غذا'' کے مصنف ڈاکٹر باورڈ بھی اسی صحت گاہ میں مقیم تھے، ہم ان سے ملے اور انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ ایک جلسے میں نباتاتی مشرب کی تلقین کے لیے تقریریں کریں میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ تقریر لکھ کر پڑھ دینا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا بہت سے لوگ اپنے خیالات اختصار اور تسلسل کے ساتھ ادا کرنے کے لیے ایسا کرتے تھے زبانی تقریر کرنا میرے لیے ناممکن تھا اس لیے میں نے اپنی تقریر قلمبند کر لی تھی میں یہ پڑھنے کھڑا ہوا مگر مجھ سے نہیں پڑھی گئی میری آنکھوں پہ اندھیرا چھا گیا اور میں سارے بدن سے کانپنے لگا حالانکہ تقریر فلسکیپ کے ایک صفحہ سے زیادہ نہ تھی آخر میری طرف سے مضموندار جی کو پڑھنا پڑھی۔ خود ان کی تقریر بہت اچھی تھی اور لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی مجھے اپنی نالائقی پر شرم آئی اور رنج ہوا۔

انگلستان میں مجمع میں تقریر کرنے کی آخری کوشش میں نے اپنی روانگی سے ایک دن پہلے کی۔ مگر اس بار بھی میں نے اپنا مضحکہ کرایا۔ میں نے ہوبرن ریستوران میں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اپنے نباتاتی دوستوں کی دعوت کی۔ میں نے دل میں سوچا کہ نباتاتی ریستوران میں تو نباتاتی دعوت ہوا ہی کرتی ہے کیا وجہ ہے کہ غیر نباتاتی ریستوران میں ایسی دعوت نہ ہو اور میں نے ہوبرن ریستوران کے مینجر سے

مل کر یہ طے کیا کہ ایسا کھانا پکے جس میں کوئی غیر نباتاتی چیز مطلق نہ ہو۔ نباتات مشرب والوں نے بڑی خوشی سے اس تجربے کا خیر مقدم کیا دعوتیں ہمیشہ صحبت کے لیے ہوتی ہیں لیکن مغرب نے انہیں اتنی ترقی دی ہے کہ ایک مستقل فن بنا لیا ہے وہاں دعوت میں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے باجہ بجتا ہے، تقریریں کی جاتی ہیں میری چھوٹی سی دعوت بھی اس طمطراق سے خالی نہ تھی اس لیے تقریروں کا ہونا ضروری تھا جب میری باری آئی تو میں بھی تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ میں نے بڑے اہتمام سے ایک تقریر سوچی تھی جس میں چند جملوں سے زیادہ نہ تھے لیکن میں ایک جملے سے آگے نہ بڑھ سکا میں نے ایڈیسن کا قصہ پڑھا تھا کہ جب وہ پہلی بار دارالعلوم میں تقریر کرنے لگا تو اس نے تین بار کہا ''مجھے امید ہے'' مگر اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا اس پر ظریف نے اٹھ کر کہا ''حضرت کو امید 26 تین بار رہی مگر ہوا ہوایا کچھ نہیں'' میرا ارادہ تھا کہ اسی قصے سے ابتدا کر کے ایک ظریفانہ تقریر کروں ابتدا تو میں نے کر دی مگر ایک جملہ کہہ کر اٹک گیا میرے حافظے نے بالکل کام نہ دیا اور ظریفانہ تقریر کرنے کی کوشش میں خود آماجگاہ ظرافت بن گیا۔ میں نے سلسلہ کو چھوڑ کر کہا ''میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری دعوت قبول کی'' اور بیٹھ گیا۔

جنوبی افریقہ پہنچ کر میرا حجاب کچھ کم ہوا مگر رفع نہیں ہوا فی البدیہہ تقریر کرنا میرے لیے ناممکن تھا جب کبھی اجنبی مجمع کا سامنا ہوتا تو میں جھجکتا اور جہاں تک ہو سکتا تقریر کرنے سے پہلو بچاتا۔ آج بھی نہ مجھ سے یہ ممکن ہے اور نہ میں چاہتا ہوں کہ دوستوں کے مجمع کو فضول باتوں میں الجھائے رکھوں۔

مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس خلقی حجاب سے، سوائے اس کے کہ کبھی کبھی میرا مضحکہ اڑایا گیا مجھے اور کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ چیز میرے

لیے بڑی مفید ثابت ہوئی رک رک کر تقریر کرنے سے مجھے ایک زمانے میں تکلیف ہوتی تھی مگر اب خوشی ہوتی ہے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے مجھے لفظوں کی کفایت شعاری سکھائی میں نے خیالات کو قابو میں رکھنے کی عادت ڈالی اور اب میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زبان سے یا میرے قلم سے کوئی لفظ بے سوچے سمجھے نہیں نکلتا مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے اپنی تحریر یا تقریر میں کوئی لفظ ایسا استعمال کیا ہو جس پر بعد میں پشیمانی ہوئی ہو۔ اس طرح میں خدا جانے کتنی مصیبت سے اور تضیع اوقات سے محفوظ رہا تجربے نے مجھے سکھایا ہے کہ خاموشی طالب حق کی روحانی تربیت کا جز ہے انسان کی یہ قدرتی کمزوری ہے کہ وہ جان بوجھ کر یا انجان پن میں سچی بات کو گھٹا بڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس پر قابو پانے کے لیے خاموشی ضروری ہے کم سخن آدمی عموماً بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولتا ایک ایک لفظ کو تولتا ہے بہت سے لوگوں کو بات کرنے کی بے صبری ہوتی ہے ہر جلسے میں لوگ تقریر کی اجازت کے لیے پرچے لکھ لکھ کر صدر کے ناک میں دم کر دیتے ہیں اور جب اجازت ملتی ہے تو عموماً لوگ مقررہ وقت سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور وقت مانگتے ہیں اور پھر بغیر اجازت کے تقریر کرتے رہتے ہیں آخر اس قدر باتیں کرنے سے دنیا کو کیسا فائدہ پہنچتا ہے؟ تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا میرا حجاب دراصل میرا زرہ بکتر ہے اس کے سبب سے مجھے روحانی ترقی کا موقع ملا۔ اس نے مجھے حق و باطل میں تمیز کرنا سکھایا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جھوٹ کا ناسور

چالیس سال پہلے انگلستان میں ہندوستانی طالب علم آج کل کے مقابلے میں بہت کم تھے ان لوگوں کا دستور تھا کہ چاہے بیاہے بھی ہوں مگر کنوارے بنتے تھے انگلستان میں سکول اور کالج کے طالب علم سب کنوارے ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کے نزدیک طالب علمی اور شادی کی زندگی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔ ہمارے یہاں بھی پرانے زمانے میں یہی رواج تھا ان دونوں طالب علم برہمچاری کہلاتے تھے مگر آج کل بچپن میں شادی ہو جاتی ہے جو انگلستان میں ان سنی بات ہے اس لیے وہاں ہندوستانی طالب علموں کو یہ کہتے شرم آتی تھی کہ ہماری شادی ہو گئی ہے اس سخن سازی کا ایک اور بھی سبب تھا وہ جانتے تھے کہ اگر اصلی حال معلوم ہو گیا تو جس خاندان میں وہ رہتے ہیں اس کی لڑکیوں کے ساتھ سیر کرنے یا ان سے عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ چھیڑ چھاڑ کم و بیش پاکبازانہ ہوتی تھی خود والدین اس معاملے میں شہ دیتے تھے ممکن ہے کہ نوجوان مرد و عورت کا اس طرح ملنا اس ملک میں ضروری ہو کیونکہ وہاں ہر نوجوان کو اپنے رفیق کا انتخاب خود کرنا پڑتا ہے لیکن اگر ہندوستانی نوجوان انگلستان جا کر یہ تعلقات قائم کرتے ہیں جو وہاں کے نوجوان کے لیے بالکل قدرتی ہیں تو نتیجہ عموماً مہلک ہوتا ہے جس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے نوجوانوں کا قدم ترغیب سے ڈگمگا جاتا ہے اور وہ جھوٹ کی زندگی بسر کرتے ہیں اس میل جول کی خاطر جو انگریز نوجوانوں کے لیے کتنا ہی معصومانہ کیوں نہ ہو مگر ان کے لیے اچھا نہیں مجھے بھی یہ روگ لگ گیا میں

بے تکلف اپنے آپ کو کنوارا کہتا تھا۔ حالانکہ میں بیاہا اور ایک بچے کے باپ تھا لیکن اس بناوٹ میں میرا بھلا نہ ہوا۔ محض میری دیر آشنائی اور کم سخنی نے مجھے بچایا ورنہ میں قعر گناہ میں گر جاتا۔ جب میں بات ہی نہیں کرتا تھا تو کوئی لڑکی مجھ سے کیوں بولتی یا میرے ساتھ جانے پر کیوں راضی ہوتی۔

میری بزدلی بھی میری دیر آشنائی سے کم نہ تھی جن لوگوں کے یہاں میں وینیز میں ٹھہرا تھا اس قسم کے خاندانوں میں قاعدہ تھا کہ مالکہ مکان کی لڑکی مہمانوں کو لے کر ٹہلنے جایا کرتی تھی میری میزبان کی لڑکی ایک دن مجھے ان خوبصورت پہاڑیوں پر لے گئی جو وینیز کے گرد واقع ہیں میں خاصا تیز چلتا تھا لیکن میری رفیق مجھ سے بھی تیز رفتار تھی وہ مجھے کھینچے لیے جاتی تھی اور اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی میں اس کی باتوں پر کبھی کبھی آہستہ سے ''ہوں ہوں'' کہہ دیتا تھا یا زیادہ سے زیادہ ''ہاں سچ مچ کیسی خوبصورت جگہ ہے'' وہ پرندے کی طرح اڑی چلی جاتی تھی اور میں اس فکر میں تھا کہ لوٹ کر گھر کب پہنچیں گے اس طرح ہم ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے اب یہ سوال تھا کہ نیچے کیسے اتریں یہ پچیس برس کی پھرتیلی لڑکی، اگرچہ اس کے بوٹ اونچی ایڑی کے تھے تیر کی طرح زن سے نیچے پہنچ گئی میں جھینپتا ہوا ٹھوکریں کھاتا ہوا آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ وہ پہاڑی کے دامن میں کھڑی مسکرا رہی تھی میری ہمت بڑھا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ کہو تو میں تمہیں ہاتھ پکڑ کر اتار لاؤں بھلا میں ایسی بزدلی بھی کیا کرتا، یہ ہزار وقت زمین پر بیٹھ بیٹھ کر میں کسی لیے نیچے اترا وہ زور سے ہنسی اور ''شاباش''، ''شاباش'' پکارنے لگی غرض اس نے مجھے اور بھی شرمندہ کیا اور یہ اس کا حق بھی تھا۔

لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میں بالکل صاف بچ جاتا کیونکہ خدا کو تو یہ منظور تھا کہ مجھے

جھوٹ کے ناسور سے نجات دے میں ایک بار برائٹن گیا جو وینٹز کی طرح ایک صحت گاہ ہے۔ یہ وینٹز جانے سے پہلے کا ذکر ہے۔ وہاں ہوٹل میں ایک متوسط الحال بوڑھی بیوہ سے ملاقات ہوئی یہ انگلستان میں میرا پہلا سال تھا طعال نامے پر جتنے کھانوں کے نام تھے سب فرانسیسی میں تھے جو میں اس وقت تک نہیں سمجھتا تھا۔ جس میز پر میں تھا اسی پر یہ بوڑھی خاتون بھی تھیں۔ یہ دیکھ کر کہ میں اجنبی ہوں اور اس وقت پریشانی میں ہوں انہوں نے فوراً میری مدد کی انہوں نے کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں اجنبی ہو اور اس وقت کسی دقت میں مبتلا ہو تم نے اب تک کھانے کے لیے کوئی چیز کیوں نہیں منگوائی؟'' میں طعام نامے کے ہجے کر رہا تھا اور ویٹر کو بلا کر پوچھنے والا تھا کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں کہ اتنے میں ان نیک خاتون نے مداخلت کی میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ میں فرانسیسی نہیں جانتا اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا ان میں نے کون کون سے کھانے نباتاتی ہیں۔

انہوں نے کہا'' آئیے میں آپ کی مدد کروں میں طعام نامہ آپ کو سمجھا دوں گی اور یہ بتا دوں گی کہ آپ کیا کیا چیزیں کھا سکتے ہیں'' میں نے احسان مندی سے ان کی مدد قبول کی اس طرح میری ان کی ملاقات کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر دوستی بن گئی یہ دوستی میرے قیام انگلستان کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد بہت دنوں تک قائم رہی۔ انہوں نے مجھے اپنا لندن کا پتہ دیا اور دعوت دی کہ ہر اتوار کو میرے یہاں کھانا کھایا کرو اس کے علاوہ خاص خاص تقریبوں میں وہ مجھے بلایا کرتی تھیں میرے حجاب کو رفع کرنے کی کوشش کرتی تھیں مجھے نوجوان خواتین سے ملاتی تھیں اور گفتگو اس طرح چھیڑتی تھیں کہ مجھے ان سے باتیں کرنا پڑتیں اس گفتگو میں خاص طور پر وہ ایک نوجوان خاتون کو شریک کرتی تھیں جو ان کے گھر میں رہتی تھیں اور اکثر ہم

دونوں کو بالکل تنہا چھوڑ دیتی تھیں۔

شروع شروع میں میں ان باتوں سے بہت گھبراتا تھا نہ میں گفتگو شروع کر سکتا تھا اور نہ مجھے مذاق کرنا آتا تھا۔ مگر انہوں نے میری رہنمائی کی اور میں رفتہ رفتہ آداب مجلس سیکھنے لگا کچھ دنوں کے بعد مجھے سنیچر کا انتظار رہنے لگا۔ اس نو جوان دوست سے گفتگو میں مزا آنے لگا۔

یہ بوڑھی خاتون اسی طرح میرے آس پاس جال بچھاتی رہی انہیں ہم دونوں کے ملنے سے دلچسپی تھی شاید اس میں ان کا بھی کوئی مقصد تھا۔

میں عجب شش و پنج میں تھا میں نے اپنے دل میں کہا کاش میں اس نیک خاتون سے یہ کہہ دیتا کہ میری شادی ہوگئی ہے تب ہم دونوں کی نسبت کا منصوبہ نہ باندھتیں خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اگر میں سچا حال بیان کر دوں تو ممکن ہے کہ آئندہ اس مصیبت سے بچ جاؤں" یہ باتیں سوچ کر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس کا مضمون قریب قریب یہ تھا۔"

جب سے میری آپ کی ملاقات برائٹن میں ہوئی آپ مجھ پر بہت مہربان رہی ہیں آپ نے اس طرح میری خبر گیری کی جیسے ماں بیٹے کی کرتی ہے آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ میں شادی کرلوں اور اس غرض سے آپ نے مجھے نوجوان خاتون سے ملایا مجھے یہ گوارا نہیں کہ بات اس سے آگے بڑھے۔ اس سے تو میں یہ اچھا سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے اعتراف کرلوں کہ میں آپ کی محبت کے قابل نہیں جب میں نے آپ کے یہاں آمد و رفت شروع کی مجھے اسی وقت آپ سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ میری شادی ہو چکی ہے مجھے معلوم تھا کہ انگلستان میں جو ہندوستانی طالب علم ہیں وہ اپنی شادی کو چھپاتے ہیں اور میں نے بھی ان کی تقلید کی اب میں محسوس کرتا

ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے تھا کہ میری شادی بچپن میں ہوگئی تھی اور اب میں ایک لڑکے کا باپ ہوں مگر مجھے خوشی ہے کہ اب خدا نے مجھے سچ بولنے کی ہمت عطا فرمائی ہے کیا آپ میرا قصور معاف کر دیں گی؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اس نوجوان خاتون سے جن سے آپ نے مجھے ملایا تھا ایسی بے تکلفی نہیں برتی جو نامناسب ہو میں جانتا تھا کہ دوستی کی حد کہاں تک ہے آپ کو میری شادی کا حال تو معلوم نہیں تھا اس لیے قدرتی طور پر آپ کی خواہش تھی کہ ان کی نسبت مجھ سے ہو جائے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو سچے واقعات سے مطلع کر دوں تا کہ بات اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

''اگر یہ خط پہنچنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں کہ میں آپ کی مہمان نوازی کا مستحق نہیں ہوں تو یقین مانیے مجھے ناگوار نہ ہوگا آپ نے اپنی مہربانی اور شفقت سے مجھے ہمیشہ کے لیے زیر بار احسان کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ نے مجھے اپنے یہاں نہ نکالیں اور بدستور مہمانی کے قابل سمجھیں جس کا مستحق بننے کی میں انتہائی کوشش کروں گا تو ظاہر ہے کہ مجھے بے حد مسرت ہوگی اور میں اسے آپ کی لطف وکرم کی مزید علامت سمجھوں گا۔''

قارئین کو سمجھ لینا چاہیے کہ میرے لیے ایسا خط لکھنا تھوڑی دیر کا کام نہ تھا میں نے خدا جانے کتنی بار مسودہ بنا بنا کر بدلا ہوگا اسے بھیجنے کے بعد میرے دل پر سے وہ بوجھ ہٹ گیا جس سے وہ دبا جاتا تھا تقریباً واپسی ڈاک ان کا جواب آیا جس کا مضمون کم وبیش یہ تھا:

''آپ کا خط آیا جس میں آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے ہم دونوں کو خوشی ہوئی اور ہم خوب دل کھول کر ہنسے۔ جس غلط بیانی کے ارتکاب کا آپ کو

اعتراف ہے وہ معافی کے قابل ہے مگر یہ اچھا ہوا کہ آپ نے ہمیں اصلی صورت حال بتادی ۔میری دعوت بدستور قائم ہے امید ہے کہ آپ اگلے اتوار کوضرور آئیں گے ہمیں اشتیاق ہے کہ آپ کی بچپن کی شادی کے سارے واقعات سنیں اور آپ کا مضحکہ اڑائیں کیا اب بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے ہماری دوستی میں اس واقعے سے کوئی فرق نہیں آیا؟''

اس طرح میں نے جھوٹ کے ناسور سے نجات پائی اس کے بعد جب کبھی ضرورت ہوئی میں نے بے تامل لوگوں سے اپنی شادی کا ذکر کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

All rights reserved. ©2002-2006

مختلف مذہبوں کا مطالعہ

میرے قیام انگلستان کے دوسرے سال کے آخر میں دو تھیوسوفول سے میری ملاقات ہوئی یہ دو بھائی تھے اور دونوں کنوارے انہوں نے مجھ سے ''بھگوت گیتا'' کا ذکر کیا وہ سر ایڈون ارنلڈ کا ترجمہ ''نغمہ آسمانی'' پڑھ رہے تھے اور انہوں نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ اصل کتاب ان کے ساتھ مل کر پڑھوں مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کیونکہ میں نے یہ مقدس کتاب نہ سنسکرت میں دیکھی تھی نہ گجراتی۔ میں مجھے ان سے یہ کہنا پڑا کہ میں نے ''گیتا'' ابھی تک نہیں پڑھی مگر میں بڑی خوشی سے آپ کے ساتھ اس کا مطالعہ کروں گا اور اگرچہ میں سنسکرت بہت کم جانتا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ اصل کتاب کو اس حد تک سمجھ لوں گا کہ ترجمے کی مصنوعی غلطیوں کو پہچان لوں۔ غرض میں ان کے ساتھ گیتا کی تلاوت کرنے لگا اور جب دوسرے باب کے یہ اشلوک پڑھے:

جہاں کسی نے محسوس چیزوں کی طرف توجہ کی
اس کے دل کو ان سے ایک لگاؤ سا ہو جاتا ہے
یہ رفتہ خواہش بن جاتا ہے

خواہش بڑھتے بڑھتے لگن بن جاتی ہے اور آدمی کو اندھا کر دیتی ہے حافظہ ہراس ہو کر اونچے مقصد سے ہاتھ دھو لیتا ہے اور دل میں زہر پھیلا دیتا ہے۔

یہاں تک کہ انسان کا دل اس کا مقصد اور خود انسان ہلاک ہو جاتا ہے تو میرے دل پر بہت اثر ہوا اور یہ آج تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں مجھے اس کتاب کی

انتہائی قدر و قیمت اور عظمت کا احساس ہوا اور اس دن سے برابر یہ احساس بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اب میرے نزدیک حق کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں اس نے مایوسی اور افسردگی کی گھڑیوں میں میری بڑی مدد کی ہے میں نے قریب قریب سب انگریزی ترجمے پڑھے ہیں اور ان میں میرے خیال میں سر ایڈون ارنلڈ کا ترجمہ بہترین ہے انہوں نے متن کی پوری پابندی کی ہے اور پھر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے اگرچہ میں نے ان دوستوں کے ساتھ ''گیتا'' پڑھی لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس دفعہ اس کا مطالعہ جیسا چاہیے کیا البتہ چند سال کے بعد میں نے اس کی مزاولت شروع کی۔

ان بھائیوں نے مجھے سر ایڈون ارنلڈ کی ''نور ایشیا'' پڑھنے کی بھی ہدایت کی۔ میں آرنلڈ صاحب کو اب تک محض ''گیتا'' کے مترجم کے حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کی ''نور ایشیا'' مجھے ''گیتا'' سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوئی جب میں نے اسے شروع کیا تو ختم کیے نہ چھوڑ سکا۔ یہ دونوں بھائی مجھے بلاواٹسکی لاج میں بھی لے گئے اور میڈم بلاواٹسکی اور میسز بیسنٹ سے میرا تعارف کرایا مسز بیسنٹ حال ہی میں تھیوسوفی انجمن میں داخل ہوئی تھیں اور ان کے تبدیلی عقائد کے متعلق جو نزاع ہو رہی تھی اس کا میں بہت دلچسپی سے مطالعہ کرتا تھا ان دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تھیوسوفی انجمن میں شریک ہو جاؤں لیکن میں نے بہ طریق مناسب انکار کر دیا اور کہا ''مجھے اپنے مذہب سے بہت کم واقفیت ہے اس لیے میں کسی مذہبی انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتا'' مجھے یاد ہے کہ میں نے ان دونوں بھائیوں کے کہنے سے میڈم بلاواٹسکی کی کتب ''تھیوسوفی کی کنجی'' بھی پڑھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے ہندو مذہب کی کتابیں پڑھنے کا اور بھی شوق ہو گیا اور میرے دل سے وہ غلط خیال

نکل گیا جو مشنریوں نے جمار کھا تھا کہ ہندو مذہب میں ضعیف الاعتقادی بھری پڑی ہے۔

اسی زمانے میں ایک نباتاتی بورڈنگ ہاؤس میں مجھے مانچسٹر کے ایک نیک عیسائی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے مجھ سے عیسائیت کے متعلق گفتگو کی میں نے ان سے راجکوٹ کے واقعات کا جو مجھے یاد تھے، ذکر کیا انہیں یہ سن کر تکلیف ہوئی انہوں نے کہا ''میں گوشت نہیں کھاتا ہوں اور شراب بھی نہیں پیتا یہ سچ ہے کہ بہت سے عیسائی گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں لیکن کتاب مقدس میں ان دونوں چیزوں کا حکم نہیں دیا گیا۔ مہربانی کر کے آپ بائبل ضرور پڑھیے'' میں نے ان کا مشورہ قبول کرلیا اور انہوں نے مجھے کتاب کا ایک نسخہ لادیا مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ وہ خود بائبل فروخت کرتے تھے اور میں نے ان سے ایک نسخہ خریدا تھا۔ جس میں مقالات کے نقشے انڈیکس اور دوسری چیزیں تھیں جن سے پڑھنے والے کو مدد ملے۔ میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا لیکن توریت کسی طرح مجھ سے آخر تک نہیں پڑھی جاتی تھی میں نے کتاب تخلیق پڑھ ڈالی لیکن اس کے بعد کے حصے پڑھتے پڑھتے نیند آجاتی تھی مگر صرف یہ کہنے کے لیے کہ میں نے کتاب ختم کر لی ہے۔ دوسرے حصے بھی بہ ہزار دشواری دیکھے مگر مطلق دلچسپی نہ ہوئی اور نہ کچھ سمجھ میں آیا ''کتاب اعداد'' کو پڑھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔

لیکن انجیل کا مجھ پر کچھ اور ہی اثر ہوا خصوصاً ''پہاڑی کا وعظ'' تو بالکل دل میں بیٹھ گیا میں نے اس کا مقابلہ ''گیتا'' سے کیا ان آیتوں کو پڑھ کر ''مگر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بدی میں مزاحم نہ ہو بلکہ جو تیرے سیدھے گال پر طمانچہ مارے اس کی طرف دوسرا گال بھی پھیر دے اگر کوئی تیرے قبا لے لے تو اسے عبا بھی لیجانے دے'' مجھے

بے حد خوشی ہوئی اور شامل بھٹ کے وہ شعر یاد آئے ''جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلائے'' میرے فام کار ذہن نے اپنی بساط کے موافق ''گیتا'' ''نور ایشیا'' اور پہاڑی کا وعظ کی تعلیم کو یکجا کرنے کی کوشش کی یہ بات میرے دل کو لگی کہ ترک دنیا مذہب کا سب سے اونچا درجہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے میرا یہ شوق اور بھی بڑھ گیا کہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کروں ایک دوست نے مجھے کارلائل کی ''ہیرو اینڈ ہیرو رشپ'' پڑھنے کی ہدایت کی میں نے اس کا ایک باب ''ہیرو بہ حیثیت پیغمبر کے'' پڑھا اور مجھ پر پیغمبر اسلام کی عظمت، شجاعت اور زہد و اتقا کی حقیقت منکشف ہوئی۔

اس زمانے میں میں مذہب سے اس سے زیادہ واقفیت نہ حاصل کر سکا کیونکہ امتحان کی کتابوں کے مطالعے سے مجھے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ کچھ اور پڑھ سکوں لیکن میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اور مذہبی کتابیں بھی پڑھوں گا اور تمام بڑے مذہبوں سے واقفیت حاصل کروں۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں دہریت سے بھی تھوڑا بہت واقف نہ ہو جاتا؟ ہر ہندوستانی بریڈلا کو اور اس کی نام نہاد دہریت کو جانتا تھا میں نے بھی اس کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ میں دہریت کے لق و دق صحرا سے پہلے ہی گزر چکا تھا مسز بیسنٹ نے جن کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی دہریت سے خدا پرستی کی طرف رجوع کیا تھا اس بات سے اس نفرت کو اور تقویت ہوئی جو میں دہریت کی طرف سے رکھتا تھا۔

اسی زمانے میں بریڈلا کا انتقال ہوا اور رو و کنگ کے قبرستان میں دفن کیا گیا میں

اس کے جنازے میں شریک ہوا اور مجھ پر کیا موقف لندن میں جتنے ہندوستانی تھے سبھی شریک ہوئے چند پادری بھی اسے دفن کرنے آئے تھے قبرستان سے واپس آتے وقت مجھے ریل کے انتظار میں اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑا مجمع میں ایک دہریہ مجاہد ایک پادری کے پیچھے پڑا ہوا تھا ''کیوں صاحب آپ خدا کے قائل ہیں'' بے چارے پادری نے آہستہ سے کہا ''بے شک ہوں''

دہریے نے بر خود غلط تبسم کے ساتھ کہا آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ کرہ زمین کا قطر اٹھائیس ہزار میل ہے۔

''جی ہاں''

''اچھا تو بتایئے آپ کا خدا کتنا بڑا ہے اور کہاں ہے؟''

''کاش ہم جانتے کہ وہ ہم دونوں کے دل میں رہتا ہے''

مجاہد نے فخریہ ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا ''بس بس رہنے دیجئے آپ نے مجھے کوئی بچہ مقرر کیا ہے۔''

پادری عاجزی سے خاموش ہو گیا

اس گفتگو نے مجھے دہریت سے اور بھی بدظن کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نربل کے بل رام

ہندو مذہب اور دوسرے مذہبوں سے مجھے کچھ یونہی سے واقفیت ہوگئی تھی مگر مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ مجھے آزمائشوں میں ثابت قدم رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے امتحان کے وقت انسان مطلق نہیں جانتا کہ کونسی چیز اس کے کام آئی اگر وہ بے دین ہے تو اپنی نجات کو اتفاق سمجھتا ہے اگر دیندار ہے تو کہتا ہے خدا نے بچالیا۔ وہ بعد میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مذہبی تعلیم یا روحانی تربیت کی بدولت توفیق الٰہی نے اس کا ساتھ دیا لیکن عین نجات کے وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ بچانے والی اس کی روحانی تربیت ہے یا کوئی اور چیز، کون ایسا ہے جسے اپنی روحانی قوت پر ناز ہو اور اس نے اسے مٹی میں ملتے نہ دیکھا ہو؟ ان آزمائشوں کے موقعوں پر دینیات کا علم بغیر دینداری کے جذبے کے پرکاہ کے برابر وقعت نہیں رکھتا۔

انگلستان ہی میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ خالی خولی مذہبی علم محض بیکار ہے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے متعدد موقعوں پر میں نے کیونکر نجات پائی تھی کیونکہ ان دنوں میری عمر بہت کم تھی مگر اب بیس برس کا ہو چکا تھا اور بیوی بچے والا بھی تھا اس لیے مجھے ان باتوں کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میرے قیام انگلستان کے آخری سال یعنی 1890ء میں پورٹسمتھ میں نباتاتیوں کی کانفرنس تھی جس میں میں اور میرے ایک ہندوستانی دوست مدعو تھے پورٹسمتھ ایک بندرگاہ ہے جس میں بحری افسروں اور خلاصیوں کی بہت بڑی آبادی ہے وہاں بہت سے مکان ایسے ہیں جن میں بدوضع عورتیں رہتی

ہیں جو رنڈیاں تو نہیں ہیں مگر اپنے اخلاق کی طرف سے بہت بے پرواہ ہیں۔ہم اسی قسم کے ایک مکان میں ٹھہرائے گئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجلس استقبالیہ اس بات سے بالکل ناواقف تھی پورٹ سمتھ ایسے شہر میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ ہمارے جیسے مسافروں کے لیے جو دو چار دن کے لیے آتے ہیں کون سے مکان اچھے ہیں اور کون سے برے۔

ہم شام کو کانفرنس سے لوٹے کھانے کے بعد ہم برج کھیلنے بیٹھے اور اس میں ہماری مالکہ مکان بھی شریک ہوگئی جیسے کہ انگلستان کے اچھے خاندانوں میں بھی دستور ہے۔ایسے موقع پر کھیلنے والے آپس میں بے ضرر مذاق بھی کیا کرتے ہیں مگر یہاں میرے دوست میں اور مالکہ مکان میں فحش مذاق ہونے لگا۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے دوست اس فن میں استاد ہیں مجھ پر بھی یہ رنگ چھا گیا اور میں بھی شریک ہوگیا ٹھیک اس وقت جب میں "چھوڑ چھاڑ" کر حد سے آگے بڑھنے والا تھا خدا نے میرے نیک رفیق کی زبان سے یہ مبارک الفاظ کہلوائے "صاحبزادے تم میں کہاں سے شیطان سا گیا! جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

میں شرم سے پانی پانی ہوگیا میں نے اس تنبیہہ پر عمل کیا اور دل ہی دل میں اپنے دوست کا شکر گزار ہوا مجھے وہ عہد یاد آ گیا جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔اس شکار کی طرح جو شکاری سے بچ کر بھاگا ہو ہانپتا اپنے کمرے میں پہنچا میرا بدن لرز رہا تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو دیکھ کر میرے دل میں شہوانی خواہش ہوئی میں نے وہ رات جاگ کر کاٹی میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا کیا میں یہ مکان چھوڑ دوں؟ یا اس شہر سے بھاگ جاؤں میں کیا

ہوں؟ اگر میں حواس بجانہ رہے تو کیا انجام ہوگا؟ میں نے یہ طے کیا اب بہت احتیاط سے کام لوں گا اس مکان سے اٹھ کر کسی اور مکان میں نہ جاؤں گا بلکہ کسی ترکیب سے پورٹ سمتھ ہی سے چل دوں گا کانفرنس صرف دو دن کی تھی مجھے یاد ہے کہ میں دوسرے دن شام کو پورٹ سمتھ سے روانہ ہوگیا میرے دوست کچھ دن وہاں اور ٹھہرے رہے۔

مجھے اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ مذہب کی یا خدا کی حقیقت کیا ہے اور خدا ہمارے دلوں پر کیونکر اثر ڈالتا ہے مجھے محض ایک دھندلا سا خیال تھا کہ اس موقعے پر خدا نے بچایا ہر امتحان کے وقت اسی نے مجھے بچایا ہے میں جانتا ہوں کہ اب یہ الفاظ ''خدا نے مجھے بچایا'' میرے لیے بڑے گہرے معنی رکھتے ہیں پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی پوری اہمیت اب تک نہیں سمجھا جب تک میرا روحانی تجربہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوگا بس ان کو ما حقہ سمجھنے سے قاصر رہوں گا لیکن مجھے جتنے امتحان پیش آئے روحانی زندگی میں، وکالت کے پیشے میں، اداروں کے چلانے میں، سیاست میں، سب میں خدا نے مجھے بچایا جب کوئی امید نہیں رہتی، جب مددگار کام نہیں آتے اور سہارے ٹوٹ جاتے ہیں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں سے یہ مدد پہنچی، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے الحاج وزاری عبادت دعا اوہام نہیں ہیں یہ حقیقی افعال ہیں اور ان میں کھانے پینے، بیٹھنے چلنے سے زیادہ حقیقت ہے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ صرف یہی چیزیں حقیقی ہیں اور جو کچھ ہے وہ مجازی ہے۔

یہ عبادت یا دعا خطابت کا طرفان نہیں، محض زبانی اطاعت اور بندگی نہیں یہ وہ چیز ہے جو دل سے نکلتی ہے اگر ہم تزکیہ قلب کی اس منزل پر پہنچ جائیں کہ دل سوائے

محبت کے ہر چیز سے خالی ہو، اگر اس کے سب تار کسے ہوئے ہوں تو ان کی لرزش نغمہ بن کر حد نظر سے آگے چل جاتی ہے دعا کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں وہ بجائے خود سمعی محسوس سے مستغنی ہے مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دعا کو شہوانی جذبات سے پاک کرنے کے لیے اکسیر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی عاجزی بھی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

نرائن ہیم چندر

اسی زمانہ میں نرائن ہیم چندر انگلستان آئے میں نے ان کا نام بہ حیثیت مصنف کے سنا تھا۔ ہم دونوں کی ملاقات مس منیلنگ کے یہاں ہوئی جو نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی رکن تھیں مس منیلنگ جانتی تھیں کہ میں لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے میں بہت کچا ہوں جب کبھی میں ان کے ہاں جاتا تو خاموش بیٹھ رہتا تھا اور جب تک کوئی مجھے مخاطب نہ کرے میں کسی سے نہیں بولتا تھا۔

انہوں نے مجھے نرائن ہیم چندر سے ملایا وہ انگریزی نہیں جانتے تھے ان کا لباس عجیب تھا بھدا سا پتلون، میلا کچیلا پارسی وضع کا بھورا کوٹ جس میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں اس کے ساتھ نہ کالر نہ نکٹائی، پھندنے دار ادنی ٹوپی۔

وہ اکہرے بدن کے پستہ قد آدمی تھے گول چہرے پر چیچک کے داغ، ناک نہ ستواں نہ زیادہ پھیلی ہوئی منہ پر داڑھی تھی جس میں وہ برابر ہاتھ سے کنگھی کرتے رہتے تھے۔

ایسی انوکھی شکل اور نرالی پوشاک کے آدمیوں پر خوش وضع لوگوں کے مجمع میں خواہ مخواہ نظر ٹھٹکتی تھی میں نے ان سے کہا ''میں نے آپ کا ذکر اکثر سنا ہے اور آپ کی بعض کتابیں بھی پڑھی ہیں آپ میرے یہاں تشریف لائیں تو بڑی عنایت ہو۔''

نرائن ہیم چندر کی آواز بھاری تھی انہوں نے مسکرا کر کہا ''اچھی بات ہے تم رہتے کہاں ہو؟'' ''اسٹور اسٹریٹ میں'' میں نے بتایا

''تب تو ہم دونوں پاس ہی پاس رہتے ہیں'' میں انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں

پڑھا دو گے؟

''مجھے جو تھوڑا بہت آتا ہے بڑی خوشی سے اور بڑی محنت سے آپ کو پڑھاؤں گا آپ فرمائیں تو میں آپ کے یہاں حاضر ہو جایا کروں؟''

''جی نہیں میں خود تمہارے یہاں آؤں گا اور ترجمے کی کتاب بھی لیتا آؤں گا''

غرض ہم نے وقت مقرر کر لیا تھوڑے دنوں میں ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔

نرائن ہیم چندر صرف و نحو کے بکھیڑے سے پاک تھے ''گھوڑا'' ان کے نزدیک فعل تھا اور ''دوڑو'' اسم مجھے ایسی بہت سے مضحک مثالیں یاد ہیں مگر وہ اس ناواقفیت کی کب پروا کرتے تھے میرا صرف و نحو کا ناچیز علم ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ رکھتا تھا گرامر نہ جاننا ان کے نزدیک کوئی شرم کی بات نہیں تھی۔

وہ بڑی بے پروائی سے کہا کرتے تھے ''میں نے تمہاری طرح سکول میں نہیں پڑھا اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لیے مجھے کبھی صرف و نحو کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بنگالی بھی جانتے ہو؟ میں جانتا ہوں میں نے ہی مہارشی دیوا یندر ناتھ ٹگور کی تصانیف کا گجراتی میں ترجمہ کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اور بہت سی زبانوں کے ادبی خزانے گجراتی میں منتقل کر دوں۔ تم جانتے ہو کہ لفظی ترجمہ کبھی نہیں کرتا۔ میں تو بس اصل مطلب کو اپنی زبان میں ادا کر دیتا ہوں ممکن ہے کہ آگے چل کر مجھ سے زیادہ قابل لوگ بہتر ترجمہ کریں۔ مگر میں اپنے اسی کام میں خوش ہوں جو میں نے بغیر صرف و نحو کے کر لیا ہے۔ میں ہندی، مرہٹی، بنگالی جانتا ہوں اور اب انگریزی پڑھ رہا ہوں بس میری یہی خواہش ہے کہ بہت سے الفاظ سیکھ لوں اور کاے تم سمجھتے ہو کہ میرا حاصلہ بس اتنا ہی ہے؟ میں ابھی فرانس جا کر فرانسیسی سیکھوں گا لوگ کہتے ہیں کہ اس زبان کا بڑا وسیع ادب ہے پھر ممکن ہوا تو جرمنی جا کر جرمنی زبان سیکھوں

گا‘‘غرض وہ اسی طرح باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔

انہیں زبانیں سیکھنے کا اور غیر ملکوں کی سیاحت کا بڑا شوق تھا

’’آپ امریکہ بھی جائیں گے نہ؟‘‘

’’ضرور جاؤں گا بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر ہی دنیا دیکھے ہندوستان واپس جاؤں‘‘

’’مگر آپ کو روپیہ کہاں سے ملے گا؟‘‘

مجھے روپیہ کی کیا ضرورت ہے؟ میں کچھ تمہاری طرح فیشن ایبل آدمی ہوں نہیں مجھے تو بس پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا چاہیے اور اس کے لیے جو تھوڑا بہت مجھے اپنی کتابوں سے اور دوستوں سے مل جاتا ہے کافی ہے۔ میں ہمیشہ تیسرے درجہ میں سفر کرتا ہوں امریکہ بھی ’’ڈیک‘‘ پر جاؤں گا۔

سادگی ’’نرائن ہیم چندر‘‘ کا حصہ تھی اور ان کی صاف گوئی بھی اسی شان کی تھی۔ غرور انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ البتہ بہ حیثیت مصنف کے وہ اپنی قابلیت کا اندازہ کسی قدر زیادہ کرتے تھے۔

ہم دونوں میں روزانہ ملاقات ہوتی تھی ہمارے خیالات اور طرز عمل میں بہت مشابہت تھی۔ دونوں نباتاتی تھے۔ اکثر دوپہر کا کھانا ساتھ کھتے تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ میں سترہ شلنگ ہفتہ وار میں گزر کرتا تھا اور اپنا کھانا آپ پکاتا تھا۔ کبھی میں ان کے یہاں چلا جاتا تھا، کبھی وہ میرے یہاں چلے آتے تھے میں انگریزی طریقہ پر پکاتا تھا مگر انہیں سوائے ہندوستانی کھانے کے کچھ پسند نہ تھا۔ دال کے بغیر وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ میں گاجر وغیرہ کا شوربہ تیار کرتا تھا اور وہ میرے شوق پر افسوس کیا کرتے تھے ایک بار انہیں کہیں سے مونگ کی دال مل گئی اور وہ پکا کر میرے یہاں لائے۔

میں نے بڑے شوق سے کھائی۔اس کے بعد سے ہم دونوں میں مبادلے کا باقاعدہ سلسلہ قائم ہوگیا۔میں جو اچھی چیز پکاتا تھا ان کے لیے لے جاتا تھا اور وہ اپنی محبوب چیزیں میرے لیے لاتے تھے۔

اس زمانے میں کارڈنل مینگ کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا کھارے کھاڑی کے مزدوروں کی ہڑتال جان برنس اور کارڈنل مینگ کی کوششوں سے قبل از وقت ختم ہو گئی تھی میں نے نرائن ہیم چندر سے ذکر کیا ڈزرائیلی سے کارڈنل کی سادگی کی بڑی تعریف کی انہوں نے کہا پھر تو میں اس رشی سے ضرور ملوں گا میں نے کہا وہ بڑے آدمی ہیں آپ کی رسائی ان تک کیسے ہوگی؟

''کیوں اس میں کیا مشکل ہے تم میری طرف سے انہیں خط لکھو ان کو یہ بتاؤ کہ میں مصنف ہوں اور ان سے مل کر انہیں اس کار خیر پر مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔یہ بھی لکھ دینا کہ میں تمہیں ترجمان کے طور پر لاؤں گا کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا۔''

میں نے اس مضمون کا خط لکھا دو تین دن کے بعد اس کے جواب میں کارڈنل صاحب کا کارڈ آیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فلاں وقت ہم دونوں سے ملیں گے میں نے وہاں جانے کے لیے دستور کے مطابق ملاقات کا سوٹ پہنا نرائن ہیم چندر کے وہی ٹھاٹ تھے، وہی کوٹ پتلون میں نے چاہا کہ اس لباس کی ہنسی اڑاؤں۔مگر انہوں نے الٹا مجھ ہی کو بنا ڈالا۔

''تم جیسے مہذب لوگ سب بزدل ہوتے ہیں بڑے آدمی کسی شخص کے لبادکو نہیں دیکھتے اس کے دل کو دیکھتے ہیں''

ہم کارڈنل کے دولت خانے پر پہنچے ابھی جا کر ہم بیٹھے ہی تھے کہ ایک دبلے پتلے لمبے سے پیر مرد برآمد ہوئے اور انہوں نے ہم سے مصافحہ کیا نرائن ہیم چندر نے

سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا۔

''میں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا میں نے آپ کی بہت تعریف سنی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ یہاں آ کر اس نیک کام کا شکریہ ادا کروں جو آپ نے ہڑتالیوں کے لیے کیا ہے میری عادت ہے کہ دنیا میں جتنے رشی ہیں سب کی خدمت میں جایا کرتا ہوں اسی لیے میں نے آپ کو بھی زحمت دی ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ ان الفاظ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے گجرات میں کہے تھے

''مجھے آپ کے آنے سے خوشی ہوئی خدا کرے آپ کو لندن کا قیام راس آئے اور یہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملے خدا آپ پر برکت نازل کرے۔''

یہ الفاظ کہہ کر کارڈنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہمیں رخصت کر دیا ایک بار نرائن ہیم چندر قمیض اور دھوتی پہنے ہوئے میرے یہاں چلے آئے بیچاری مالکہ مکان نے دروازہ کھولا تو ڈر گئی میرے پاس چلاتی ہوئی آئی (اس کے یہاں میں نیا نیا آیا تھا اس لیے وہ نرائن ہیم چندر کو نہیں جانتی تھی) اور کہنے لگی ''ایک پاگل سا آدمی تم سے ملنے آیا ہے میں دروازہ پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نرائن ہیم چندر کھڑے ہیں مجھے سخت تعجب اور صدمہ ہوا مگر ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ رہتی تھی۔''

''مگر یہ تو کہیے آپ کو سڑک پر لڑکوں نے نہیں چھیڑا''

''اجی وہ میرے پیچھے دوڑے مگر میں نے کچھ پروا نہیں کی تو وہ بھی چپ ہو رہے۔''

نرائن ہیم چندر چند مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد پیرس گئے انہوں نے فرانسیسی پڑھنا، فرانسیسی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ میں اتنی فرانسیسی جانتا تھا

کہ ان کے ترجمے پر نظر ثانی کر سکوں اس لیے وہ ترجمہ کر کے مجھے دکھایا کرتے تھے یہ ترجمہ کیا خلاصہ ہوتا تھا۔

آخر انہوں نے امریکہ جانے کا مقصد بھی پورا کیا بڑی مشکل سے انہیں ڈیک کا ٹکٹ ملا وہاں بھی وہ ایک بار قمیض اور دھوتی پہن کر نکلے ان پر ''غیر مہذب لباس پہننے'' کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ بری کر دیئے گئے تھے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

عظیم الشان نمائش

1890ء میں پیرس میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی میں نے اس کی دھوم دھام کا حال پڑھا تھا اور مجھے پیرس دیکھنے کا بھی شوق تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اس وقت پیرس ہو آؤں تو ایک پنتھ دو کاج کا مضمون ہو گا۔ نمائش کی ایک خاص کشش ایفل مینار تھا جو خالص لوہے کا اور ایک ہزار فٹ بلند تھا ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ چیزیں بھی تھیں لیکن یہ مینار سب سے بڑھ کر تھا کیونکہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا اونچا مینار قائم نہیں رہ سکتا۔

میں نے پیرس کے نباتاتی ریستوران کا نام سنا تھا میں نے وہاں ایک کمرہ لے لیا اور سات دن ٹھہرا میں نے پیرس کا سفر اور وہاں کی سیر دونوں میں بہت کم خرچ میں کام چلایا۔ میں شہر کا ایک نقشہ اور نمائش کی گائڈ لے کر پیدل پھرا کرتا تھا ان کے ذریعے سے انسان تمام بڑی سڑکوں پر اور خاص دلچسپ جگہوں پر جا سکتا تھا۔

مجھے نمائش کے متعلق سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ بڑی عظیم الشان تھی اور وہاں مختلف قسم کی دلچسپ چیزیں تھیں ایفل ٹاور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کیونکہ میں دو تین بار اس پر چڑھا تھا پہلی منزل پر ایک ریستوران تھا اور صرف یہ کہنے کے لیے میں نے اتنی بلندی پر کھانا کھایا ہے میں نے سات شلنگ دوپہر کے کھانے پر ضائع کیے۔

پیرس کے پرانے گرجے مجھے اب تک یاد ہیں ان کی رفعت اور شوکت ان کا سکون جس نے دیکھا ہے وہ بھول نہیں سکتا نوتر ادام کی حیرت انگیز عمارت اور سنگ

تراشی کے خوبصورت نمونے جن سے اس کی اندرونی آرائش کی گئی ہے ان چیزوں کی تصویر دل سے نہیں مٹ سکتی مجھے اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے کروڑوں خرچ کر کے یہ گرجے بنوائے ہیں ان کے دل میں یقیناً خدا کی محبت ہو گی۔

میں نے پیرس کی تراش خراش اور وہاں کے لہو ولعب کے بہت سے قصے پڑھے تھے۔ یہ چیزیں ہر سڑک پر نظر آتی تھیں لیکن گرجے ان مناظر سے الگ تھلگ دوسری ہی شان سے کھڑے تھے۔ جہاں انسان ان میں سے کسی گرجے میں داخل ہوا وہ بھول جاتا تھا کہ باہر اتنا شور شغب ہے۔ اس کا انداز بدل جاتا اور ب وہ کسی شخص کے پاس سے گزرتا تھا جو کنواری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہوتو اس کی نقل وحرکت سنجیدگی اور عقیدت سے معمور ہو جاتی تھیں مجھے جو احساس اس وقت تھا وہ اب اور گہرا ہوتا جاتا ہے کہ یہ تعظیم اور عبادت محض ضعیف الاعتقادی نہیں تھیں اور یہ لوگ جو کنواری بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے محض سنگ مرمر کی پرستش نہیں کر رہے تھے ان کے دل میں سچی عقیدت کا جوش تھا اور وہ پتھر کو نہیں بلکہ ذات الٰہی کو پوجتے تھے جن کا جلوا نہیں اس میں نظر آتا تھا مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس پرستش سے وہ خدا کے عظمت وجلال کو گھٹا نہیں رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔

میں چند الفاظ ایفل مینار کے متعلق بھی کہوں گا مجھے معلوم نہیں کہ اب اس سے کیا کام لیا جاتا ہے مگر اس زمانے میں اس کی تعریف بھی بہت کی جاتی تھی اور مذمت بھی۔ مجھے یاد ہے کہ مذمت کرنے والوں میں ٹالسٹائی پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایفل مینار انسان کی دانشمندی کی نہیں بلکہ اس کی حماقت کی یادگار ہے وہ تمباکو کو دنیا کا سب سے بڑا نشہ سمجھتا تھا کیونکہ تمباکو پینے والوں سے اس کے نزدیک ایسے جرم

سرزد ہوتے ہیں جن کے ارتکاب کی شرابیوں کو کبھی جرأت نہیں ہوتی۔ شراب تو انسان کو بالکل دیوانہ کر دیتی ہے مگر تمباکو سے اس کا تخیل دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے وہ خیالی پلاؤ پکانے اور ہوا محل بنانے لگتا ہے ایفل مینار اس کے خیال میں ایسا ہی تخلیقی کارنامہ ہے جو انسان تمباکو کے نشے میں کر دکھاتا ہے اس مینار میں آرٹ کی کوئی خوبی نہیں اس سے نمائش کی خوبصورتی میں کوئی مدد نہیں ملی لوگ اسے جوق در جوق دیکھنے کو آتے تھے اور اس پر چڑھتے تھے کیونکہ وہ ایک نئی چیز تھی اور اونچائی میں بے نظیر یہ نمائش کا کھلونا تھا جب تک ہم میں بچپن ہے ہم کھلونوں کو دیکھ کر پھسل جاتے ہیں اور یہ مینار اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم سب بچے ہیں اور دکھاوے کی چیزوں پر جان دیتے ہیں یہی ایفل مینار کا مقصد کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بیرسٹر تو ہو گئے مگر اب

میں نے اب تک اس چیز کا ذکر نہیں کیا ہے جس کے لیے میں انگلستان گیا تھا۔ یعنی بیرسٹری کا امتحان۔ اب ذرا اس کا بھی مختصر سا حال بیان کر دوں۔

باضابطہ بیرسٹر بننے کے لیے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں بارہ ٹرم یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی حاضری سے مراد یہ تھی کہ ہر ٹرم کی چوبیس ڈنر کی دعوتوں میں سے کم سے کم چھ میں شرکت کی جائے۔ شرکت کے لیے کھانا کھانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ مقررہ وقت پر پہنچ جانا اور ڈنر کے آخر تک موجود رہنا کافی تھا۔ عام طور پر لوگ بہت خوشی سے یہاں کے ڈنر اور نفیس شرابوں سے لطف اٹھاتے تھے اور ڈنر کی قیمت ڈھائی شلنگ تک یعنی دو روپے سے تین روپے تک ہوتی تھی یہ کم سمجھی جاتی تھی کیونکہ ہوٹلوں میں اتنے دام فقط شراب ہی کے دینے پڑتے تھے۔ ہمارے ہندوستان میں جو لوگ ''مہذب'' نہیں ہیں انہیں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پینے کی چیز کے دام کھانے سے زیادہ ہوں۔ مجھے جب یہ پہلی بار معلوم ہوا تو سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ لوگ شراب پر اتنا روپیہ ضائع کر دیتے ہیں اور ان کا دل نہیں دکھتا۔ آگے چل کر میں اس راز کو سمجھ گیا، میں اکثر ان دعوتوں میں کچھ نہیں کھاتا تھا۔ میرے کھانے کی چیزیں صرف روٹی و آلو اور گوبھی تھیں ابتداء میں یہ چیزیں نہیں کھاتا تھا کیونکہ یہ مجھے پسند نہیں تھیں اور آگے چل کر جب یہ پسند آنے لگیں تو اس وقت تک مجھ میں اتنی جرأت بھی پیدا ہو گئی تھی کہ اور کھانوں کی فرمائش کر سکوں۔

منتظموں کو طالب علموں سے اچھا کھانا ملتا تھا۔ میں نے اور ایک پارسی طالب علم نے جو میری طرح نباتاتی تھا یہ درخواست دی کہ نباتاتی مشرب کی رعایت سے ہمیں وہ نباتاتی کھانے ملیں جو منتظموں کو دیئے جاتے ہیں یہ درخواست منظور ہو گئی اور ہمیں منتظموں کی میز سے پھل اور ترکاریاں ملنے لگیں۔

چار چار آدمیوں میں شراب کی دو دو بوتلیں ملتی تھیں اور چونکہ میں انہیں چھوتا تک نہ تھا اس لیے مجھ سے لوگ ہمیشہ اصرار کرتے تھے کہ ان کے حلقے میں شریک ہو جاؤں تاکہ دو بوتلیں تین آدمیوں کے حصے میں آئیں ہر ٹرم میں ایک ''بڑی رات'' منائی جاتی تھی اور اس موقع پر علاوہ ریورٹ اور شیری کی مقررہ بوتلوں کے شامپین وغیرہ بھی ملتی تھی۔ مجھ سے اس رات کے آنے میں خاص اصرار ہوتا تھا اور سب لوگ مجھے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

میری سمجھ میں نہ اس وقت آیا تھا اور نہ اب تک آیا ہے کہ ڈنر کھا کر طالب علموں میں بیرسٹری قابلیت کیونکر پیدا ہو جاتی ہے ایک زمانے میں ان دعوتوں میں بہت کم طالب علم آیا کرتے تھے۔ اس لیے انہیں منتظموں سے گفتگو کا موقع ملتا تھا اور تقریریں بھی ہوتی تھیں اس صحبتوں سے انہیں دنیا کا تجربہ حاصل ہوتا تھا ان کے مزاج میں ستھرا پن اور نفاست پیدا ہوتی تھی اور ان کی قوت گویائی بڑھ جاتی تھی لیکن میرے زمانے میں باتیں ناممکن تھیں کیونکہ منتظموں کی میز حفظ مراتب کے خیال سے طالب علموں سے دور بچھتی تھیں۔ یہ رسم رفتہ رفتہ بے معنی ہو گئی لیکن قدامت پسند انگلستان نے اسے بدستور قائم رکھا ہے۔

نصاب تعلیم بہت سہل تھا اور بیرسٹروں کو لوگ مذاق میں دو ڈنر بیرسٹر کہتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ امتحان کی کوئی وقعت نہیں ہے میرے زمانے میں دو امتحان ہوتے

تھے ایک رومی قانون میں اور ایک عام قانون میں ان کے لیے باقاعدہ کتابیں مقرر تھیں جن میں لوگ کئی بار کر کے امتحان دے سکتے تھے مگر شاید ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگوں نے محض خلاصہ اور شرح پڑھ کر رومی قانون کا امتحان دو ہفتہ میں اور عام قانون کا دو تین مہینے میں پاس کر لیا۔ سوالات کے پرچے سہل ہوتے تھے اور ممتحن دل کھول کر نمبر دیتے تھے رومی قانون کے امتحان میں پچانوے سے ننانوے فیصد تک اور آخری امتحان میں ستر فیصد بلکہ اس نے زیادہ امیدوار پاس کیے جاتے تھے۔ اس لیے فیل ہونے کا خوف بہت کم تھا اور امتحان سال میں ایک بار نہیں بلکہ چار بار ہوتا تھا ان سہل امتحانوں میں کسی کو دشواری محسوس نہ ہوتی تھی۔

لیکن میں نے اپنے لیے دشواری پیدا کر ہی لی میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ساری درسی کتابیں پڑھوں میرے لیے کتابوں کو نہ پڑھنا دغا بازی تھی میں نے ان کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا میں نے طے کیا کہ رومی قانون لاطینی کتابوں سے پڑھوں گا۔ جتنی لاطینی میں نے لندن کے میٹریکولیشن امتحان کے لیے پڑھی تھی وہ بہت کام آئی اور اس مطالعہ سے آگے چل کر جنوبی افریقہ میں بڑا فائدہ ہوا کیونکہ وہاں رومی ولندیزی قانون رائج تھا۔ جسٹینین کی کتابیں پڑھنے سے مجھے جنوبی افریقہ کا قانون سمجھنے میں بہت مدد ملی۔

انگلستان کے عام قانون کو پڑھنے میں مجھے نو مہینے تک اچھی خاصی محنت کرنا پڑی کیونکہ بردم کی ''قانون عام'' کو (یہ ضخیم کتاب ہے مگر دلچسپ) پڑھنے میں بہت دن لگ گئے ''Equity'' دلچسپ تھی۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل تھا وائٹ اور ٹیوڈر کی کتاب ''معرکے کے مقدمے'' جس میں سے چند مقدمے نصاب میں تھے دلچسپ

اور مفید تھی میں نے ولیم کی ''Real Proprety'' اور گوڈا یو کی ''اصول عدل'' کو بھی شوق سے پڑھا۔ ولیم کی کتاب ناول معلوم ہوتی تھی ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے صرف ایک کتاب مین کی ''دھرم شاستر'' اس قدر شوق سے پڑھی ہے مگر یہاں ہندوستان کی قانونی کتابوں کے ذکر کا موقع نہیں۔

میں نے اپنے امتحان پاس کر لیے 10 جون 1891ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی 11 جون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور 12 جون کو میں جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان روانہ ہو گیا۔

لیکن باوجود تعلیم ختم کرنے کے مجھ پر خوف اور مایوسی طاری تھی میں نے اپنے آپ میں وکالت کرنے کی قابلیت نہیں پاتا تھا۔

اس یاس اور بے بسی کو بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ باب چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆☆

میری بے بسی اور مایوسی

بیرسٹر ہو جانا سہل تھا مگر بیرسٹری کرنا دشوار میں نے قانون پڑھا تھا لیکن قانون سے کام لینا نہیں سیکھا تھا میں نے ''قانونی مقولے'' شوق سے پڑھے تھے مگر انہیں اپنے پیشے میں برتنا نہیں جانتا تھا ان میں سے ایک مقولہ تھا ''اپنی ملک کو اس طرح استعمال کرو کہ اس سے دوسروں کی املاک کو نقصان نہ پہنچے'' مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے انسان اپنے موکل کے حق میں کیونکر استعمال کرے۔ اس مقولے کے متعلق جتنے معرکے کے مقدمے تھے میں نے سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں اسے خود اپنے مقدموں میں کام میں لا سکوں گا۔

علاوہ اس کے میں نے ہندوستان کا قانون بالکل نہیں پڑھا تھا دھرم شاستر اور قانون شرع محمودی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا تھا مجھے عرضی دعوے تک لکھنا نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا۔ میں نے سنا تھا کہ سر فیروز شاہ مہتا عدالت میں شیر کی طرح گرجتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے انگلستان میں یہ کیسے سیکھ لیا ان کی سی قانون سوجھ بوجھ حاصل کرنا تو درکنار مجھے اس میں بھی بہت شبہ تھا کہ میں اس پیشے سے پیٹ بھرنے کے لائق کما سکوں گا۔

جب میں قانون پڑھتا تو یہ شبہے اور وسوسے میرے دل میں رہتے تھے میں نے اپنی مشکلیں اپنے چند دوستوں سے بیان کیں ان میں سے ایک نے کہا کہ دادا بھائی نوروجی سے مشورہ کروں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انگلستان جاتے وقت میرے پاس دادا بھائی نوروجی کے نام تعارف کا خط تھا میں نے اس سے بہت دیر میں کام لیا

میں سوچتا تھا کہ مجھے اتنے بڑے آدمی کو زحمت دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب کبھی ان کی کسی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو میں وہاں جاتا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں بیٹھ کر سنتا تھا اور دیدار و گفتار کا لطف اٹھا کر چلا آتا تھا۔ طالب علموں سے گہرا تعلق پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی میں اس کے جلسوں میں جایا کرتا تھا اور دادا بھائی کو طالب علموں سے جو محبت تھی اور ان لوگوں کے دل میں ان کا جو احترام تھا اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اتنی ہمت ہوگئی کہ میں نے تعارف کا خط پیش کر دیا انہوں نے کہا ''تمہارا جب جی چاہے آؤ اور مجھ سے مشورہ لو'' لیکن میں نے اس دعوت سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا میں سمجھتا تھا کہ بغیر اشد ضرورت کے انہیں زحمت دینا مناسب نہیں اس لیے جب میرے دوست نے کہا میں دادا بھائی نورو جی سے مل کر اپنی مشکلیں ان کے سامنے پیش کروں تو مجھے اس کی جرأت نہ ہوئی انہی دوست یا کسی اور صاحب کی رائے ہوئی کہ میں فریڈرک پنکٹ صاحب سے ملوں یہ قدامت پسند تھے مگر انہیں ہندوستانی طالب علموں سے خاص اور بے غرض محبت تھی بہت سے طالب علم ان سے مشورہ لیا کرتے تھے میں نے بھی ملاقات کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ میں اس ملاقات کو کبھی نہ بھولوں گا۔ انہوں نے دوستانہ میرا خیر مقدم کیا اور میری مایوسی کو اپنے قہقہوں سے دور کر دیا انہوں نے کہا تم سمجھتے ہو کہ ہر شخص کے لیے فیروز شاہ مہتا ہونا ضروری ہے؟ فیروز شاہ اور بدر الدین جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں یقین مانو کہ معمولی وکیل ہونے کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں وہ محض ایمانداری اور محنت کی بدولت گزر کر سکتا ہے سب مقدمے پیچیدہ نہیں ہوتے اچھا یہ بتاؤ تمہارا عام مطالعہ کہاں تک ہے؟

جب میں نے ان سے اپنے محدود ذخیرہ معلومات کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا کہ

انہیں کسی قدر مایوسی ہوئی اگر چہ یہ حالت محض ایک لمحے تک رہی چشم زدن میں ان کا چہرہ خوشگوار تبسم سے دمکنے لگا اور وہ کہنے لگے "میں تمہاری مشکل سمجھ گیا تمہارا عام مطالعہ بہت کم ہے۔ تمہیں دنیا کا تجربہ مطلق نہیں حالانکہ یہ ایک وکیل کے لیے نا گزیر ہے تم نے ہندوستان کی تاریخ تک نہیں پڑھی۔ وکیل کو انسانی فطرت سے واقف ہونا چاہیے اس میں یہ قابلیت ہونا چاہیے کہ انسان کی سیرت کو اس کی صورت سے پہچان لے اور ہندوستان کی تاریخ جاننا تو ہر ہندوستانی کے لیے ضروری ہے اس کا قانونی پیشے سے کوئی تعلق نہیں مگر تمہیں اتنی معلومات ضروری ہونا چاہیے تمہارے کہنے سے معلوم ہوا کہ تم نے کے اور سلیسین کی تاریخ غدر 1857ء بھی نہیں پڑھی، جاؤ اسے فوراً شروع کر دو اور دو اور کتابیں پڑھو جن سے انسانی فطرت کو سمجھنے میں مدد ملے" آخر میں ان کا اشارہ لافاٹر اور شمیل پینگ کی کتابوں کی طرف تھا جو علم قیافہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔

میں ان محترم دوست کا بہت شکر گزار ہوں ان کے سامنے میرا سارا خوف جاتا رہا لیکن جیسے ہی میں ان سے رخصت ہوا پھر فکروں میں گھر گیا۔ گھر جاتے ہوئے مجھے ان دونوں کتابوں کا خیال آیا اور میں اس اڈھیر بن میں مبتلا ہو گیا کہ انسان کی صورت سے اس کی سیرت کا پتہ کیونکر چلایا جائے۔ دوسرے دن میں نے لافاٹر کی کتاب خرید لی شمیل پینگ والی دکاندار کے یہاں ہی تھی میں نے لافاٹر کی کتاب پڑھی جو مجھے اسینل کی (Equity) سے بھی زیادہ مشکل معلوم ہوئی میری طبیعت اس میں بالکل نہیں لگی میں نے اس میں شیکسپیئر کے قیافے کا بہت غور سے مطالعہ کیا مگر مجھے یہ ڈھب نہ آیا کہ ان لوگوں میں سے جو لندن کی سڑکوں پر پھرتے تھے شیکسپیئر کو چھانٹ لوں۔

لا فاٹر کی کتاب سے میرے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا پنکٹ صاحب کی نصیحت سے مجھے براہ راست بہت کم فائدہ ہوا مگر ان کی محبت بہت کام آئی ان کا مسکراتا ہوا بے بناوٹ چہرہ میری آنکھوں میں پھرتا رہا اور مجھے ان کی اس رائے پر بھروسہ ہو گیا کہ وکیل بننے کے لیے اس سوجھ بوجھ قابلیت اور حافظے کی ضرورت نہیں جو فیروز شاہ میں ہے بلکہ ایمانداری اور محنت کافی ہے اور چونکہ مجھ میں ان دونوں باتوں کی کمی نہ تھی اس لیے مجھے کسی قدر اطمینان ہو گیا۔

میں کے اور سلیبسن کی تاریخ انگلستان نہیں پڑھ سکا مگر میں نے جنوبی افریقہ میں پڑھی کیونکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ جب موقع لگا اس کتاب کا مطالعہ کرونگا۔

غرض دل میں مایوسی کے ساتھ خفیف سی امید لیے ہوئے میں ''آسام'' نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر اترا۔ بندرگاہ میں سمندر میں تلاطم تھا۔ اس لیے مجھے ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے پر جانا پڑا۔

☆☆☆☆☆☆☆

حصہ دوم

رائے چندر بھائی

میں پچھلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ بمبئی کی بندرگاہ میں سمندر میں تلاطم تھا۔ جون اور جولائی میں بحر ہند کا طوفانی ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ عدن سے یہاں تک کم وبیش ہوا کا زور رہا۔ قریب قریب ہر مسافر متلی اور دوران سر میں مبتلا تھا۔ البتہ میں بالکل چاق تھا اور ڈک پر کھڑا طوفانی سمندر کا تماشا دیکھتا تھا اور موجوں کے تھپیڑوں کا لطف اٹھاتا تھا ناشتے کے وقت میرے علاوہ دو ہی ایک آدمی اور ہوتے تھے۔ جئی کا دلیہ کھاتے وقت رکابیوں کو احتیاط سے گود میں رکھ لیتے کہ کہیں سارا دلیہ ان کے جسم پر نہ آن پڑے۔

یہ بیرونی طوفان میرے لیے اندرونی طوفان کی علامت تھا مگر جس طرح پہلے طوفان سے میرے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی اسی طرح دوسرے طوفان سے بھی میں نہیں گھبرایا۔ ایک طرف برادری سے نبٹنا تھا دوسری طرف وکالت شروع کرنے کی دقتیں تھیں جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ تیسری طرف مصلح کی حیثیت سے میں دماغ سوزی کر رہا تھا کہ فلاں فلاں اصلاحوں کے شروع کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے لیکن ابھی میرے لیے اور مصیبتیں تھیں جن کی مجھے خبر تک نہ تھی۔

میرے بڑے بھائی مجھ سے ملنے کے لیے بندرگاہ پر آئے تھے وہ ڈاکٹر مہتا اور ان کے بڑے بھائی سے پہلے ہی مل چکے تھے اور چونکہ ڈاکٹر مہتا نے مجھے اپنے یہاں

ٹھہرانے پر اصرار کیا اس لیے ہم سیدھے ان کے یہاں گئے اس طرح جو ملاقات انگلستان میں شروع ہوئی تھی وہ ہندوستان میں جاری رہی اور رفتہ رفتہ دونوں میں مستقل دوستی ہوگئی۔

میں اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے گلے سے لگانے کے لیے دنیا میں موجود نہیں اب مجھے یہ اندوہناک خبر ملی اور میں نے دستور کے مطابق اشنان وغیرہ کیا ان کا انتقال میرے قیام انگلستان ہی کے زمانے میں ہو چکا تھا مگر میرے بھائی نے مجھ سے یہ خبر پوشیدہ رکھی تھی وہ چاہتے تھے کہ پردیس میں مجھے یہ شدید صدمہ نہ پہنچے پھر بھی جب میں نے یہ خبر سنی تو میرے دل کو بڑا دھچکا لگا مگر اس کا ذکر تفصیل سے کرنا مناسب نہیں مجھے اتنا رنج ہوا کہ والدہ کے مرنے کا بھی نہ ہوا تھا۔ بہت سی امیدیں جنہیں میں نے دل میں جگہ دی تھی، خاک میں مل گئیں۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اظہار غم میں بے اعتدالی نہیں کی میں آنسو تک پی جاتا تھا اور زندگی کے دھندوں میں مصروف رہتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

ڈاکٹر مہتا نے مجھے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ ان میں سے ایک ان کے بھائی ریوا شنکر جگ جیون تھے جن کی مجھ سے عمر بھر کے لیے دوستی ہوگئی خاص طور پر قابل ذکر ملاقات رائے چندر یا راجا چندر شاعر کی ہے یہ ڈاکٹر مہتا کے بڑے بھائی کے داماد تھے اور اس جوہری کی دکان میں حصہ دار تھے جو ریوا شنکر جگ جیون کے نام سے تھی اس زمانے میں ان کی عمر پچیس سے بھی کم تھی لیکن پہلی ملاقات میں مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ ذی علم اور نیک سیرت ہیں وہ ''شتو دہنی'' 27 بھی سمجھے جاتے تھے اور ڈاکٹر مہتا نے مجھ سے اصرار کیا کہ ان کے حافظے کے کارنامے ضرور دیکھوں۔ مجھے یورپ کی زبانوں کے جتنے الفاظ آتے تھے سب میں نے کہہ ڈالے اور پھر ان

شاعر سے فرمائش کی کہ انہیں دہرائیں۔ انہیں نے بالکل اسی ترتیب سے جیسے میری زبان سے نکلے تھے دہرا دیئے۔ مجھے ان کی اس قوت پر رشک آیا لیکن میرے دل پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ البتہ ایک چیز نے میرے دل کو موہ لیا اور اس کی مجھے بعد میں خبر ہوئی یہ ان کا وسیع مذہبی علم ان کا بے داغ کردار اور ان کا تکمیل نفس کا جوش تھا آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہی آخری چیز ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ ملکتا نند کے یہ شعر ان کے وردزبان رہتے تھے اور ان کے لوح دل پر نقش تھے۔

میں اپنے آپ کو سعید صرف اس وقت سمجھوں گا۔

جب مجھ روزمرہ کے ہر کام میں اس کا جلوا نظر آئے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی ذات پاک ملکتا نند کا رشتہ حیات ہے۔

رائے چندر بھائی کا تجارتی کاروبار لاکھوں کا تھا۔ وہ ہیرے موتی کے بڑے مبصر تھے۔ کاروبار کے مشکل سے مشکل مسئلوں کو چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے لیکن یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کا مرکز اور مدار نہ تھیں اس کا مرکز عرفان الٰہی تھا۔ ان کی کاروباری میز پر علاوہ اور چیزیوں کے مذہبی کتابیں اور ان کا روزنامچہ بھی رہتا تھا۔ جیسے ہی انہیں کام سے فرصت ہوتی تھی وہ کوئی مذہبی کتاب یا اپنا روزنامچہ کھول کر بیٹھ جاتے تھے ان کی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں اکثر اسی روزنامچے سے نقل کی گئیں ہیں جو شخص اہم تجارتی معاملوں کی گفتگو ختم کرتے ہیں روح کے پوشیدہ اسرار پر خامہ فرسائی کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ وہ کاروباری آدمی نہیں بلکہ سچا طالب حق ہے اور میں نے انہیں ایک دو بار نہیں بلکہ عین کاروبار کے درمیان معرفت الٰہی کے خیالوں میں ڈوبا ہوا دیکھا ہے میرے سامنے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے اطمینان قلب میں خلل آیا ہو۔ مجھ میں اور ان میں کوئی کاروباری یا خودغرضی کے تعلقات نہیں تھے مگر

آپس میں بڑا میل جول تھا۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی تھی وہ سنجیدہ مذہبی مسائل پر گفتگو چھیڑ دیتے اگر چہ میں اس وقت تک گمراہی میں تھا اور مذہبی بحثوں سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ پھر بھی مجھے ان کی گفتگو میں بے حد لطف آتا تھا۔ جب سے اب تک میں بہت سے مذہبی پیشواؤں اور معلموں سے ملا ہوں۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر مذہب کے سردار کی زیارت کروں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا رائے چندر بھائی سے ان کے الفاظ میرے دل میں اتر جاتے تھے ان کی دماغی قابلیت کی میں اتنی ہی عزت کرتا تھا جتنی ان کے اخلاقی جوش کی اور مجھے صمیم قلب سے یقین تھا کہ وہ مجھے جان بوجھ کر گمراہ نہیں کریں گے اور مجھے اپنے دل کے گہرے بھید بتا دیں گے اس لیے جب میں روحانی کشمکش میں مبتلا ہوتا تھا تو انہی کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔

مگر باوجود اس کے کہ میں ان کا اس قدر احترام کرتا تھا میں انہیں اپنے دل میں گرو کی جگہ نہیں دے سکتا تھا یہ جگہ اب تک خالی ہے اور میری تلاش جاری ہے۔

میں ہندوؤں کے گرو کے نظریہ کا قائل ہوا اور اسے تکمیل نفس کے لیے بہت اہم سمجھتا ہوں میرے خیال میں یہ اصول بڑی حد تک صحیح ہے کہ بے گرو کے سچا علم حاصل نہیں ہوتا دنیاوی چیزوں میں تو ناقص استاد پر بھی قناعت کی جا سکتی ہے مگر دینی امور میں بے مرشد کامل کے تسکین نہیں ہوتی گرو کے تخت پر صرف وہی آدمی بٹھایا جا سکتا ہے جو پورا گیانی ہو اس لیے انسان کو خود اپنی تکمیل نفس کی ان تھک کوشش کرنا چاہیے؟ کیونکہ اس گرد کے استحقاق کا ملتا ہے تکمیل نفس کی انتہائی کوشش ہر شخص کا حق ہے یہ آپ ہی اپنا اجر ہے باقی جو کچھ ہے خدا کے ہاتھ ہے۔

گو میں رائے چندر بھائی کو اپنے دل میں گرو کی جگہ نہ دے سکا مگر ہم آگے چل

کر دیکھیں گے کہ متعدد موقعوں پر وہ میرے رہنما اور مددگار رہے جدید زمانے کے تین شخصوں نے مجھے متاثر کیا اور میرے دل کو موہ لیا رائے چندر بھائی نے اپنے فیض صحبت سے، ٹالسٹائی نے اپنی اس کتاب سے ''سلطنت الٰہی تمہارے دل کے اندر ہے'' اور رسکن نے اپنے ''آخری انجام'' سے مگر ان چیزوں کی تفصیل اپنی اپنی جگہ پر آئے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

میں نے زندگی کیونکر شروع کی

میرے بڑے بھائی نے مجھ سے بہت امیدیں باندھ رکھی تھیں ان کو مال و دولت اور عزت اور شہرت کی بڑی آرزو تھی وہ بڑے فراخدل تھے حد سے زیادہ فیاض ان صفتوں کے علاوہ ان کی طبیعت میں سادگی بہت تھی اس لیے ان سے بہت سے لوگوں سے دوستی تھیں انہیں امید تھی کہ ان دوستوں کے ذریعے سے مجھے مقدمے دلوائیں گے ۔انہوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری وکالت خوب چلے گی اور اس توقع پر گھر کا خرچ بڑھا دیا تھا۔انہوں نے میری وکالت کے لیے زمین ہموار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

میرے برادری کے لوگوں میں میرے پردیس کے سفر کے سبب سے اب تک ہلچل مچی ہوئی تھی اس مسئلے نے برادری کو دو فرقوں میں تقسیم کر دے ا جن میں سے ایک نے تو مجھے فوراً پھر سے ذات میں شامل کر لیا مگر دوسرا میرے اخراج پر اڑا ہوا تھا۔ پہلے فریق کو خوش کرنے کے لیے میرے بھائی مجھے راجکوٹ لے جانے سے پہلے پاک دریا میں اشنان کرانے ناسک لے گئے اور راجکوٹ پہنچ کر انہوں نے برادری کو دعوت دی مجھے یہ باتیں پسند نہیں تھیں لیکن میرے بھائی کو مجھ سے بے حد محبت تھی اور میں دل و جان سے ان کی اطاعت کرتا تھا اس لیے جو وہ کہتے تھے میں چپ چاپ کرتا تھا اور ان کی مرضی کو قانون سمجھتا تھا۔

جس حلقے نے مجھے داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا میں نے اس میں جانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اس کے کسی سرکردہ کی طرف سے میرے دل میں ذرا بھی

شکایت نہ تھی۔ ان میں سے بعض مجھے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن میں بہت خیال رکھتا تھا ان کی رو سے میرے عزیزوں میں سے کوئی یہاں تک کہ میرے ساس، سسر اور سالے سالیاں بھی مجھے اپنے یہاں نہیں رکھ سکتے تھے اور میں ان کے یہاں پانی نہیں پی سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے تیار تھے کہ پوشیدہ طور پر اس ممانعت کی خلاف ورزی کریں لیکن یہ بات میری طبیعت کے خلاف تھی کہ جو کام کھلم کھلا نہ کر سکوں اسے چھپا کر کروں۔

میرے اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ برادری والوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا بلکہ جو لوگ مجھے اب تک برادری سے خارج سمجھتے ہیں ان میں سے اکثر نے میرے ساتھ ہمیشہ لطف و کرم کا برتاؤ کیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے میرے کام میں میری مدد کی ہے اور اس کے بدلے میں مجھ سے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ میں برادری کی کوئی خدمت کروں میرا عقیدہ یہ ہے کہ ان کا یہ حسن سلوک میرے عدم مزاحمت کا نتیجہ ہے اگر میں برادری میں داخل ہونے کے لیے جدوجہد کرتا اس میں اور تفریق ڈالنے کی کوشش کرتا، برادری والوں کو اشتعال دلاتا تو وہ مجھ سے بدلہ لیتے اور انگلستان سے آنے کے بعد میں اس طوفان سے محفوظ رہنے کے بجائے فتنہ وفساد کے گرداب میں مبتلا ہو جاتا اور کوئی عجب نہیں کہ مجھے ظاہر داری اور زمانہ سازی سے کام لینا پڑتا۔

بیوی سے میری تعلقات اب تک حسب دلخواہ نہیں تھے انگلستان کے قیام سے بھی میری بدگمانی کی عادت دور نہیں ہوئی تھی میں ذرا ذرا سی بات میں بے جا شک اور چڑچڑے پن سے کام لیتا تھا جس کے سبب سے میری دلی خواہشیں پوری نہیں ہوتی تھیں میں نے طے کیا تھا کہ اپنی بیوی کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں لیکن میری شہوت پرستی اس میں حائل ہوتی تھیں اور میرے عیبوں کی سزا انہیں بھگتنا پڑتی تھی ایک بار تو

میں نے یہاں تک کیا کہ انہیں میکے بھیج دیا اور جب تک بے چاری رنج سے ہلکان نہ ہو گئیں واپس نہیں بلایا۔ آگے چل کر میری سمجھ میں آیا کہ یہ سب باتیں محض میری حماقت کا نتیجہ تھیں۔

میں نے بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی تجویز سوچی تھی میرے بھائی کے کئی بچے تھے اور میرا لڑکا جسے گھر چھوڑ کر میں انگلستان گیا تھا اب چار برس کا تھا میری خواہش تھی کہ اب سب کو ورزش سکھا کر مضبوط اور جفاکش بناؤں اور خود ان کی نگرانی کیا کروں۔ اس میں میرے بھائی نے بھی مدد کی اور مجھے اپنی کوششوں میں کم و بیش کامیابی ہوئی مجھے بچوں کی صحبت بہت پسند تھی اور ان سے ہنسنے کھیلنے کی مجھے آج تک عادت ہے اس وقت سے میرا یہ خیال ہے کہ میں بچوں کے لیے اچھا معلم ہو سکتا ہوں۔

غذا کے ''ریفارم'' کی صریح ضرورت تھی، چائے اور قہوے کا استعمال گھر میں شروع ہو چکا تھا میرے بھائی چاہتے تھے کہ جب میں واپس آؤں تو مجھے تھوڑی بہت انگریزیت کی فضا ملے۔ اس خیال سے چینی کے برتن وغیرہ جو پہلے خاص خاص موقعوں کے لیے رکھے رہتے تھے اب روزمرہ استعمال ہونے لگے رہی سہی کمی میرے ''ریفارم'' نے پوری کر دی میں نے جئی کا دلیہ کھانا سکھایا اور کوکو کا استعمال اس نیت سے شروع کرایا کہ یہ چائے اور قہوے کے قائم مقام ہو جائے لیکن ہوا یہ کہ چائے اور قہوہ بدستور باقی رہا اور یہ ایک اور اضافہ ہو گیا۔ بٹ اور شو پہلے سے رائج تھے میں نے انگریزی لباس شروع کرا کے فرنگیت کی تکمیل کر دی۔

اس طرح خرچ بڑھتا گیا روز نئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ ہم نے ایک سفید ہاتھی دروازہ پر باندھ رکھا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اسے کھلائیں کہاں سے؟

راجکوٹ میں وکالت شروع کرنا اپنا مضحکہ کرانا تھا میری قابلیت ایک اچھے وکیل کے برابر نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا۔ کون موکل ایسا بیوقوف تھا کہ میرے پاس آتا؟ اور فرض کیجئے کوئی پھنس بھی جاتا تو کیا میں اپنی جہالت پر خود پسندی اور فریب کاری کا بھی اضافہ کر لیتا اور دنیا کا بوجھ اور بڑھا لیتا۔

دوستوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لیے بمبئی جاؤں وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں، ہندوستان کے قانون کا مطالعہ کروں اور مقدمے ملنے کے لیے ہاتھ پیر ماروں میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔

بمبئی میں گھر بار کے کام میں میرا مددگار ایک رسوئیا تھا جو میرے ہی جیسا نالائق تھا وہ ذات کا برہمن تھا میں اس سے ایسا برتاؤ نہیں کرتا تھا جیسا نوکروں سے کیا جاتا ہے بلکہ عزیزوں کی طرح پیش آتا تھا۔ وہ اپنے جسم پر پانی ڈالتا تھا مگر نہاتا کبھی نہ تھا۔ اس کی دھوتی اتنی ہی میلی رہتی تھی جتنا اس کا جنیو اور اسے مذہبی کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی لیکن مجھے کھانا پکانے کے لیے اور کوئی آدمی ملنا دشوار نہیں۔

میں اس سے کہا کرتا تھا'' بھئی راوی سنکر تم چاہے کھانا پکانا نہ جانتے ہو مگر'' سندھیا'' (روزمرہ کی پوجا) تو ضرور جانتے ہو گے؟''

'' سندھیا'' کیسی بابو صاحب ہماری '' سندھیا'' ہل ہے اور ہماری پوجا پھاوڑا ہے۔ میں تو ایسا ہی برہمن ہوں آپ کے پاس اس لیے آتا ہوں کہ آپ کی کرپا سے میری پرورش ہو جائے نہیں تو پھر اپنی کھیتی تو کہیں گئی نہیں۔

غرض مجھے راوی شنکر کا استاد بننا پڑا میں پکانے کا آدھا کام خود کرتا تھا اور ساگ تیار کرنے میں انگریزی طریقے سے کام لیتا تھا میں نے ایک گیس کا چولہا خرید لیا اور راوی شنکر کے ساتھ مل کر رسوئی بنانے لگا مجھے غیر ذات والوں کے ساتھ کھانے میں

کوئی تامل نہ تھا راوی شنکر کا پرہیز بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا دونوں میں خوب نبھنے لگی بس ایک دقت تھی راوی شنکر نے قسم کھائی تھی کہ ہمیشہ میلا رہے گا اور کھانے کو بھی میلا رکھے گا۔

مگر بمبئی میں میرے لیے چار یا پانچ مہینے سے زیادہ رہنا ناممکن تھا کیونکہ خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور آمدنی کچھ نہ تھی۔

اس طرح میری زندگی شروع ہوئی میں نے بیرسٹری کے پیشے کو برا پایا۔ نمائش بہت اور علم کم مجھے اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس تھا کہ میں اس کے بوجھ سے دبا جاتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

پہلا مقدمہ

بمبئی کے قیام کے زمانے میں ایک طرف تو میں نے ہندوستان قانون کا مطالعہ شروع کیا اور دوسری طرف غذائیات کے تجربے جس میں میرے دوست ویر چند گاندھی میرے شریک تھے۔ ادھر میرے بھائی میرے لیے مقدمے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہندوستانی قانون کے مطالعے سے میری طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ قانون ضابطہ فوجداری کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر قانون شہادت میں یہ بات نہ تھی، ویرچند گاندھی سالیسٹر کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور وہ مجھے بیرسٹروں اور وکیلوں کے متعلق طرح طرح کے قصے سنایا کرتے تھے سر فروز شاہ کی قابلیت کا راز یہ ہے کہ انہیں قانون پر پورا پورا عبور ہے قانون شہادت مجھے حفظ یاد ہے اور دفعہ بتیس کے متعلق سارے مقدمے نوک زبان میں ہیں بدرالدین کی بحث اس قیامت کی ہے کہ ججوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

ایسے ایسے نامی وکیلوں کا حال سن کر میری اہمیت پست ہو جاتی تھی وہ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہتے تھے "بیرسٹر کے لیے پانچ سات برس خالی بیٹھے رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں اسی لیے میں نے سالیسٹر کا کام شروع کیا ہے تمہاری اگر تین برس میں بھی چل نکلے تو غنیمت سمجھو۔"

خرچ ہر مہینے بڑھتا جاتا تھا باہر بیرسٹر کا سائن بورڈ لگانا اور گھر میں بھی بیرسٹری کا کام سیکھانا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا اس لیے میں یکسوئی سے مطالعہ نہیں کر سکتا تھا

مجھے قانون شہادت سے دلچسپی ہوگئی تھی اور متن کی دھرم شاستر میں نے بڑے شوق سے اور غور سے پڑھی تھی لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ کسی مقدمے کی پیروی کروں میری بے بسی بیان سے باہر ہے یہ حال تھا جیسے دلہن نئی نئی سسرال میں آتی ہے!

اس زمانے میں میرے پاس مامی بائی نام ایک عورت کا مقدمہ آیا یہ ایک خفیفہ کا معاملہ تھا مجھ سے لوگوں نے کہا ''تمہیں دلال کو کمیشن دینا پڑے گی میں نے قطعاً انکار کردیا''

مگر فوجداری کا فلاں نامی وکیل جس کی تین چار ہزار ماہوار کی آمدنی ہے وہ بھی دلالی دیتا ہے ''مجھے ان کی ریس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میرے لیے تین سو کافی ہے میرے والد کی آمدنی بھی اس سے زیادہ نہ تھی۔''

''اب وہ دن گئے بمبئی میں خرچ اتنا بڑھ گیا ہے کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ تمہیں کاروباری اصول کا لحاظ کرنا چاہیے۔''

میں ثابت قدم رہا مامی بائی کا مقدمہ بغیر دلالی دیئے ہوئے مجھے مل گیا سیدھا سادھا معاملہ تھا میں نے تیس روپیہ محنتانہ لیا ایک دن سے زیادہ کا کام نہ تھا۔

یہ عدالت خفیفہ میں میرا پہلا داخلہ تھا۔ میں مدعا علیہا کی طرف سے تھا اس لیے میرا کام یہ تھا کہ مدعی کے گواہوں سے جرح کروں میں کھڑا ہوا لیکن میرا دل بیٹھ گیا۔

میرے سر میں چکر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے میری سمجھ میں کوئی سوال نہیں آیا جو میں پوچھتا جج یقیناً ہنسا ہوگا اور وکیلوں کو اس تماشے سے لطف آیا ہوگا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا میں بیٹھ گیا اور میں نے مختار سے کہا کہ میں پیروی نہیں کرسکتا تم مجھ سے فیس واپس لو اور پٹیل کو وکیل کرلو۔ پٹیل صاحب نے

اکاون روپے لیے اور وکالت نامہ داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے یہ مقدمہ بچوں کا کھیل تھا۔

میں عدالت سے جلدی سے اٹھ کر چل دیا اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی کہ میری موکلہ جیتی یا ہاری مگر مجھے بڑی شرم آئی اور میں نے یہ طے کیا کہ آئندہ کوئی مقدمہ اس وقت تک نہ لوں گا جب تک مجھ میں پیروی کرنے کی ہمت نہ پیدا ہو جائے اور سچ مچ میں نے اس کے بعد جنوبی افریقہ ہی میں عدالت میں قدم رکھا اس فیصلے میں میری کوئی تعریف نہ تھی عصمت بی بی از پے چادری کا معاملہ تھا بھلا ایسا کون سا بیوقوف تھا کہ مجھے ہارنے کے لیے مقدمہ دیتا۔

لیکن بمبئی میں مجھے ایک معاملہ اور ملا یہ ایک عرضداشت لکھنے کا کام تھا ایک غریب مسلمان کی زمین پوربندر میں ضبط کر لی گئی تھی وہ مجھے نیک باپ کا سپوت بیٹا سمجھ کر میرے پاس آیا اس کا دعویٰ بظاہر کمزور تھا لیکن میں اس شرط پر اس کی طرف سے عرضداشت لکھنے پر راضی ہو گیا کہ چھپائی کا خرچ اس کے ذمے رہے۔ میں نے اس کا مسودہ لکھ کر دوستوں کو سنایا انہوں نے پسند کیا اور اس سے مجھے تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ میں عرضداشت لکھنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور یہ واقعہ بھی تھا۔

اگر میں بغیر فیس کے عرضداشتیں لکھا کرتا تو مجھے خوب کام ملتا لیکن اس سے پیٹ کا دھندا کیسے چلتا؟ اس لیے میں نے یہ سوچا کہ مدرسی کروں میری انگریزی اچھی تھی اور اگر مجھے کسی سکول میں انٹرنس کے لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کا کام مل جاتا تو میں بڑی خوشی سے کرتا اس طرح میرے خرچ کا کچھ حصہ تو نکل ہی آتا میں نے اشتہار دیکھا ''ضرورت ہے، انگریزی کے مدرس کی ایک گھنٹہ روز سبق تنخواہ پچھتر روپیہ'' یہ اشتہار ایک مشہور سکول کی طرف سے تھا میں ملاقات کے لیے طلب ہوا اور خوش خوش

پہنچا۔ مگر جب پرنسپل کو معلوم ہوا کہ میں گریجوٹ نہیں ہوں تو انہوں نے افسوس کے ساتھ انکار کر دیا۔

''مگر میں نے لندن میٹریکولیشن پاس کیا ہے اور میری اختیاری زبان لاطینی تھی''

''یہ سچ ہے مگر ہمیں تو گریجویٹ چاہیے''

ایسی صورت میں مجبوری تھی میں مایوس ہو کر کف افسوس ملنے لگا میرے بھائی کو بھی بڑی تشویش تھی ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اب بمبئی میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہمیں راجکوٹ میں رہنا چاہیے وہاں میرے بھائی کی وکالت تھوڑی بہت چلتی ہے اور وہ مجھے درخواستیں اور عرضداشتیں لکھنے کا کام دے سکتے ہیں۔ پھر راجکوٹ میں گھر بار موجود ہی ہے اس لیے بمبئی میں گھر لے کر رہنے کا بھاری خرچ بچ جائے گا مجھے یہ تجویز پسند آئی اس طرح بمبئی میں چھ مہینے قیام کرنے کے بعد میں بوریا بستر اٹھا کر چل دیا۔

بمبئی میں ہائی کورٹ جایا کرتا تھا لیکن میں نے وہاں کبھی بھی نہیں سیکھا میں اتنی قابلیت ہی نہیں رکھتا تھا کہ وہاں جانے سے پورا فائدہ اٹھا سکوں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مقدمے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے اور میں اونگھنے لگتا تھا اس معاملے میں اور لوگ بھی میرے ساتھی تھے اس لیے میرے شرم کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا بلکہ کچھ دن کے بعد تو شرم کا احساس ہی نہیں رہا کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہائیکورٹ میں اونگھنا فیشن میں داخل ہے۔

اگر آج کل بھی بمبئی میں میرے جیسے بیکار بیرسٹر ہیں تو میں انہیں زندگی کا ایک عملی نکتہ بتاتا ہوں اگرچہ میں گرگام میں رہتا تھا لیکن بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ گاڑی یا اس کے بغیر میں نے ہائی کورٹ پیدل جانے کا معمول کر لیا تھا اور وہاں جانے میں

پورے دس روپے روزانہ لگتے تھے اور واپس بھی ہمیشہ پیدل ہی آتا تھا دھوپ میں چلنے کی میں نے عادت ڈال لی تھی عدالت پیدل آنے جانے سے خاصی رقم بچتی تھی اور پھر یہ فائدہ تھا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میری طبیعت کبھی ناساز نہیں ہوئی۔ حالانکہ میرے دوست جو بمبئی میں مقیم تھے بیمار رہا کرتے تھے جب میں روپیہ کمانے لگا تب بھی میں نے پیدل دفتر آنے جانے کی عادت رقم رکھی اور اس سے میری صحت کو جو فائدہ پہنچا اس کا اثر آج تک محسوس ہو رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

پہلا دھچکا

میں مایوس ہو کر بمبئی سے راجکوٹ آیا اور یہاں میں نے اپنا دفتر قائم کر لیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا۔ درخواستوں اور عرضداشتوں کے مسودے لکھ کر میں اتنا کما لیتا تھا کہ میری آمدنی کا اوسط تین سو روپے ماہوار تھا یہ کام مجھے میری قابلیت کی بدولت نہیں بلکہ تعلقات کی بناء پر ملتا تھا کیونکہ جن وکیلوں کی شرکت میں میرے بھائی کام کرتے تھے ان کی وکالت بہت اچھی چلتی تھی جو درخواستیں وغیرہ ان کے نزدیک واقعی اہم تھیں وہ نامی بیرسٹروں کے پاس بیٹھتے تھے میرے حصے میں غریب موکلوں کی درخواستیں آتی تھیں۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرا کمیشن دینے کا اصول جس پر میں بمبئی میں بہت سختی سے عامل تھا یہاں پوری طرح قائم نہیں رہ سکا مجھ سے یہ کہا گیا کہ ان دونوں صورتوں میں بہت اختلاف ہے بمبئی میں کمیشن دلالوں کو دینا پڑتا تھا اور یہاں وکیلوں کو دیا جاتا ہے جن سے مقدمے ملتے ہیں یہاں بھی بمبئی کی طرح سارے بیرسٹر اپنی فیس میں سے چند فیصد کمیشن کے طور پر دیتے ہیں میرے بھائی نے جو دلیل پیش کی اس کا مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ میں ایک وکیل کی شرکت میں کام کرتا ہوں میں ہمیشہ یہ چاہوں گا کہ ہمارے مقدموں میں سے جتنے تمہارے بس کے ہوں وہ تمہیں دے دیئے جائیں اب اگر تم میرے شریک کو کمیشن دینے سے انکار کر دو گے تو میں بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا میرا تمہارا گھر بار ایک ہے اس لیے تمہاری فیس ہم دونوں کے کام آتی ہے اور مجھے اس

میں سے خود بخود حصہ مل جاتا ہے مگر میرا شریک کہاں جائے؟ فرض کرو جو مقدمہ وہ تمہیں دیتا ہے وہ کسی اور بیرسٹر کو دے تو اسے کمیشن ملے گا یا نہیں، میں اس وکیل سے دھوکے میں آ گیا اور میں نے سمجھا کہ اگر مجھے بیرسٹری کرنا ہے تو میں ان صورتوں میں اپنے کمیشن والے اصولوں پر زور نہیں دے سکتا۔ میں نے اس طرح اپنے آپ کو سمجھایا بلکہ تکلف برطرف، اپنے ضمیر کو فریب دیا لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہیے کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے سوائے، اس صورت کے کسی مقدمے میں کمیشن نہیں دیا۔

اب میرا خرچ تنگی ترشی سے چلنے لگا مگر اسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار غم اور غصہ کا دھچکا لگا۔ میں نے سنا تھا کہ برطانوی حاکم کیسے ہوتے ہیں مگر مجھے اب تک کسی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

میرے بھائی آنجہانی رانا صاحب پوربندر کے تخت نشین ہونے سے پہلے ان کے سیکرٹری اور مشیر رہے تھے آج کل ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں ممدوح کو غلط مشورہ دیا تھا معاملہ پولیٹکل ایجنٹ تک پہنچا جو میرے بھائی سے پہلے سے بدظن تھے میں ان صاحب سے انگلستان میں مل چکا تھا اور وہاں ان کا برتاؤ مجھ سے خاصا دوستانہ تھا۔ میرے بھائی کا خیال تھا کہ مجھے اس دوستی سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور پولیٹکل ایجنٹ سے مل کر ان کی سفارش کرنا چاہیے تاکہ ان کے دل میں جو بدگمانی ہے وہ دور ہو جائے مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی میں نے دل میں سوچا کہ مجھے انگلستان کی معمولی سی ملاقات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں اگر میرے بھائی واقعی قصوروار ہیں تو میری سفارش سے کیا فائدہ اور اگر وہ بے قصور ہیں تو انہیں باقاعدہ عرضداشت پیش کرنا چاہیے اور اپنی بے گناہی پر بھروسہ کر

کے بے کھٹکے نتیجے کا منتظر رہنا چاہیے میرے بھائی اس مشورے سے خوش نہیں ہوئے۔

انہوں نے کہا ''تم ابھی کاٹھیاوار کی حالت سے واقف نہیں اور دنیا کا تجربہ بھی نہیں رکھتے یہاں تو بس سفارش ہی سے کام چلتا ہے تم میرے بھائی ہو جب تم صریحاً ایک حاکم کو جانتے ہو اور اس سے میری سفارش کر سکتے ہو تو تمہیں اپنے فرض سے جی چرانا مناسب نہیں۔''

میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے جبراً قہراً پولیٹکل ایجنٹ کے پاس گیا میں جانتا تھا کہ مجھے اس معاملے میں ان سے کچھ کہنے سننے کا حق نہیں اور مجھے پورا احساس تھا کہ میں اپنی خودداری کو نقصان پہنچا رہا ہوں لیکن میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی اور انہوں نے قبول کر لی میں نے انہیں پرانی واقفیت یاد دلائی لیکن مجھے فوراً یہ محسوس ہو گیا کہ کاٹھیاوار اور انگلستان میں فرق ہے اور انگریز حاکم رخصت کی حالت میں کچھ اور ہوتا ہے اور اپنے کام پر کچھ اور پولیٹکل ایجنٹ صاحب نے واقفیت کا اقرار کیا لیکن اس کے یاد دلانے سے وہ مجھ سے کھنچ گئے ان کی یہ کشیدگی اور ان کے تیور زبان حال سے کہہ رہے تھے کہیں تم سے شناسائی سے بیجا فائدہ اٹھانے تو نہیں آئے ہو۔ اس پر میں نے اپنا مدعا کہہ ڈالا۔ صاحب جھولا کر بولے تمہارا بھائی بڑا فطرتی آدمی ہے میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا اگر تمہارے بھائی کو کچھ کہنا ہے تو اس سے کہو کہ ضابطہ کی درخواست پیش کرے یہ جواب کافی تھا اور شاید میں اس کا مستحق بھی تھا مگر غرض مند اندھا ہوتا ہے میں اپنا دکھڑا روتا رہا اور صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

میں نے کہا ''مگر میری پوری بات تو سن لیجئے'' یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا

انہوں نے چپڑاسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازے کے باہر پہنچا دے۔ میں اب تک پس و پیش کر رہا تھا کہ چپڑاسی نے آ کر دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھے اور مجھے کمرے میں باہر نکال دیا۔

صاحب اور چپڑاسی دونوں ہٹ گئے اور میں غصے میں بھرا ہوا چلا آیا۔ میں نے فوراً اس مضمون کا رقعہ لکھ کر بھیجا آپ نے میری ہتک کی آپ اپنے چپڑاسی کے توسط سے مجھ پر حملہ کرنے کے مرتکب ہوئے اگر آپ نے اس کی تلافی نہ کی تو مجھے قانونی چارہ جوئی کرنا پڑے گی۔

ذرا سی دیر میں ایک سوار کے ساتھ یہ جواب پہنچا

''تم نے مجھ سے گستاخی کا برتاؤ کیا میں نے تم سے کہا کہ چلے جاؤ مگر تم نہیں گئے اب سواء اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ میں چپڑاسی سے کہوں تمہیں دروازے کے باہر پہنچا دے اس کے کہنے پر بھی تم دفتر سے نہیں ہلے اسے مجبوراً اتنی جسمانی قوت سے کام لینا پڑا جتنی تمہیں ہٹانے کے لیے ضروری تھی تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو چارہ جوئی کرو''

یہ جواب جیب میں رکھے ملول اور دل شکستہ میں گھر آیا اور اپنے بھائی سے سارا ماجرا بیان کیا انہیں بہت رنج ہوا مگر وہ حیران تھے کہ مجھے کیونکر تسکین دیں انہوں نے اپنے ملنے والے وکیلوں سے گفتگو کی کیونکہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ صاحب پر مقدمہ کس طرح چلایا جائے اس زمانے میں اتفاق سے سر فیروز شاہ مہتا کسی مقدمہ میں بمبئی سے راجکوٹ آئے ہوئے تھے مگر میرے جیسے مبتدی وکیل میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ ان سے مل سکتا۔ اس لیے میں نے ان وکیل کی معرفت جنہوں نے انہیں بلایا تھا اپنے مقدمے کے کاغذات ان کے پاس بھیجے اور ان سے التجا کی کہ

مجھے مشورہ دیں انہوں نے کاہ گاندھی سے کہہ دو کہ یہ باتیں وکیلوں اور بیرسٹروں کو روزمرہ پیش آتی ہیں انہیں انگریز حکام کا تجربہ نہیں ہے اگر وہ کچھ کمانا چاہتے ہیں اور چین سے رہنا چاہتے ہیں تو رقعے کو پھاڑ ڈالیں اور بات کو پی جائیں صاحب پر مقدمہ چلانے سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ خود ہی تباہ ہو جائیں تو مجب نہیں ان سے کہو کہ ابھی کچھ دن سیکھیں کہ زندگی کیا چیز ہے۔

یہ نصیحت مجھے زہر کی طرح کڑوی معلوم ہوئی مگر یہی داروئے تلخ پینا پڑی میں اس توہین کو چپ چاپ پی گیا اور میں نے اس سے آئندہ کے لیے سبق بھی حاصل کیا میں نے اپنے دل میں عہد کرلیا کہ اب میں کبھی ایسے پھیر میں نہ آؤں گا مجھے اپنے اصولوں کے خلاف عمل کرنا پڑے اور کبھی دوستی سے یوں بیجا فائدہ نہ اٹھاؤں گا اس وقت سے آج تک میں نے کبھی اس عہد کو نہیں توڑا اس دھچکے نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جنوبی افریقہ جانے کی تیاریاں

بے شک یہ میری غلطی تھی کہ میں پولیٹکل ایجنٹ کے پاس گیا لیکن ان کا یہ طیش اور قہر میری غلطی کے تناسب سے کہیں زیادہ تھا میں نے ایسا قصور نہیں کیا تھا کہ نکال دیا جاتا۔ میں نے ان کا پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا ہوگا لیکن انہیں تو میرا بات کرنا ہی ناگوار تھا وہ چاہتے تو مجھ سے آدمیت سے کہہ دیتے کہ چلے جاؤ مگر وہ تو حکومت کے نشے میں چور تھے آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ ان صاحب کے صفات حسنہ میں تحمل داخل نہ تھا ان کی عادت تھی کہ جو ملاقات کے لیے آتا اس کی توہین کرتے۔ کوئی بات ذرا بھی خلاف مزاج ہوئی اور صاحب بگڑے۔

اب وقت یہ تھی میرے مقدمے زیادہ تر انہی کی عدالت میں ہوتے تھے ان کے غصے کو دور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی مجھے ان کی چاپلوسی کرنے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ایک بار نالش کی دھمکی دے کر چپ چاپ رہنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا اس عرصے میں مجھے اپنے ملک کے ادنی درجے کی سیاسی چالوں کا حال معلوم ہوا۔ کاٹھیا وار بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ ہے اس لیے قدرتی طور پر یہاں جوڑتوڑ لگانے والوں کی کمی نہ تھی ریاستوں کا باہمی ساز باز کرنا اور عہدیداروں کا اپنی قوت بڑھانے کے لیے سازشیں کرنا معمولی بات تھی رئیس ہر وقت اپنے رازداروں سے دبے رہتے تھے اور خوشامدیوں کی باتوں پر فوراً اعتبار کر لیتے تھے صاحب کے چپڑاسی تک کی خوشامد کرنا پڑتی تھی اور سر رشتہ دار تو گویا صاحب کے بھی آقا تھے کیونکہ وہی ان کے آنکھ کان تھے انہیں ہر چیز ترجمہ کر کے

سمجھاتے تھے سر رشتہ دار کی مرضی قانون تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان کی آمدنی صاحب سے زیادہ تھی ممکن ہے کہ یہ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا خرچ بہت تھا اور تنخواہ اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ فضا مجھے زہریلی معلوم ہوتی تھی اور میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ اس کے اثر سے کیونکہ محفوظ رہوں۔

میں بہت پژمردہ رہتا تھا اور میرے بھائی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے ہم دونوں کا خیال تھا کہ اگر مجھے کوئی مستقل کام مل جائے تو اس سازش کی فضا سے چھٹکارا ہو جائے لیکن بغیر سازش کے دیوانی یا جج ملنا ناممکن تھا اور وکالت میں یہ دقت تھی کہ صاحب سے جھگڑا ہو گیا تھا۔

پوربند میں اس زمانے میں راجہ صاحب با اختیار نہ تھے انگریزی حکومت کی طرف سے ایک منتظم مقرر تھے مجھے ان سے اس لیے ملنا تھا کہ راجہ صاحب کو کچھ اختیارات دلواؤں اور امیروں پر جو بھارتی اوگوتی (مالگذاری) باندھ دی گئی ہے اسے کم کراؤں یہ منتظم تھے تو ہندوستانی مگر میں نے انہیں صاحب سے بھی مغرور پایا۔ یہ قابل آدمی تھے مگر ان کی قابلیت کی بدولت رعایا کچھ خوش حال نہیں معلوم ہوتی تھی میں راجہ صاحب کو تھوڑے بہت اختیارات دلوانے میں کامیاب ہوا لیکن امیروں کی کوئی دادرسی نہ ہو سکی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کے معاملے پر اچھی طرح غور تک نہیں کیا گیا۔

غرض یہاں بھی مجھے اپنی کوشش میں ایک لحاظ سے مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ میرے موکلوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا لیکن کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا تھا زیادہ سے زیادہ میں پولیٹکل ایجنٹ یا گورنر کے یہاں اپیل کر سکتا تھا مگر وہ یقیناً میرے

اپیل کو خارج کر دیتے اور مداخلت کرنے سے انکار کرتے۔ اگر ان فیصلوں کی نگرانی کے لیے کوئی قاعدہ یا ضابطہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی مگر وہاں تو صاحب کی مرضی قانون تھی۔

میں یہاں کی زندگی سے اور بھی بیزار ہو گیا۔

اس عرصے میں ایک میمن نے جن کی دوکان پوربندر میں تھی میرے بھائی کو یہ پیغام بھیجا ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں ہمارو کاروبار بڑا ہے اور وہاں عدالت میں ہمارا ایک بڑا مقدمہ ہے جس میں ہماری طرف سے چالیس ہزار پونڈ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ بہت دن سے چل رہا ہے ہم نے بہترین وکیلوں اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ان کے لیے بھی اچھا ہے اور ہمارے لیے بھی وہ ہمارے وکیلوں کو ہم سے بہتر ہدایات دے سکیں گے۔ انہیں یہ فائدہ ہے کہ ایک نئے **ملک** کی سیر کر لیں گے اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔

بھائی صاحب نے مجھ سے اس معاملے میں گفتگو کی میں یہ صاف طور پر نہیں سمجھ سکا کہ مجھے صرف وکیلوں کو ہدایتیں دینا ہو گی یا عدالت میں بھی جانا پڑے گا مگر بات ایسی تھی کہ میرا جی للچا گیا۔

بھائی صاحب نے مجھ سیٹھ عبدالکریم جھاویری سے ملوایا۔ یہ اسی عبداللہ کمپنی میں جس کا یہ معاملہ تھا حصہ دار تھے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں انہیں نے کہا وہاں ہماری بڑے بڑے یورپیوں سے دوستی ہے آپ کی بھی ان سے ملاقات ہو جائے گی آپ سے دوکان کے کام میں بھی مدد ملے گی ہماری خط و کتابت زیادہ تر انگریزی میں ہوتی ہے اس میں آپ ہاتھ بٹا لیں گے ظاہر ہے

کہ آپ وہاں ہمارے مہمان ہوں گے اور آپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔

میں نے پوچھا آپ میری خدمات کتنے دن کے لیے چاہتے ہیں اور معاوضہ کیا ہو گا۔

''آپ کو ایک سال سے زیادہ نہیں لگے گا ہم آپ کو آنے جانے کا اول درجے کا کرایہ دیں گے اور کل اخراجات کے علاوہ ایک سو پانچ پاونڈ اور''

یہ بیرسٹر کی حیثیت سے جانا تو کہا نہیں جا سکتا یوں کہنا چاہیے کہ میں دوکان کے ایک ملازم کی حیثیت سے جا رہا تھا لیکن مجھے تو یہ فکر تھی کہ کسی طرح ہندوستان سے نکلوں پھر یہ لالچ تھا کہ نیا ملک دیکھنے میں آئے گا اور نیا تجربہ حاصل ہو گا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ایک سو پانچ پاونڈ بھائی صاحب کو بھیج سکوں گا جس سے گھر کے خرچ میں مدد ملے گی غرض میں نے بغیر ردوبدل کیے ان شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

نٹال پہنچنا

جنوبی افریقہ جاتے وقت مجھے وہ جدائی کا درد محسوس نہیں ہوا جو انگلستان جاتے وقت ہوا تھا اب میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا میں دنیا دیکھ چکا تھا اور غیر ملکوں کے سفر کا تجربہ حاصل کر چکا تھا اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ راجکوٹ سے بمبئی جانا غیر معمولی بات ہو۔

اس بار صرف مجھے اپنی بیوی کی جدائی شاق گزری۔ میرے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ایک اور بچہ پیدا ہو چکا تھا ہم دونوں کی محبت ابھی شہوانی خواہش سے خالی نہ تھی مگر روز بروز پاک ہوتی جاتی تھی جب سے میں یورپ سے واپس آیا مجھے بہت کم ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔ اب میں جیسا کچھ برا بھلا مجھ سے ممکن تھا انہیں پڑھاتا تھا اور بعض اصلاحوں میں ان کی مدد کرتا تھا اس لیے ہم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہم زیادہ دن یکجا رہیں تا کہ یہ اصلاحیں جاری رہ سکیں لیکن جنوبی افریقہ کے شوق میں فراق کا صدمہ برداشت کرنے کو تیار ہو گیا میں نے انہیں یہ کہہ کر تسکین دی ہم دونوں ایک سال میں ضرور ملیں گے اور راجکوٹ سے بمبئی روانہ ہو گیا۔

یہاں مجھے دادا عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کے ذریعہ سے جہاز کا ٹکٹ لینا تھا مگر جو جہاز جانے والا تھا اس میں بالکل جگہ نہ تھی اور مجھے یہ مشکل کہ اگر اس جہاز سے نہ جاؤں تو بمبئی میں بیکار پڑا رہنا پڑے۔ ایجنٹ نے کہا ہم نے اول درجے کا ٹکٹ لینے کی انتہائی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ہاں آپ ڈیک پر جانا چاہیں تو جا سکتے

ہیں اس کا انتظام کر دیا جائے گا کہ کھانا آپ دوسرے مسافروں کے ساتھ کمرے میں کھا سکیں'' یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں اول درجے سے کم میں سفر ہی نہیں کرتا تھا اور یوں بھی بھلا بیرسٹر صاحب ڈیک پر کیسے جا سکتے ہیں، اس لیے میں نے اس دعوت سے انکار کر دیا مجھے ایجنٹ کی سچائی میں شبہ تھا کیونکہ یہ یقین نہیں آتا تھا کہ اول درجے میں کوئی جگہ خالی نہیں۔ آخر اس کی رضامندی سے میں خود کوشش کرنے نکلا میں جہاز پر گیا اور کپتان سے ملا اس نے صاف صاف کہہ دیا ہمارے یہاں عام طور پر مسافروں کی اتنی کثرت نہیں ہوتی لیکن چونکہ مزنبیق کے گورنر جنرل اس جہاز پر جا رہے ہیں اس لیے سب جگہیں بھر گئی ہیں۔''

میں نے پوچھا کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ میرے لیے کسی طرح گنجائش نکال دیں اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا اور مسکرا کر کہا صرف ایک صورت ہے میرے کیبن میں ایک زائد جگہ ہے جو عموماً مسافروں کو نہیں دی جاتی مگر میں آپ کو دے دوں گا میں نے شکریہ ادا کیا اور ایجنٹ کو بھیج کر ٹکٹ منگوالیا اپریل 1893ء میں میرے دل میں بڑے ولولے سے ہوئے قسمت آزمائی کرنے جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔

پہلی بندرگاہ جہاں جہاز ٹھہرا لاموتھی۔ ہم یہاں تیرہ دن میں پہنچے اس عرصے میں مجھ میں اور کپتان میں بڑی دوستی ہو گئی اسے شطرنج کھیلنے کا شوق تھا مگر وہ نو آموز تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا شخص ساتھ کھیلنے کو ملے جو اس سے بھی زیادہ کھیلتا ہو۔ اس لیے اس نے مجھ سے کھیلنے کی فرمائش کی میں نے اس کھیل کی بہت تعریف سنی تھی مگر کھیلا نہ تھا کھیلنے والے کہا کرتے تھے کہ اس میں ذہانت سے کام لینے کا بہت موقع ہے کپتان نے کہا تمہیں کھیلنا سکھا دوں گا اور چونکہ مجھ میں صبر بے حد تھا اس لیے وہ مجھے بڑا مستعد شاگرد سمجھتا تھا ہر بار میں ہی ہارتا تھا اس لیے وہ مجھے اور بھی شوق سے

سکھاتا تھا کھیل مجھے پسند آیا مگر میری رغبت بس جہاز ہی تک رہی اور میری معلومات سیدھی سادھی چالوں سے آگے نہیں بڑھی۔

لامو میں جہاز تین چار گھنٹے لنگر انداز رہا اور میں نیچے اتر کر بندرگاہ دیکھنے گیا۔ کپتان بھی کنارے پر گیا مگر اس نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ یہاں سمندر کی حالت اعتبار کے قابل نہیں اور تاکید کر دی کہ ذرا پہلے سے لوٹ آؤں۔

یہ چھوٹی سی جگہ تھی میں ڈاک خانے پہنچا وہاں میں ہندوستانی کلرکوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ان سے باتیں کرنے لگا مجھے افریقی بھی نظر آئے اور میں نے ان کے طرز زندگی سے جس سے مجھے بہت دلچسپی تھی واقف ہونے کی کوشش کی اس میں کچھ دیر لگ گئی۔

چند ڈیک کے مسافر بھی جن سے مجھے بہت واقفیت ہو گئی تھی ساحل پر آئے تھے کہ ذرا اطمینان سے کھانا پکا کر کھائیں میں نے دیکھا کہ وہ واپسی کی تیاری کر رہے ہیں اور ہم سب کے سب ایک ہی کشتی میں بیٹھ گئے سمندر باڑھ پر تھا اور ہماری کشتی مناسب مقدار سے زیادہ لدی ہوئی تھی پانی کا دھارا اتنا تیز تھا کہ کشتی جہاز کی سیڑھی کے برابر کسی طرح نہیں ٹھہرتی تھی روانگی کی پہلی سیٹی بج چکی تھی میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ کپتان اوپر کھڑا ہماری پریشانی دیکھ رہا تھا اس نے جہاز کو اور پانچ منٹ ٹھہرانے کا حکم دیا جہاز کے قریب ایک اور کشتی تھی جسے ایک دوست دس روپے میں میرے لیے کرایہ پر لے لیا۔ اس کشتی نے مجھے جہاز کے قریب پہنچایا سیڑھی اٹھالی گئی تھی اس لیے میں ایک رسی کے ذریعہ سے اوپر کھینچا گیا اور جہاز فوراً روانہ ہو گیا دوسرے مسافر رہ گئے اب مجھے کپتان کی نصیحت کی قدر ہوئی۔

لامو کے آگے دوسری بندرگاہ ممباسا تھی اور تیسری زنجبار یہاں کوئی آٹھ دس

دن ٹھہرنا پڑا اور یہاں سے ہم دوسرے جہاز میں سوار ہوئے۔

کپتان کو مجھ سے انس ہو گیا تھا مگر اس انس کی بدولت ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ اس نے مجھے اور انگریز دوست کو اپنے ساتھ سیر کرنے کی دعوت دی ہم تینوں ایک کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر گئے میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس سیر کے کیا معنی ہیں اور کپتان بے چارہ کیا جانے کہ میں ان معاملات میں کتنا سادہ لوح ہوں ایک دلال ہم لوگوں کو حبشی عورتوں کے یہاں لے گیا اور اس نے ہم تینوں کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں پہنچا دیا میں دم بخود کھڑا تھا اور شرم سے گرا جاتا تھا خدا جانے وہ بے چاری عورت مجھے کیا سمجھتی ہوگی۔ جب کپتان نے مجھے پکارا تو جیسا گیا تھا ویسا ہی آ گیا اس نے میرے چہرہ سے میری پاکدامنی معلوم کر لی پہلے تو مجھے بہت شرم آئی لیکن چونکہ اس فعل کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے اس لیے شرم کا احساس رفتہ رفتہ جاتا رہا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس عورت کو دیکھ کر میرے دل میں ذرا بھی بدی نہیں آئی مجھے اپنے آپ سے نفرت آتی تھی کہ میں نے جرأت سے کام لے کر کمرے میں جانے سے انکار کیوں نہ کر دیا۔

میری زندگی میں یہ اس قسم کی تیسری آزمائش تھی خدا جانے کتنے نوجوان جو ابتداء میں پاکدامن ہوں گے جھوٹی شرم کی بدولت گناہ میں آلودہ ہو گئے ہوں گے۔ میری اس میں کوئی تعریف نہیں کہ میں بے داغ بچ کر چلا آیا۔ تعریف تو جب ہوتی کہ میں کمرے میں جانے ہی سے انکار کر دیتا۔ مجھے اس رحمٰن و رحیم کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ اس واقعے سے مجھے ذات الٰہی پر اور بھی عقیدہ ہو گیا اور ایک حد تک جھوٹی شرم سے نجات ملی۔

چونکہ اس بندرگاہ میں ایک ہفتہ ٹھہرنا تھا اس لیے میں نے شہر میں کمرے کرائے

پڑے لیے اور آس پاس پھر کر خوب سیر کی زنجبار میں درختوں اور سبزہ زاروں کی کثرت تھی اس کا اندازہ اگر ہو سکتا ہے تو لابار کو دیکھ کر مجھے وہاں کے اونچے درختوں اور بڑے بڑے پھلوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اس کے بعد مزنبیق میں قیام ہوا اور وہاں سے چل کر ہم مئی کے آخر میں نٹال پہنچ گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

چند تجربے

نٹال کی بندرگاہ ڈربن ہے اسے پورٹ نٹال بھی کہتے ہیں وہاں عبداللہ سیٹھ مجھے لینے کے لیے آئے جب جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچا تو میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے جہاز پر آئے تھے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستانی کچھ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے عبداللہ سیٹھ کے جاننے والوں کا جو برتاؤ ان کے ساتھ تھا اس سے ایک طرح کی رعونت ظاہر ہوئی تھی جس سے میرے دل پر چوٹ لگی عبداللہ سیٹھ اس کے عادی ہو گئے تھے مجھے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے میں اپنے لباس کے سبب سے اور ہندوستانیوں سے ممتاز نظر آتا تھا۔ میں فراک کوٹ پہنے تھا اور میرے سر پر بنگالی وضع کی پگڑی تھی۔

ہمیں دکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرے میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت کا اندازہ کرنے میں دقت ہوئی ان کاغذات کو پڑھ کر جو ان کے بھائی نے میرے ساتھ بھیجے تھے وہ الجھن میں پڑ گئے وہ سمجھے کہ ان کے بھائی نے ان کے گھر ایک سفید ہاتھی بھیج دیا ہے۔ جسے کھلاتے کھلاتے دیوالہ نکل جائے گا۔ میرے لباس اور طرز معاشرت میں انہیں فرنگیوں کا سا اسراف نظر آیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس وقت کوئی خاص کام بھی نہیں جو ان حضرت کو دیا جا سکے۔ مقدمہ ٹرانسوال میں ہے فوراً وہاں بھیجنا بالکل فضول ہے پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قابلیت اور دیانت پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے میں تو پریٹوریا میں رہوں گا کہ ان کی نگرانی کرسکوں مدعا

دلیہ سب وہیں ہیں ممکن ہے کہ وہ لوگ ان پر ناجائز چھوٹے۔

مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا انہوں نے کہا اگر تم ایسا کرو گے تو بہت برا اثر پڑے گا تمہارے سبب سے ان لوگوں کی بات بگڑ جائے گی جو پگڑی باندھنے پر اڑے ہوئے ہیں اور تمہارے سر پر ہندوستانی پگڑی بھلی بھی معلوم ہوتا ہے اگر تم انگریزی ہیٹ لگاؤ تو ہوٹل کے بیرے معلوم ہونے لگو گے۔

یہ نصیحت مصلحت اندیشی، حب وطن اور کسی قدر تنگ نظری پر مبنی تھی مصلحت تو ظاہر ہے اور حب وطن نہ ہوتا تو وہ ہندوستانی پگڑی باندھنے پر اتنا زور کیوں دیتے۔

مگر بیرے کی حقارت آمیز پھبتی سے ایک طرح کی تنگ نظری ظاہر ہوتی تھی ہندوستانی پابند مزدوروں میں تین مذہب کے لوگ تھے۔ ہندو، مسلمان اور عیسائی آخر الذکر پابند مزدوروں کی اولاد تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا 1893ء ہی میں ان کی تعداد خاصی بڑی ہو گئی تھی وہ انگریزی لباس پہنتے تھے اور ان میں سے اکثر ہوٹلوں میں بیرے کا کام کر کے گزر کرتے تھے عبداللہ سیٹھ نے بھی انگریزی ہیٹ پر اعتراض کیا تو ان کا اشارہ اسی گروہ کی طرف تھا ہوٹل کا بیرا ہونا ذلت سمجھی جاتی تھی بہت سے لوگ اب تک اس خیال پر قائم ہیں۔

مجموعی حیثیت سے مجھے عبداللہ سیٹھ کی نصیحت پسند آئی میں نے اخباروں میں اس واقعہ کا حال لکھا اور اپنی پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا اس مسئلہ پر اخباروں میں خوب بحث ہوئی اور انہوں نے میرا لقب ''ناپسندیدہ نووارد'' رکھ دیا بعض میری تائید کرتے تھے اور بعض میری بیباکی پر اعتراض کرتے تھے۔

مگر جب تک جنوبی افریقہ میں رہا قریب قریب ہمیشہ پگڑی باندھتا رہا۔ البتہ ایک زمانے میں پگڑی ٹوپی وغیرہ سب چھوڑ دی تھی اور ننگے سر رہتا تھا۔ یہ کب ہوا

اور کیوں ہوا اس کا حال آگے چل کر معلوم ہوگا۔

تین دن کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہاں ہندوستانی چار طبقوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں پہلا طبقہ مسلمان تاجروں کا جو اپنے آپ کو عرب کہتے تھے دوسرا طبقہ چند محرروں اور تیسرا پارسی محرروں کا تھا ہندو محرر کسی شمار قطار میں نہ تھے سوائے ان لوگوں کے جو عربوں میں مل جل گئے تھے۔ پارسی محرر اپنے آپ کو ایرانی کہتے تھے۔ ان تینوں طبقوں میں آپس میں سماجی تعلقات تھے مگر سب سے بڑا طبقہ تامل تیلنگو اور شمالی پہچان کے پابند اور آزاد مزدوروں کا تھا۔ پابند مزدور وہ تھے جو پانچ سال کی ملازمت کا معاہدہ کر کے نٹال گئے اور گرمٹی کہلاتے تھے۔ ''گرمٹی'' ''گرمٹ'' سے نکلا ہے جو انگریزی کے لفظ ایگریمنٹ (معاہدہ) کی خرابی ہے مذکورہ بالا تینوں طبقے اس چوتھے طبقہ سے محض کاروباری تعلقات رکھتے تھے انگریز لوگ ان کو قلی کہتے تھے اور چونکہ اکثر ہندوستانی مزدور تھے اس لیے سبھی اقلی یا اسامی کہلاتے تھے سامی کا کل زبان کا لاحقہ ہے جو اکثر تامل تیلنگو کے آخر میں آتا ہے اور یہ اصل میں سنسکرت لفظ ''سوامی'' ہے جس کے معنی مالک کے ہیں اس لیے جب کسی ہندوستانی کو جس کی طبیعت میں ظرافت ہو کوئی شخص سامی کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو وہ یہ جواب دیتا تھا آپ مجھے اسامی کہتے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ اسامی کے معنی مالک کے ہیں میں آپ کا مالک تو نہیں ہوں بعض انگریز یہ سن کر جھینپ جاتے تھے بعض اس ہندوستانی کو گالیاں دیتے تھے بلکہ موقع ملے تو مار بیٹھتے تھے۔

کیونکہ ان کے نزدیک اسامی ''حقارت'' کا لفظ تھا اس کے معنی مالک بتانا گویا ان کی توہین کرنا تھا۔

اس لیے لوگ مجھے اقلی ''بیرسٹر'' کہتے تھے ہندوستانی تاجر اقلی تاجر کہلاتے ہیں رفتہ

رفتہ لوگ اقلی کے معنی بھول گئے تھے اور یہ ہندوستانیوں کا عام لقب ہو گیا تھا کسی مسلمان تاجر کو کوئی انگریز ''اقلی'' کہہ دے تو وہ بہت بگڑتا تھا اور کہتا تھا میں اقلی نہیں ہوں بلکہ عربی ہوں یا میں تاجر ہوں اور انگریز اگر مہذب ہوا تو اس سے معافی مانگ لیتا تھا۔

ایسی صورت میں پگڑی کا مسئلہ بہت اہم تھا پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے گویا چپ چاپ ذلت سہ لی اس لیے میں نے سوچا کہ اب ہندوستانی پگڑی کو خیرباد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہیے تاکہ میری ذلت نہ ہو اور ان ناگوار جھگڑے سے پیچھا اثر ڈالیں۔ اب اگر مقدمے کا کام نہیں دیا جا سکتا تو پھر اور کون سا کام دیا جائے۔ دوسرے کام تو میرے محرران سے کہیں اچھا کر لیتے ہیں اور محرر اگر غلطی کریں تو ان سے باز پرس ہو سکتی ہے لیکن اگر ان سے غلطی ہو تو کیا کیا جائے۔ اس لیے اگر مقدمے کے متعلق کوئی کام انہیں نہ دیا جائے تو گویا مفت میں ان کا بار میرے سر پڑ گیا۔

عبداللہ سیٹھ قریب قریب ان پڑھ تھے مگر ان کا تجربہ بہت وسیع تھا ان کی سوجھ بوجھ غضب کی تھی اور انہیں اس کا احساس بھی تھا مشق سے انہوں نے بس اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں مگر وہ اسی سے سارا کاروبار چلاتے تھے چاہے بینک کے مینجروں اور یورپی تاجروں سے معاملہ کرنا ہو یا وکیل کو مقدمہ سمجھانا ہو۔ ہندوستانی ان کی بڑی عزت کرتے تھے ان سب خوبیوں کے ساتھ ان میں ایک عیب تھا وہ فطری طور پر شکی واقع ہوئے تھے۔

انہیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کا مذہب اسلام ہے اور اس مذہب کے فلسفے پر تقریر کرنے کا انہیں بڑا شوق تھا وہ عربی نہیں جانتے تھے مگر قرآن مجید کی تفسیر اور عام اسلامی امور میں خاصا دخل رکھتے تھے مثالیں انہیں بڑی کثرت سے یاد تھیں اور جب چاہتے تھے ان سے کام لیتے تھے ان کی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی عملی واقفیت ہو گئی۔

جب ہم دونوں میں بے تکلفی ہوگئی تو ہم اکثر مذہبی مسئلوں پر بحث کیا کرتے تھے۔

میرے آنے کے دوسرے تیسرے دن وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے وہاں انہوں نے مجھے کئی آدمیوں سے ملوایا اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا۔ مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا۔آخر میں اس نے مجھ سے کہا ''پگڑی اتار ڈالو'' میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہاں بھی میری تقدیر میں لڑائی لڑنا لکھا ہے۔عبداللہ سیٹھ نے مجھے سمجھایا کہ بعض ہندوستانیوں کو پگڑی اتارنا پڑتا ہے انہوں نے کہا جو لوگ اسلامی لباس پہنتے ہیں وہ پگڑی باندھے رہتے ہیں لیکن اور ہندوستانیوں کو عموماً عدالت میں جاتے وقت پگڑی اتارنے کا حکم ہے۔

اس باریک فرق کو سمجھانے کے لیے مجھے کسی قدر تفصیل سے کام لینا چاہیے اور دو

☆☆☆☆☆☆☆

پریٹوریا کا سفر

مجھے تھوڑے دن میں عیسائی ہندوستانیوں سے جو ڈربن میں رہتے تھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ عدالت کے مترجم مسٹر پال رومن کیتھولک تھے مجھ سے ان کی ملاقات ہو گئی اور مسٹر سبحان گاڈفرے آنجہانی سے بھی جو اس زمانے میں پروٹسٹنٹ مشن میں مدرس تھے۔ ان کے بیٹے مسٹر جیمس گاڈفرے پارسال جنوبی افریقہ کے وفد کے رکن ہو کر ہندوستان آئے تھے اسی زمانے میں میں پارسی رستم جی آنجہانی اور آدم جی میاں جی خاں آنجہانی سے بھی ملا۔ ان سب دوستوں میں جو اس وقت تک ایک دوسرے سے صرف کاروبار کے سلسلے میں ملتے تھے بعد میں بہت گہرے تعلقات ہو گئے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

ادھر میں اپنے حلقہ ملاقات کو وسیع کر رہا تھا اور ادھر ہماری دکان کے نام وکیل کا خط آیا جس میں اطلاع ملی کہ اب مقدمے کی تیاریاں کرنے کا وقت ہے اور عبداللہ سیٹھ کو چاہیے یا تو وہ خود پریٹوریا جائیں یا اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں۔

عبداللہ سیٹھ نے مجھے یہ خط پڑھنے کو دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم پریٹوریا جاؤ گے میں نے کہا یہ میں اس وقت کہہ سکتا ہوں جب آپ سے مقدمہ سمجھ لوں ابھی تو میں حیران ہوں کہ میرا وہاں کیا کام ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے محرروں کو حکم دیا کہ مجھے مقدمہ سمجھائیں۔

جب میں مقدمے کا مطالعہ کرنے لگا تو یہ معلوم ہوا کہ مجھے ان معاملات میں الف ب سے شروع کرنا چاہیے جب میں زنجبار میں کچھ روز ٹھہرا تھا تو میں نے

عدالت میں جا کر وہاں کی کارروائی دیکھی تھی ایک پارسی وکیل گواہ سے جرح کے سلسلے میں بہی کھاتے کے متعلق سوال کر رہا تھا میں ایک حرف نہیں سمجھا۔ سیاق کا فن میں نے نہ تو سکول میں سیکھا تھا اور نہ انگلستان کے قیام کے زمانے میں اس مقدمے کا جس کے لیے میں جنوبی افریقہ آیا تھ دارومدار حساب کتاب پر تھا محرر لکھے جو کھے کی باتیں کرتا چلا گیا اور میری الجھن بڑھتی گئی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پی نوٹ کسے کہتے ہیں لغت میں بھی یہ لفظ نہیں ملا۔ میں نے محرر کے سامنے اپنی جہالت کا اظہار کیا اور اس سے معلوم ہوا کہ پی نوٹ سے پرامیسری نوٹ مراد ہے میں نے سیاق پر ایک کتاب خریدی اور اس کا مطالعہ کیا۔ اس سے مجھے کس قدر اطمینان ہوا مقدمہ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ عبداللہ سیٹھ جنہیں حساب لکھنا نہیں آتا تھا اتنی سوجھ بوجھ رکھتے تھے کہ سیاق کی پیچیدگیوں کو دم بھر میں سلجھا کے رکھ دیتے تھے میں نے ان سے کہا کہ میں پریٹوریا جانے کو تیار ہوں۔

انہوں نے پوچھا ''آپ ٹھہریں گے کہاں'' میں نے کہا ''جہاں آپ فرمائیں'' اچھا تو میں وکیل صاحب کو لکھ دوں گا وہ آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیں گے میں اپنے میمن دوستوں کو بھی اطلاع دے دوں گا لیکن میری رائے میں ان کے یہاں آپ کا ٹھہرنا مناسب نہیں فریق ثانی کا پریٹوریا میں بڑا اثر ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ہمارے خط پڑھ لے تو ہمیں بہت نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے آپ ان لوگوں سے ربط ضبط بڑھانے سے جتنا پرہیز کریں اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہے۔

''مجھے جہاں آپ کے وکیل ٹھہرائیں گے وہیں ٹھہروں گا یا اپنے طور کہیں علیحدہ مکان ڈھونڈ لوں گا آپ خاطر جمع رکھیں ہماری پوشیدہ باتوں کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی مگر یہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ فریق ثانی سے ملاقات بلکہ دوستی پیدا کروں۔

اگر ہو سکا تو میں یہ کوشش کروں گا کہ عدالت کے باہر آپس میں سمجھوتہ ہو جائے آخر سیٹھ طیب آپ کے عزیز ہی تو ہیں۔"

سیٹھ طیب حاجی خان محمد عبداللہ سیٹھ کے قریبی رشتہ دار تھے۔

سیٹھ کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ سمجھوتے کا نام سن کر کھٹک گئے لیکن مجھے ڈربن آئے چھ سات دن ہو چکے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف ہو گئے تھے اب میں سفید ہاتھی نہیں رہا تھا انہوں نے رک رک کر کہا:

ہاں۔۔۔۔۔۔ہے۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔اچھا عدالت کے باہر سمجھوتا ہو جائے تو کیا بات ہے لیکن ہم سب عزیز ہیں اور ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں طیب سیٹھ آسانی سے راضی ہونے والے آسامی نہیں۔ اگر ہم نے ذرا سی غفلت کی تو وہ ہم سے نہ جانے کیا کچھ اینٹھ لیں گے اور آخر میں ایسا چر کہ دیں گے کہ ہم بھی یاد کریں گے اس لیے آپ ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھائیے گا۔

میں نے کہا" آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے مجھے طیب سیٹھ سے یا کسی شخص سے مقدمہ کا حال بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو انہیں صرف یہ صلاح دوں گا کہ آپس میں سمجھوتا کر لیں ورنہ مدتوں بیکار مقدمہ بازی ہوتی رہے گی۔"

ڈربن آنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرے لیے اول درجے کا ٹکٹ لیا گیا۔ وہاں قاعدہ تھا کہ اگر بستر کی ضرورت ہو تو پانچ شلنگ اور دینا پڑتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ کا اصرار تھا کہ میں اپنا بستر کرائے پر لے لوں لیکن میں نے کچھ تو ضد اور غرور میں اور کچھ پانچ شلنگ بچانے کے خیال سے انکار کر دیا۔ عبداللہ سیٹھ نے کہا" دیکھو یہ ہندوستان نہیں ہے ہمیں خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف لے لو۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ نو بجے رات کو گاڑی نٹال کے دارالحکومت میریٹز مرگ پہنچی ۔بستر وغیرہ اسی اسٹیشن پر دیئے جاتے تھے۔ایک ریل کا آدمی آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کو بستر تو نہیں چاہیے میں نے کہا "نہیں میرے پاس موجود ہے۔" اس کے بعد ایک (سفید چمڑی کا) مسافر آیا اور اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔اسے معلوم ہوگیا کہ یہ کالا آدمی ہے اس کی طبیعت منغض ہوگئی۔ وہ فوراً چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو ایک ریل کے ملازموں کو ساتھ لے آیا۔انہوں نے تو کچھ نہیں کہا مگر ایک اور افسر میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ادھر آؤ تمہیں گارڈ کے ڈبے میں بیٹھنا پڑے گا۔

میں نے کہا "مگر میرے پاس تو اول درجے کا ٹکٹ ہے۔"

اس نے جواب دیا "اس سے کچھ نہیں ہوتا میں جو تم سے کہتا ہوں کہ تمہیں گارڈ کے ڈبے میں چلنا پڑے گا۔"

"اور میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے ڈربن میں اس ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی اور میں اسی میں جاؤں گا۔"

"ہرگز نہیں تمہیں یہ ڈبہ خالی کرنا پڑے گا ورنہ میں پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں نکلوادوں گا۔"

"تمہیں اختیار ہے میں اپنی مرضی سے تو جانے کا نہیں"

سپاہی آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لیا میرا اسباب بھی اٹھا لیا گیا میں نے دوسرے ڈبے میں جانے سے انکار کیا اور گاڑی چل دی میں جا کر مسافر خانے میں بیٹھ گیا۔میں نے اپنا ہینڈ بیگ لیا اور باقی سامان جہاں تھا وہاں پڑا رہنے دیا۔ریل کے ملازموں نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

جاڑے کے دن تھے اور جنوبی افریقہ کے بلند خطوں میں کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے۔ میریزبرگ بہت اونچی جگہ ہے یہاں بڑی سخت سردی تھی میرا کوٹ میرے اسباب میں تھا لیکن مجھے مانگنے کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ کہیں پھر ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اس لیے بیٹھا کانپتا رہا۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ آدھی رات کے قریب ایک مسافر آیا اور اس نے چاہا کہ مجھ سے باتیں کرے مگر میں ایسی حالت میں کیا خاک باتیں کرتا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ میں اپنے حقوق کے لیے لڑوں یا اسی وقت ہندوستان لوٹ جاؤں یا چپ چاپ ذلت برداشت کر کے پریٹوریا پہنچوں اور مقدمہ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی واپسی کا قصد کروں جس کام کا میں نے ذمہ لیا ہے اسے پورا کیے بغیر ہندوستان واپس جانا بزدلی ہے مجھے تکلیف اٹھانا پڑی۔ یہ سطحی چیز ہے۔ یہ محض ایک علامت ہے رنگ کے تعصب کی جو ایک مہلک مرض کی صورت میں سطح کے نیچے موجود ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ اس مرض کا پورا ازالہ ہو جائے اور اس میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں سب جھیلنا چاہیے۔ میرے ساتھ بدسلوکی گئی ہے اس کی تلافی کی کوشش صرف اس حد تک جائز ہے جہاں تک نسلی تعصب کو دور کرنے میں مدد ملے۔

غرض میں نے یہ طے کیا کہ جو پہلی گاڑی ملے گی اس پر پریٹوریا چلا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو میں نے ریلوے کے جنرل منیجر کے نام بڑا لمبا تار دیا اور عبداللہ سیٹھ کو بھی اطلاع دے دی۔ وہ فوراً جا کر جنرل منیجر سے ملے اس نے ریل کے ارکنوں کے طرز عمل کو جائز قرار دیا۔ لیکن سیٹھ صاحب کو اطمینان دلایا کہ اسٹیشن ماسٹر کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ میرے حفاظت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچنے کا انتظام کر دے۔ عبداللہ سیٹھ نے میریٹزبرگ کے ہندوستانی تاجروں کو اور اپنے دوستوں کو

جو دوسرے مقامات پر تھے تار دے دیئے کہ وہ مجھ سے ملیں اور میری مدد کریں۔ تاجر مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے مجھے تسکین دینے کے بعد ان دقتوں کا ذکر کیا جو انہیں پیش آ چکی تھیں اور کہا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں جو ہندوستانی اول درجے میں یا دوسرے درجے میں سفر کرتے ہیں انہیں ریلوے کے ملازموں اور فرنگی مسافروں کی بدسلوکی کے لیے تیار رہنا چاہیے سارا دن انہی المناک داستانوں کے سننے میں گزر گیا۔ شام کی گاڑی آئی۔ میرے لیے ایک جگہ محفوظ کر لی گئی۔ میرٹیزبرگ میں میں نے بستر کا ٹکٹ جس کے لینے سے ڈربن میں انکار کیا تھا خرید لیا۔

اس گاڑی نے مجھے چارلس ٹاؤن تک پہنچایا۔

☆☆☆☆☆

مزید تکلیفیں

چارلس ٹاؤن میں گاڑی صبح کو پہنچی اس زمانے میں چارلس ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے درمیان ریل نہ تھی بلکہ شکرم چلتی تھی جو رستے میں اسٹیڈرٹن کے مقام پر رات بھر ٹھہرتی تھی۔ میرے پاس شکرم کا ٹکٹ تھا جس کی معیار میریٹزبرگ میں ایک دن ٹھہر جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھی اس کے علاوہ عبداللہ سیٹھ نے چارلس ٹاؤن کے ایجنٹ کو تار دے دیا تھا۔

مگر ایجنٹ مجھے ٹالنے کے لیے بہانا ڈھونڈتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے وہی جواب دیا جو دینا چاہیے تھا۔ مگر جس خیال سے وہ ٹالنا چاہتا تھا وہ جگہ کی کمی نہ تھی بلکہ کچھ اور ہی بات تھی۔ مسافر شکرم کے اندر بٹھائے جاتے تھے۔ شکرم کا محافظ جو لیڈر کہلاتا تھا ایک گوار تھا اس نے دیکھا کہ میں اقلی ہوں اور اجنبی معلوم ہوتا ہوں اس لیے اس نے مجھے فرنگی مسافروں کے ساتھ بٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ کوچ بکس کے دونوں طرف بھی بیٹھنے کی جگہیں تھیں۔ لیڈر عموماً ان میں سے کسی جگہ پر بیٹھا کرتا تھا مگر آج وہ خود اندر بیٹھا اور مجھے اپنی جگہ پر بٹھایا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صریحی ناانصافی ہے اور اس میں میری توہین ہے مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے چپ چاپ برداشت کرلوں۔ زبردستی اندر گھس جانا میرے امکان میں نہ تھا اور اگر میں صدائے احتجاج بلند کرتا تو شکرم مجھے چھوڑ کر چلی جاتی، میرا ایک دن اور ضائع ہوتا اور دوسرے دن خدا جانے کیا واقعہ پیش آتا۔ اس لیے اگرچہ میں اپنے دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر مصلحت اندیشی سے کام لے کر کوچوان کے پاس بیٹھ گیا۔

تین بجے کے قریب شکرم پار دیکوپ پہنچی۔ اب لیڈر کو یہ سوجھی کہ میری جگہ پر بیٹھے کیونکہ اسے تمبا کو پینے اور شاید تازہ ہوا کی خواہش تھی۔ اس لیے اس نے کوچوان سے ایک میلا سا ٹاٹ لے کر پیر رکھنے کے تخت پر بچھا دیا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا سامی تم اس پر بیٹھو میں کوچوان کے پاس بیٹھوں گا۔ یہ اتنی بڑی ذلت تھی جسے میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا ڈرتے ڈرتے میں نے اس سے کہا تم ہی نے مجھے یہاں بٹھایا تھا حالانکہ میری جگہ اندر ہونا چاہیے تھی۔ میں نے یہ ذلت برداشت کر لی اب تمہارا جی باہر بیٹھ کر تمبا کو پینے کو چاہتا ہے اس لیے تم مجھے اپنے پیروں کے پاس بٹھاتے ہو یہ تو میں نہیں کروں گا۔ البتہ اندر بیٹھنے کو تیار ہوں جتنی دیر میں نے اٹک اٹک کر یہ الفاظ کہے وہ شخص میری طرف بڑھا اور اس نے میرے کانوں پر تان تان کر گھونسے لگانا شروع کیے۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچ کر نیچے اتارنا چاہا میں نے پیتل کا کٹہرا جو کوچ بکس پر لگا تھا مضبوطی سے پکڑ لیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ چاہے میری کہنی ٹوٹ جائے مگر اسے نہ چھوڑوں گا۔ مسافر یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ وہ شخص مجھے گالیاں دے رہا ہے مجھے کھینچ رہا ہے، مار رہا ہے اور میں خاموش ہوں۔ وہ طاقتور تھا اور میں کمزور تھا۔ بعض مسافروں کو رحم آ گیا اور انہوں نے چلا کر کہا بھلے آدمی اس بیچارے کو چھوڑ دے۔ اسے کیوں مار رہا ہے۔ یہ سچ تو کہتا ہے اگر وہاں نہیں بیٹھنا چاہتا تو اسے ہمارے پاس بیٹھ جانے دے اس نے گرج کر جواب دیا ہر گز نہیں مگر وہ کچھ سٹپٹایا اور اس نے مجھے مارنے سے ہاتھ روک لیا پھر اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور مجھے دو چار گالیاں دے کر ہاینٹاٹ نوکر کو جو کوچ بکس کے دوسرے سرے پر بیٹھا تھا نیچے بٹھایا اور خود اس کی جگہ لے لی۔

سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے سیٹی بجی اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ میرا دل دھڑک

رہا تھا اور میں دل میں کہتا تھا کہ دیکھیے منزل مقصود تک زندہ پہنچتا ہوں یا نہیں وہ شخص مجھے کبھی کبھی قہر آلود نظر سے دیکھتا تھا اور انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے کہتا تھا'' خبر دار مجھے اسٹینڈ رڈٹن پہنچنے دو پھر میں تمہیں دکھا دوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں''

جب ہم اسٹینڈ رٹن پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا یہاں مجھے کچھ ہندوستانی صورتیں نظر آئیں اور میں نے اطمینان کی سانس لی میرے اترتے ہی یہ دوست میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ آپ کا استقبال کریں اور آپ کو عیسیٰ سیٹھ کے یہاں لے جائیں۔ ہمارے دادا عبداللہ کا تار آیا تھا میں بہت خوش ہوا اور ہم سب سیٹھ عیسیٰ حاجی عمر کے یہاں پہنچے سیٹھ اور ان کے محرر میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنی ساری بپتا سنائی۔ انہیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اپنے تلخ تجربات مجھ سے بیان کیے۔

میں چاہتا تھا شکرم کمپنی کے ایجنٹ کو سارے واقعے کی اطلاع دوں۔ اس لیے میں نے ان کے نام خط لکھا اور جو کچھ گزرا تفصیل سے بیان کر کے اسے محافظ کی دھمکی کی طرف توجہ دلائی۔ میں نے اس سے بات کا بھی اطمینان چاہا کہ جب شکرم دوسرے دن صبح کو روانہ ہو گی تو مجھے اندر دوسرے مسافروں کے ساتھ جگہ دی جائیگی۔ ایجنٹ کا یہ جواب آیا'' اسٹینڈ رٹن سے بہت بڑی شکرم چلتی ہے جس کے محافظ دوسرے ہیں اور آپ کو اور مسافروں کے ساتھ ہی جگہ ملے گی۔'' اس سے مجھے کسی قدر اطمینان ہوا ظاہر ہے کہ میرا ارادہ اس شخص پر جس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا دعویٰ کرنے کا نہ تھا اس لیے یہ واقعہ یہیں ختم ہو گیا۔

صبح کو سیٹھ کے آدمی مجھے شکرم تک پہنچانے گئے۔ مجھے اچھی جگہ مل گئی اور میں اسی روز رات کو خیریت سے جوہانسبرگ پہنچ گیا۔

اسٹینڈرٹن ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور جوہانسبرگ بڑا شہر ہے۔ عبداللہ سیٹھ نے جوہانسبرگ بھی تار دیدیا تھا اور مجھے محمد قاسم قمر الدین کی دکان کا پتہ بتا دیا تھا ان کا آدمی مجھے لینے شکرم کے اڈے پر آیا تھا۔ نہ میں نے اسے دیکھا اور نہ اس نے مجھے پہنچانا۔ اس لیے میں نے کسی ہوٹل میں جانے کا قصد کیا مجھے کئی ہوٹلوں کے نام معلوم تھے میں نے ایک کرایہ کی گاڑی لی اور کہا کہ انڈنیشنل ہوٹل لے چلو میں نے مینجر سے مل کر کمرہ مانگا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور تہذیب کے ساتھ یہ الفاظ کہہ کر کہ ''افسوس ہے ہمارے یہاں بالکل جگہ نہیں'' رخصت کر دیا۔ اس لیے میں نے گاڑی والے سے محمد قاسم قمر الدین کی دوکان پر چلنے کو کہا۔ وہاں عبدالغنی سیٹھ میرا انتظار کر رہا تھا اور انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا ہوٹل کا واقعہ سن کر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے ''بھلا آپ کو ہوٹل میں جگہ کیسے مل سکتی تھی۔''

میں نے پوچھا ''آخر کیوں نہیں؟''

انہوں نے کہا ''جب چند روز یہاں رہیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا یہاں تو ہم ہی لوگ رہ سکتے ہیں جو روپیہ کمانے کے لالچ میں ذلتیں سہتے ہیں۔ پھر ہماری جو حالت ہے وہ آپ دیکھتے ہی ہیں'' اس کے بعد انہوں نے مجھ سے ان سختیوں کے واقعات بیان کیے جو ہندوستانیوں پر جنوبی افریقہ میں ہوئی تھیں۔ ان سیٹھ صاحب کا آگے چل کر مفصل ذکر آئے گا۔

انہوں نے کہا ''یہ ملک آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ دیکھیے اب آپ کو پریٹوریا جانا ہے۔ آپ کو تیسرے درجے میں سفر کرنا پڑے گا۔ ٹرانسوال کی حالت نٹال سے بھی بدتر ہے پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ ہندوستانیوں کو کبھی نہیں دیئے جاتے۔''

’’معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں نے اس لیے جم کر کوشش نہیں کی۔‘‘

’’ہم نے عرضداشتیں بھیجیں لیکن سچ پوچھیے تو ہم لوگ خود عام طور پر پہلے اور دوسرے درجے میں سفر نہیں چاہتے۔‘‘

میں نے ریلوے کو ضوابط منگائے اور انہیں پڑھا ایک جگہ کچھ گنجائش نظر آئی۔ ٹرانسوال کے پرانے قوانین کی زبان ابہام اور گنجلک سے خالی نہ تھی اور ریلوے کے ضوابط کی زبان تو اور بھی ناقص تھی۔

میں نے سیٹھ صاحب سے کہا میں تو اول درجے میں جانا چاہتا ہوں اور اگر یہ ممکن نہیں تو میں کرایہ کی گاڑی میں جانا زیادہ پسند کروں گا یہاں سے پریٹوریا کل سینتیس ہی میل تو ہے۔

سیٹھ عبدالغنی نے مجھے سمجھایا کہ اس میں بہت دیر لگے گی اور بڑا خرچ ہوگا۔ البتہ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ میں اول درجے میں سفر کروں۔ چنانچہ میں نے اسٹیشن ماسٹر کے نام ایک رقعہ بھیجا میں نے لکھا کہ میں بیرسٹر ہوں اور ہمیشہ اول درجے میں سفر کرتا ہوں مجھے جلد سے جلد پریٹوریا پہنچنا ہے۔ اس لیے اتنا وقت نہیں کہ جواب کا انتظار کیا جائے میں خود اسٹیشن آ کر جواب لوں گا اور امید ہے کہ مجھے اول درجے کا ٹکٹ مل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ خود جا کر جواب لینے میں خاص مقصد مدنظر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اسٹیشن ماسٹر نے تحریری جواب بھیجا تو وہ یقیناً انکار کرے گا۔ خصوصاً اس کے ذہن میں ’’قلی بیرسٹر‘‘ کا تصور کچھ اور ہی ہوگا اس لیے میں نے سوچا کہ میں مکمل انگریزی وضع میں جا کر اس سے باتیں کروں تو ممکن ہے وہ ٹکٹ دے دے۔ اس لیے میں فراک کوٹ پہن کر اور نکٹائی لگا کر اسٹیشن گیا اور ٹکٹ گھر کے تختے پر کرایہ کی ایک گنی رکھ کر میں نے اول درجے کا ٹکٹ مانگا۔

اس نے پوچھا ''تمہیں نے مجھے رقعہ بھیجا تھا۔''

جی ہاں آپ ٹکٹ دیدیں تو بڑی مہربانی ہو۔ مجھے آج پریٹوریا پہنچنا ضروری ہے۔ وہ مسکرایا اور ہمدردی سے کہنے لگا میں ٹرانسوال کا رہنے والا نہیں بلکہ پانستانی 28ہوں میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور آپ سے ہمدردی رکھتا ہوں میں آپ کو ٹکٹ ضرور دوں گا مگر ایک شرط پر کہ اگر گارڈ آپ کو اتار کر تیسرے درجے میں بٹھا دے تو آپ مجھے اس جھگڑے میں نہ کھینچیں گے یعنی ریلوے کمپنی پر دعویٰ نہ کریں۔ اچھا خدا حافظ۔ آپ کی صورت سے ظاہر ہے کہ آپ شریف آدمی ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے ٹکٹ دے دیا'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جو بات وہ چاہتا تھا اس کی طرف سے اطمینان دلایا''

سیٹھ عبدالغنی مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے تھے انہیں یہ دیکھ کر کہ مجھے اول درجے کا ٹکٹ مل گیا بہت تعجب ہوا مگر انہوں نے مجھے متنبہ کرنے کے لیے کہا'' خدا ہی جانتا ہے جو تم خیریت سے پریٹوریا پہنچ جاؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ گارڈ تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دے گا اور اگر اس نے نہ بھی چھیڑا تو مسافر دق کریں گے۔''

میں اول درجے کے ڈبے میں بیٹھا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ جرمسٹن میں گارڈ ٹکٹ دیکھنے آیا۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر جھنجھلایا اور انگلی سے اشارہ کرنے لگا کہ تیسرے درجے میں جا کر بیٹھو۔ میں نے اسے اپنا اول درجہ کا ٹکٹ دکھایا اس نے کہا'' اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ جاؤ تیسرے درجے میں بیٹھو۔''

ڈبے میں صرف ایک انگریز مسافر تھا اس نے گارڈ کی خبر لی'' تم کیوں ایک شریف آدمی کو دق کر رہے ہو دیکھتے نہیں کہ ان کے پاس اول درجے کا ٹکٹ ہے مجھے ان کے ساتھ سفر کرنے میں مطلق اعتراض نہیں'' مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''آپ اطمینان سے یہیں بیٹھیے''

گارڈ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ''اگر تم اقلی کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہو تو کرو میرا کونسا حرج ہے۔''

شام کو آٹھ بجے گاڑی پریٹوریا پہنچی۔

☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پریٹوریا میں پہلا دن

مجھے امید تھی کہ پریٹوریا کے اسٹیشن پر دادا عبداللہ کے وکیل کی طرف سے کوئی شخص لینے آئے گا۔ میں جانتا تھا کہ کوئی ہندوستانی میرے استقبال کے لیے موجود نہ ہوگا۔ کیونکہ میں نے پکا وعدہ کرلیا تھا کہ کسی ہندوستانی کے یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ لیکن وکیل نے کسی کو نہیں بھیجا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اتوار کے سبب کسی شخص کے آنے میں بڑی زحمت ہوتی۔ میں بہت پریشان تھا اور میرے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی ہوٹل مجھے نہیں لے گا۔

1893ء میں پریٹوریا کے اسٹیشن کی وہ حالت نہیں تھی جو 1914ء میں تھی۔ ایک آدھ لیمپ ٹمٹما رہا تھا اور اکا دکا مسافر نظر آتے تھے میں نے سوچا کہ اور سب مسافر چلے جائیں اور ٹکٹ کلکٹر خالی ہوتو میں اپنا ٹکٹ دوں اور اس سے پوچھوں کہ اسے کوئی چھوٹا سا ہوٹل یا کوئی اور جگہ معلوم ہے جہاں میں رات کو ٹھہر سکوں۔ اگر وہ بتا دے تو اچھا ہے ورنہ پھر اسٹیشن ہی پر رات گزاروں مگر سچ پوچھیے تو مجھے اس سے اتنی ہی بات دریافت کرنے میں بھی جھجک تھی کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ذلیل نہ ہونا پڑے۔

اسٹیشن مسافروں سے خالی ہوگیا میں نے ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دے اا وراس سے جو سوالات کرنا تھے کیے۔ اس نے تہذیب سے جواب دیا مگر معلوم ہوتا کہ اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ البتہ ایک امریکی حبشی جو پاس کھڑا تھا مجھ سے کہنے لگا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں بالکل اجنبی ہیں آپ کے کوئی ملاقاتی ہیں۔

آپ میرے ساتھ آیئے تو آپ کو ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے چلوں۔ اس کا مالک امریکی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے خیال میں وہ آپ کو ٹھہرا لے گا۔"

مجھے اس میں شبہہ تھا لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی رائے مان لی۔ وہ مجھے جانسٹن کے فیملی ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مسٹر جانسٹن کو الگ لے جا کر باتیں کیں وہ مجھے اس شرط پر رات بھر ٹھہرانے کے لیے تیار ہو گیا کہ میں کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں۔

انہوں نے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل رنگ کے تعصب سے خالی ہے لیکن میرے گاہک سب فرنگی ہیں اور اگر میں آپ کو کھانے کے کمرے میں بیٹھنے دوں تو ممکن ہے کہ وہ خفا ہو جائیں بلکہ اٹھ کر چلے جائیں۔"

میں نے کہا میں تو آپ کی اسی عنایت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے رات بھر ٹھہرا لیا۔ اب مجھے یہاں کے حالات سے کم و بیش واقفیت ہو گئی ہے اور میں آپ کی مشکلوں کو سمجھتا ہوں آپ مجھے کمرے ہی پر کھانا بھیج دیجئے کیا مضائقہ ہے۔ امید ہے کہ کل میں کوئی اور انتظام کر لوں گا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہاں بیٹھ کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں بالکل تنہا تھا اور اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوٹل میں زیادہ مہمان نہیں تھے اور مجھے امید تھی کہ بیرا تھوڑی دیر میں کھانا لے آئے گا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اس کے بجائے خود مسٹر جانسٹن چلے آ رہے ہیں انہوں نے کہا کہ مجھے شرم آئی کہ میں نے آپ سے یہاں کھانا کھانے کو کہا اس لیے میں نے جا کر اور مہمانوں سے پوچھا کہ اگر ہندوستانی مہمان کھانے کے کمرے بیٹھ کر کھائیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا۔

انہوں نے کہا ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہماری طرف سے وہ شوق سے جب تک جی چاہے اس ہوٹل میں رہیں۔ اس لیے اگر آپ مناسب سمجھیں تو کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیے اور جب تک مرضی ہو یہاں قیام کیجئے۔

میں نے پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور کھانے کے کمرے میں جا کر خوب اطمینان سے کھانا کھایا دوسرے دن صبح کو میں عبداللہ سیٹھ کے وکیل اور بیکر سے ملا۔ سیٹھ صاحب کی گفتگو سے مجھے ان کی طبیعت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی گرمجوشی سے ملنے پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دوستانہ مزاج پرسی کی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں کس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا بیرسٹر کی حیثیت سے آپ کے لیے کوئی کام نہیں کیونکہ ہم نے بہترین بیرسٹر کو کرلیا ہے۔ مگر مقدمہ عرصہ سے چل رہا ہے اور اس میں بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ اس لیے بہت سے واقعات معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں میں آپ سے مدد لوں گا اور پھر ظاہر ہے کہ آپ کے سبب سے مجھے اپنے موکل سے خط و کتابت کرنے میں آسانی ہو گی کیونکہ مجھے ان سے جو کچھ پوچھنا ہو گا آپ ہی کے توسط سے پوچھوں گا آپ کے آنے سے یہ بڑا فائدہ ہوا۔ میں نے ابھی تک آپ کے لیے کمرے نہیں لیے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔ اس کے بعد اس کا انتظام کرلوں گا۔ یہاں رنگ کے تعصب کی بڑی شدت ہے اس سبب سے آپ جیسے آدمی کے لیے مکان ملنا بہت مشکل ہے۔ مگر میری نظر میں ایک غریب عورت کا مکان ہے اس کا شوہر ڈبل روٹی بیچتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو اپنے یہاں ٹھہرا لے گی۔ اس سے اس کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جائے گا۔ آیئے اس کے یہاں چلیں۔

وہ مجھے لے کر اس عورت کے یہاں گئے انہوں نے اس سے علیحدہ گفتگو کی اور وہ مجھے پینتیس شلنگ ہفتہ وار پر اپنے یہاں رکھنے پر راضی ہوگئی۔

مسٹر بیکر اپنے پیشے کے کام کے علاوہ بڑے جوش اور انہماک سے وعظ بھی کہا کرتے تھے وہ ابھی زندہ ہیں اور اب وکالت چھوڑ کر محض تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔

ان کی مالی حالت اچھی ہے۔میرے ان کے درمیان اب تک خط و کتابت جاری ہے۔ان کے خطوں کا ہمیشہ ایک ہی موضوع ہوتا ہے وہ مختلف پہلوؤں سے مذہب عیسوی کی فضیلت ثابت کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ جب تک انسان مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا اور نوع انسانی کا نجات دہندہ نہ مانے اسے ابدی تسکین نصیب ہونا ناممکن ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں مسٹر بیکر نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ میں نے کہا میں ہندو دھرم میں پیدا ہوا لیکن مجھے اس مذہب سے بہت کم واقفیت ہے اور دوسرے مذہبوں میں اتنی بھی نہیں۔ سچ پوچھے تو مجھے خود اپنے حال کی خبر نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا عقیدہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے میرا ارادہ ہے کہ اپنے مذہب کا گہرا مطالعہ کروں اور جہاں تک ہو سکے دوسرے مذہبوں کا بھی۔

مسٹر بیکر یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میں جنوبی افریقہ کے جنرل مشن کے ڈائریکٹروں میں سے ہوں۔میں نے اپنے خرچ سے ایک گرجا بنوایا ہے اور اس میں پابندی سے وعظ کہا کرتا ہوں۔میرا دل رنگ کے تعصب سے پاک ہے میرے چند رفیق ہیں اور ہم سب روز ایک بجے چند منٹ کے لیے جمع ہوتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں تسکین اور ہدایت نصیب ہو اگر آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوا کریں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی میں آپ کو اپنے رفیقوں سے ملواؤں گا۔وہ

آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور امید ہے کہ آپ کو بھی ان کی صحبت پسند آئے گی اس کے علاوہ میں آپ کو چند مذہبی کتابیں پڑھنے کے لیے دوں گا اور سب کتابوں کی سرتاج تو مقدس بائبل ہے جس کی تلاوت کی میں آپ کو خاص طور پر تاکید کرتا ہوں۔

میں نے مسٹر بیکر کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ ایک بجے کی عبادت میں ہاں تک ہو سکے گا پابندی سے شریک ہوا کروں گا۔

مسٹر بیکر نے کہا ''تو میں کل ایک بجے اسی جگہ آپ کا انتظار کروں گا اور ہم دوں مل کر عبادت میں جائیں گے'' اور ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

ابھی میرے پاس ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

میں مسٹر جانسٹن کے یہاں پہنچا ان کا بل ادا کیا اور اپنے نئے مکان میں جا کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ مالکہ مکان بڑی نیک عورت تھی اس نے میرے لیے نباتاتی کھانا پکایا تھا۔ مجھے اس خاندان کے لوگوں سے بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگی۔

اس کے بعد میں ان دوست سے ملنے گیا جن کے نام عبداللہ نے رقعہ دیا تھا ان سے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو کیا کیا سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں ان کا اصرار تھا کہ میرے ساتھ ٹھہرو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہاں کہ میں پہلے ہی انتظام کر چکا ہوں انہوں نے بہت اصرار سے کہا کہ جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لینا۔

اب شام ہو گئی تھی میں نے گھر آ کر کھانا کھایا اور خیالات میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا ابھی میرے لیے کوئی کام نہ تھا میں نے عبداللہ سیٹھ کو اس کی اطلاع دے دی میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر بیکر کو مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ مجھے

ان کے دیندار رفیقوں سے مل کر کیا فائدہ ہو گا۔ میرے لیے عیسائی مذہب کا مطالعہ کرنا کہاں تک اچھا ہے؟ ہندو دھرم کے متعلق کتابیں کہاں سے ملیں؟ اور جب تک میں خود اپنے مذہب سے اچھی طرح واقع نہ ہو جائیں عیسائیت کا صحیح اندازہ کیسے کر سکتا ہوں میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے ہر چیز پر جو میرے سامنے آئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے اور مسٹر بیکر کے حلقے کے لوگ جو سوالات کریں ان کا جواب دینے کے لیے خدا کی ہدایت کا منتظر رہنا چاہیے جب تک میں اپنے مذہب کو اچھی طرح سمجھ نہ لوں کسی دوسرے مذہب کا اختیار کرنے کا خیال دل میں لانا مناسب نہیں ہے۔

یہ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

عیسائیوں کی صحبت

دوسرے دن ایک بجے مسٹر بیکر کی عبادت کی صحبت میں گیا وہاں مجھ سے مس ہیرس، مس گیپ اور مسٹر کوٹس وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ہر شخص دعا مانگنے کے لیے دو زانو ہو گیا۔ میں نے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی یہی کیا۔ دعا میں ہر شخص اپنی اپنی خواہش کے مطابق خدا سے مختلف چیزوں کی التجا کرتا تھا۔ مثلاً عام طور پر لوگ اس طرح کی دعائیں مانگتے تھے کہ دن امن و عافیت سے گزر جائے یا خدا ہمارے دل کے دروازے کھول دے۔

اب ایک نئی دعا میری فلاح کے لیے مانگی جانے لگی ''اے مالک ہمارے نئے بھائی کو جو ہمارے درمیان آیا ہے اپنی راہ دکھا دے۔ اسے بھی اے مالک وہ تسکین عطا کر جو تو نے ہمیں بخشی ہے یسوع مسیح جس نے ہمیں نجات دی ہے اسے بھی نجات دے۔ اے خدا تجھے واسطہ یسوع کا'' ان صحبتوں میں مناجاتیں نہیں گائی جاتی تھیں بلکہ کسی قسم کا گانا بجانا نہیں ہوتا تھا روز کسی خاص چیز کی دعا مانگنے کے بعد ہم سب منتشر ہو جاتے تھے اور اپنے اپنے گھر جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے دعا میں پانچ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے۔

مس ہیرس اور مس گیپ دونوں کنواری خواتین تھیں مسٹر کوٹس کوئیکر 29 تھے یہ دونوں خواتین ساتھ رہتی تھیں اور انہوں نے مجھے مستقل دعوت دی کہ ہر اتوار کو ان کے یہاں چائے پیا کروں۔

جب ہم سب لوگ اتوار کے دن جمع ہو جاتے تو میں مسٹر کوٹس کو اپنا ہفتہ بھر کا

مذہبی روزنامچہ دے دیتا تھا اور میں نے اس عرصہ میں جو مذہبی کتابیں پڑھی تھیں اور ان کے جو اثرات مجھ پر ہوئے تھے ان کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا۔ دونوں خواتین اپنے پاک تجربے بیان کرتی تھیں اور جو تسکین قلب انہیں حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتی تھیں۔

مسٹر کوٹس ایک صاف دل راسخ العقیدہ نوجوان تھے۔ ہم دونوں ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے اور وہ مجھے دوسرے عیسائی دوستوں کے ہاں بھی لے جاتے تھے۔

جب مجھ میں اور ان میں زیادہ گہری دوستی ہوگئی تو وہ مجھے اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لیے دینے لگے یہاں تک کہ میری الماری ان کتابوں سے بھر گئی میں بڑے ذوق شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا اور جو کچھ میں پڑھتا تھا اس پر ہم دونوں میں بحث ہوا کرتی تھی۔

1893ء میں میں نے اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھیں مجھے ان سب کے نام یاد نہیں مگر ان میں ''سٹی ٹیمپل کے ڈاکٹر پارکر کی تفسیر'' پیرسن کی بہت سے قطعی ثبوت (Many Infallible) اور ہٹلر کی ''قیاسات'' (Analogry) بھی تھیں ان کے بعض حصے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے بعض باتیں مجھے پسند آئیں اور بعض ناپسند ہوئیں ''بہت سے قطعی ثبوت'' میں انجیل کے مذہب کی حیثیت سے کہ مصنف نے اسے سمجھا ہے حمایت کی گئی ہے اس کتاب نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا پارکر کی ''تفسیر'' اخلاقی احساس کو ابھارنے والی کتاب ہے لیکن ایک ایسے شخص کو جو عیسائی مذہب کے رسمی عقائد کا قائل نہیں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی ہٹلر کی ''قیاسات'' میں مجھے بہت دقت ہوئی اور مشکل کتاب معلوم ہوئی جس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے چار پانچ بار پڑھنا ضروری ہے میرے خیال میں یہ دہریوں کی خداپرست

بنانے کے لیے لکھی گئی ہے اس میں خدا کے وجود کی دلیلیں جو دی گئی ہیں وہ میرے لیے غیر ضروری تھیں کیونکہ میں نے دلی منزل سے گزر چکا تھا لیکن جن دلیلوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خدا نے صرف عیسیٰ ہی کے جسم میں حلول کیا تھا اور وہ خدا کے دربار میں بندوں کے شفیع ہیں، ان کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

لیکن مسٹر کوٹس آسانی سے ہار ماننے والے آدمی نہ تھے انہیں مجھ سے بہت محبت تھی انہوں نے میرے گلے میں تلسی کے دانوں کا کنٹھا دیکھا جو ویشنو مذہب کی علامت ہے وہ اسے ضعیف الاعتقادی سمجھے جس سے انہیں بہت دکھ ہوا ''یہ ضعیف الاعتقادی تمہیں زیب نہیں دیتی اور آؤ میں اسے توڑ ڈالوں''

''یہ نہیں ہوسکتا یہ میری ماں کا دیا ہوا تبرک ہے''

''مگر کیا تم اس پر عقیدہ رکھتے ہو''

میں اس کے بھید کو نہیں جانتا میرا خیال نہیں ہے کہ اس کو نہ پہننے سے مجھے کوئی نقصان پہنچے گا لیکن یہ کنٹھا میری ماں نے مجھے بڑی محبت سے یہ سمجھ کر دیا ہے کہ میرے لیے باعث برکت ہوگا اسے میں بلاوجہ نہیں اتار سکتا جب یہ دن گزرنے سے گھستے گھستے خود بخود ٹوٹ جائے گا میں دوسرا نہیں پہنوں گا مگر اسے تو ہر گز نہیں توڑوں گا۔

مسٹر کوٹس میری دلیل کو نہیں سمجھے کیونکہ ان کی نظر میں میرے مذہب کی کوئی وقعت نہیں تھی انہیں آرزو تھی کہ خدا وہ دن دکھائے کہ جب وہ مجھے جہالت کے گڑھے سے نکالیں۔ مجھے یقین دلانا چاہتے تھے کہ چاہے دوسرے مذہبوں میں بھی حق کی جھلک ہو لیکن کامل حق صرف مذہب عیسوی میں ہے اسے قبول کیے بغیر میری نجات ناممکن ہے جب تک مسیح کی شفاعت نہ ہو میرے گناہ نہیں بخشے جائیں گے

اور میرے نیک اعمال کسی کام نہ آئیں گے۔

جس طرح انہوں نے مجھے متعدد نئی کتابوں کی طرف توجہ دلائی اسی طرح متعدد دوستوں سے بھی جو ان کے نزدیک پکے عیسائی تھے ملوایا ان میں سے ایک خاندان اس عیسائی فرقے سے تعلق رکھتا تھا جسے پلیمتھ 30 برادری کہتے ہیں۔

جن عیسائیوں سے میں مسٹر کوٹس کی معرفت ملا ان میں سے بہت سے نیک لوگ تھے اکثر کو میں نے پرہیز گار پایا لیکن اس خاندان کے ایک پلیمتھ برادر نے ایک بار ایسی دلیل پیش کی جسے سن کر میں حیران رہ گیا۔

''آپ ہمارے مذہب کی خوبی کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عمر بھر اپنی لغزشوں کی فکر میں الجھے رہتے ہیں، ہر وقت ان کی اصلاح اور تلافی کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بھلا عمل کے ابدی ادوار میں پڑ کر آپ کی نجات کیونکر ہو سکتی ہے۔ اس طرح تو آپ کو کبھی سکون قلب حاصل نہیں ہو سکتا آپ کو اعتراف ہے کہ ہم سب گنہگار ہیں۔ اب دیکھیے ہمارا عیدہ کتنا مکمل ہے ہم جانتے ہیں کہ برائیوں کی اصلاح اور تلافی کی سعی لاحاصل ہے اور گناہوں کا کفارہ ضروری ہے ہم میں یہ طاقت کہاں اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ ہم یہ بوجھ مسیح کے سر ڈال دیں وہ خدا کا معصوم اکلوتا بیٹا ہے اس نے کہا ہے کہ جو مجھ پر عقیدہ رکھتا ہے اسے ابدی زندگی نصیب ہوگی یہ خدا کا رحم و کرم ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ مسیح نے ہماری طرف سے کفارہ دے دیا اس لیے ہمارے گناہ ہماری نجات کو نہیں روک سکتے۔ گناہ تو ہماری سرشت میں ہے کون ہے جو اس دنیا میں گناہ سے پاک رہ سکے اسی لیے مسیح نے ایذائیں اٹھائیں اور سارے انسانوں کے گناہوں کی تلافی کر دی صرف اسی شخص کو جو اس کفارہ عظیم پر ایمان

لائے ابدی سکون نصیب ہو سکتا ہے ذرا سوچیے تو کہ آپ کی زندگی کیسی بے چینی کی ہے اور ہمیں کیسی امن و عافیت و بشارت دی گئی۔''

اس دلیل سے مجھے مطلق تشفی نہیں ہوئی اور میں نے عاجزی سے کہا:

''اگر یہی عیسائیت ہے جسے سب عیسائی مانتے ہیں تو میں اسے قبول کرنے سے معذور ہوں میں گناہ کے عذاب سے نجات نہیں چاہتا مجھے تو خود گناہ سے بلکہ اس کے خیال سے نجات کی جستجو ہے۔ جب تک میں یہ مقصد نہ حاصل کر لوں اس وقت تک بے چین رہنا مجھے قبول ہے۔''

پلیمتھ برادر نے جواب دیا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا'' میں نے کہا ''اس پر غور کیجیے''

اور اس بزرگ نے جو کہا تھا وہ کر کے بھی دکھایا وہ خاص کر کے برے کام کرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے سکون قلب میں خلل نہیں پڑا۔

مگر مجھے ان دوستوں سے ملنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ سب عیسائی کفارے کے نظرے کے قائل نہیں ہیں خود مسٹر کوٹس کی زندگی متقیانہ تھی ان کا دل پاک تھا اور وہ تزکیہ نفس کے امکان کو مانتے تھے دونوں خواتین بھی یہی عقیدہ رکھتی ہیں عیسائی مذہب کی جو کتابیں میرے ہاتھ آئیں ان میں سے بعض محبت اور معرفت الٰہی سے مالا مال تھیں اس لیے اگرچہ کوٹس کو میرے اس نئے تجربے سے بہت تشویش ہوئی ہوگی مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ کسی پلیمتھ برادر کے بگڑے ہوئے عقیدہ کی وجہ سے میں عیسائیت سے بدظن نہیں ہو سکتا۔

میری مشکلیں اور تھیں یہ بائبل سے اور اس کی مروجہ تفسیر سے متعلق تھیں۔

☆☆☆☆☆

ہندوستانیوں سے ملاقات کی کوشش

قبل اس کے کہ میں عیسائیوں کی صحبت کے مزید حالات بیان کروں مجھے اس زمانے کے اور تجربے بھی بیان کر دینا چاہیے۔

سیٹھ طیب حاجی خان محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی کوئی عام تحریک ان کے بغیر نہیں چل سکتی تھی میں نے پہلے ہی ہفتے ان سے واقفیت پیدا کر لی اور ان سے اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا کہ پریٹوریا میں جتنے ہندوستانی ہیں ان سب سے ملوں گا میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حالات تحقیق کروں اور ان سے اس بارے میں مدد چاہی انہوں نے بڑی خوشی سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کر کے ایک تقریر کروں جس سے انہیں یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں ان کا کیا حال ہے یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد جوسب 31 کے یہاں ہوا جن کے نام میں تعارف کا خط لایا تھا اس میں زیادہ تر میمن تاجر تھے مگر اکا دکا ہندو بھی نظر آتے تھے اصل میں پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم تھی۔

میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ہماری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جا سکتی ہے اس کا عنوان تھا ''کاروبار میں سچائی سے کام لینا'' میں اچھی طرح تیار ہو کر گیا تھا میں نے ہمیشہ تاجروں کو یہ کہتے سنا تھا کہ کاروبار میں سچائی سے کام نہیں چلتا میں اس بات کو نہ اس زمانے میں مانتا تھا نہ اب مانتا ہوں اب بھی بعض تاجر دوستوں کا خیال

ہے کہ سچائی اور کاروبار یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں وہ کہتے ہیں کہ کاروبار عملی چیز ہے اور سچائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور عملی امور کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ان کے نزدیک خالص حق کا کاروبار میں نام بھی نہ لینا چاہیے البتہ ایک مناسب حد تک سچائی شاید برتی جاسکے۔ میں نے اپنی تقریر میں اس خیال کی سختی سے مخالفت کی اور تاجروں کے دل میں ان کے دہرے فرض کے احساس کو ابھارا میں نے کہا غیر ملک میں رہ کر ہم پر سچائی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہاں کے لوگ ہم چند ہندوستانیوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ہمارے کروڑوں ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔

میں نے دیکھا کہ ہماری قوم کے لوگ انگریزوں کے مقابلے میں جن کے درمیان وہ رہتے ہیں میلے اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے بے پرواہیں۔ میں نے انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے علاوہ اس بات پر زور دیا کہ ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، پنجابی، سندھی، کچھی، ہورتی وغیرہ کا امتیاز مٹا دینا چاہیے۔

آخر میں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک انجمن قائم کی جائے جس کے ذریعے سے ہندوستانی باشندے اپنی تکلیفوں کی شکایت حکام تک پہنچاسکیں اور یہ وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہے میں اپنا وقت اس انجمن کی خدمت میں صرف کیا کروں گا۔

مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میری تقریر کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔

اس تقریر کے بعد بحث شروع ہوئی، بعض لوگوں نے وعدہ کیا کہ مجھے معلومات مہیا کرنے میں مدد دیں گے میں نے دیکھا کہ حاضرین میں سے بہت کم لوگ انگریزی جانتے ہیں چونکہ میرا خیال تھا کہ انگریزی جاننا اس ملک میں بہت مفید

ثابت ہوگا اس لیے میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ جسے فرصت ہو وہ انگریزی ضرور سیکھے میں نے ان سے کہا کہ بڑی عمر میں بھی آدمی نئی زبان سیکھ سکتا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں پیش کیں اس کے علاوہ میں نے اس کا ذمہ لیا کہ اگر کوئی کلاس شروع کی جائے تو میں اس میں پڑھاؤں گا یا جن لوگوں کو پڑھنے کا شوق ہے انہیں الگ الگ تعلیم دوں گا۔

کلاس تو نہیں شروع ہوئی مگر تین نوجوان اس پر راضی ہوئے کہ فرصت کے وقت پڑھا کریں گے بشرطیکہ میں ان کے گھر جا کر پڑھاؤں۔ ان میں سے دو مسلمان تھے ایک حجام اور ایک محرر اور تیسرا ہندو تھا جس کی چھوٹی سی دکان تھی میں نے منظور کر لیا کہ جو وقت ان کے لیے مناسب ہوگا اس میں انہیں جا کر پڑھا کروں گا۔ مجھے اپنی پڑھانے کی قابلیت میں ذرا شبہ نہ تھا میرے شاگرد چاہے تھک جائیں مگر میں کبھی نہ تھکتا تھا بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ میں ان کے گھر پہنچ کر انہیں کاروبار میں مصروف پاتا تھا مگر میں صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا تینوں میں سے کسی کو انگریزی سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی مگر دو نے آٹھ مہینے میں اچھی خاصی ترقی کر لی ان دونوں نے حساب کتاب رکھنا اور معمولی کاروباری خط لکھنا سیکھ لیا۔ حجام کا حوصلہ بس اس حد تک تھا کہ گاہکوں سے بات چیت کرنے کی انگریزی آجائے۔ میرے شاگردوں میں سے دو کو پڑھنے سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا۔

میں جلسے کے نتیجے سے مطمئن تھا جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے ہوا کہ اس قسم کے جلسے مہینے میں ایک بار ہوا کریں یہ جلسے کم و بیش پابندی سے ہوتے تھے اور میں آزادی سے تبادلہ خیالات کیا کرتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پریٹوریا میں کوئی ہندوستانی

ایسا نہ تھا جس کی مجھ سے ملاقات نہ ہو اور جس کے حالات مجھے نہ معلوم ہوں اب میں نے مناسب سمجھا کہ مسٹر جیکوئس ڈی ویٹ سے جو پریٹوریا میں برطانوی ایجنٹ تھے، ملوں انہیں ہندوستانیوں سے ہمدردی تھی مگر ان کا اثر بہت کم تھا۔ بہر حال وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جہاں تک ہو سکے گا ہماری مدد کریں گے اور مجھے دعوت دی کہ جب ضرورت ہو مجھ سے مل لیا کرو۔

اب میں نے ریلوے حکام سے خط و کتابت کی اور انہیں یہ بتایا کہ جو پابندیاں ہندوستانیوں پر عائد کی جاتی ہیں وہ خود ان کے قواعد کی رو سے جائز قرار نہیں پا سکتیں مجھے یہ جواب ملا کہ جو ہندوستانی معقول لباس پہنتے ہوں انہیں پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ ملا کریں گے اس سے ہماری دقت رفع نہیں ہوئی کیونکہ معقول لباس کا فیصلہ کرنا تو سٹیشن ماسٹر کے اختیار میں تھا۔

برطانوی ایجنٹ نے مجھے ہندوستانیوں کے متعلقہ کچھ کاغذات دکھائے طیب سیٹھ نے بھی مجھے اس قسم کے کاغذات دیئے تھے ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی کس بے رحمی سے ارینج فری اسٹیٹ سے نکالے جا رہے ہیں۔

پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرانسوال اور ارینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ مطالعہ میرے لیے آگے چل کر اس قدر مفید ثابت ہو گا کیونکہ میرا خیال تھا کہ سال کے آخر تک بلکہ اگر مقدمہ جلد ختم ہو گیا تو اس سے بھی پہلے ہندوستان واپس جاؤں گا۔

مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی۔

☆☆☆☆☆☆

قلیوں کی درگت

یہاں ٹرانسوال اور آرینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی حالت تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں جو لوگ اس سے پورے طرح واقف ہونا چاہتے ہیں وہ میری کتاب ''جنوبی افریقہ کے ستیا گرہ کی تاریخ'' پڑھیں البتہ اس کا کچھ مختصر سا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

آرینج فری اسٹیٹ میں ہندوستانی ایک خاص قانون کے ذریعے سے جو 1888ء میں بلکہ اس سے بھی پہلے پاس ہوا تھا کل حقوق سے محروم کیے جا چکے تھے اب ان کے وہاں رہنے کی صرف یہی صورت تھی کہ ہوٹلوں میں بیرے بن کر رہیں یا اور اسی قسم کے ادنیٰ پیشے اختیار کریں تاجر برائے نام ہرجانہ دے کر نکال دیئے گئے تھے انہوں نے عرضیاں دیں، وفد بھیجے مگر کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔

ٹرانسوال میں 1885ء میں ایک بڑا سخت قانون پاس ہوا 1886ء میں اس میں کچھ خفیف سی ترمیم ہوئی جس کی رو سے ہندوستانیوں کو نٹال میں داخل ہونے کے لیے تین پونڈ محصول دینا پڑتا تھا انہیں سوائے بعض علاقوں کے جو ان کے لیے مخصوص کر دیئے گئے تھے کہیں زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی اور ان علاقوں میں بھی اراضی عملاً ان کی ملکیت نہیں ہوتی تھی انہیں ووٹ دینے کا حق نہ تھا وہ قانون جس میں یہ سب قیود لگائی گئی تھیں خاص ایشیا کے باشندوں کے لیے تھا اس کے علاوہ ان لوگوں پر وہ قوانین بھی عائد ہوتے تھے جو غیر سفید اقوام کے خلاف وضع کیے گئے تھے ان کی رو سے ہندوستانیوں کو سڑک کے کنارے کی پٹڑی پر چلنے کی

ممانعت تھی اور رات کو نو بجے کے بعد بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکلنے پاتے تھے اس ضابطہ کی عملدرآمد میں ہندوستانیوں کے ساتھ نرمی اور سختی دونوں کی گنجائش تھی جو لوگ ''عرب'' سمجھے جاتے تھے وہ رعایۃً اس سے مستثنیٰ کر دیئے۔

مجھے خود ان دونوں ضابطوں سے سابقہ پڑا میں رات کو اکثر مسٹر کوٹس کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتا تھا اور ہم دونوں عموماً دس بجے کے قریب واپس آیا کرتے تھے اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پولیس مجھے گرفتار نہ کر لے مسٹر کوٹس کو اس معاملے میں مجھ سے زیادہ تشویش تھی وہ اپنے حبشی نوکروں کو پاس دیا کرتے تھے لیکن مجھے کیسے دیتے؟ وہ تو صرف آقا اپنے نوکروں کو دے سکتا تھا اگر میں ان سے پاس مانگتا اور وہ دینے پر تیار بھی ہو جاتے تب بھی اصولاً نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ دغابازی میں داخل تھا۔

اس لیے مسٹر کوٹس یا ان کے کوئی دوست مجھے ڈاکٹر کراوز کے پاس لے گئے جو حکومت کے قانونی مشیر تھے وہ اسی انس آف کورٹ کے بیرسٹر نکلے جہاں کا میں تھا۔ انہیں اس پر بہت غصہ آیا کہ میری حیثیت کا آدمی رات کو نو بجے کے بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور بجائے پاس کے مجھے ایک خط لکھ کر دے دیا جس کی رو سے مجھے اختیار تھا کہ ہر وقت بے روک ٹوک باہر نکل سکوں۔ میں جب کبھی باہر جاتا تھا تو یہ خط اپنے پاس رکھتا تھا محض اتفاق کی بات تھی کہ مجھے کبھی اس سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر کراوز نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور ہم دونوں میں خاصی دوستی ہو گئی میں کبھی کبھی ان کے یہاں جایا کرتا تھا اور ان ہی کے توسط سے میری ملاقات ان کے بھائی سے ہوئی جو ان سے زیادہ مشہور تھے یہ جوہانسبرگ میں سرکاری وکیل تھے جنگ بوئر کے زمانے میں انہیں فوجی عدالت کے ایک انگریز افسر کے قتل کے

الزام میں سات برس کی سزا ہوئی انس آف کورٹ کے منتظموں نے ان کا نام بیرسٹروں کے زمرنے سے خارج کر دیا۔لڑائی کے ختم ہونے کے بعد رہا ہو کر اعزاز کے ساتھ ٹرانسوال کی مجلس وکلاء میں دوبارہ داخل کیے گئے اور بدستور وکالت کرنے لگے۔

ان لوگوں کی ملاقات آگے چل کر قومی خدمت کی زندگی میں میرے لیے مفید ثابت ہوئی اور اس کی بدولت میرے کام میں بڑی آسانی ہوگئی۔

پٹڑی پر چلنے کے متعلق جو ضابطہ تھا اس سے مجھے زیادہ نقصان پہنچا میں ہمیشہ ٹہلنے کے لیے پریسیڈنٹ سٹریٹ سے ہوتا ہوا کھلے میدان میں نکل جایا کرتا تھا۔ پریسیڈنٹ کروگر کا مکان اسی سڑک پر تھا۔یہ ایک معمولی سی عمارت تھی جس میں باغ تک نہ تھا اور اس میں آس پاس کے مکانوں میں مشکل سے تمیز کی جا سکتی تھی پریٹوریا کے بہت سے لکھ پتیوں کے مکان کہیں زیادہ شاندار تھے جن کے احاطوں میں باغ لگے ہوئے تھے پریسیڈنٹ کروگر کی سادگی ضرب المثل تھی صرف مکان کے سامنے پولیس کا پہرا دیکھ کر پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کسی سرکاری عہدیدار کا مکان ہے میں تقریباً ہمیشہ پٹڑی پر پہرے داروں کے قریب سے جایا کرتا تھا اور کبھی روک ٹوک نہیں ہوئی۔

مگر پہرے دار بدلتے رہتے تھے ایک بار ان میں سے ایک شخص نے بغیر اس کے کہ مجھے آگاہ کرتا یا پٹڑی سے اترنے کے لیے کہتا مجھے دھکا دے کر اور لات مار کر سڑک پر دھکیل دیا مجھے بڑا رنج ہوا مگر اس سے پہلے کہ میں اس شخص سے اس برتاؤ کا سبب پوچھوں مسٹر کوٹس نے جو اتفاق سے اسی وقت گھوڑے پر سوار وہاں سے گزر رہے تھے مجھے آواز دی اور کہا ''گاندھی میں نے سارا واقعہ دیکھا ہے اگر تم اس شخص

پر مقدمہ چلاؤ تو میں خوشی سے گواہی دوں گا مجھے نہایت افسوس ہے کہ تم پر اس بدتمیزی سے حملہ کیا گیا۔''

میں نے کہا ''اس میں افسوس کی کیا بات ہے، اس غریب کو کیا معلوم کہ یہ کون شخص ہے، اس کے نزدیک سب کالے آدمی برابر ہیں۔ غالباً وہ حبشیوں کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرتا ہے جو اس نے میرے ساتھ کیا میں نے یہ اصول قرار دے لیا میں اپنے ذاتی معاملے میں کبھی عدالت میں چارہ جوئی نہیں کروں گا اس لیے ارادہ اس پر مقدمہ چلانے کا نہیں''

مسٹر کوٹس نے کہا ''تم سے یہی توقع تھی مگر پھر سے سوچ لو ہمیں ان لوگوں کو سبق ضرور دینا چاہیے۔'' پھر انہوں نے پولیس والے سے مخاطب ہو کر اس کو ملامت کی میں ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا کیونکہ پولیس والا بوئر تھا اور یہ دونوں ولندیزی [32] زبان میں گفتگو کر رہے تھے مگر آخر میں اس سپاہی نے مجھ سے معافی مانگی جس کی کوئی ضرورت نہ تھی میں پہلے ہی معاف کر چکا تھا۔

مگر میں پھر کبھی اس سڑک پر نہیں گیا میں نے سوچا کہ اس شخص کی جگہ دوسرے لوگ آئیں گے انہیں یہ واقعہ تو معلوم نہیں ہوگا اس لیے وہ بھی مجھ سے اسی قسم کا برتاؤ کریں گے میں کیوں بے ضرورت ایسا کام کروں جس میں لاتیں کھانے کا اندیشہ ہو۔ اس لیے میں نے ٹہلنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس واقعے سے میرے دل میں نو آباد ہندوستانیوں کا درد اور بڑھ گیا میں نے ان سے مشورہ کیا کہ اگر ان ضابطوں کی منسوخی کے لیے برطانوی ایجنٹ سے ملنے کے بعد آزمائشی مقدمہ لڑنے کی ضرورت پڑے تو لڑنا چاہیے یا نہیں۔

اس طرح مجھے نو آباد ہندوستانیوں کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقع ملا اور وہ

بھی سن سنا کر یا کتابوں میں پڑھ کر نہیں بلکہ ذاتی تجربے کی بناء پر مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خوددار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اس فکر میں غلطاں اور پیچاں رہنے لگا کہ اس حالت میں اصلاح کرنے کی کیا صورت ہے۔

لیکن اس وقت تو میرا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ دادا عبداللہ کے مقدمے کی پیروی کروں۔

☆☆☆☆☆☆☆

مقدمے کی تیاری

پریٹوریا میں ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا۔ یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا اور اسے انجام دینے کی تھوڑی بہت قابلیت پیدا ہوئی یہیں وہ مذہبی روح جو میرے دل میں تھی قوت سے فعل میں آئی یہیں مجھے وکالت کے متعلق صحیح واقفیت حاصل ہوئی اور میں نے وہ چیزیں سیکھیں جو ایک نیا بیرسٹر ایک پرانے بیرسٹر کے دفتر میں سیکھتا ہے۔ یہیں مجھے یہ اعتماد پیدا ہوا کہ میں وکالت میں کچھ ایسا برا نہ رہوں گا اور یہیں کامیابی کی کنجی میرے ہاتھ لگی۔

دادا عبداللہ کا مقدمہ کوئی چھوٹا مقدمہ نہ تھا چالیس ہزار پونڈ کا دعویٰ تھا اس کا تعلق تجارتی معاملات سے تھا اس لیے اس میں سیاق کی بڑی بڑی پیچیدگیاں تھیں دعویٰ کا ایک جزو پرامیری نوٹوں پر مبنی تھا اور ایک پرامیری نوٹ لکھنے کے صریحی دعوے پر (جواب دعویٰ یہ تھا کہ یہ نوٹ دھوکہ دے کر حاصل کیے گئے) ان کے لکھنے کی کوئی معقول وجہ ثابت نہیں ہوتی اس پیچیدہ مقدمے میں بہت سے نفس الامری اور قانونی نکتے تھے۔

فریقین کی طرف سے چوٹی کے وکیل اور بیرسٹر تھے اس طرح مجھے اس کام کے مطالعے کا بہت عمدہ موقع ملا مدعی کی طرف سے مقدمے کے کاغذات ترتیب دے کر وکیل کے حوالے کرنا اور واقعات کی چھان بین کر کے مدعی کے مفید مطلب باتیں نکالنا میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وکیل میرے ترتیب دیئے ہوئے

واقعات کا کتنا حصہ قبول کرتا ہے اور کتنا رد کرتا ہے اور بیرسٹر وکیل کی تیار کی ہوئی کیفیت کو کس حد تک کام میں لاتا ہے اور یہ میرے لیے ایک مفید تعلیم تھی اس لیے مجھے اچھا خاصا اندازہ ہو گیا کہ معاملے کو سمجھنے اور شہادت دینے کو ترتیب دینے کی کو حد تک قابلیت رکھتا ہوں۔

میں اس کام میں بڑی سرگرمی سے مصروف تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دل و جان سے محو تھا میں نے معاملات کے متعلق کل کاغذات پڑھے میرے موکل قابل آدمی تھے اور مجھ پر پورا اعتبار کرتے تھے جس سے میرے کام میں بڑی آسانی ہو گئی میں نے سیاق پر خاصا عبور حاصل کر لیا اور چونکہ خط و کتاب زیادہ تر گجراتی میں ہوتی تھی اور مجھے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنا پڑتا اس لیے میری ترجمے کی مشق بھی بڑھ گئی۔

اگرچہ مجھے مذہبی مشاغل اور قومی خدمت سے بڑی دلچسپی تھی اور میں اپنے وقت کا کچھ حصہ ان میں صرف کرتا تھا لیکن یہ چیزیں میری توجہ کا مرکز نہ تھیں سب سے زیادہ شغف مجھے مقدمہ کی تیاری میں تھا قانونی کتابوں کا مطالعہ اور حسب ضرورت نظیریں تلاش کرنا میرے نزدیک سب سے مقدم تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے مقدمے کے واقعات پر اتنا عبور ہو گیا جتنا خود مدعی اور مدعا علیہ کو بھی نہ ہو گا کیونکہ میرے پاس دونوں کے کاغذات موجود تھے۔

مجھے مسٹر پنکٹ آنجہانی کی یہ نصیحت یاد تھی کہ مقدمے کے تین چوتھائی واقعات کو سمجھنا چاہیے آگے چل کر جنوبی افریقہ کے مشہور بیرسٹر مسٹر لیونارڈ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ میں نے اپنے مقدمے میں یہ دیکھا کہ اگرچہ میرا موکل حق پر ہے لیکن قانون بظاہر اس کے خلاف ہے میں نے مایوسی کی حالت میں مسٹر لیونارڈ سے مدد چاہی انہیں بھی یہ محسوس ہوا کہ واقعات کی شہادت بہت قوی ہے انہوں نے جوش

میں آ کر کہا گاندھی میں نے اتنے دن میں ایک بات سیکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم مقدمے میں واقعات کا پہلو سنبھال لیں تو قانونی پہلو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا ہمیں اس مقدمے کے واقعات کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمے پر اور غور کرو اور پھر میرے پاس آؤ میں نے واقعات پر دوبارہ نظر ڈالی تو مقدمے کی صورت کچھ اور ہی ہوگئی اور مجھے اس کے متعلق جنوبی افریقہ کی ایک نظیر بھی مل گئی میں خوش خوش مسٹر لیونارڈ کے پاس گیا اور ان سے سب حالات بیان کیے انہوں نے کہا ''بس اب ہم جیت جائیں گے البتہ اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ مقدمہ کس جج کے سامنے پیش ہوتا ہے''

دادا عبداللہ کے مقدمے کی ترتیب کے زمانے میں مجھے واقعات کی اہمیت کا افسوس تھ اگر اس حد تک نہیں تھا اصل میں واقعات حق کا نام ہے اور اگر ہم حق کا دامن مضبوطی سے تھام لیں تو قانون خود بخود ہماری مدد کرتا ہے میں نے دیکھا کہ دادا عبداللہ کا مقدمہ واقعات کے اعتبار سے بہت زوردار ہے اور قانون یقیناً ان کی مدد کرے گا لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال ہوا کہ اگر مقدمہ بازی کا سلسلہ یوں چلتا رہا تو مدعی اور مدعا علیہ جو ایک ہی شہر کے رہنے والے اور آپس میں رشتہ دار ہیں تباہ ہو جائیں گے کسی کو خبر نہ تھی کہ مقدمہ کب تک چلے گا اندیشہ تھا کہ عدالت ہی کے ذریعے سے فیصلہ ہوا تو مدتوں میں ہوگا اور دونوں فریقوں میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لیے دونوں کی خواہش تھی کہ اگر ممکن ہو تو فوراً تصفیہ ہو جائے۔

میں نے طیب سیٹھ سے مل کر انہیں مشورہ دیا اور اپنی طرف سے درخواست کی کہ پنچایت سے فیصلہ کر لیجیے میں نے کہا آپ اپنے بیرسٹر سے گفتگو کیجیے اگر کوئی ایسا شخص پنچ بنا دیا جائے جس پر فریقین کو اعتبار ہو تو بہت جلد تصفیہ ہو جائے گا میں دیکھ

رہا تھا کہ وکیلوں کی فیس میں روپیہ اتنی تیزی سے گھل رہا ہے کہ اگر چہ موکل دولت مند تاجر ہیں لیکن ان کا سارا سرمایہ اسی میں کھپ جائے گا اور پھر انہیں مقدمے کی اتنی فکر رہتی ہے کہ کسی اور کام کی فرصت نہیں ملتی۔ ادھر آپس میں مخالفت بڑھتی جاتی ہے مجھے اس پیشہ سے نفرت ہو گئی۔ دونوں طرف سے بیرسٹر اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے قانونی پہلو نکالیں جو ان کے موکل کے حق میں مفید ہوں اس کے علاوہ مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ جو فریق جیتتا ہے اسے پورا خرچہ نہیں ملتا۔ کورٹ فیس کے ضابطے کی رو سے خرچ کی جو ایک فریق سے دوسرے کو دلایا جاتا تھا، ایک خاص رقم متعین کر دی گئی تھی لیکن اصل میں وکیل اپنے موکل سے اس سے کہیں زیادہ وصول کرتے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ دونوں فریقوں کا خیر خواہ رہوں اور ان میں میل کرا دوں میں نے مصالحت کی انتہائی کوشش کی خدا خدا کر کے طیب سیٹھ راضی ہو گئے ایک پنچ مقرر کئے گئے ان کے سامنے مقدمے کی بحث ہوئی اور فیصلہ دادا عبداللہ کے موافق ہوا۔

لیکن مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا میں نے سوچا کہ اگر میرے موکل نے فوراً ڈگری اجرا کرائی تو سیٹھ طیب پورا روپیہ ادا نہیں کر پائیں گے اور جنوبی افریقہ میں جو پوربندر کے میمن رہتے تھے ان میں بن لکھا قانون تھا کہ دیوالے پر موت کو ترجیح دینا چاہیے۔ سیٹھ طیب کے لیے سینتیس ہزار پاؤنڈ اور خرچ یکمشت ادا کرنا ناممکن تھا وہ چاہتے تھے کہ پیشہ پیشہ چکا دیں اور دوالیے نہ قرار دیئے جائیں اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دادا عبداللہ ان سے تھوڑا تھوڑا کر کے روپیہ لیں انہوں نے وہ فراخدلی دکھائی جس کی اس موقع پر ضرورت تھی اور سیٹھ طیب کو بہت سی قسطوں میں رقم ادا کرنے کی اجازت دے دی مجھے قسط وار ادائیگی کی رعایت حاصل کرنے میں

اتنی دقت ہوئی جتنی فریقین کو پنچایت پر راضی کرنے میں بھی نہیں ہوئی تھی لیکن جب تصفیہ ہو گیا تو دونوں کو خوشی ہوئی اور دونوں کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھ گئی میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی میں سمجھا کہ میں نے وہ بات سیکھ لی جو وکالت کا حقیقی مقصد ہے مجھے فطرت انسانی کے اعلیٰ عنصر کا ڈھونڈ ھ نکالنا اور لوگوں کے دل کی بات سمجھنا آ گیا۔ مجھ پر راز کھل گیا کہ وکیل کا اصل کام کیا ہے کہ جن دلوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہو انہیں ملا دے یہ سبق میرے دل پر ایسا نقش ہو گے ا کہ بیس سال کی وکالت کے زمانے میں میرا وقت زیادہ تر سینکڑوں مقدموں میں آپس میں راضی نامہ کرانے میں صرف ہوا اس میں میرا نقصان نہیں ہوا یہاں تک کہ میری آمدنی میں بھی کمی نہیں ہوئی اور میری روح تو بلاشبہ ہلاکت سے محفوظ رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆

مذہبی جوش

اب میں پھر ان معاملات کی طرف رجوع کرتا ہوں جو عیسائی دوستوں کے سابقے میں پیش آئے مسٹر بیکر کو میری آئندہ زندگی کی بڑی فکر تھی وہ مجھے ویلنگٹن کانفرنس میں لے گئے پروٹسٹنٹ عیسائی چند سال کے وقفے سے اس طرح کے جلسے ''روحانی روشنی'' یعنی تزکیہ نفس کی خاطر کیا کرتے تھے اسے ہم مذہبی تجدید یا ایمان تازہ کرنا کہہ سکتے ہیں ویلنگٹن کانفرنس اسی قسم کی چیز تھی اس کے صدر وہاں کے مشہور پادری اینڈریو مرے صاحب تھے مسٹر بیکر صاحب کو امید تھی کہ کانفرنس کی مذہبی ذوق وشوق کی فضا اور حاضرین کے جوش اور خلوص کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ میں عیسائیت قبول کرلوں گا۔

مگران کا آخری سہارا دعا کی تاثیر تھی دعا کے وہ بہت قائل تھے انہیں یقین کامل تھا کہ اگر دل سے دعا مانگی جائے تو خدا ضرور سنتا ہے وہ ایسے لوگوں کی مثال دیا کرتے تھے جیسے برسٹل کا جارج ملر جو دنیاوی امور میں بھی ہمیشہ دعا ہی سے کام لیتا تھا میں دعا کی تاثیر کے متعلق ان کی تقریر بغیر کسی تعصب کے توجہ سے سنا کرتا تھا اور میں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اگر عیسائیت کے اصول میرے دل میں اتر گئے تو کوئی چیز مجھے عیسائی ہونے سے نہیں روک سکتی مجھے ان سے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہ تھا اس لیے میں نے مدت سے اپنے نفس کو ضمیر کی پیروی کا عادی بنالیا تھا مجھے اس کی اطاعت میں لطف آتا تھا۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا میرے لیے مشکل اور تکلیف دہ ہوتا تھا۔

غرض ہم ویلنگٹن گئے مسٹر بیکر میرے جیسے کالے آدمی کو ساتھ لے جانے سے بڑی مشکل میں پڑ گئے انہیں بارہا محض میرے سبب سے تکلیفیں جھیلنا پڑیں ہمیں ایک روز رستے میں ٹھہرنا پڑا کیونکہ اتوار کا دن آ گیا اور مسٹر بیکر اور ان کے ساتھی یوم السبت کو سفر نہیں کر سکتے تھے اسٹیشن کے ہوٹل میں مینجر بڑی تکرار کے بعد مجھے ٹھہرانے پر تو راضی ہو گیا مگر کھانے کے کمرے میں جانے کی کسی طرح اجازت نہیں دی مسٹر بیکر آسانی سے ماننے والے آدمی نہ تھے وہ اس پر اڑ گئے تھے کہ ہوٹل کے مسافروں کو جو حقوق ہیں وہ اسے بھی دیئے جائیں مگر مجھے اس شخص کی مشکلوں کا اندازہ تھا ویلنگٹن میں بھی میں مسٹر بیکر کے ساتھ ٹھہرا انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں ناگوار صورتیں پیش آتی تھیں وہ انہیں مجھ سے چھپانا چاہتے تھے مگر مجھے سب معلوم تھا۔

یہ کانفرنس دیندار عیسائیوں کی ملن تھی مجھے ان کی خوش اعتقادی دیکھ کر بہت مسرت ہوئی میں پادری مرے صاحب سے ملا۔ میں نے دیکھا کہ بہت لوگ میرے لیے دعا کر رہے ہیں مجھے ان کی بہت سی مناجاتیں پسند آئیں ان میں بڑی شیرینی تھی۔

کانفرنس تین دن رہی جو لوگ اس میں شریک تھے ان کی دینداری کی میرے دل میں بڑی قدر تھی مگر مجھے اپنا عقیدہ بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی یہ یقین کرنا میرے لیے ناممکن تھا کہ جب تک عیسائی نہ ہو جاؤں گا میری نجات نہ ہو گی میں نے یہ بات اپنے چند نیک عیسائی دوستوں سے کہی تو ان کے دل کو بڑا دھچکا لگا مگر میں کیا کرتا مجبور تھا۔

میری مشکلات بہت گہری تھیں یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ

مسیح خدا کے مجسم اکلوتے بیٹے ہیں اور صرف وہی شخص جو انہیں مانتا ہے ابدی نجات حاصل کر سکتا ہے میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ اگر کوئی خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے تو ہم سب اس کے بیٹے ہیں اگر مسیح خدا سے مشابہ ہیں یا خدا ہیں تو سبھی انسان خدا سے مشابہ ہیں اور خدا ہو سکتے ہیں میری عقل قبول نہیں کرتی تھی کہ مسیح کی شہادت اور ان کے خون سے دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہونا حقیقی معنی میں صحیح ہے استعارے کے طور پر ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت ہو۔ پھر مذہب عیسوی کہتا تھا کہ جانوروں میں روح نہیں ہوتی ان کے لیے موت کامل فنا ہے اور میرا عقیدہ اس کے خلاف تھا میں مسیح کو شہید، ایثار مجسم، خدا کا رسیدہ گرو مان سکتا تھا مگر سب سے مکمل انسان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا ان کا صلیب پانا دنیا کے لیے ایک شاندار مثال تھی مگر یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی تھی کہ اس میں کوئی پر اسرار دیا معجز نما تاثیر تھی۔ فلسفیانہ حیثیت سے عیسائیت کے اصولوں میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ایثار کے نقطہ سے میرے خیال میں ہندو عیسائیوں سے بہت آگے تھے میرے لیے عیسائیت کو مکمل یا سب مذہبوں سے بڑھ کر سمجھنا ناممکن تھا۔

جب موقع ملتا تھا میں اپنے خدشوں کا ذکر اپنے عیسائی دوستوں سے کرتا تھا مگر ان کے جوابوں سے مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی اس زمانے میں جس طرح میں عیسائیت کو مکمل یا بہترین مذہب تسلیم نہیں کرتا تھا اسی طرح ہندو دھرم کو بھی نہیں مانتا تھا ہندوؤں کے عیب میری نظروں میں کھٹکتے تھے میں جانتا تھا کہ چھوت چھات ہندو دھرم کا جزو ہے تو اسی طرح ہے جیسے بد گوشت جسم کا جزو ہوتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے فرقوں اور ذاتوں کے ہونے میں کیا مصلحت ہے اس کے کیا معنی ہیں کہ وید خدا کا منزل کلام ہے۔ اگر اسے منزل مانا جائے تو بائیبل اور قرآن کو بھی ماننا

چاہیے۔

جس طرح عیسائی دوست مجھے اپنے مذہب میں لانے کی کوشش کر رہے تھے اسی طرح مسلمان دوست بھی کر رہے تھے عبداللہ سیٹھ برابر مجھے اسلام کے مطالعہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور ہمیشہ اس کی کوئی نہ کوئی خوبی بیان کرتے تھے۔

میں نے رائے چند بھائی کو خط لکھا جس میں اپنے شبہے ظاہر کئے ہندوستان کے اور دھرم شاستریوں سے بھی میں نے خط و کتاب کی رائے چند بھائی کے خط سے مجھے کسی قدر تسکین ہوئی انہوں نے لکھا کہ تم صبر سے کام لو اور ہندو مذہب کا اور گہرا مطالعہ کرو ان کا ایک جملہ یہ تھا ''اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ہندو دھرم میں جتنی دقت نظر، نزاکت خیال، روحانی بلند پروازی اور کشادہ دلی ہے کسی مذہب میں نہیں۔''

میں نے سیل کا ترجمہ قرآن خرید کر اس کا مطالعہ شروع کیا اور اسلام کے متعلق اور کتابیں بھی مہیا کیں میں نے انگلستان کے عیسائی دوستوں کو خطوط لکھے ان میں سے ایک نے میرا تعارف ایڈورڈ میلینڈ سے کرایا۔ جس سے میری خط و کتابت ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے ''طریق احسن'' بھیجی جو انہوں نے اور انیا کنگسفورڈ نے مل کر لکھی تھی اس کتاب میں عیسائیوں کے مروجہ عقائد کی تردید تھی انہوں نے مجھے ایک اور کتاب بائبل کی ''تفسیر'' اور ''جدید'' بھی بھیجی مجھے یہ دونوں پسند آئیں ان سے بظاہر ہندو دھرم کی تائید ہوتی تھی ٹالسٹائی کی ''خدا کی سلطنت تمہارے سینے میں ہے۔'' نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس کا اثر میرے دل پر ہمیشہ باقی رہا اس میں اتنی آزادی خیال، اخلاقی گہرائی اور سچائی تھی کہ وہ سب کتابیں جو مسٹر کوٹس نے مجھے دی تھیں اس کے آگے ماند پڑ گئیں۔

غرض مجھے کتابوں کے مطالعے نے ایسے رستے پر ڈال دیا جس کا میرے عیسائی دوستوں کو خیال تک نہ آیا ایڈورڈ ڈمیٹلینڈ سے میری خط و کتابت بہت دن تک ہوتی رہی اور رائے چند بھائی سے تو جب تک وہ زندہ رہے نامہ و پیام جاری رہا۔ انہوں نے جو کتابیں مجھے بھیجی تھیں ان میں سے بعض میں نے پڑھیں مثلاً پنچ کرن رت نملا، یوگ وشستا کی موملکشا پرا کرن اور ہری بھدر سوری کی سدرشن سچیا وغیرہ۔

اگر چہ میں اس رستے پر چلنے لگا جس پر میرے عیسائی دوست مجھے نہیں چلانا چاہتے تھے تاہم میں ان کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا کہ انہوں نے میرے دل میں مذہبی تحقیق کے شوق کو ابھارا۔ مجھے ان کی صحبت کی یاد ہمیشہ عزیز رہے گی اس کے بعد آنے والے زمانے میں ایسی اور بہت سی صحبتیں میرے نصیب میں تھیں۔

☆☆☆☆☆☆

آدمی کیا سوچتا ہے اور خدا کیا کرتا ہے

مقدمہ طے ہو چکا تھا اور اب میرے پریٹوریا میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے میں ڈربن واپس آیا اور وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگا مگر بھلا عبداللہ سیٹھ مجھے بغیر رخصتی جلسے کے کب جانے دیتے تھے انہوں نے مجھے رخصت کرنے کے لیے سڈنہم میں جلسہ منعقد کیا۔

ہم لوگ وہاں دن بھر رہنے کے ارادے سے گئے میں بیٹھا کچھ اخباروں کی ورق گردانی کررہا تھا کہ اتفاق سے اخبار کے ایک کونے میں میری نظر ایک پیرا گراف پر پڑی جس کا عنوان تھا "ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق" یہ اس مسودہ قانون کے متعلق تھا جو ان دنوں مجلس وضع قوانین میں پیش تھا اور جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستانی نٹال کی مجلس وضع قوانین کے رکن منتخب کرنے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں مجھے اور دوسرے مہمانوں کی جو وہاں جمع تھے اب تک اس مسودے کا علم نہ تھا۔

میں نے عبداللہ سیٹھ سے اس کے متعلق پوچھا انہوں نے کہا بھلا ہم لوگ ان معاملات کو کیا جانیں ہم تو صرف ان باتوں کو سمجھتے ہیں جن کا اثر ہماری تجارت پر پڑتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ اورنج فری اسٹیٹ میں ہماری جتنی تجارت تھی سب برباد کر دی گئی ہم نے بہت فریاد کی مگر کچھ نتیجہ نہیں ہوا ان پڑھ ہونے کے سبب ہم بالکل بے دست و پا ہیں ہم اخبار عموماً محض اس لیے پڑھتے ہیں کہ بازار کے روزانہ نرخ وغیرہ معلوم کرتے ہیں ہمیں کیا خبر کہ وضع قوانین کسے کہتے ہیں ہماری آنکھ کان تو

یہاں کے یورپی وکیل ہیں۔

میں نے کہا ''یہاں بہت سے نوجوان ہندوستانی ہیں جن کی پیدائش اور تعلیم یہیں کی ہے وہ آپ کی مدد نہیں کرتے؟''

عبداللہ سیٹھ نے جھلا کر کہا ''جی ہاں! وہی تو ہماری مدد کریں گے وہ تو ہمارے پاس تک نہیں پھٹکتے اور سچ پوچھیے تو ہم بھی انہیں اپنا نہیں سمجھتے عیسائی ہونے کے سبب سے وہ لوگ یورپی پادریوں کی مٹھی میں ہیں اور پادری ٹھہرے گورنمنٹ کے نیازمند۔''

یہ سن کر میری آنکھیں کھل گئیں میں نے دل میں سوچا کہ ان لوگوں کو اپنا بنانا چاہیے کہ عیسائیت کے یہی معنی ہیں؟ کیا عیسائی ہو جانے سے آدمی ہندوستانی نہیں رہتا؟

لیکن میں وطن کی واپسی کے لیے پابرکاب تھا اس لیے میں اس مسئلے کے متعلق جو خیالات میرے دل میں تھے انہیں ظاہر کرتے ہچکچاتا تھا میں نے عبداللہ سیٹھ سے صرف اتنی بات کہی ''اگر یہ مسودہ پاس ہو کر قانون بن گیا تو ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی یہ ہمارے لیے موت کا پیغام ہے یہ ہماری خودداری کو مٹا کر چھوڑے گا۔''

سیٹھ عبداللہ نے کہا ''بہت ممکن ہے مگر یہ تو سنیے کہ ووٹ کا مسئلہ کیونکر شروع ہوا ہمیں اس کی کچھ خبر نہ تھی مسٹر ایسکومب نے جو یہاں چوٹی کے وکیل ہیں جنہیں آپ بھی جانتے ہیں ہمیں یہ بات سمجھائی اس کا قصہ یہ ہے کہ مسٹر ایسکومب بڑے زبردست لڑنے والے ہیں ان میں اور بندرگاہ کے انجینئر میں ان بن تھی ان کا خیال تھا انجینئر ان کے ووٹ چھین لے گا اور انہیں انتخاب میں شکست دے دے گا اس لیے انہوں نے ہمارے حقوق سمجھائے اور ان کے کہنے سے ہم لوگوں نے اپنے نام

ووٹ ڈالنے والوں کے رجسٹر میں لکھوا لیے اور ان کے حق میں ووٹ دیا اب آپ ہی دیکھیے کہ ووٹ کے حق کی اہمیت آپ کی نظر میں ہے ہماری نظر میں کیسے ہو سکتی ہے مگر ہم آپ کا مطلب سمجھتے ہیں آپ یہ بتایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

اور مہمان اس گفتگو کو غور سے سن رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا ''مجھ سے پوچھیے کہ کیا کرنا چاہیے آپ اپنا جہاز کا ٹکٹ منسوخ کرا لیجیے اور یہاں ایک مہینہ اور ٹھہریئے ہم آپ کی ہدایت کے مطابق لڑیں گے۔''

سب کے سب بول اٹھے ''بالکل ٹھیک ہے! بالکل ٹھیک ہے! عبداللہ سیٹھ آپ گاندھی بھائی کو ہرگز نہ جانے دیجیے''

سیٹھ بڑے سیانے آدمی تھے انہوں نے کہا ''مجھے اب کیا حق ہے کہ انہیں رکوں؟ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جتنا حق مجھے ہے اتنا ہی آپ کو بھی ہے۔ مگر آپ کہتے ٹھیک ہیں آیئے ہم سب مل کر انہیں روکیں البتہ یہ یاد رکھیے کہ یہ بیرسٹر ہیں ان کی فیس کا کیا بندوبست ہو گا؟''

فیس کے ذکر سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے قطع کلام کر کے کہا سیٹھ صاحب فیس کا نام بھی نہ لیجیے قومی خدمت کی کوئی فیس نہیں ہوتی میں یہاں ٹھہرا بھی تو خادم کی حیثیت سے ٹھہروں گا اور آپ کو معلوم ہے کہ میں ان سب دوستوں سے واقف نہیں ہوں اگر آپ کو یقین ہو کہ یہ میرا ساتھ دیں گے تو میں ایک مہینہ ٹھہرنے کو تیار ہوں لیکن ایک بات ہے مجھے تو کوئی معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں مگر جس قسم کا کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس لیے ابتدا میں تھوڑا بہت روپیہ ضرور چاہیے مثلاً ممکن ہے ہمیں تار بھیجنا پڑیں کاغذات چھپوانا پڑیں دورہ کرنا، مقامی وکیلوں سے مشورہ لینا ہو اور چونکہ میں آپ کے یہاں کے قوانین سے ناواقف ہوں اس لیے شاید مجھے

معلومات حاصل کرنے کے لیے کچھ کتابوں کی ضرورت پیش آئے یہ سب کام بغیر روپیہ کے نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص کے بس کی بات نہیں بہت سے لوگوں کو میرا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

سب نے ایک زبان ہو کر کہا ''انشاء اللہ تعالیٰ، روپے کی کوئی کمی نہیں آدمی جتنے آپ چاہیں موجود ہیں آپ مہربانی کر کے ٹھہرنے کی ہامی تو بھریں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس طرح رخصتی پارٹی مجلس انتظامی بن گئی میں نے یہ رائے دی کہ کھانا وغیرہ جلدی ختم کر کے گھر واپس چلنا چاہیے میں نے اپنے دل میں اس مہم کا نقشہ سوچ لیا میں نے ان لوگوں کے نام معلوم کیے جن کا نام ووٹ دینے والوں کی فہرست میں تھا اور ایک مہینہ ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس طرح خدا نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور اس لڑائی کا بیج بویا جو قومی خودداری کی حفاظت کے لیے لڑی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نٹال میں مستقل سکونت

سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا 1893ء میں نٹال کے ہندوستانیوں کے ممتاز رہنما سمجھے جاتے تھے دولت کے اعتبار سے سیٹھ عبداللہ حاجی آدم سب سے بڑے مانے جاتے تھے لیکن پبلک معاملات میں وہ اور دوسرے لوگ سیٹھ حاجی محمد ہی کو اپنا سردار مانتے تھے اس لیے ان کی صدارت میں ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے گھر پر ہوا۔ جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسودہ قانون حق رائے دہندگی کی مخالفت کی جائے۔

رضا کار بھرتی کیے گئے جلسے میں وہ ہندوستانی بھی بلائے گئے جو نٹال میں پیدا ہوئے تھے جن میں سے اکثر نوجوان عیسائی تھے ڈربن کے مترجم عدالت مسٹر پال اور مشن سکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر سبحان گاڈفرے بھی موجود تھے اور ان ہی کی کوشش سے عیسائی نوجوان اچھی تعداد میں جمع ہو گئے تھے یہ سب لوگ رضا کاروں میں بھرتی ہو گئے۔

بہت سے مقامی تاجر بھی رضا کار بنے جن میں سے سیٹھ داؤد محمد، محمد قاسم، قمر الدین، آدم جی میاں خان، اے کولاند آویلو پلے، سی پچھمن رام، رنگا سامی پدیا چی اور امور جیو خاص طور پر قابل ذکر ہیں پارسی رستم جی بھی موجود تھے محرروں میں سے مانک جی، جوشی، نرسنگھ رام اور دادا عبداللہ کمپنی اور دوسری بڑی دکانوں کے ملازم تھے ان سب نے اپنے آپ کو قومی کام میں شرکت کرتے دیکھا تو انہیں تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ ان کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ انہیں اس کام میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔ قومی مصیبت کے وقت اونچے نیچے، چھوٹی بڑے، نوکر آقا،

ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، سندھی وغیرہ کا فرق بھلا دیا گیا سب کے سب یکساں اور وطن کے خادم تھے۔

مسودے کی دوسری خواندگی منظور ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں ان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کا اس سخت تجویز کی مخالفت نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ووٹ کا حق پانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

میں نے حاضرین جلسہ کو صورت حال سمجھائی سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مجلس وضع قوانین کے صدر کے نام تار بھیجا کہ مہربانی کر کے اس مسودے پر مزید بحث ملتوی کر دیجئے اسی مضمون کا تار وزیر اعظم سر جان رابنس کو دیا گیا اور مسٹر الیکومب کو بھی جو دادا عبداللہ کے دوست تھے صدر نے فوراً جواب دیا کہ بحث دو دن کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے اس سے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔

ایک عرضداشت مجلس وضع قوانین میں پیش کرنے کی غرض سے تیار کی گئی اس کی تین نقلیں مجلس کے لیے کرنا تھیں اور ایک زائد نقل اخباروں کے لیے یہ بھی تجویز تھی کہ ان حتی الامکان بہت سے دستخط حاصل کیے جائیں اور یہ سب کام ایک رات میں ختم کرنا تھا۔ انگریزی دان رضا کار اور بعض اور لوگ رات بھر جاگتے رہے ایک ضعیف العمر بزرگ مسٹر آرتھر نے جن کی خوشنویسی مشہور تھی پہلا بیضہ لکھا اور نقلیں دوسرے لوگوں نے اس طرح کیں کہ ایک شخص بولتا جاتا تھا اور کئی آدمی لکھتے جاتے تھے یوں ایک وقت میں پانچ نقلیں تیار ہو گئیں تاجروں میں سے جو لوگ رضا کار تھے انہوں نے اپنی گاڑیوں میں اور کرائے کی گاڑیوں میں گشت لگا کر لوگوں سے عرضداشت پر دستخط کرائے یہ کام بہت جلد ہو گیا اور عرضداشت بھیج دی گئی اخباروں نے اسے شائع کیا اور اپنی اپنی موافق رائے لکھی مجلس وضع قوانین میں بھی

لوگ اس سے متاثر ہوئے اور اس پر بحث کی گئی۔ مسودہ قانون کے حامیوں نے ان دلیلوں کا جو اس میں پیش کی گئی تھیں جواب دیا، جو مسلمہ طور پر کمزور تھا مگر قانون پاس ہو ہی گیا۔

سب جانتے تھے کہ یہی ہونا ہے لیکن اس تحریک کے جوش وخروش نے نٹال کے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کی جماعت ایک متحد جماعت ہے جس میں کوئی تفریق نہیں اور ان کا فرض ہے کہ جس طرح اس کے تجارتی حقوق کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح سیاسی حقوق کی بھی کریں۔

اسی زمانے میں لارڈ رپن برطانیہ کے وزیر نو آبادیت تھے ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو ایک عرضداشت بھیجی جائے جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوں کوئی چھوٹا کام نہیں تھا جو ایک دن میں ہو جاتا رضا کار بھرتی کیے گئے اور ان سب نے اپنا اپنا کام مستعدی سے انجام دیا۔

میں نے اس عرضداشت کے تیار کرنے میں بڑی محنت کی اس موضع پر جتنا مواد مل سکتا تھا سب کا مطالعہ کیا میرے استدلال کی بنیاد دو چیزیں تھیں ایک اصولی بات اور دوسرا مصلحت کا پہلو میں نے لکھا کہ چونکہ ہمیں ہندوستان میں ایک حد تک ووٹ کا حق حاصل ہے اس لیے اصولاً نٹال میں بھی ہونا چاہیے اور مصلحت بھی یہی ہے کہ یہ حق باقی رہنے دیا جائے کیونکہ ہندوستانیوں کی تعداد جو اسے استعمال کر سکتے ہیں بہت کم ہے۔

دو ہفتے کے اندر دس ہزار دستخط کیے گئے سارے صوبے سے اس تعداد میں دستخط حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا خصوصاً اس لحاظ سے کہ کام کرنے والے بالکل ناتجربہ کار تھے اس لیے خاص طور پر قابل رضا کاروں کا انتخاب کرنا پڑا کیونکہ طے کر لیا

گیا تھا کہ کسی شخص سے اس وقت تک دستخط نہ کرائے جائیں گے جب تک اسے عرضداشت کا مطلب پوری طرح نہ سمجھا دیا جائے۔ گاؤں دور دور پھیلے ہوئے تھے کام جلدی ہونا جبھی ممکن تھا کہ کچھ رضا کار دل و جان سے اس میں لگ جائیں۔ سب نے اپنے اپنے حصہ کا کام سرگرمی اور جوش سے انجام دیا لیکن ان سطروں کو لکھتے وقت سیٹھ داؤد محمد، رستم جی، آدم جی میاں خاں اور آمود جیو کی شکلیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ دستخط جمع کر کے لائے داؤد سیٹھ دن بھر اپنی گاڑی میں پھرتے رہے اور یہ سارا کام بلا معاوضہ کیا گیا بلکہ لوگوں نے جو اپنے پاس سے خرچ کیا تھا وہ بھی نہیں لیا دادا عبداللہ کا گھر سرائے اور عام دفتر بن گیا۔ متعدد تعلیم یافتہ دوست جو میرا ہاتھ بٹاتے تھے اور بہت سے لوگ وہیں کھانا کھاتے تھے اس طرح ہر شخص کو جو ہماری مدد کرتا تھا زیر بار ہونا پڑا۔

خدا خدا کر کے درخواست بھیجی گئی گشت کرانے اور تقسیم کرانے کے لیے اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی تھیں اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے لوگوں کو پہلی بار نٹال کے حالات معلوم ہوئے میں نے اس کی کاپیاں ہندوستان کے سب اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو جن سے میں واقف تھا بھیجیں۔

ٹائمز آف انڈیا نے اس عرضداشت پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبات کی زوردار تائید کی ہم نے انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو بھی اس کی کاپیاں بھیجیں لندن ٹائمز نے بھی ہماری تائید کی اور ہمارے دل میں یہ امید بندھنے لگی کہ یہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا۔

اب میرے لیے نٹال سے جانا ممکن نہ تھا ہندوستانی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور

میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہاں مستقل طور پر قیام کرلوں میں نے اپنی مشکلوں کا ذکر کیا میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ یہاں رہوں گا تو اس شرط پر کہ اپنا خرچ پبلک پر نہ ڈالوں گا اب یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ میں الگ گھر لے کر رہوں میں سوچتا تھا کہ مکان معقول ہو اور موقع بھی اچھا ہو یہ بھی خیال تھا کہ اگر میں اس شان سے نہ رہوں جیسے بیرسٹر عموماً رہتے ہیں تو اس میں میری جماعت کی بدنامی ہے اور اس طرح رہنے میں بظاہر تین سو پونڈ سالانہ سے کم خرچ نہ تھا اس لیے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر کے لوگوں سے کہہ دیا ''میں صرف ایک شرط پر ٹھہر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جماعت کے لوگ میرے لیے کم سے کم تین سو پونڈ سالانہ کا قانونی کام فراہم کرنے کا ذمہ لیں۔''

انہوں نے کہا ''مگر ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اتنی رقم آپ کو پبلک خدمات کے معاوضے میں دی جائے اور ہم آسانی سے جمع کر سکتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ اس فیس کے علاوہ ہے جو آپ کو لوگوں کے ذاتی مقدمے میں ملے گی۔''

میں نے کہا ''نہیں، میں پبلک خدمت کا معاوضہ آپ سے نہیں لے سکتا اس میں مجھے بیرسٹری کی قابلیت صرف کرنے کی بہت کم ضرورت پڑے گی۔ میرا کام تو یہ ہوگا کہ آپ سب لوگوں سے کام لوں بھلا اس کا معاوضہ میں آپ سے کیسے لے سکتا ہوں؟ اس کے علاوہ مجھے اس کام کے سلسلے میں اکثر لوگوں سے چندہ مانگنے کی ضرورت ہوگی اور اگر میں آپ سے تنخواہ لوں تو پھر بڑی رقموں کا مطالبہ کرنے میں دقت ہوگی اور آگے چل کر کام رک جائے گا۔''

''مگر ہم آپ کو اتنے دن سے جانتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ روپیہ ہرگز نہ لیں گے جب ہم آپ کو ٹھہرا رہے ہیں تو آپ کا خرچ بھی

ہمارے ذمے ہونا چاہیے۔"

"آپ محبت کے سبب سے اور موجودہ جوش میں ہی باتیں کہہ رہے ہیں یہ کیسے یقین ہو کہ یہ محبت اور جوش ہمیشہ رہے گا؟ آپ کے دوست اور خادم کی حیثیت سے مجھے کبھی کبھی آپ سے سخت باتیں کہنا پڑیں گے خدا جانے اس وقت آپ کو مجھ سے محبت رہے یا نہ رہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں پبلک کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتا میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ لوگ اپنے قانونی معاملات میرے سپرد کر دیا کریں ممکن ہے کہ اس میں بھی آپ کو دقت ہو کیونکہ اول تو میں گورا بیرسٹر نہیں ہوں معلوم نہیں عدالت پر میرا کیسا اثر پڑے دوسرے یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وکیل کی حیثیت سے کیسا رہوں گا اس لیے مجھے پہلے سے وکیل کرنا بھی آپ کے لیے جوکھم سے خالی نہیں اگر میرے ساتھ اتنا احسان کریں گے تو میں اسی کو اپنے لیے کافی معاوضہ سمجھوں گا۔"

اس بحث کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً بیس تاجروں نے مجھے ایک سال کے لیے اپنے تمام قانونی معاملات میں وکیل کر لیا اس کے علاوہ دادا عبداللہ نے بجائے اس رقم کے جو وہ مجھے رخصت کرتے وقت دینا چاہتے تھے مجھے فرنیچر خرید دیا۔ یوں میں نے نٹال میں سکونت اختیار کر لی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رنگ کی قید

عدالت کی تمثیل ایک ترازو قرار دی گئی ہے جسے ایک اندھی منصف مزاج تیز رفتار ہاتھ میں اس طرح لیے بیٹھی ہے کہ اس کے دونوں پلڑے برابر ہیں تقدیر نے اسے خاص کر کے اندھا کر دیا ہے تا کہ وہ کسی شخص کے متعلق اس کی ظاہر صورت کی بناء پر رائے قائم نہ کر سکے بلکہ اس کے باطنی جوہر کو تو لے۔ مگر نٹال کی انجمن وکلاء نے عدالت عالیہ کو ترغیب دی کہ وہ اس اصول کے خلاف عمل کرے اور اپنی تمثیل کو غلط کر دے۔

میں نے عدالت عالیہ میں بیرسٹر کی حیثیت سے داخلے کی اجازت چاہی۔ میرے پاس بمبئی ہائیکورٹ کے داخل کی سند تھی انگلستان کی سند میں نے بمبئی ہائیکورٹ کے حوالے کر دی تھی داخلے کی درخواست کے ساتھ چال چلن کے دو تصدیق نامے داخل کرنا ضروری تھا میں نے یہ سمجھ کر کہ یورپینوں کی تصدیق کی زیادہ وقعت ہو گی دو یورپی تاجروں سے جنہیں میں دادا عبداللہ کی معرفت جانتا تھا یہ تصدیق نامے لکھوائے عرضی کے لیے یہ شرط تھی کہ کسی وکیل کی معرفت داخل کی جائے اور عموماً صدر مشیر قانونی ایسی درخواستیں بغیر کسی مجلس کے داخل کر دیتا تھا صدر مشیر قانونی مسٹر ایسکومپ تھے جن کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دادا عبداللہ کمپنی ان سے اپنے معاملات میں قانونی مشورہ لیا کرتی تھی میں ان کے پاس گیا اور وہ میری درخواست داخل کرنے پر خوشی سے راضی ہو گئے۔

مگر انجمن وکلاء نے مجھے اچانک یہ نوٹس دیا کہ وہ میرے داخلے کی مخالفت

کرے گی۔ اس کا اعتراض یہ بھی تھا کہ میری درخواست کے ساتھ انگلستان کی اصل سند نہیں ہے لیکن جس بات پر اس نے سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ جب بیرسٹروں کے داخلے کے قواعد بنائے گئے تو یہ امکان ہرگز بنانے والوں کے ذہن میں نہ ہو گا کہ کوئی کالا آدمی داخلے کی درخواست کرے گا اگر کالے آدمی داخل کیے گئے تو ان کی تعداد یورپیوں سے بڑھ جائے گی اور یورپیوں کے لیے اپنے حقوق کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔

انجمن وکلاء کی طرف سے ایک نامی وکیل پیروکار تھے چونکہ ان کا تعلق بھی دادا عبداللہ کمپنی سے تھا اس لیے انہوں نے سیٹھ عبداللہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم آ کر مجھ سے مل جاؤ انہوں نے مجھ سے کھل کر گفتگو کی اور میرے پچھلے حالات پوچھے جو میں نے بیان کر دیئے اس پر انہوں نے کہا ''مجھے آپ کے داخلے پر کوئی اعتراض نہیں مجھے تو صرف یہ خوف تھا کہ کہیں آپ ان لوگوں میں تو نہیں جن کی پیدائش یہیں کی ہے اور جو گھر بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور آپ کی درخواست کے ساتھ اصل سند نہ ہونے سے میرے شبہے کی تائید ہوئی۔ ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ لوگوں نے دوسروں کی اسناد اپنے نام سے پیش کر دیں۔ آپ نے چال چلن کے جو تصدیق نامے یورپی تاجروں کی طرف سے پیش کیے ہیں وہ میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے یہ لوگ آپ کے حالات کیا جانیں؟ انہیں آپ سے واقفیت ہو گی بھی تو برائے نام ہو گی؟''

میں نے کہا ''یوں تو پھر یہاں ہر شخص مجھ سے ناواقف ہے عبداللہ سیٹھ کی بھی مجھ سے یہیں کی ملاقات ہے۔''

''مگر آپ تو یہ کہتے ہیں نا کہ وہ آپ کے ہم وطن ہیں؟ اگر آپ کے والد وہاں

وزیر تھے تو عبداللہ سیٹھ آپ کے خاندان کو ضرور جانتے ہوں گے۔ آپ ان کی حلفی تصدیق پیش کر دیں تو مجھے آپ کے معاملے میں مطلق اعتراض نہ ہوگا تب میں انجمن وکلاء سے کہہ دوں گا کہ میں آپ کی درخواست کی مخالفت نہیں کر سکتا۔‘‘

یہ گفتگو سن کر مجھے غصہ آ گیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا میں نے اپنے دل میں کہا ’’اگر میں دادا عبداللہ کا تصدیق نامہ بھیجتا تو یہ لوگ اسے رد کر دیتے اور یورپیوں کے تصدیق نامے مانگتے۔ بھلا بیرسٹری کے داخلے سے میرے حسب نسب کو کیا تعلق؟ اگر میں غریب یا برے خاندان کا بھی ہوتا تو میرے داخل پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا، مگر میں نے اس سے صرف اتنا کہا ’’اگرچہ میں تسلیم نہیں کرتا کہ انجمن وکلاء کو ان تفصیلات کا مطالبہ کرنے کا حق ہے پھر بھی میں وہ تصدیق نامہ جو آپ مانگتے ہیں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔

سیٹھ عبداللہ کی طرف سے حلفی تصدیق نامہ لکھ کر باضابطہ انجمن وکلاء کے پیرو کار کو بھیج دیا گیا انہوں نے اپنا اطمینان ظاہر کیا مگر انجمن وکلاء مطمئن نہیں ہوئی اس نے عدالت عالیہ میں میرے داخلے کی مخالفت کی مگر عدالت نے اس کی عذرداری کو خارج کر دیا ہمارے وکیل مسٹر ایسکومب کو جواب تک دینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ چیف جسٹس کے الفاظ قریب قریب یہ تھے۔ ’’یہ اعتراض کہ عرضی گذار نے اصل سند منسلک نہیں کی، بے بنیاد ہے۔ اگر وہ دروغ حلفی کا مرتکب ہوا ہے تو اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اور اگر وہ مجرم ثابت ہو تو اس کا نام وکلاء کی فہرست سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ قانون کالے گورے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس لیے عدالت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ مسٹر گاندھی کو بیرسٹروں کے زمرے میں داخل ہونے سے روکے۔ ہم درخواست منظور کرتے ہیں مسٹر گاندھی آپ داخلے کا حلف اٹھائیے۔‘‘

میں نے کھڑے ہو کر رجسٹرار کے سامنے حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ہی چیف جسٹس نے مجھ سے کہا "مسٹر گاندھی اب آپ کو اپنی پگڑی اتارنا پڑے گی۔ عدالت نے اپنے بیرسٹر کے لباس کے متعلق جو قاعدے مقرر کیے ہیں ان کی پابندی آپ پر لازم ہے۔"

اب مجھے محسوس ہوا کہ میری آزادی محدود ہو گئی وہی پگڑی جس کے اتارنے سے میں نے مجسٹریٹ ضلع کی عدالت میں انکار کر دیا تھا اب مجھے عدالت عالیہ کے حکم سے اتارنا پڑی میں یہ نہیں کہتا کہ اگر میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتا تو یہ انکار جائز ہوتا لیکن میں چاہتا تھا کہ اپنی قوت کو بڑے معرکوں کے لیے محفوظ رکھوں، مجھے لڑنے میں جو سلیقہ حاصل تھا اسے پگڑی باندھنے کی حمایت میں صرف کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ یہ چیز اس قابل تھی کہ اس سے بہتر مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کو میری یہ خوئے تسلیم (یا کمزوری) پسند نہیں آئی ان کے نزدیک مجھے اپنے اس حق پر اصرار کرنا چاہیے تھا کہ عدالت میں پگڑی باندھ کر جایا کروں۔ میں نے انہیں سمجھایا، بجھایا اور یہ مثل یاد دلائی "جیسا دیس ویسا بھیس" میں نے کہا "اگر ہندوستان میں کوئی انگریز افسر پگڑی اتارنے کا حکم دیتا تو انکار کرنا جائز تھا لیکن نٹال کی عدالت میں جو دستور ہے اس کی پابندی سے انکار مجھے بحیثیت ایک رکن عدالت کے مناسب نہیں۔"

میں نے اس قسم کی دلیلوں سے اپنے دوستوں کو کسی قدر دھیما کیا لیکن انہیں اس معاملے میں اس اصول کا پوری طرح قائل نہ کر سکا کہ ایک ہی چیز مختلف صورتوں میں مختلف نقطہ نظر سے دیکھی جا سکتی ہے حالانکہ مجھے زندگی بھر خود حق پرستی نے یہ سبق دیا ہے کہ صلح کی خاطر کسی قدر دب جانا بہت اچھی چیز ہے آگے چل کر

مجھے معلوم ہوا کہ یہ روش ستیاگرہ کا لازمی جزو ہے اس کے سبب مجھے اکثر اپنی جان خطرے میں ڈالنا اور دوستوں کی خفگی اٹھانا پڑی مگر حق میرے کی طرح سخت ہے اور شگوفے کی طرح نازک۔

انجمن وکلاء کی مخالفت سے جنوبی افریقہ میں میری اور بھی شہرت ہوگئی بہت سے اخباروں نے انجمن کو اس مخالفت پر ملامت کی اور اسے حاسد قرار دیا اس شہرت سے ایک حد تک میرے کام میں آسانی پیدا ہوگئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

نٹال انڈین کانگریس

وکالت میرے لیے اول سے آخر تک ایک ضمنی مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی۔ نٹال کے قیام میں میرا جو مقصد تھا اسے پورا کرنے کے لیے یہ لازم تھا کہ میں پبلک کام پر پوری توجہ صرف کروں ہندوستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف محض عرضداشت بھیج دینا کافی نہ تھا۔ وزیر نوآبادیات کو متاثر کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں میں جوش پھیلانے کی کوشش کی جائے یہ قرار پایا کہ اس مقصد کے لیے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہیے میں نے سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ نئی انجمن کا نام کیا رکھا جائے۔ ایسے نام کی ضرورت تھی جس کا تعلق کسی خاص پارٹی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں کو ظاہر کرتا ہو مجھے معلوم تھا کہ کانگریس کا نام انگلستان کے قدامت پسندوں میں بھی بدنام ہے مگر ہندوستان کی جان کانگریس ہی ہے پس چاہتا تھا کہ اسے نٹال میں ہر دلعزیز بناؤں اس نام کے اختیار کرنے میں ہچکچانا بزدلی سی معلوم ہوتی تھی اس لیے میں نے مفصل دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ اس انجمن کا نام نٹال انڈین کانگریس رکھا جائے۔ اس طرح 24 مئی کو نٹال انڈین کانگریس معرض وجود میں آئی۔

اس روز دادا عبداللہ کا وسیع کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب حاضرین نے بڑے جوش کے ساتھ کانگریس کے قیام پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کا دستور اساسی بالکل سیدھا سادہ تھا اور چندہ زیادہ رکھا گیا تھا۔ اس کا ممبر وہی شخص ہو سکتا تھا جو پانچ

شلنگ ماہوار دے۔ مرفہ الحال طبقے کے لوگ اس پر آمادہ کیے گئے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ چندہ دے سکیں دیا کریں عبداللہ سیٹھ نے سب سے زیادہ یعنی دو پونڈ ماہوار چندہ لکھوایا دو اور دوستوں نے ان کی تقلید کی میں نے سوچا کہ مجھے اپنے چندے میں کمی نہیں کرنا چاہیے اس لیے ایک پاؤنڈ ماہوار میں نے بھی لکھ دیا۔ یہ میرے لیے کوئی چھوٹی رقم نہ تھی لیکن میں نے خیال کیا کہ اگر میرا کام ذرا بھی چل گیا تو اتنا دینا میری مقدرت سے باہر نہ ہوگا اور خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا۔ ممبروں کی ایک معقول تعداد نے ایک پونڈ چندہ لکھوایا۔ دس شلنگ دینے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی اس کے علاوہ کچھ لوگوں نے یکمشت عطیے دیئے جو خوشی کے ساتھ قبول کیے گئے۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ ایک بار مانگنے سے کوئی شخص چندہ نہیں دیتا اور جو ممبر ڈربن سے باہر رہتے تھے ان کے یہاں بار بار جانا ناممکن تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارا جوش ہانڈی کا سا ابال تھا جو چشم زدن میں غائب ہو گیا خود ڈربن کے ممبر بھی بغیر بار بار کے تقاضے کے چندہ نہیں دیتے تھے۔

چندہ جمع کرنے کا کام میرے متعلق تھا کیونکہ سیکرٹری میں ہی تھا کچھ دنوں میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ میرا محرر دن بھر چندہ مانگتا پھرتا تھا وہ بے چارہ اس کام سے عاجز آ گیا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر اس صورت حال میں اصلاح کرنی ہے تو چندے کی وصولی ماہوار نہیں بلکہ سالانہ ہونی چاہیے اور وہ بھی ہمیشہ پیشگی اس لیے میں نے کانگریس کا جلسہ کیا ہر شخص نے خوشی سے یہ تجویز منظور کی کہ چندہ بجائے ماہوار کے سالانہ کر دیا جائے اور کم سے کم تین پاؤنڈ رکھا جائے اس سے وصولی کے کام میں بڑی آسانی ہوگی۔

میں نے پہلے ہی سبق سیکھ لیا تھا کہ پبلک کام قرض کے روپے سے کبھی نہیں کرنا چاہیے لوگوں کا اعتبار اور بہت سی باتوں میں کیا جا سکتا ہے مگر روپے کے معاملے میں جائز نہیں میں نے لوگوں کو کبھی موعودہ چندہ ادا کرنے میں مستعد نہیں پایا اور نٹال کے ہندوستانی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے اس لیے میں نے بغیر روپے کے کبھی کوئی کام شروع نہیں کیا اور نٹال انڈین کانگریس کبھی مقروض نہیں رہی۔

میرے رفیقوں نے ممبر بنانے میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ یہ ایسا کام تھا جس سے انہیں دلچسپی بھی تھی اور بہت قیمتی تجربہ حاصل ہوتا تھا لوگ بہت بڑی تعداد میں نقد چندہ ادا کر کے ممبر بننے لگے۔ اندرون ملک کے دور افتادہ دیہات میں کام کرنا دقت سے خالی نہ تھا لوگ پبلک کام کی ماہیت سے واقف نہ تھے پھر بھی ہم دور دراز مقامات پر بلائے جاتے تھے اور ہر جگہ کے بڑے تاجر ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھتے تھے۔

ایک بار دورے میں ذرا مشکل پڑ گئی ہمیں توقع تھی کہ ہمارے میزبان چھ پاؤنڈ چندہ دیں گے لیکن انہوں نے تین پاؤنڈ سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا اگر ہم ان سے یہ رقم قبول کر لیتے تو دوسرے بھی ان کی تقلید کرتے اور ہمارا مجموعی چندہ بہت کم ہو جاتا رات زیادہ ہو گئی تھی اور ہم بہت بھوکے تھے لیکن ہم جتنی رقم لینے پر اڑے ہوئے تھے اسے وصول کیے بغیر کھانا کیونکر کھاتے؟ ہم نے لاکھ سر مارا مگر کوئی اثر نہ ہوا ہمارے میزبان کسی طرح نہیں مانتے تھے اس مقام کے دوسرا تاجر انہیں سمجھاتے رہے اور ساری رات جاگتے گزر گئی مگر نہ وہ اپنی بات سے ذرہ برابر ہٹے اور نہ ہم میرے بہت سے رفیق غصے سے کھول رہے تھے مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا خدا خدا کر کے صبح سویرے ہمارے میزبان پسیجے انہوں نے چھ پاؤنڈ دیئے اور ہم نے

خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا یہ ٹون گاٹ کا واقعہ ہے مگر اس کا اثر اسٹینگر سے لے کر جو شمال ساحل پر واقع ہے اندرون ملک میں چارلس ٹاؤن تک پڑا اور اس کی بدولت وصولی کا کام تیزی سے ہونے لگا مگر ہمارا کام صرف یہی نہ تھا کہ چندہ جمع کرتے رہتے بلکہ میں نے تو عرصے سے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ جتنے روپے کی ضرورت ہو اس سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے۔

جلسہ مہینے میں ایک بار یا اگر ضرورت ہو تو ہفتے میں ایک بار ہوتا تا۔ پچھلے جلسے کی روداد پڑھی جاتی تھی اور ہر قسم کے سوالات پر بحث ہوتی تھی لوگوں کو پبلک مباحثوں میں شرکت کا اور مختصر اور بر محل تقریر کرنے کا تجربہ نہ تھا ہر شخص تقریر کرنے سے ہچکچاتا تھا میں نے انہیں پبلک جلسوں کے ضوابط سمجھائے اور یہ لوگ ان کی پابندی کرنے لگے انہیں محسوس ہو گے اکہ یہ ان کے لیے ایک تعلیم ہے اور بہت سے لوگ جنہیں کبھی مجمع کے سامنے تقریر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس کے عادی ہو گئے کہ پبلک مسئلوں کے متعلق اپنے خیالات عام جلسوں میں بیان کر سکیں۔

مجھے معلوم تھا کہ پبلک کام میں کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے اخراجات میں بہت روپیہ صرف ہو جاتا ہے اس لیے میں نے یہ طے کیا تھا کہ ابتداء میں رسیدیں نہیں چھپوانا چاہئیں میرے دفتر میں ایک نقل کی مشین تھی اسی پر میں رسیدوں اور رپورٹوں کی نقلیں لے لیا کرتا۔ ان چیزوں کو چھپوانا میں نے اس وقت شروع کیا جب کانگریس کے پاس روپے کی افراط ہو گئی اور ممبروں کی تعداد اور کام کی مقدار بہت بڑھ گئی اس طرح کی کفایت شعاری ہر انجمن کے لیے ضروری ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت کم برتی جاتی ہے اسی لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک چھوٹی مگر ترقی پذیر انجمن کی ابتدائی حالت کا ذکر کرتے ہوئے یہ تفصیلات بیان کر دوں۔

لوگوں کو روپیہ دے کر رسید لینے کی پروا نہ تھی لیکن ہم ہمیشہ بڑے اصرار سے رسید دیا کرتے تھے اس طرح پائی پائی کا حساب رہتا تھا اور میرے خیال میں 1894ء کے حسابات نٹال انڈین کانگریس کے دفتر میں اب تک محفوظ ہوں گے حساب کے معاملے میں احتیاط ہر انجمن کے لیے ضروری ہے بغیر اس کے وہ بدنام ہو جاتی ہے جب تک حساب باقاعدہ نہ ہو حق کی اصل پاکیزگی قائم رہنا ناممکن ہے۔

کانگریس کی ایک اور خصوصی یہ تھی کہ اس میں وہ تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی شریک تھے جو افریقہ میں پیدا ہوئے تھے کانگریس کے ماتحت افریقی ہندیوں کے لیے ایک تعلیمی انجمن قائم کی گئی جس کے ارکان زیادہ تر یہی تعلیم یافتہ نوجوان تھے انہیں کچھ برائے نام چندہ بھی دینا پڑتا تھا اس انجمن میں وہ اپنی ضرورتوں اور شکایتوں کو ظاہر کر سکتے تھے یہاں ان کی غور وفکر کی قوت ابھرتی تھی انہیں ہندوستانی تاجروں سے ملنے جلنے کا اور اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا موقع ملتا تھا یہ ایک طرح کا دار المباحثہ تھا اس کے ارکان پابندی سے جمع ہوا کرتے تھے اور مختلف مضامین پر تقریریں کرتے تھے یا مضامین پڑھتے تھے۔ انجمن کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا۔

کانگریس کا تیسرا کام تھا تبلیغ و اشاعت یعنی افریقہ اور انگلستان کے انگریزوں اور ہندوستان کے لوگوں کو نٹال کے صحیح حالات سے آگاہ کرنا میں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو پمفلٹ لکھے پہلے کا نام تھا ''جنوبی افریقہ کے ہر برطانوی سے ایک درخواست'' اس میں میں نے نٹال کے ہندوستانیوں کی عام حالت مع اعداد و شمار بیان کی تھی اور ہر بات کا ثبوت دیا تھا دوسرے کا نام تھا ''ہندوستانی اور ووٹ کا حق ایک درخواست'' اس میں نٹال کے ہندوستانیوں کے مسلمہ ووٹ کی ایک مختصر سی تاریخ مع اعداد و شمار لکھی تھی میں نے یہ رسالے بڑی محنت اور بڑے مطالعے کے

بعد لکھے تھے میری محنت ٹھکانے لگی اور ان رسالوں کی خوب اشاعت ہوئی۔

اس سارے جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بہت سے دوست پیدا ہو گئے اور ہندوستان کی سب پارٹیوں کو اس مسئلے سے ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی۔ اس کے علاوہ خود افریقہ کے ہندوستانوں کو ایک معینہ راہ عمل نظر آنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بالاسندرم

دل کی سچی اور پاک آرزو ہمیشہ پوری ہوتی ہے میں نے خود اس اصول کی صحت کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنے کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے اس کی بدولت میں ان میں مل جل کر رہا اور ان ہی کا ہو رہا۔

نٹال انڈین کانگریس میں افریقی ہندی اور محرر وغیرہ شامل تھے لیکن بے سیکھے مزدور اور پابند مزدور ابھی شامل نہیں کئے گئے تھے ابھی تک کانگریس ان کی نہ تھی ان لوگوں میں اتنی مقدرت نہ تھی کہ چندہ دے کر اس کے کارکن بنیں کانگریس انہیں صرف اس طرح اپنا کرسکتی تھی کہ ان کی خدمت کرے اس کا ایک موقع آیا لیکن سچ پوچھیے تو ابھی تک نہ کانگریس اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار تھی اور نہ میں تھا۔ ابھی مجھے وکالت شروع کیے دو ہی تین مہینے ہو رہے تھے اور کانگریس بالکل ابتدائی حالت میں تھی کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تاملی چیتھڑے لگائے اپنا پھیٹا ہاتھ میں لیے میرے سامنے کھڑا کانپ رہا ہے اور رو رہا ہے اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے مجھے اس شخص کا سارا حال اپنے محرر سے معلوم ہوا جو خود تاملی تھا آنے والے کا نام بالا سندرم تھا اور یہ نٹال کے ایک مشہور یورپی کے یہاں پابند مزدور تھا اس کے آقا نے غصے کے مارے آپے سے باہر ہو کر اسے اتنا مارا کہ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا ان دنوں وہاں صرف یورپی ڈاکٹر تھے میں ایک تصدیق نامہ چاہتا تھا جس سے معلوم ہو بالا سندرم کو کس قسم کی چوٹ آئی ہے

مجھے یہ تصدیق نامہ مل گیا اور میں نے فوراً بالاسندرم کو مجسٹریٹ کے یہاں لے جا کر بیان حلفی داخل کرا دیا۔ مجسٹریٹ اسے پڑھ کر آگ ہو گیا اور اس نے فوراً آقا کے نام سمن جاری کر دیا۔

میری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ آقا کو سزا دلاؤں میں تو صرف بالاشندرم کو اس کے پنجے سے چھڑانا چاہتا تھا پابند مزدوروں کے متعلق جو قانون تھا وہ میں نے پڑھا۔ اگر معمولی نوکر بغیر پہلے سے اطلاع دیئے نوکری چھوڑ دے تو اس کا آقا اس پر دیوانی میں مقدمہ چلا سکتا تھا۔ مگر پابند مزدور کی حالت بالکل دوسری تھی اس پر ایسی صورت میں فوجداری میں مقدمہ چلایا جاتا تھا اور اگر وہ مجرم قرار پائے تو اسے قید کی سزا ہوتی تھی اسی لیے سر ولیم منٹر نے کہا تھا کہ پابند مزدوری غلام سے کم نہیں پابند مزدور بھی غلام ہی کی طرح اپنے آقا کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔

بالاسندرم کو چھڑانے کی صرف دو تدبیریں تھیں یا تو پابند مزدوروں کے محافظ 33 سے درخواست کی جاتی کہ اس کے معاہدے کو منسوخ کر دے یا اسے کسی اور شخص کی ماتحتی میں دے دے یا خود بالاسندرم کے آقا سے کہا جاتا کہ وہ اسے سبکدوش کر دے میں نے اس کے آقا کے پاس جا کر کہا ''میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ پر مقدمہ چلاؤں اور آپ کو سزا دلاؤں میرے خیال میں آپ کو خود یہ احساس ہوگا کہ آپ نے اس شخص کو بہت بری طرح مارا ہے میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ اس کی خدمات کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیں'' اس پر وہ فوراً راضی ہو گیا اسکے بعد میں محافظ سے ملا اس نے بھی رضامندی ظاہر کی مگر اس شرط پر کہ میں خود بالاسندرم کے لیے کوئی نیا آقا ڈھونڈوں۔

اس لے میں نے تلاش شروع کر دی۔ یہ شرط تھی کہ کوئی فرنگی آقا ہو کیونکہ

ہندوستانیوں کو پابند مزدور رکھنے کی اجازت نہیں تھی ان دنوں میری بہت کم یورپیوں سے ملاقات تھی ان میں سے ایک سے ملا اور از راہ مہربانی بالاسندرم کو لینے پر راضی ہو گیا میں نے اس مہربانی کا دل سے شکریہ ادا کیا مجسٹریٹ نے بالاسندرم کے پہلے آقا کو مجرم قرار دیا اور فیصلے میں لکھ دیا کہ وہ (باہمی تصفیہ کی بناء پر) بالاسندرم کی خدمات کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے پر راضی ہو گیا۔

بالاسندرم کے معاملے کی خبر ہر پابند مزدور کو ہو گئی اور میں ان مزدوروں کا دوست سمجھا جانے لگا مجھے اس رابطے کے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی میرے دفتر میں پابند مزدوروں کا تانتا بندھ گیا اور مجھے ان کے رنج و راحت سے واقف ہونے کا بہترین موقع ملا۔

اس معاملے کی صدائے بازگشت دور دراز مدارس تک میں سنی گئی اس صوبے کے مختلف حصے کے مزدور جو معاہدہ کر کے نٹال جایا کرتے تھے اپنے بھائیوں کے ذریعے سے جو افریقہ میں مقیم تھے اس سے واقف ہو گئے۔

خود اس معاملے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن پابند مزدور کو یہ دیکھ کر کہ نٹال میں ایک شخص ان کی مدد کے لیے اور کھلم کھلا ان کے ساتھ دینے کے لیے موجود ہے بڑی خوشی ہوئی اور ان کا دل امید سے معمور ہو گیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جب بالاسندرم میرے دفتر میں آیا تھا تو اپنا پھینٹا ہاتھ میں لیے تھا۔ اس بات کا افسوس ناک پہلو تھا جس سے ہم لوگوں کی ذلت ظاہر ہوتی تھی۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ مجھے عدالت نے پگڑی اتارنے کا حکم دیا تھا ہر پابند مجبور اور ہر اجنبی ہندوستانی کے لیے زبردستی یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ جب وہ کسی یورپی کے سامنے جائے تو اپنی پگڑی یا ٹوپی یا پھینٹا اتار کر جائے۔ صرف سلام چاہے دونوں

ہاتھوں سے کیوں نہ کیا جائے کافی نہ تھا بچارہ بالا سندرم یہ سمجھا کہ اسے میرے سامنے بھی اسی طرح آنا چاہیے میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی اس طرح میری تعظیم کرے مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اس میں نے اس سے کہا پھیٹا باندھ کے اس نے کچھ تامل کے بعد میری بات مانی مگر اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اسے بڑی خوشی ہوئی۔

یہ بات میرے لیے ہمیشہ ایک معمہ رہی کہ لوگ اپنے ہم جنسوں کی ذلت میں اپنی عزت کیونکر سمجھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

تین پاؤنڈ کا محصول

بالاسندرم کے معاملے کی بدولت مجھے پابند مزدور سے تھوڑی بہت واقفیت ہوگئی نگران کے حال کا گہرا مطالعہ کرنے پر مجھے اس تحریک نے آمادہ کیا جوان پر ایک بھاری محصول عائد کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

اسی سال یعنی 1894ء میں حکومت نٹال نے ارادہ کیا کہ پابند مزدوروں پر پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول لگائے۔ مجھے اس تجویز نے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس مسئلے کو کانگریس کے سامنے پیش کیا اور یہ تجویز منظور کرائی کہ اس محصول کی مخالفت کے لیے ضروری انتظام کیا جائے۔

مجھے پہلے اختصار کے ساتھ یہ بتا دینا چاہیے کہ اس محصول کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی۔

1860ء کے لگ بھگ نٹال کے یورپیوں کو معلوم ہوا کہ یہاں گنے کی کاشت بہت بڑے پیانے پر ہوسکتی ہے انہیں مزدوروں کی ضرورت محسوس ہوئی بغیر باہر کے مزدوروں کے گنے کی کاشت اور شکر سازی ناممکن تھی کیونکہ نٹال کے زولو اس قسم کے کام کے لیے موزوں نہ تھے اس لیے نٹال کی حکومت نے حکومت ہند سے خط و کتابت کی اور ہندوستان سے مزدور بلانے کی اجازت لے لی۔ یہ طے ہوا کہ ان مزدوروں سے پانچ سال نٹال میں کام کرنے کا معاہدہ لے لیا جائے اور اس کے بعد انہیں اختیار ہو کہ وہیں سکونت اختیار کرلیں اور زمین خرید لیں۔ اس طرح انہیں نٹال آنے کی ترغیب دلائی گئی کیونکہ اس وقت یورپیوں کا یہ خیال تھا کہ معاہدے کی

میعاد کے اندر ہندوستانی مزدوروں کی محنت سے ان کی زراعت کافی ترقی کر لے گی۔

لیکن ہندوستانیوں سے جتنی توقع تھی انہوں نے اس سے بھی زیادہ کام کیا۔ انہوں نے ترکاریوں کی کاشت کو بھی بہت ترقی دی۔ بہت سی نئی ترکاریوں ہندوستا لا کر بوئیں اور دیسی ترکاریوں کی کاشت اس طریقے پر کی کہ وہ پہلے سے سستی پڑیں۔ انہوں نے پہلے پہل آم کے درخت بھی لگائے۔ ان کا حوصلہ عمل زراعت ہی تک محدود نہیں رہا۔ انہوں نے تجارت شروع کی۔ زمین خرید کر مکان بنائے اور مزدور کی حیثیت سے ترقی کر کے زمیندار اور مکاندار بن گئے ان کے بعد ہندوستان کے تاجر آئے اور تجارت کے لیے یہیں بس گئے۔ ان سب سے پہلے سیٹھ ابوبکر آمود مرحوم آئے تھے انہوں نے تھوڑے ہی دن میں اپنے کاروبار کو بہت ترقی دے لی۔

یورپی تاجروں کو بڑا خطرہ پیدا ہو گیا جب وہ ہندوستانی مزدوروں کو خوشی خوشی لائے تھے تو انہیں خبر نہ تھیں کہ یہ تجارت میں اتنے ہوشیار ہیں یہاں تک تو غنیمت تھا کہ یہ ہندوستانی آزاد کاشت کار یا زمیندار بنیں بلکہ یورپی تاجروں کو اس کی برداشت نہ تھی کہ یہ لوگ تجارت میں بھی مقابلہ کرنے لگیں۔

اس طرح ان کے دل میں ہندوستانیوں سے عداوت کی بنیاد پڑی۔ بہت سی اور چیزیں تھیں جنہوں نے اسے ترقی دی ہمارا طرز معاشرت جوان کی زندگی سے بالکل مختلف تھا، ہماری سادگی ہمارا تھوڑے نفع پر قناعت کرنا، ہمارا حفظان صحت کے اصولوں سے بے پرواہونا، عام صفائی کا خیال نہ رکھنا، مکانوں کی مرمت میں کنجوسی کرنا پھر سب سے بڑھ کر اختلاف مذہب ان سب چیزوں نے عداوت کی آگ کو خوب بھڑکایا اس کا اظہار قانون سازی میں اس طرح ہوا کہ ہندوستانی ووٹ کے حق

سے محروم کر دیئے گئے اور پابند مزدوروں پر محصول تجویز کیا گیا اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی نیشن زنی شروع کر دی گئی۔

پہلی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی مزدور زبردستی اپنے دیس کو بھیج دیئے جائیں تا کہ ان کے معاہدے کی میعاد ہندوستان میں ختم ہو لیکن حکومت ہند سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اسے منظور کرے گی اس لیے دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ:

1 جب ہندوستانی مزدور کے معاہدے کی میعاد ختم ہو تو وہ ہندوستان چلا جائے

یا

2 ہر دو سال کے بعد اس سے کسی قدر زیادہ اجرت پر کام کرنے کا معاہدہ لیا جائے

اور اگر

3 وہ ان دونوں باتوں پر راضی نہ ہو تو پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول دیا کرے۔

ایک وفد جو سر ہنری ہنسن اور مسٹر لیس پر مشتمل تھا ہندوستان بھیجا گیا کہ یہ تجویز حکومت ہند سے منظور کرائے وائسرائے اس زمانے میں لارڈ ایلگن تھے انہوں نے پچیس پاؤنڈ کے مخصوص کو پسند نہیں کیا مگر اس پر راضی ہو گئے کہ فی کس تین پاؤنڈ محصول لگایا جائے میرا اس وقت یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ وائسرائے نے اس معاملے میں بڑی غلطی کی اس محصول کو منظور کرتے وقت انہوں نے ہندوستان کے فائدے کا بالکل خیال نہیں کیا نٹال کے فرنگیوں کی رضا جوئی ہرگز ان کے فرائض میں داخل نہ تھی اس تجویز کی رو سے تین چار سال کے بعد ہر پابند مزدور کو، اس کی بیوی کو، اس کے لڑکے کو جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہو اور لڑکی کو جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ ہو یہ محصول دینا پڑتا۔ چار آدمیوں کے ایک خاندان سے جس میں میاں بیوی

اور دو بچے ہوں بارہ پاؤنڈ محصول لینا ایسی حالت میں کہ خاندان کے افسر کی اوسط آمدنی چودہ شلنگ ماہوار سے زیادہ نہ ہوا تنا بڑا ظلم تھا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہ ملتی۔

ہم نے اس محصول کے خلاف بڑی سخت جدوجہد شروع کی۔ اگر نٹال انڈین کانگریس اس معاملے میں خاموشی رہتی تو ممکن تھا کہ وائسرائے پچیس پاؤنڈ تک کے محصول پر راضی ہو جاتے پچیس پاؤنڈ سے گھٹ کر تین پاؤنڈ محصول رہ جانا غالباً محض کانگریس کے احتجاج کا نتیجہ تھا مگر ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو شاید حکومت ہند ابتدا ہی سے پچیس پاؤنڈ محصول کی مخالف ہو اور اس نے بغیر کانگریس کے احتجاج کا خیال کیے خود اپنی طرف سے تین پاؤنڈ محصول تجویز کیا ہو۔ بہر حال حکومت ہند نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں غفلت کی وائسرائے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ہیں اس لیے انہیں کبھی اس وحشیانہ محصول پر راضی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

کانگریس نے اگر محصول پچیس پاؤنڈ سے گھٹا کر تین پاؤنڈ کرا دیا تو کوئی بڑا کام نہیں کیا اس کے کارکنوں کو اب بھی یہ قلق تھا کہ وہ پابند مزدوروں کے حقوق کی پوری حفاظت نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ اس ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی کہ محصول کو معاف کرائے مگر اس کا یہ ارادہ بیس سال کے بعد پورا ہوا اور اس وقت بھی صرف نٹال کو ہندوستانیوں کی کوشش سے نہیں بلکہ سارے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی متحدہ جدوجہد سے جب حکومت نے مسٹر گوکھلے سے بد عہدی کی تو آخری لڑائی شروع ہوئی جس میں پابند ہندوستانی مزدوروں نے پورا حصہ لیا ان میں سے بعض نے گولی کھا کر جان دی اور دس ہزار قید ہو گئے۔

لیکن آخر میں حق کا بول بالا ہندوستانیوں نے جو تکلیفیں برداشت کیں وہ گویا حق

کی آواز تھی لیکن اگر اسی کے ساتھ استوار عقیدہ انتہائی صبر اور انتھک کوشش نہ ہوتی تو یہ آواز غالب نہ آتی اگر ہندوستانی ہمت ہار بیٹھتے اور کانگریس محصول کو اٹل سمجھ کر لڑائی سے ہاتھ اٹھا لیتی تو یہ قابل نفرت محصول آج تک پابند مزدوروں پر مسلط ہوتا جس میں نہ صرف جنوبی افریقہ کی بلکہ سارے ہندوستان کی انتہائی ذلت تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مختلف مذاہب کا مطالعہ

میرے قومی خدمت میں محو ہو جانے کا اصلی سبب معرفت نفس کی آرزو تھی میں نے اپنا دین و مذہب خدمت کو بنالیا تھا یہ سمجھ کر کہ معرفت الٰہی کا ذریعہ صرف خدمت ہی ہے اور خدمت کے معنی میں ہندوستان کی خدمت سمجھتا تھا کیونکہ اس کا موقع مجھے خود بخود بے تلاش کیے مل گیا اور میں اسی کے لیے موزوں بھی تھا۔ میں جنوبی افریقہ سیاحت کا لطف اٹھانے، کاٹھیاوار کی سازشوں سے نجات پانے اور روزی کمانے کی نیت سے آیا تھا مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے میں یہاں آکر خدا کی تلاش اور معرفت نفس کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

عیسائی دوستوں نے میرے دل میں ذوق معرفت کو ابھارا تھا اور یہ ذوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ میرے دوستوں کو اس معاملے میں اتنا انہماک تھا کہ اگر میں بے پروائی بھی کرتا تو بھی وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ ڈربن میں جنوبی افریقہ کے مشن کے سردار مسٹر اسپینسر والٹن کو میرے اس ذوق کا پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھ سے راہ و رسم پیدا کی یہاں تک کہ مجھے اپنے عزیزوں کی طرح سمجھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس ملاقات کی بنا میرے اور پریٹوریا کے عیسائیوں کے تعلقات تھے مسٹر والٹن کی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے مجھ سے عیسائی مذہب اختیار کرنے کے لیے نہیں کہا لیکن انہوں نے اپنی زندگی کتاب کی طرح کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور مجھے اپنے کردار کے مشاہدے کا پورا موقع دیا ان کی بیوی بڑی نیک اور قابل تھیں مجھے ان میاں بیوی کا طرز عمل دل سے پسند تھا وہ

بھی یہ بات جانتے تھے اور میں بھی جانتا تھا کہ ہم دونوں کے عقائد میں زمین آسمان کا فرق ہے اور کتنا ہی بحث و مباحثہ کیا جائے یہ فرق مٹنے والا نہیں لیکن اگر جانبین رواداری، لطف و مدارات اور سچائی سے کام لیں تو اختلاف عقائد بھی فائدہ ہی پہنچاتا ہے مجھے مسٹر والٹن کا انکسار، استقلال اور ذوق عمل بہت پسند آیا اور ہم دونوں میں اکثر ملاقات ہونے لگی۔

یہ دوستی میرے دل میں مذہب کی چنگاری دہکاتی رہی اب مجھے پریٹوریا کی سی فرصت نصیب نہ تھی کہ پورے انہاک سے مذہب کا مطالعہ کرتا پھر بھی جو تھوڑا بہت وقت ملتا تھا اس سے میں اچھی طرح کام لیتا تھا مذہبی مسائل پر میری خط و کتابت اب بھی جاری تھی رائے چند بھائی برابر میری رہنمائی کر رہے تھے ایک دوست نے مجھے نرمد شنکر کی کتاب دھرم وچار بھیجی اس کا دیباچہ میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا میں اس شاعر کی لاابالی طرز زندگی کا حال سن چکا تھا دیباچے میں یہ پڑھ کر کہ مذہبی کتابوں کے مطالعے سے اس کی زندگی میں کایا پلٹ ہوگئی میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کا ایک ایک حرف نہایت غور سے پڑھا میں نے میکس مولر کی کتاب ''ہندوستان ہمیں کیا سکھاتا ہے'' اور اس کا ''اپنشد'' کا ترجمہ جو انجمن تھیاسوفی کی طرف سے شائع ہوا تھا بڑے شوق سے پڑھا ان سب چیزوں سے میرے دل میں ہندو دھرم کا احترام بڑھ گیا اور اس میں مجھے بہت سی خوبیاں نظر آنے لگیں مگر اس کے سبب میرے دل میں دوسرے مذہبوں کی طرف سے کسی قسم کا تعصب پیدا نہیں ہوا میں نے واشنگٹن ارونگ کی کتاب ''حضرت محمدؐ اور ان کے خلفاء کی سیرت'' اور کارلائل کا مقالہ ''پیغمبر اسلام کی روح میں'' پڑھا ان کتابوں کی بدولت میری نظر میں آنحضرتؐ کی عظمت اور زیادہ ہوگئی ایک اور کتاب

''اقوال زرتشت'' بھی میری نظر سے گزری تھی۔

اس طرح مختلف مذہبوں سے میری واقفیت بڑھ گئی اس مطالعہ سے مجھے مشاہدہ نفس کا شوق ہو گیا اور اس بات کی عادت پڑ گئی کہ جو بات میرے دل کو لگے اس پر عمل کیا کروں چنانچہ ہندو دھرم کی بعض کتابوں کو پڑھنے کے بعد میں یوگ کی کچھ ریاضتیں جس طرح میری سمجھ میں آئیں کرنے لگا مگر میں نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں چلتا اور یہ طے کیا کہ جب ہندوستان واپس جاؤں گا تو کسی واقف کار کی مدد سے یہ ریاضتیں کروں گا۔

میں نے ٹالسٹائی کی تصانیف کا بھی غور سے مطالعہ کیا ان کی کتاب ''کتاب مقدس کا خلاصہ راہ عمل'' کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا مجھے رفتہ رفتہ یہ یقین ہونے لگا کہ عالمگیر محبت کا اصول لامحدود امکانات رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں میری ایک اور عیسائی خاندان سے راہ و رسم ہو گئی میں ہر اتوار کو گرجے میں جایا کرتا تھا اس خاندان کی طرف سے مجھے عام دعوت تھی کہ اتوار کو رات کا کھانا ان کے یہاں کھایا کروں گرجے میں جانے سے میرے دل پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا وہاں کے وعظ مجھے تاثیر اور ذوق سے خالی معلوم ہوتے تھے حاضرین بھی کچھ ایسے دیندار نظر نہیں آتے تھے ان کے دلوں میں ذوق و شوق کا پتہ نہ تھا دنیا داروں کی ایک جماعت تھی جو تفریح طبع اور رسم کی پابندی کے لیے گرجے چلی جاتی تھی میں یہاں کبھی کبھی بلا ارادہ اونگھنے لگتا تھا مجھے شرم آتی تھی مگر اپنے ہم نشینوں کو اسی حال میں دیکھ کر کچھ تسکین ہو جاتی تھی میں اس حالت کو زیادہ دن تک برداشت نہیں کر سکتا تھا اسی لیے میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔

اس گھرانے سے جہاں میں ہر اتوار کو مہمان ہوا کرتا تھا میرے تعلقات دفعتاً

منقطع ہو گئے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مجھے وہاں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے میزبان کی بیوی بڑی نیک اور بھولی بھالی تھیں مگر کسی قدر تنگ خیال تھیں۔ مجھ سے ان کی اکثر مذہبی مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی میں ان دنوں آرنلڈ کی ''نورایشیا'' کا دوبارہ مطالعہ کر رہا تھا ایک بار ہم دونوں حضرت عیسیٰ اور گوتم بدھ کی زندگی کا مقابلہ کر رہے تھے میں نے کہا ''دیکھیے گوتم بدھ کے دل میں دوسروں کا کتنا درد تھا ان کی ہمدردی انسانوں تک محدود نہ تھی بلکہ ساری مخلوق خدا کو محیط تھی آپ ہی بتلایئے جب ہم انہیں تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ ایک میمنے کو کندھے پر بٹھائے جا رہے ہیں تو ہمارے دل میں محبت کا دریا امنڈ آتا ہے یا نہیں؟ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں ساری جانداروں سے یہ ہمدردی نظر آئی۔''

اس مقابلے سے اس نیک خاتون کو دکھ ہوا۔ مجھے ان کے احساسات کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے گفتگو وہیں پر ختم کر دی اور ہم سب اٹھ کر کھانا کھانے چلے گئے۔ ان کا پانچ سال کا پیارا پیارا بچہ بھی ساتھ تھا۔ میں بچوں سے مل کر جتنا خوش ہوتا ہوں کسی چیز سے نہیں ہوتا اور اس بچے کی مجھ سے پرانی دوستی تھی۔ اس کی رکابی میں ایک گوشت کا ٹکڑا تھا اور میری رکابی میں سیب تھا۔ میں نے اس کے گوشت کی بڑی برائی کی اور اپنے سیب کی بہت تعریف کی معصوم بچہ میری باتوں سے متاثر ہو کر پھل کی تعریف میں میرا ہم زبان ہو گیا۔

مگر میں نے ماں کو جو دیکھا تو عجیب حالت پائی کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

میں متنبہ ہو گیا اور میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا دوسرے ہفتے میں وہاں گیا تو مگر کچھ رکتا ہوا۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ میں آنا جانا بند کر دوں۔ مگر مجھے وہاں جانا کچھ اچھا بھی نہ معلوم ہوا۔ نیک خاتون نے میری یہ مشکل حل کر

دی انہوں نے کہا ''مسٹر گاندھی آپ برا نہ مانیں میں اپنا فرض جان کر کہتی ہوں کہ میرے لڑکے کے لیے آپ کی صحبت اچھی نہیں ہر روز اسے گوشت کھانے میں تامل ہوتا ہے وہ مجھے آپ کی دلیلیں یاد دلاتا ہے اور پھل مانگتا ہے بس اب حد ہو گئی۔ اگر اس نے گوشت چھوڑ دیا تو وہ بیمار پڑ جائے گا اور بیمار نہیں تو کمزور ضرور پڑ جائے گا بھلا مجھ سے یہ کیونکر دیکھا جا سکتا ہے؟ آپ اب جو کچھ بحث کریں بڑوں سے کریں۔ بچوں کو اس سے یقیناً نقصان پہنچے گا۔''

میں نے کہا ''بیگم صاحبہ مجھے افسوس ہے میں آپ کی مادری محبت کا اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ میرے بھی بچے ہیں اس ناگوار صورت حال کو رفع کرنا بہت آسان ہے اگر میں یہاں آتا رہا تو بچہ دیکھے گا کہ میں کون سی چیز کھاتا ہوں اور کون سی نہیں کھاتا۔ اس کا اس پر میری گفتگو سے بھی زیادہ اثر پڑے گا اس لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ میں یہاں آنا چھوڑ دوں۔ اس کے یقیناً یہ معنی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی دوستی ترک کر دیں۔''

انہوں نے کہا ''بہت بہت شکریہ'' اور ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل پر سے بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

خانہ داری

گھر بار کا انتظام کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن ٹال کا گھر بمبئی اور لندن والے گھر کی طرح نہ تھا یہاں بعض معارف محض شان کے خیال سے کرنا پڑے تھے میں اسے ضروری سمجھتا تھا کہ اپنا ساز و سامان ایسا رکھوں جو ٹال میں ایک ہندوستانی بیرسٹر اور قومی نمائندے کے مرتبے کے شایان ہو۔ اس لیے میں نے ڈربن کے اس حصے میں جہاں عمائد شہر رہا کرتے تھے ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لیا اور اسے مناسب طریقے سے سجایا۔ میری غذا سادہ تھی مگر چونکہ میں اکثر انگریز دوستوں اور ہندوستانی رفیقوں کی دعوت کیا کرتا تھا اس لیے خانہ داری کے مصارف بہت ہو جاتے تھے۔

ہر گھر کے لیے ایک اچھا نوکر ضروری ہے مگر مجھے کبھی نوکر کو نوکر کی طرح رکھنا نہ آیا۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست رفیق اور مددگار کی حیثیت سے رہتا تھا اور ایک بارچی تھا جو میرے خاندان کا ایک رکن بن گیا تھا۔ دفتر کے محرر بھی میرے یہاں رہتے تھے اور میرے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اس تجربے میں کافی کامیابی رہی مگر اسی کے ساتھ زندگی کے کچھ تلخ تجربے بھی ہوئے۔

میرا رفیق بہت تیز آدمی تھا اور میں اسے اپنا سچا بہی خواہ سمجھتا تھا۔ مجھے اس معاملے میں دھوکا ہوا۔ میرے ساتھ ایک محرر رہتا تھا جس سے وہ جلنے لگا اور اس نے ایسا جال پھیلایا کہ مجھے اس محرر کی طرف سے شبہ سا ہو گیا۔ یہ بھلا آدمی بڑا نازک

مزاج تھا جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ مجھے اس پر شبہ ہے وہ میرے گھر اور دفتر دونوں کو خیر باد کہہ کر چل دیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا مجھے یہ احساس تھا کہ شاید میں نے اس کے ساتھ ناانصافی کی اور یہ خلش میرے دل سے کبھی نہیں گئی۔

اس عرصے میں میرا باورچی کسی کام سے چلا گیا اور اسکی جگہ دوسرا شخص رکھنے کی ضرورت پڑی۔ اس شخص کے متعلق مجھے آگے چل کر معلوم ہوا کہ بڑا اثر یر ہے۔ مگر میرے لیے تو یہ خدا داد نعمت ثابت ہوا۔ دو ہی تین دن میں اسے پتہ چل گیا کہ میرے گھر کے اندر میری لاعلمی میں ناجائز کارروائیاں ہوتی ہیں اور اس نے دل میں ٹھان لی کہ مجھے آگاہ کر کے رہے گا۔ میری نسبت مشہور تھا کہ میں دوسروں پر بے جا اعتماد کر لیتا ہوں مگر خود کھرا آدمی ہوں۔ اسی لیے اس نے جو کچھ دیکھا اس سے اسے اور بھی صدمہ ہوا۔ میں ایک بجے کھانا کھانے کے لیے دفتر سے گھر جایا کرتا تھا ایک دن بارہ بجے یہ باورچی ہانپتا ہوا دفتر پہنچا اور اس نے مجھ سے کہا ''مہربانی سے ابھی میرے ساتھ گھر چلیے چلیے وہاں آپ کو عجیب تماشا نظر آئے گا۔''

میں نے کہا ''یہ کیا بک رہے ہو۔ آخر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے۔ میں اس وقت دفتر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟''

''اگر آپ نہ چلے تو پچھتائیں گے اب میں اور کیا کہوں''

اس کا اصرار مجھ پر اثر ہوا میں ایک محرر کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلا۔ باورچی آگے آگے تھا وہ مجھے سیدھا کوٹھے پر لے گیا اور میرے رفیق کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ''یہ دروازہ کھولیے اور اپنی آنکھ سے دیکھ لیجیے۔''

میں سمجھ گیا یہ کیا معاملہ ہے میں نے دروازے پر دستک دی۔ صدائے برنخاست اب کے میں نے دروازہ اتنی زور سے دھمدھمایا کہ دیواریں تک ہلنے لگیں آ کر کوڑا

کھلے۔ اندر دیکھا کہ ایک فاحشہ عورت بیٹھی ہے میں نے اس سے کہا کہ فوراً چلی جاؤ اور اب کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔

اپنے رفیق سے میں نے کہا ''بس اب تم سے مجھے کوئی واسطہ نہیں میں نے بڑا دھوکا کھایا خوب بیوقوف بنا میں نے تم پر جو اعتماد کیا تھا اس کا یہی بدلہ ہے؟''

بجائے اس کے کہ وہ کچھ سٹپٹاتا الٹا مجھے دھمکانے لگا کہ ''میں تمہارا پردہ فاش کر دوں گا۔''

میں نے کہا ''مجھے کوئی بات چھپانا نہیں ہے میں نے جو کچھ کیا ہو ساری دنیا سے کہہ دو مگر میرے گھر سے اسی دم چلے جاؤ۔''

اس پر وہ اور بھی بگڑا اب میں مجبور ہو گیا میں نے محرر سے جو نیچے کھڑا تھا کہا۔

''مہربانی سے ذرا پولیس سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر میرا سلام کہو اور یہ اطلاع دو کہ ایک شخص جو میرے ساتھ رہتا ہے بری حرکت کا مرتکب ہوا ہے اب میں اسے اپنے گھر نہیں رکھنا چاہتا مگر وہ جانے سے انکار کرتا ہے اگر آپ چند سپاہیوں کو میری مدد کے لیے بھیج دیں تو بڑا احسان ہو گا۔''

اب اسے معلوم ہوا کہ میں واقعی سختی پر آمادہ ہوں۔ احساس جرم سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے مجھ سے عاجزی سے درخواست کی کہ پولیس کو اطلاع نہ دو میں ابھی ابھی جاتا ہوں چنانچہ وہ اپنا بوریا بستر لے رخت ہو گیا۔

اس واقعے نے مجھے بروقت آگاہ کر دیا۔ اب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ اس شیطان نے مجھے کس قدر بہکایا تھا۔ اسے اپنے گھر رکھ کر میں نے اچھے کام کے لیے بڑا ذریعہ اختیار کیا تھا۔ جو کے کھیت سے گیہوں کاٹنا چاہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آوارہ شخص ہے مگر پھر بھی مجھے یقین تھا کہ یہ میرے ساتھ وفا کرے گا اس کی اصلاح کی

کوشش میں خود تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا۔ میرے مہربان مجھے متنبہ کرتے رہے مگر میں نہ مانتا۔ دوستی نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔

اگر یہ نیا باورچی نہ آتا تو کبھی سچے واقعات کا پتہ نہ چلتا اور اس دوست کے اثر میں رہ کر میں کبھی بے تعلقی کی زندگی کے قابل نہ ہوتا جو میں نے اس کے بعد سے بسر کرنا شروع کی میں اس شخص کے پیچھے اپنا وقت ضائع کرتا رہتا۔ اس میں یہ قدرت تھی کہ مجھے ہمیشہ غفلت اور گمراہی میں رکھتا۔

لیکن خدا نے ہمیشہ مجھے بچایا تھا۔ اس بار بھی بچالیا۔ میری نیت پاک تھی اس لیے میں باوجود غلطیوں کے ہلاکت سے محفوظ رہا اور شروع ہی میں یہ تجربہ ہو جانے سے آئندہ کے لیے مجھے سبق مل گیا۔

یہ باورچی گویا ایک قاصد غیبی تھا۔ وہ پکانا بالکل نہیں جانتا تھا اور باورچی کی حیثیت سے میرے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا مگر یہ اسی کا کام تھا کہ اس نے مجھے خبردار کر دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی میرے گھر میں عورتیں لائی جا چکی تھیں مگر کسی شخص میں یہ ہمت نہ تھی جو اس باورچی میں تھی۔ سب جانتے تھے کہ میں اپنے رفیق پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتا ہوں۔ یہ باورچی گویا خاص اسی کے لیے آیا تھا کیونکہ اسی وقت اس نے جانے کی اجازت مانگی کہنے لگا ”میں آپ کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ آپ بڑی جلدی دوسروں کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔“

میں نیا سے رخصت کر دیا اب مجھے معلوم ہوا کہ اس رفیق نے مجھے خواہ مخواہ میرے محرر سے بدظن کر دیا تھا میں نے اس محرر کے ساتھ جو بے انصافی کی تھی اب اس کی تلافی کی انتہائی کوشش کی مگر مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہا کہ اس کا دل کسی طرح مجھ سے صاف نہیں ہوا جو شیشہ ایک بار ٹوٹ جاتا ہے وہ کبھی نہیں جڑتا۔

وطن کا رخ

اب مجھے جنوبی افریقہ میں آئے تین سال ہو چکے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور یہ بھی مجھے خوب جان گئے تھے 1896ء میں میں نے ان سے چھ مہینے کے لیے اجازت مانگی۔ کیونکہ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے جنوبی افریقہ میں بہت دن رہنا ہے میری وکالت اچھی خاصی چلتی تھی اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت ہے اس لیے میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ گھر جا کر بیوی بچے لے آؤں اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو جائے گی۔ تین پاؤنڈ کا محصول ہمارے جسم میں ناسور کی طرح تھا۔ جب تک یہ دور نہ ہو جائے ہمیں چین نہیں آ سکتا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ میرے پیچھے کانگریس اور تعلیمی انجمن کے کام کو کون سنبھالے میری نظر میں دو شخص تھے آدم جی میاں خاں اور پارسی رستم جی یوں تو ہمیں اب تاجروں کے طبقے سے بہت سے کارکن مل سکتے تھے لیکن ان لوگوں میں جو سیکرٹری کے فرائض باقاعدہ انجام دے سکتے تھے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سب سے ممتاز یہی دونوں حضرات تھے۔ ظاہر ہے کہ سیکرٹری کے لیے کام چلانے بھر کی انگریزی جاننا ضروری تھا۔ میں نے کانگریس میں آدم جی میاں خاں (جو اب انتقال کر چکے ہیں) کا نام پیش کیا اور وہ سیکرٹری

مقرر کر دیئے گئے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ انتخاب بہت موزوں تھا آدم جی میاں خاں کے استقلال، فیاضی، مروت اور اخلاق سے سب لوگ خوش تھے اور ہر شخص پر یہ ثابت ہو گیا کہ سیکرٹری کے کام کے لیے ایسے شخص کی ضرورت نہیں جس نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ہو یا انگلستان میں اعلیٰ تعلیم پائی ہو۔

میں 1896ء کے وسط میں پنگولا جہاز سے جو کلکتے جا رہا تھا وطن روانہ ہوا۔

جہاز پر بہت کم مسافر تھے ان میں سے دو انگریز افسر تھے جن کی مجھ سے بہت بے تکلفی ہو گئی۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میں روزانہ ایک گھنٹہ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر نے مجھے ایک کتاب دی جس کا نام تھا ''بے معلم کے تامل سکھانے والی'' میں نے اس کتاب کو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے نٹال میں تجربے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے مسلمانوں سے خلا ملا پیدا کرنے کے لیے اردو اور مدراسیوں سے میل جول رکھنے کے لیے تامل سیکھنا چاہیے۔

میرا ایک انگریز دوست بھی میرے ساتھ اردو پڑھتا تھا۔ اس کی فرمائش سے میں نے تیسرے درجے کے مسافروں میں ایک اردو کا ''منشی'' ڈھونڈ نکالا اور ہم دونوں کی خوب پڑھائی ہونے لگی ان انگریز کا حافظہ مجھ سے اچھا تھا وہ جو لفظ ایک بار دیکھ لیتا تھا کبھی نہیں بھولتا تھا مجھے اکثر اردو حروف کے پہچاننے میں دقت ہوتی تھی میں نے بہت زور لگایا مگر اس کے برابر کبھی نہ پہنچ سکا۔

تامل میں میں نے خاصی ترقی کی کوئی پڑھانے والا نہ ملا لیکن کتاب بہت اچھی لکھی ہوئی تھی اور مجھے خارجی مدد کی کوئی ضرورت نہیں پیش آئی۔

مجھے امید تھی کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی یہ مطالعہ جاری رکھ سکوں گا مگر یہ بالکل ناممکن تھا 1893ء کے بعد سے اب تک میں نے جو کچھ پڑھا ہے زیادہ تر جیل

خانے میں پڑھا ہے جو تھوڑی بہت تامل اور اردو مجھے آتی ہے وہ میں نے جیل ہی میں سیکھی ہے۔ تامل جنوبی افریقہ کے جیل میں اور اردو یراودا جیل میں گھر تامل بولنا مجھے کبھی نہ آیا اور پڑھنے کی مشق بھی اب چھوٹتی جاتی ہے۔

مجھے اب تک یہ احساس ہے کہ تامل اور تیلیگو نہ جاننے سے میں بڑے گھاٹے میں رہا۔ جنوبی افریقہ کے دراویدیوں نے میرے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا تھا اس کی یاد مجھے اب تک عزیز ہے۔ جب کبھی کوئی تامل یا تیلیگو دوست نظر آتا ہے تو مجھے بے اختیار اس کے ہم وطنوں کی عقیدت، استقلال، ایثار اور بے نفسی کا خیال آجاتا ہے جن کا میرا جنوبی افریقہ میں ساتھ تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ مرد ہوں یا عورت، ان پڑھ تھے۔ جنوبی افریقہ کی لڑائی انہی لوگوں کے لیے تھی اور یہی ان پڑھ سپاہی اس میں لڑتے تھے۔ غریبوں ہی کے لیے یہ لڑائی تھی اور غریب ہی اس میں دل و جان سے شریک تھے۔ ان کی زبان نہ جاننے سے اور چاہے جو نقصان ہو مگر اپنے نیک اور بھولے ہم وطنوں کا دل مٹھی میں لینے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی یہ لوگ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی اور انگریزی بول لیتے تھے اور ہمارا کام بغیر کسی دقت کے چلتا تھا لیکن میں تامل اور تیلیگو سیکھ کر ان کی محبت کا معاوضہ کرنا چاہتا تھا تامل تو میں نے تھوڑی بہت سیکھ بھی لی مگر تیلیگو میں جس کے سیکھنے کی میں نے ہندوستان میں کوشش کی الف بے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اب میں غالباً یہ زبان نہیں کبھی نہ سیکھ سکوں گا۔ اس لیے میری ساری امید اسی پر منحصر ہے کہ دراویدی ہندوستانی سیکھ لیں گے۔ جنوبی افریقہ میں میں ان میں سے جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ ہندی یا ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی سہی مگر بول لیتے ہیں البتہ انگریزی جاننے والے اسے نہیں سیکھنا چاہتے گویا انگریزی جاننا خود اپنی زبانوں کے سیکھنے میں سدراہ ہے۔

مگر میں مطلب سے دور چلا گیا پہلے مجھے اپنے سفر کا بیان ختم کر لینا چاہیے قارئین سے پنگولا جہاز کے کپتان کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جس سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ یہ نیک کپتان پلیتھ برادر تھا۔ ہم دونوں میں گفتگو جہاز رانی پر نہیں بلکہ مذہبی مسائل پر ہوتی تھی اس کے نزدیک مذہب اور اخلاق دو جداگانہ چیزیں تھیں۔ انجیل کو وہ بچوں کا کھیل سمجھتا تھا جس کی ساری خوبی اس کی سادگی میں ہے۔ اس کا قول تھا کہ سب مرد اور بچے مسیح اور ان کی قربانی پر عقیدہ رکھیں تو ان کی نجات یقینی ہے اس دوست کو دیکھ کر مجھے پریٹوریا کا پلیتھ برادر یاد آ گیا اس کا خیال تھا کہ جو مذہب اخلاقی قیود عائد کرے وہ کبھی کسی کام کا نہیں یہ ساری بحث میری نباتاتی غذا پر سے شروع ہوتی تھی۔ اس نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ تم گوشت نہ کھاؤ چاہے وہ گائے کا ہو یا کسی اور جانور کا؟ خدا نے جس طرح نباتات کو انسان کی راحت کے لیے پیدا کیا ہے اسی طرح ان حیوانات کو بھی کیا ہے۔ ان مسائل پر گفتگو کرتے کرتے مذہبی بحث چھڑ جانا لازمی تھا۔

ہم ایک دوسرے کی تسکین نہیں کر سکے۔ میرے دل میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ مذہب اور اخلاق ایک چیز ہے کپتان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا جس کی صحت میں اسے ذرا بھی شبہ نہ تھا۔

چوبیس دن کے بعد یہ خوشگوار سفر ختم ہو گے اور میں دریائے ہوگلی کے جن پر سرد فضا ہوا کلکتے پہنچ گیا۔ اسی دن میں ریل میں بیٹھ کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہندوستان میں

بمبئی جاتے ہوئے میرے ریل پچتالیس منٹ الہ آباد میں ٹھہری۔ میں نے کہا کہ میں اتنی دیر میں گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سیر کر آؤں۔ مجھے انگریزی دواؤں کی دکان سے کچھ دوائیں بھی خریدنا تھیں، دکاندار اونگھ رہا تھا اور اس نے دواؤں کے ملانے میں اتنی دیر کر دی کہ جب میں اسٹیشن پہنچا تو میری گاڑی سامنے سے نکل گئی اسٹیشن ماسٹر نے ازراہ مہربانی ایک منٹ میری خاطر گاڑی روکی تھی مگر جب میں آتا ہوا نظر نہیں آیا تو میرا سامان بہت احتیاط سے اتروا دیا تھا۔

میں نے لوکیلرز کے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور یہ قصد کر لیا کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں گا۔ میں نے الہ آباد کے اخبار پانیر کا نام بہت سنا تھا اور مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس زمانے میں چھوٹے مسٹر چینی اڈیٹر تھے۔ میں ہر پارٹی کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے مسٹر چینی کو ایک رقعہ لکھا جس میں اپنی گاڑی چھوٹ جانے کا ذکر کیا۔ ان سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کے لیے کوئی ایسا وقت دیں کہ میں دوسرے دن روانہ ہو سکوں۔ وہ مجھ سے اسی وقت ملنے پر راضی ہو گئے مجھے بڑی خوشی ہوئی خاص کر اس لیے کہ انہوں نے میری داستان صبر سے سنی۔ انہوں نے کہا کہ تم جو کچھ لکھو گے اس پر میں اپنے اخبار میں تبصرہ کروں گا۔ مگر اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ ہندوستانیوں کے سارے مطالبات کی تائید ہی کروں گا کیونکہ میرا ابھی تو فرض ہے کہ فریق ثانی کے نقطۂ نظر کو سمجھوں اور اسے کافی اہمیت دوں۔

میں نے کہا ''یہی بہت کافی ہے کہ آپ اس مسئلے پر غور کریں اور اپنے اخبار میں اس پر بحث کریں میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ معمولی انصاف کیا جائے جو ہمارا حق ہے۔''

دن کا بقیہ حصہ میں نے شہر کی سیر میں تین دریاؤں کے خوش نما سنگم تربینی کے نظارے میں اور اپنے کام کے متعلق تدبیریں سوچنے میں گزارا۔

پانیر کے ایڈیٹر سے یہ غیر متوقع ملاقات واقعات کے ایک مسئلے کا آغاز تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ نٹال میں عوام نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

میں بغیر بمبئی میں ٹھہرے سیدھا راجکوٹ پہنچا اور جنوبی افریقہ کے حالات پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے لکھنے اور شائع کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ اس کا سرورق سبز تھا اس لیے آگے چل کر اس کا نام سبز پمفلٹ پڑ گیا۔ اس میں میں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی مشکلات خاص کر کے ہلکے رنگ میں دکھائیں اور طرز بیان بھی اور دو پمفلٹوں کے مقابلے میں جس کا ذکر میں کر چکا ہوں معتدل رکھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ دور کی چیزیں جتنی اصل میں ہوتی ہیں اس سے بڑی معلوم ہوا کرتی ہیں۔

میں نیا س پمفلٹ کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور ہندوستان کے سارے اخباروں کو اور سب پارٹیوں کے مشہور لیڈروں کو بھیجیں سب سے پہلے اس پر پانیر کے ایڈیٹر نے تبصرہ کا ے رپورٹر نے اس کے مضمون کا خلاصہ نٹال پہنچایا۔ یہ آخری تار تین سطر سے زیادہ نہ تھا میں نے جو تصویر اس سلوک کی جو نٹال میں ہندوستانیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کھینچی تھی اس کا اس تار میں چھوٹا سا عکس تھا مگر اس میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا تھا اور جو الفاظ نقل کیے گئے تھے وہ میرے نہ تھے۔ اس کا نٹال

میں جو اثر ہوا اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ ہندوستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔

ان پمفلٹوں کو لفافوں میں رکھ کر ڈاک میں ڈالنا کوئی سہل کام نہ تھا اور اگر میں اجرت دے کر لفافہ وغیرہ بنواتا تو بہت مصارف پڑتے۔ مگر مجھے اس کی بڑی آسان ترکیب سوجھ گئی میں نے اپنے محلے کے سب لڑکوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ صبح کو سکول کے وقت سے پہلے دو تین گھنٹے رضا کار کی حیثیت سے کام کیا کریں۔ وہ اس پر خوشی سے راضی ہو گئے میں نے ان سے کہا کہ میں تمہیں دعائیں دوں گا اور انعام میں استعمال شدہ ٹکٹ بانٹوں گا۔ انہوں نے بات ہی بات میں سارا کام نپٹا دیا۔ چھوٹے بچوں سے رضا کار کے طور پر کام لینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ان چھوٹے دوستوں میں سے دو اس کتاب کی تحریر کے وقت میرے رفیق کار ہیں۔

اسی زمانے میں بمبئی میں طاعون شروع ہوا اور چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ راجکوٹ میں بھی وبا پھیلنے کا خوف تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں حفظان صحت کے شعبے میں مفید کام کر سکوں گا اس لیے میں نے ریاست کے حکام کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں میری درخواست منظور ہوئی اور میں اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا جو اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے بنائی گئی تھی میں نے پاخانوں کی صفائی پر بہت زور دیا اور کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ سب گھروں کے پاخانے معائنہ کیے جائیں غریبوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ انہیں جو اصلاحی تجاویز بتائی گئیں ان پر خوشی سے عمل کیا۔ مگر جب ہم عمائد ریاست کے گھروں کا معائنہ کرنے گئے تو ہمارے مشوروں پر عمل کرنا تو درکنار ان میں سے بعض نے ہمیں اپنے گھر میں رہنے تک نہیں دیا۔ ہمیں عام طور پر یہ تجربہ ہوا کہ امیروں کے پاخانے زیادہ گندے ہیں پاخانے کیا تھا

تاریک بدبودار کوٹھریاں تھیں۔جن میں غلاظت کے اور کیڑوں کے انبار لگے تھے ہم نے جو اصلاحی تجاویز بنائی تھیں وہ بالکل سیدھی سادی تھیں مثلاً کھڈی میں ناندیں رکھنا تا کہ میلا زمین پر نہ گرے۔ پیشاب بھی ناند میں کرنا اور زمین میں جذب نہ ہونے دینا۔پاخانوں اور بیرونی دیواروں کے بیچ میں جو اڑ ہوا سے دور کر دینا تا کہ پاخانوں میں زیادہ روشنی اور ہوا آ سکے اور مہتر کو پوری طرح صفائی کرنے میں دقت نہ ہو۔اونچے طبقوں نے اس آخری تجویز کو بڑی مخالفت کی اور اکثر لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

کمیٹی کو اچھوتوں کے محلوں کا بھی معائنہ کرنا تھا،صرف ایک ممبر میرے ساتھ وہاں جانے پر راضی ہوا اور لوگوں کے نزدیک ان محلوں میں جانا ہی ایک لغو بات تھی۔ چہ جائیکہ وہاں کے پاخانوں کا معائنہ کرنا لیکن میں نے ان محلوں کو دیکھا تو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی مجھے اپنی عمر میں ایسی جگہ جانے کا پہلا اتفاق تھا وہاں کے عورت اور مرد ہم کو دیکھ کر متعجب ہوئے۔میں نے ان سے پاخانوں کے معائنے کی اجازت مانگی۔

انہوں نے متحیر ہو کر کہا ''پاخانوں کا ہمارے یہاں کیا کام ہم تو کھلے میدان میں جھاڑے جایا کرتے ہیں پاخانے تو حضور جیسے امیروں کے لیے ہیں''

میں نے کہا ''اچھا تو ہمیں اپنا گھر تو دکھاؤ گے؟''

''شوق سے دیکھیے ایک ایک کونا دیکھ ڈالیے، ہمارے گھر ہی کیا ہیں چوہے کے بل ہیں۔''

میں اندر گیا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اندر بھی ویسی ہی صاف ہے جیسی باہر ہے دروازوں میں خوب جھاڑو دی ہوئی تھی فرش سلیقے سے گوبر سے لپے

ہوئے تھے اور جو تھوڑے بہت باسن وغیرہ تھے وہ دھلے اور منجے ہوئے رکھے تھے۔

ان محلوں میں وبا پھیلنے میں کوئی اندیشہ نہ تھا۔

امیروں کے محلے میں ایک پاخانہ نظر آیا جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں ہر کمرے میں ایک نالی تھی جس میں پانی بھی پھینکا جاتا تھا اور پیشاب بھی کیا جاتا تھا۔ یعنی سارے گھر میں بدبو پھیلی ہوئی تھی ایک مکان میں کوٹھے پر ایک سونے کا کمرا تھا۔ جس کے اندر کی نالی پیشاب اور پاخانے دونوں کے کام میں لائی جاتی تھی اس نالی کے سرے پر ایک نل تھا جو نیچے کی منزل تک چلا گیا تھا اس کمرے میں ایسی سڑی ہوئی بدبو تھی کہ دماغ پھٹا جاتا تھا خدا جانے لوگ اس میں کیونکر سوسکتے تھے۔

کمیٹی نے ویشنو حویلی کا بھی معائنہ کیا حویلی کے متولی سے میرے خاندان والوں کے بڑے مراسم تھے اس لیے وہ اسی پر راضی ہو گیا کہ ہم لوگ سارا مندر دیکھیں اور جو اصلاحات چاہیں تجویز کریں اس عمارت کا ایک حصہ ایسا تھا جو انہوں نے خود کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جگہ تھی جہاں بچا کچھا کھانا اور پتے جن پر بھوجن کیا جاتا تھا دیوار کے پیچھے پھینک دیئے جاتے تھے یہاں کوؤں اور چیلوں کا ہجوم رہتا تھا ظاہر ہے کہ پاخانے بھی بہت گندے تھے میرا قیام راجکوٹ میں بہت کم رہا اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے جو تدبیریں بتائی تھیں اس پر متولی نے کس حد تک عمل کیا۔

مجھے ایک عبادت گاہ میں اس قدر گندگی دیکھ کر بہت رنج ہوا قاعدے سے تو ایسی جگہ پر جسے لوگ مقدس سمجھتے ہیں حفظان صحت کے اصولوں کا خاص اہتمام ہونا چاہیے مجھے اس زمانے میں بھی یہ معلوم تھا کہ سمرتیوں کے مصنفوں نے بیرونی اور اندرونی صفائی پر بہت زور دیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وفاداری کا جوش اور تیمارداری کا جذبہ

برطانوی آئین کا جتنا وفادار میں تھا اتنا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وفاداری کی تہہ میں حق کی محبت تھی مجھ سے وفاداری یا کسی اور نیکی کا جھوٹا اظہار کبھی نہ ہو سکا۔ نٹال میں میں جن جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا وہاں نیشنل انتھم 34 گایا جاتا تھا۔ میں اس زمانے میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس گیت میں شریک ہوں اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے برطانوی حکومت کی خرابیوں کا علم نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اسے مجموعی حیثیت سے قابل قبول سمجھتا تھا اس زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ مجموعی حیثیت سے برطانوی حکومت رعایا کے لیے مفید ہے۔

رنگ اور نسل کا جو تعصب مجھے جنوبی افریقہ میں نظر آیا اسے میں برطانوی روایات کے منافی سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض مقامی اور عارضی چیز ہے اس لیے میں تاج برطانیہ کی وفاداری میں انگریزوں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا میں نے بڑی محنت سے نیشنل انتھم کا راگ سیکھا اور جب کبھی یہ گیت گایا جاتا تھا میں بھی ساتھ دیتا تھا بغیر تصنع اور نمائش کے وفاداری کے اظہار کا جو موقع ملتا تھا میں اس میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

میں نے ساری عمر میں اس وفاداری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کبھی اس کی بدولت اپنے ذاتی اغراض پورے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ میرے لیے ایک فرض سا تھا اور میں بغیر کسی معاوضے کے اسے انجام دیتا تھا۔

جب میں ہندوستان پہنچا تو یہاں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی منانے کی تیاریاں ہو

رہی تھیں۔ راجکوٹ میں جو کمیٹی اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی مگر مجھے یہ شبہہ تھا کہ اس جشن میں زیادہ تر نمائش سے کام لیا جائے گا۔

اس میں بہت ریاکاری نظر آئی جس سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ مجھے کمیٹی میں رہنا چاہیے یا نہیں۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دینے پر قناعت کرنی چاہیے۔

ایک تجویز یہ تھی کہ درخت لگائے جائیں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ دکھاوے کی خاطر اور افسروں کو خوش کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ کوئی شخص درخت لگانے پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک فرمائش ہے اگر یہ پوری کی جائے تو اچھی طرح کرنا چاہیے ورنہ تماشے سے کیا فائدہ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لوگ میرے ان خیالات پر ہنستے تھے میں نے اپنے حصے کا درخت اسی طرح لگایا جیسے لگانا چاہیے اور بڑی محنت سے اس میں پانی دیتا رہا اور اس کی نگرانی کرتا رہا۔

میں نے نیشنل اینتھم اپنے گھر کے بچوں کو بھی یاد کرا دیا مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ گیت راجکوٹ ٹریننگ سکول کے طالب علموں کو بھی سکھایا تھا مگر یہ خیال نہیں کہ یہ جوبلی کا واقعہ ہے یا ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے زمانے کا آگے چل کر اس کے الفاظ میرے کانوں کو ناگوار ہونے لگے جوں جوں میرا ''اہمسا'' کا تصور پختہ ہوتا گیا میری احتیاط اپنے خیالات اور الفاظ کے بارے میں بڑھتی گئی۔ اینتھم کے یہ اشعار:

خدا اس کے دشمنوں کو منتشر

اور ہلاک کردے۔

ان کی سیاست الٹ پلٹ ہو جائے

اور ان کی مفسدانہ سازشیں ناکام رہیں

خاص طور پر میرے جذبہ ''اہما'' کے منافی تھے۔ میں نے اپنا یہ خیال ڈاکٹر بوتھ سے ظاہر کیا انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ جو شخص ''اہما'' کا قائل ہے اسے الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کے ''دشمن'' ہمیشہ ''مفسد'' ہوتے ہیں؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ بادشاہ ہمیشہ حق پر ہو اور اس کے دشمن ناحق پر ہوں؟ ہم خدا سے صرف دعا کر سکتے ہیں کہ حقدار کا ساتھ دے۔ ڈاکٹر بوتھ نے میرے خیالات کی تصدیق کی اور اپنی جماعت کے لیے ایک نیا اینتھم تصنیف کیا۔ ان بزرگ کا ذکر آگے آئے گا۔

جس طرح وفاداری میری سرشت میں تھی اسی طرح تیمارداری کا بھی مجھے فطری ملکہ تھا مجھے لوگوں کی تیمارداری کا شوق تھا خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن ہوں۔

جن دنوں میں راجکوٹ میں جنوبی افریقہ کے پمفلٹ لکھنے میں مشغول تھا مجھے ایک آدھ روز کے لیے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا میرا یہ قصد تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور ابتدا میں نے بمبئی سے کی۔ سب سے پہلے میں جسٹس رانا ڈے سے ملا۔ انہوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سر فیروز شاہ مہتا سے ملنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد میں جسٹس طیب جی سے ملا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا ''مجھ سے اور جسٹس رانا ڈے سے بہت کم مدد مل سکتی ہے۔ آپ کو ہماری حالت معلوم ہے ہم قومی معاملات میں عملی حصہ نہیں لے سکتے لیکن ہمیں آپ سے ہمدردی ضروری ہے آپ کی پوری رہنمائی صرف ایک شخص کر سکتا ہے اور وہ سر فیروز شاہ مہتا ہیں۔''

میں خود سر فیروز شاہ مہتا سے ملنا چاہتا تھا لیکن جب ان بزرگوں نے مجھے ان کے مشورے پر عمل کرنے کی رائے دی تب مجھے پورا اندازہ ہوا کہ سر فیروز شاہ مہتا کا پبلک میں کتنا اثر ہے کچھ دن کے بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں ان کے سامنے جاؤں گا تو مجھ پر رعب طاری ہو جائے گا۔ ان کو پبلک نے جو خطابات دیئے تھے وہ میں سن چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ میں ''شیر بمبئی''، ''احاطہ بمبئی کے بے تاج بادشاہ'' کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں مگر بادشاہ نے مجھے اپنے جاہ و جلال سے مرغوب نہیں کیا۔ وہ مجھ اسے اس طرح پیش آئے جیسے باپ بیٹے سے ملتا ہے۔ یہ ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی۔ وہ اپنے دوستوں اور پیرووں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں مسٹر ڈی اے واچا اور مسٹر کاما بھی تھے جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ میں مسٹر واچا کا ذکر پہلے سن چکا تھا یہ سر فیروز شاہ مہتا کے دست راست سمجھے جاتے تھے اور ویر چند جی گاندھی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ اعداد و شمار کے بڑے ماہر ہیں مسٹر واچا نے کہا ''گاندھی جی مجھ سے پھر ضرور ملیے گا۔''

اس تعارف میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے اس کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا جسے سر فیروز شاہ غور سے سنتے رہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں جسٹس رانا ڈے اور جسٹس طیب جی سے مل چکا ہوں آخر انہوں نے کہا ''گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری ضرور مدد کرنی چاہیے مجھے یہاں جلسہ کرنا پڑے گا'' پھر اپنے سیکرٹری مسٹر منشی کی طرف مخاطب ہو کر انہوں نے جلسے کی تاریخ مقرر کرنے کا حکم دیا تاریخ طے ہو گئی اور انہوں نے مجھے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ جلسے سے ایک روز پہلے میرے پاس پھر آنا میرے دل میں جو کھٹکا تھا وہ اس ملاقات سے جاتا رہا اور میں خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

بمبئی کے قیام کے زمانے میں میں اپنے بہنوئی سے ملنے گیا جو یہاں علاج کے لیے آئے ہوئے تھے وہ کوئی خوشحال آدمی نہیں تھے۔ان کی تیمارداری کرنا میری بہن کے بس کی بات نہیں تھی ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لیے میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے ساتھ راجکوٹ چلیے۔وہ اس پر آمادہ ہو گئے اور میں انہیں اور بہن کو ساتھ لے آیا۔ان کی علالت نے توقع سے زیادہ طول کھینچا۔میں نے انہیں اپنے کمرے میں ٹھہرایا اور رات دن ان کے پاس رہتا تھا۔مجھے رات کو دیر تک جاگنا پڑتا تھا اور اسی تیمارداری کے دوران میں جنوبی افریقہ کا کام بھی کرنا پڑتا تھا آخر میں مریض کا انتقال ہو گے اگر مجھے اس خیال سے بڑی تسکین ہوئی کہ مجھے آخری وقت میں ان کی خدمت کا موقع مل گیا۔

مجھے تیمارداری سے جو مناسبت تھی اس نے رفتہ رفتہ انتہائی انہماک کی صورت اختیار کر لی یہاں تک کہ اکثر میں اس کی وجہ سے اپنے کام میں غفلت کرنے لگا اور کبھی کبھی میں اپنی بیوی بلکہ سارے گھر کو اس کی خدمت میں اپنے ساتھ کھینچ لیتا تھا۔

ایسی خدمت اسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے کہ انسان کو اس میں لطف آئے اگر یہ محض دکھاوے کے لیے یا عام رائے کے ڈر سے کی جائے تو یہ انسان کی نشوونما کو روکتی ہے اور اس کی روح کو کچل ڈالتی ہے وہ خدمت جس میں خوشی نہ خادم کے کام آتی ہے نہ مخدوم کے۔لیکن دلی مسرت کے سات جو خدمت کی جائے اس کے آگے دنیا کی ساری راحت اور دولت ہیچ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بمبئی کا سفر

جس دن میرے بہنوئی کا انتقال ہوا اسی دن مجھے جلسے میں شریک ہونے کے لیے بمبئی جانا پڑا۔ مجھے اپنی تقریر تیار کرنے کا بالکل موقع نہیں ملا تھا۔ فکرو تردد کی حالت میں رات دن جاگنے میں پست ہو گیا تھا اور میری آواز بھاری ہو گئی تھی بہر حال میں خدا پر بھروسہ کر کے بمبئی روانہ ہو گیا مجھے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اپنی تقریر لکھ ڈالوں۔

سر فیروز شاہ کی ہدایت کے مطابق میں جلسے سے ایک دن پہلے شام کو پانچ بجے ان کے دفتر میں پہنچ گیا انہوں نے پوچھا ''کو گاندھی تمہاری تقریر تو تیار ہے نا؟''

میں نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا ''جی نہیں میرا ارادہ وقت پر تقریر کرنے کا ہے۔''

''بمبئی میں اس طرح کام نہیں چلے گا یہاں تقریروں کی رپورٹ بہت ناقص ہوتی ہے اگر اس جلسے سے فائدہ اٹھانا ہے تو اپنی تقریر لکھ ڈالو اور وہ کل دن نکلنے سے پہلے چھپ کر تیار بھی ہو جائے تم اس کا انتظام کر لو گے؟''

میں بہت سٹ پٹایا مگر میں نے کہا میں کوشش کروں گا

''اچھا تو منشی تمہارے پاس مسودہ لینے کے لیے کب آئیں؟''

میں نے کہا ''آج رات کو گیارہ بجے''

دوسرے دن جلسے میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ سر فیروز شاہ کی ہدایت کی کیا مصلحت تھی جلسہ سر کاوس جی جہانگیر انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جب سر فیروز شاہ مہتا کسی جلسے میں تقریر کرتے ہیں تو ہال کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ خصوصاً طالب علم ان کی اسپیچ سننے کے شوق میں بڑی کثرت سے آتے ہیں میرا

ایسے جلسے میں شریک ہونے کا پہلا اتفاق تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری آواز کسی کو نہیں سنائی دیتی جب میں نے اپنی تقریر پڑھنا شروع کی تو میں کانپ رہا تھا سر فیروز شاہ میری ہمت بڑھانے کے لیے بار بار فرمائش کرتے تھے کہ آواز کو اور بلند کرو مگر مجھ پر اس کا اثر الٹا ہوا اور میری آواز اور گرتی گئی۔

میرے پرانے دوست کیشو راؤ جی دیش پانڈے میری مدد کے لیے اٹھے۔ میں نے اپنی تقریر ان کے حوالے کردی۔ ان کی آواز ایسے جلسے کے لیے بہت موزوں تھی مگر حاضرین کو اس سے تسکین نہیں ہوئی ہر طرف سے ''واچا، واچا'' کا شور اٹھا جس سے سارا ہال گونج گیا۔ اس لیے مسٹر واچا نے کھڑے ہو کر وہ تقریر پڑھی اور اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ بالکل خاموش ہو گئے اور آخر تک بڑے غور سے سنتے رہے۔ بیچ بیچ میں وہ تحسین کے اور جہاں نفریں کا موقع تھا ''شرم، شرم'' کے نعرے بلند کرتے جاتے تھے مجھے اس سے دلی مسرت ہو رہی تھی۔

سر فیروز شاہ کو یہ تقریر پسند آئی میں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا اس جلسے کی بدولت دیش پانڈے جی اور ایک پارسی دوست (جن کا نام بتانے میں مجھے تامل ہے کیونکہ وہ آج کل سرکاری ملازمت میں بڑے عہدے پر ممتاز ہیں) میرے عملی ہمدرد بن گئے۔ دونوں نے میرے ساتھ جنوبی افریقہ جانے پر آمادگی ظاہر کی مگر پارسی دوست کو مسٹر سی ایم کرسیٹ جی نے جو اس زمانے میں عدالت خفیفہ کے جج تھے اس ارادے سے ہٹا لیا کیونکہ انہوں نے ان کے لیے شادی کا لاسا لگا رکھا تھا۔ اب وہ یا تو شادی کرتے یا جنوبی افریقہ جاتے۔ انہوں نے شادی کو ترجیح دی۔ مگر ان کی عہد شکنی کی تلافی پارسی رستم جی نے کردی اور ان کی بیوی کی اعانت جرم کی تلافی میں آج بہت سی پارسی بہنیں کھدر کا کام کر رہی ہیں۔ اس لیے میں نے ان

میاں بیوی کا قصور سچے دل سے معاف کر دیا۔ ڈیشپا جی کو شادی کا لالچ نہ تھا مگر وہ بھی نہ جا سکے۔ آج وہ خود اپنی عہد شکنی کی اچھی طرح تلافی کر رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ واپس جاتے ہوئے مجھے زنجبار میں طیب جی کے خاندان کے ایک رکن ملے تھے اور انہوں نے بھی میری مدد کے لیے آنے کا وعدہ کیا تھا، مگر نہیں آئے۔ ان کے جرم کا کفارہ عباس طیب جی ادا کر رہے ہیں۔ غرض میں نے تین بیرسٹروں کو جنوبی افریقہ لے جانے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اس سلسلے میں پستونجی پادشاہ یاد آ گئے مجھ سے ان کے قیام انگلستان کے زمانہ میں دوستانہ مراسم تھے پہلی ملاقات ان سے لندن میں ایک بار تائی ریستوران میں ہوئی تھی میں نے ان کے بھائی مسٹر برورجی پادشاہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ خبطی ہیں میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا مگر لوگ انہیں مراتی کہتے تھے وہ گھوڑوں کی ٹرام پر نہیں بیٹھتے تھے کیونکہ انہیں غریب جانوروں پر رحم آتا تھا۔ باوجود غیر معمولی حافظے کے انہوں نے ڈگریاں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں کسی کے پابند نہ تھے اور باوجود پارسی ہونے کے نباتاتی تھے۔ پستونجی کو یہ شہرت تو نصیب نہ تھی مگر ان کی علمیت کا لندن تک چرچا تھا مجھ میں اور ان میں صرف نباتاتی مسلک کا رابطہ تھا ورنہ علم و فضل میں تو میں ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے انہیں بمبئی میں ڈھونڈ نکالا۔ وہ ہائیکوٹ میں سرِ دفتر تھے ان دنوں وہ اعلیٰ گجراتی لغت کا ایک حصہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ جنوبی افریقہ کے کام میں مدد مانگنے کے سلسلے میں میں نے اپنے کسی دوست کو نہیں چھوڑا تھا۔ چنانچہ میں نے پستونجی پادشاہ سے بھی اس کا ذکر کیا مگر انہوں نے نہ صرف میری مدد سے انکار کیا مجھے بھی نصیحت کی کہ جنوبی افریقہ نہ جاؤں۔

انہوں نے کہا ''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا بلکہ سچ پوچھو تو میں خود تمہارے جنوبی افریقہ جانے کو بھی پسند نہیں کرتا کیا ہمارے ملک میں کام کی کمی ہے ذرا دیکھو تو ہمیں اپنی زبان ہی کی ترقی کے لیے ابھی کتنا کچھ کرنا ہے۔ میرے سپرد علمی اصلاحیں تلاش کرنے کا کام ہے۔ یہ کل کام کی محض اک ذرا سی شاخ ہے۔ اپنے ملک کے افلاس پر غور کرو۔ یہ سچ ہے کہ جنوبی افریقہ میں ہمارے ہم وطن مصیبت میں ہیں۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ تمہارے جیسا آدمی اس کام کے لیے قربان کیا جائے۔ پہلے ہمیں یہاں آزادی حاصل کرنے دو اس سے وہاں ہمارے ہم وطنوں کو خود بخود مدد پہنچے گی میں جانتا ہوں کہ تم میری بات نہیں مانوں گے مگر مجھ سے یہ توقع نہ رکھوں کہ تمہارے جیسے کسی شخص کو تمہارا ساتھ دینے کی رائے دوں گا۔''

مجھے یہ مشورہ پسند نہیں آیا مگر اس کی وجہ سے میرے دل میں مسٹر پستو نجی پادشاہ کا احترام اور بڑھ گیا مجھ پر اس محبت کا بہت اثر ہوا جو نہیں اپنے ملک سے اور اپنی زبان سے تھی۔ اس واقعے کے بعد میرا ان کا دلی رابطہ اور بڑھ گیا۔ میں ان کے نقطہ نظر کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر بجائے اس کے کہ میں اپنے جنوبی افریقہ کے ارادے کو ترک کرتا میرا ارادہ اور مضبوط ہو گیا۔ ایک محب وطن کو مادر وطن کی کسی خدمت سے منہ نہیں موڑنا چاہیے اور میرے لیے گیتا کا صریحی اور تاکیدی حکم کافی تھا۔

آخر میں یہ بہتر ہے کہ آدمی جیسے بھی بن پڑے اپنا کام انجام دے چاہے پھر اس میں ناکام ہی ہو، بہ نسبت اس کے کہ پرائے کام اپنے ذمے لے، چاہے وہ کیسے ہی اچھے معلوم ہوں۔

اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مر جانا کوئی عیب نہیں لیکن جو دوسری راہیں تلاش کرتا ہے وہ ہمیشہ مارا مارا پھرتا ہے۔

پونا اور مدراس

سرفیروز شاہ نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔ بمبئی سے میں پونا پہنچا۔ یہاں دو پارٹیاں تھیں میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا پہلے میں لوکمانیہ تلک سے ملا۔ انہوں نے کہا:

''آپ کی یہ رائے بالکل صحیح کہ ہر پارٹی سے مدد لینی چاہیے۔ جنوبی افریقہ کے معاملہ میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ بہت ضروری ہے کہ آپ صدر کسی ایسے شخص کو بنائیں جو کسی پارٹی میں نہ ہو۔ آپ پروفیسر بھنڈارکر کو لیں۔ انہوں نے کچھ دن سے پبلک معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے مگر ممکن ہے کہ وہ اس مسئلے پر اظہار خیال کریں آپ ان سے ملیے اور وہ جو کچھ کہیں اس کی مجھے اطلاع دیجئے میں آپ کی پوری پوری مدد کرنا چاہتا ہوں آپ کا جی چاہے میرے پاس آیئے۔ مجھے کسی وقت آپ سے ملنے میں تامل نہ ہوگا۔''

مجھے لوکمانیہ سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا میری سمجھ میں آ گیا کہ ان کی غیر معمولی ہردلعزیزی کا کیا راز ہے؟

اس کے بعد میں گوکھلے کے پاس گیا۔ فرگوسن کالج کے احاطہ میں ان سے ملاقات ہوئی انہوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور ان کے اخلاق نے میرے دل کو تسخیر کر لیا۔ ان سے بھی میں پہلی بار ملا تھا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملے ہوں۔ سرفیروز شاہ میری نظر میں ہمالیہ کی طرح تھے اور لوکمانیہ سمندر کی طرح مگر گوکھلے گنگا کی مانند تھے۔ اس پاک دریا میں آدمی جی

کھول کر نہا سکتا تھا۔

ہمالیہ پر چڑھنا محال تھا اور سمندر میں کشتی لے جانا دشوار مگر گنگا گود پھیلائے اپنی طرف بلاتی تھی اس میں کشتی لے جانے سے روحانی مسرت ہوئی تھی گوکھلے نے مجھ سے کھود کھود کر سوال کیے جیسے سکول کے داخلے کے وقت استاد طالب علم کا امتحان لیا ہے انہوں نے بتایا کہ مجھے کن لوگوں کے پاس جانا چاہیے اور ان سے کیونکر ملنا چاہیے انہوں نے بے تکلفی سے میری اسپیچ مانگ کر پڑھی اور مجھے کالج کی سیر کرائی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارا جب جی چاہے مجھ سے ملو۔ میں ہر وقت حاضر ہوں اور چلتے وقت تاکید کر دی کہ ڈاکٹر بھنڈار کر کی ملاقات کا جو نتیجہ ہو مجھے ضرور بتانا۔ میں ان کے پاس سے اٹھا تو میرا دل خوشی سے معمور تھا سیاسی لوگوں میں سے میرے دل کا جو تعلق گوکھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب تک ہے وہ اور کسی سے نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈار کر میرے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آئے میں جب ان کے پاس پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا اس علم مرتاض پر اس بات کا بڑا اثر ہوا کہ میں ایسی دھوپ میں لوگوں سے ملتا پھرتا تھا میری یہ تجویز کہ جلسے کا صدر ایسا شخص ہو جو کسی پارٹی میں نہ ہو انہیں بہت پسند آئی اور وہ بے اختیار چلا اٹھے ''بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک''

جب میں اپنی داستان سنا چکا تھا تو انہوں نے کہا ''تم جس سے پوچھو گے وہ کہہ دے گا کہ میں سیاست میں حصہ نہیں لیتا مگر تم سے میں عذر نہیں کر سکتا تمہارا کام اتنا اہم ہے اور تمہاری محنت اس قدر قابل تعریف ہے کہ مجھے تمہارے جلسے میں شریک ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ تلک اور گوکھلے سے مشورہ کر لیا۔

اگر تکلیف نہ ہو تو ان سے جا کر کہہ دینا کہ میں بہت خوشی سے دونوں انجمنوں کے متحدہ جلسے میں صدارت کروں گا جلسے کا وقت مجھ سے مقرر کرانے کی ضرورت نہیں ان کے لیے جو وقت مناسب ہو وہ مجھے منظور ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور بزرگانہ دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

پونا کے ان بے نفس عالموں نے بغیر کسی تکلف اور نمائش کے ایک چھوٹا سا جلسہ کیا جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے مشن کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔

اس کے بعد میں مدراس گیا یہاں لوگوں میں بے حد جوش تھا جلسے کے حاضرے پر بالا سندرم کے واقعے کا بڑا اثر ہوا میری تر تقی چھپی ہوئی تھی اور میرے اندازہ میں خاصی طویل تھی مگر حاضرین ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے رہے جب جلسہ ختم ہوا تو لوگ ''سبز پمفلٹ'' پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اس پر نظر ثانی کرنے کے بعد دوبارہ دس ہزار چھپوایا۔ اس کی بکری خوب ہوئی مگر مجھے معلوم ہوا کہ اتنی تعداد میں چھپوانے کی ضرورت نہ تھی میں نے اپنے جوش میں مانگ کا اندازہ بہت زیادہ کیا تھا۔ میری تقریر کے مخاطب صرف انگریزی خواں تھے اور مدراس میں اس طبقے کے لوگوں میں دس ہزار نسخے نہیں کھپ سکتے تھے۔

یہاں سب سے زیادہ مدد مجھے آنجہانی جی پریشورن پلے ایڈیٹر مدراس اسٹینڈرڈ سے ملی۔ انہوں نے اس مسئلے پر بہت اچھی طرح غور کیا تھا اور اکثر مجھے اپنے دفتر میں بلا کر ہدایتیں دیا کرتے تھے جی سبرامینم ایڈیٹر ہندو اور ڈاکٹر نیرامینم نے بھی مجھ سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا لیکن پریشورن جی نے تو مدراس اسٹینڈرڈ کے کالم میرے لیے وقف کر دیئے اور میں ان کی عنایت سے اکثر فائدہ اٹھاتا تھا پاچیپال ہال کا جلسہ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر سبرامینم کی صدارت میں ہوا تھا۔ اکثر

دوستوں نے میرے ساتھ اس قدر محبت کا برتاؤ کیا اور میرے کام میں اتنا جوش اور انہماک ظاہر کیا کہ ہرچند میری ان کی بات چیت انگریزی میں ہوتی تھی مگر میں ان سے بالکل بے تکلف ہو گیا تھا ایسا کونسا حجاب ہے جسے محبت دور نہ کر سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

''جلد واپس آؤ''

مدراس سے میں کلکتہ گیا۔ یہاں مجھے بڑی دقت کا سامنا ہوا کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ایک کمرا کرایہ پر لے لیا۔ یہاں مسٹر ایلر تھورپ سے ملاقات ہوئی جو ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندے تھے وہ بنگال کلب میں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے وہاں ملنے کے لیے بلایا۔ انہیں اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ کلب کے ڈرائنگ روم میں ہندوستانیوں کو لیجانے کی ممانعت ہے جب انہیں اس کی اطلاع ہوئی تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے انہوں نے مقامی انگریزوں کے اس تعصب پر اظہار افسوس کیا اور مجھ سے معافی مانگ کر مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر نہ بٹھا سکے۔

ظاہر ہے کہ مجھے سب سے پہلے ''بنگال کے دیوتا'' سر سید رناتھ بزجی سے ملنا تھا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے میری درخواست سن کر کہنے لگے:

''مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو آپ کے کام سے دلچسپی نہ ہوگی آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ کیسی مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں مگر آپ اپنی طرف سے پوری کوشش کیجئے۔ آپ کو مہاراجوں کی ہمدردی حاصل کرنا ہوگی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نمائندے سے ضروری ملیے۔ راجا سر پیارے موہن مکرجی اور مہاراجہ ٹگور کے پاس جائیے یہ دونوں آزادخیال ہیں اور پبلک کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔''

میں ان حضرات سے ملا کوئی کامیابی نہیں ہوئی دونوں مجھ سے سرد مہری سے پیش آئے انہوں نے کہا کلکتہ میں پبلک جلسہ کرنا بہت مشکل ہے ہاں اگر کچھ ہوسکتا ہے تو سریندر ناتھ بزجی کی کوشش سے ہوسکتا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے کام میں نئی نئی دقتیں پیدا ہوتی جارہی ہیں میں امرت بازار پتر کا کے دفتر گیا۔ جو حضرات وہاں ملے وہ مجھے یہ سمجھے کہ یہ کوئی آفاقی ہے۔ یونہی مارا مارا پھرا کرتا ہے بنگباسی والے ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس کے ایڈیٹر نے مجھے ایک گھنٹہ انتظار میں رکھا۔ یہ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ ان سے ملنے کے لیے بہت سے لوگ کھڑے ہیں مگر ان سب کو نپٹانے کے بعد انہوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس لیے میں نے جرأت کر کے خود گفتگو شروع کی انہوں نے کہا ''تم دیکھتے نہیں کہ میں مصروف ہوں۔ تمہارے جیسے لوگ صبح سے شام تک سینکڑوں آیا کرتے ہیں بہتر ہے کہ تم یہاں سے چل دو مجھے تمہاری باتیں سننے کی فرصت نہیں۔''

پہلے تو مجھے بڑا غصہ آیا مگر فوراً ہی یہ احساس ہوا کہ ایڈیٹر کی دقتوں کو بھی تو دیکھنا چاہیے۔ میں نے بنگباسی کی شہرت سنی تھی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ہر وقت آنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے اور یہ لوگ سب وہ تھے جن سے ایڈیٹر کی واقفیت تھی ان کے اخبار کے لیے مضامین کی کمی نہ تھی اور جنوبی افریقہ کو اس زمانے میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

جو شخص ایڈیٹر کے پاس کوئی شکایت لے کر جاتا ہے اسے اپنا معاملہ کتنا ہی اہم کیوں نہ معلوم ہو ایڈیٹر کے نزدیک تو وہ ان بے شمار لوگوں میں سے ایک ہے جو اپنی اپنی شکایتیں لے کر اس کے دفتر پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ غریب ایڈیٹر کس کس کی

حاجت روائی کرے۔ اس کے علاوہ غرض مند یہ سمجھتے ہیں کہ ایڈیٹر کا ملک میں بڑا اثر ہے مگر یہ اسی کا دل جانتا ہے کہ اس کا اثر جو کچھ ہے اخبار کے دفتر کے اندر ہے باہر کچھ بھی نہیں۔ میں اور اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملتا رہا۔ حسب معمول اینگلو انڈین ایڈیٹروں کے یہاں بھی گیا۔ اسٹیس مین اور انگلش مین نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی میں نے ان سے اس کے متعلق طویل گفتگو کی اور انہوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔

انگلش مین کے ایڈیٹر مسٹر سانڈرس نے مجھے اپنی حمایت میں لے لیا۔ انہوں نے اپنا اخبار اور اپنا دفتر میرے لیے وقف کر دیا بلکہ یہاں تک کیا کہ اس مسئلے پر جو مقالہ افتتاحیہ لکھا تھا اس کے پروف میرے پاس بھیج دیئے اور مجھے اجازت دیدی کہ اس میں حسب دالخواہ تغیر وتبدل کر دوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان میں اور مجھ میں دوستی ہوگئی تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا انہوں نے مجھے حتی الامکان مدد دینے کا وعدہ کیا اور اس وعدے کو حرف بہ حرف پورا کیا۔ اس کے بعد بھی مجھ سے ان سے بہت دن تک خط وکتابت ہوتی رہی مگر ان کی شدید علالت کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

میری زندگی میں خوش قسمتی سے یہ اکثر ہوا ہے کہ لوگوں سے خود بخود دوستی ہوگئی جس کی کوئی توقع نہ تھی مسٹر سانڈرس کو میرا سچ بولنا اور مبالغے سے پرہیز کرنا بہت پسند آیا۔ میرے کام سے ہمدردی کرنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کھود کھود کر سوالات کیے اور انہیں یہ یقین ہوگیا کہ میں ان کے سامنے جنوبی افریقہ کے حالات سچائی سے بیان کرنے میں یہاں تک کہ یورپیوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنے میں بھی اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ میں یورپیوں کے جائز مطالبات کی قدر کرتا ہوں۔

مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں سے انصاف چاہنے کا سب سے زوداثر طریقہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کے ساتھ انصاف کرے۔

مسٹر سانڈرس کی غیر متوقع مدد سے مجھے یہ امید ہو چلی تھی کہ کوئی تعجب نہیں کلکتے میں بھی جلسہ کرنے کی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے یہ تار پہنچا۔

''پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہے فوراً واپس آؤ۔''

اس لیے میں نے ایک خط کے ذریعہ سے اخباروں کو اطلاع دی کہ ان وجوہ سے اس قدر جلد کلکتے سے چلے جانے پر مجبور ہوں اور بمبئی روانہ ہو گیا روانگی سے پہلے میں نے بمبئی میں دادا عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کو تار دیا کہ جو پہلا جہاز جنوبی افریقہ جاتا ہو اس کا ٹکٹ میرے لیے خریدے۔ دادا عبداللہ نے اسی زمانے میں مسافر جہاز ''کورلینڈ'' نیا نیا خریدا تھا۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ اسی جہاز سے چلو میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو مفت میں پہنچا دوں گا۔ میں نے ان کی دعوت شکریئے کے ساتھ قبول کر لی اور شروع دسمبر میں اپنی بیوی دونوں لڑکوں اور اپنی بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے کو ساتھ لے کر دوبارہ جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔ ہمارے جہاز کے ساتھ ایک اور جہاز ''نلدیری'' بھی ڈربن جا رہا تھا اس کمپنی کی ایجنسی دادا عبداللہ کمپنی کے پاس تھی ان دونوں جہازوں کے مسافر آٹھ سو کے قریب ہوں گے۔ ان میں سے آدھے ٹرانسوال جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حصہ سوم

طوفان کی گرج

میرا یہ پہلا سفر تھا جس میں بیوی بچے ساتھ تھے میں اس کتاب میں کئی جگہ کہہ چکا ہوں کہ اوسط طبقہ کے ہندوؤں میں صغر سنی کی شادی کی بدولت یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شوہر پڑھا لکھا ہے مگر اس کی بیوی قریب قریب ان پڑھ ہے اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل نا آشنا رہتے ہیں اور شوہر کو بیوی کا معلم بننا پڑتا ہے۔ چنانچہ مجھے جنوبی افریقہ جاتے وقت سب جزویات طے کرنا پڑیں کہ میری بیوی اور بچوں کو کیسے کپڑے پہننا چاہئیں، کیسا کھانا کھانا چاہیے اور نئی جگہ پہنچ کر کس طرح کے آداب معاشرت اختیار کرنا چاہیے۔ اس زمانے کی بعض باتیں یاد کر کے ہنسی آتی ہے ہندو بیوی آنکھ بند کر کے شوہر کی اطاعت کرنے کو اپنے دھرم کی معراج سمجھتی ہے۔ ہندو شوہر اپنے آپ کو بیوی کا مالک سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑی رہے۔

ان دنوں میرا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے لباس اور آداب معاشرت میں جہاں تک ہو سکے یورپیوں کی تقلید کرنا چاہیے۔ تا کہ ہم مہذب معلوم ہوں میں سمجھتا تھا کہ صرف اسی طریقے سے ہم تھوڑا بہت اثر پیدا کر سکتے ہیں اور بغیر اثر کے قوم کی خدمت کرنا ناممکن ہے۔

اسے نظر میں رکھ کر میں نے اپنی بیوی اور بچوں کے لباس کی ایک وضع معین کی۔

اس زمانے میں پارسی ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے اس لیے جب بالکل یورپی وضع اختیار کرنا مناسب معلوم ہوا تو ہم نے پارسیوں کی وضع اختیار کی۔ میری بیوی پارسیوں کی طرح ساڑھی باندھنے لگیں اور میرے بچے پارسی کوٹ اور پتلون پہننے لگے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی جوتے اور موزے تو ہر شخص کے لیے لازمی تھے میرے بیوی اور بچوں کو ان چیزوں کا عادی ہونے میں بہت دیر لگی۔ انگریزی جوتے ان کے پیر کو دباتے تھے اور موزوں میں پسینے سے بدبو آنے لگتی تھی پیر کی انگلیاں اکثر سوج جاتی تھیں میرے پاس ان سب اعتراضوں کے جواب تیار رہتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جواب ان کے لیے اتنے تشفی بخش نہ تھے جتنا میرے حکم کا اثر تھا۔ وہ لباس کی وضع بدلنے پر اس لیے راضی ہو گئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی بد دلی سے انہوں نے چھری کانٹے کا استعمال شروع کیا بلکہ یہ انہیں اور بھی زیادہ ناگوار تھا جب میرا جوش ان تہذیب کی نشانیوں کے بارے میں ٹھنڈا ہو گیا تو انہوں نے چھری کانٹے کو خیرباد کہی۔ غالباً نئی وضع کا عادی ہو جانے کے بعد انہیں اس کے چھوڑنے میں بھی اتنی ہی دقت ہوئی ہو گی۔ مگر اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ "تہذیب" کا زرق برق لبادہ اتارنے سے ہماری طبیعت بہت ہلکی ہو جاتی ہے۔

جس جہاز میں ہم تھے اسی میں ہمارے بعض رشتے دار اور شناسا بھی تھے۔ میں اکثر ان سے اور تیسرے درجے کے مسافروں سے ملنے کے لیے جایا کرتا تھا کیونکہ جہاز دادا عبداللہ کے دوستوں کا تھا اور میں بے تکلف جہاں جی چاہے جا سکتا تھا۔

کیونکہ جہاز بغیر درمیانی بندرگاہوں پر ٹھہرے ہوئے سیدھا نٹال جا رہا تھا اس لیے ہمارا سفر صرف اٹھارہ دن کا تھا مگر نٹال پہنچنے سے چار روز پہلے بڑی سخت آندھی

آئی گویا اس اصلی طوفان کا پیش خیمہ تھی جس سے ہمیں جنوبی افریقہ پہنچ کر سابقہ پڑنے والا تھا کرہ ارض کے جنوبی حصے میں دسمبر برسات کا مہینہ ہے اس لیے اس زمانے میں بحر جنوبی میں چھوٹی بڑی آندھیاں آیا کرتی ہیں جس آندھی کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ اتنے زور سے آئی اور اتنے دیر تک رہی کہ مسافر ڈر گئے۔ اس وقت عجب پر اثر منظر تھا۔ عام خطرے کے مقابلے میں سب ایک ہو گئے تھے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی سب کے سب آپس کے اختلافات بھول گئے تھے اور اس خدائے واحد کو جو سب کا معبود ہے یاد کر رہے تھے بعض لوگوں نے طرح طرح کی نذریں مانیں۔ کپتان بھی مسافروں کے ساتھ دعا میں شریک ہو گیا۔ اس نے ہم سب کو یقین دلایا کہ گو طوفان خطرے سے خالی نہیں مگر کچھ ایسا خوفناک بھی نہیں ہے اس نے کہا کہ اچھا مضبوط جہاز قریب قریب ہر طرح کے موسم کو برداشت کر سکتا ہے مگر ان لوگوں کو کسی طرح تسکین نہیں ہوئی۔ ہر لمحے چرچراہٹ کی آواز آتی تھی جس سے یہ ڈر ہوتا تھا کہ شاید جہاز کہیں سے ٹوٹ گیا ہے یا اس میں سوراخ ہو گیا ہے ہچکولوں کا یہ عالم کہ ہر لمحہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاز اب الٹا ہی چاہتا ہے۔ ڈیک پر جانا بالکل نا ممکن تھا ہر شخص زبان حال سے رضا بالقضا و تسلیما لامرہ کہہ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ کشمکش چوبیس گھنٹے کے قریب رہی۔ آخر آسمان سے بادل ہٹ گئے سورج نکل آیا۔ اور کپتان نے یقین دلایا کہ طوفان گزر گیا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے اور خطرے کے ہٹتے ہی زبانوں پر خدا کا نام بھی نہیں رہا، پھر وہی کھانا پینا، گانا، بجانا، رنگ رلیاں منانا شروع ہو گئے موت کے خوف سے نجات ملتے ہی خشوع و خضوع کی عارضی کیفیت رخصت ہو گئی اور دلوں پر ''مایا'' 35 کا تسلط ہو گیا لوگ معمولی اوقات میں نمازیں پڑھتے دعائیں مانگتے تھے لیکن اب ان میں حضور قلب

نہ تھا جو اس ہولناک گھڑی میں پیدا ہو گیا تھا۔

مگر اس طوفان کے سبب مجھ میں اور دوسرے مسافروں میں بہت میل جول ہو گیا۔ مجھے طوفان کا ڈر نہیں تھا کیونکہ میں ایسے موقعے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میری طبیعت بحری سفر سے مناسبت رکھتیت ہے اور مجھے کبھی متلی یا دردسر کی شکایت نہیں ہوئی اس لیے میں سارے جہاز میں بے دھڑک گشت لگاتا تھا۔ مسافروں کی تسلی اور دلدہی کرتا تھا اور انہیں ہر گھنٹے کپتان کا پیام پہنچاتا تھا۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ان لوگوں کی دوستی میرے بڑے کام آئی۔

18 یا 19 دسمبر کو جہاز ڈربن میں لنگر انداز ہوا ''نادری جہاز'' بھی اسی دن پہنچا۔

مگر اصل طوفان اب آگے آنے والا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

طوفان

میں پہلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ 18 دسمبر کو دونوں جہاز ڈربن کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے جنوبی افریقہ کی بندرگاہوں میں جہازوں کو بغیر طبی معائنے کے ساحل پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی مسافر کو کوئی لگ جانے والی بیماری ہو تو اسے قرنطینے میں رہنا پڑتا ہے جب ہم بمبئی سے چلے تھے تو وہاں طاعون تھا اس لیے ہمیں یہ ڈر تھا کہ کہیں ہم لوگ بھی کچھ دن قرنطینے میں نہ رکھے جائیں معائنے سے پہلے ہر جہاز پر ایک زرد جھنڈا نصب کیا جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اتارا جا سکتا جب تک کہ ڈاکٹر مسافروں کی صحت کی تصدیق نہ کر دے۔ مسافروں کے عزیزوں اور دوستوں کو زرد جھنڈے کے اتارے جانے کے بعد جہاز پر آنے کی اجازت ملتی ہے۔

چنانچہ ہمارے جہاز پر بھی زرد جھنڈا نصب کیا گیا اور ڈاکٹر معائنے کے لیے آیا اس نے پانچ دن کے قرنطینے کا حکم دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ طاعون کی جراثیم کی نشوونما زیادہ سے زیادہ تیئس دن میں ہوتی ہے۔ ہمارے جہاز کو یہ حکم سنایا گیا کہ جس دن بمبئی سے چلا تھا اس کے تیئسویں دن تک قرنطینے میں رہے لیکن اس حکم میں حفظان صحت کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی تھیں۔

ڈربن کے یورپی باشندوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی وہ لوگ یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ ہم سب اپنے ملک کو لوٹا دیئے جائیں اور قرنطینے کے حکم کی ایک وجہ یہ جدوجہد بھی تھی دادا عبداللہ کے آدمی مجھے برابر شہر کی خبریں پہنچاتے تھے۔ یورپی

روز بڑے بڑے جلسے کرتے تھے یہ لوگ دادا عبداللہ کمپنی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے تھے اور کبھی کبھی لالچ بھی دلاتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ اگر دونوں جہاز واپس کر دیئے جائیں تو ہم ہرجانہ دینے کو تیار ہیں لیکن دادا عبداللہ کمپنی ان دھمکیوں میں آنے والی نہ تھی اس زمانے میں سیٹھ عبدالکریم آدم کمپنی کے شریک و منتظم تھے۔

وہ اس پر اڑے ہوئے تھے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو دونوں جہازوں کو گودی پر لائیں گے اور مسافروں کو اتاریں گے خوش قسمتی سے ان دنوں سکھ لال جی نظر بھی مجھ سے ملنے کے ارادے سے ڈربن آئے ہوئے تھے یہ بڑے قابل اور جری آدمی تھے اور ہندوستانیوں کی رہنمائی کر رہے تھے ان کے وکیل مسٹر لاٹن (The Laughton) بھی جرأت میں کچھ کم نہ تھے۔ وہ یورپیوں کے طرز عمل کو برا سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کو صرف محتانے کی خاطر نہیں بلکہ سچے دوست کی طرح مشورہ دیتے تھے۔

اس طرح ڈربن ایک زبردست اور ایک کمزور فریق کی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا ایک طرف تھوڑے سے ہندوستانی اور ان کے معدودے چند انگریز دوست تھے اور دوسری طرف یورپیوں کی صف تھی جو تعداد میں، قوت میں، تعلیم میں اور دولت میں ان سے کہیں بڑھے ہوئے تھے پھر نٹال کی حکومت بھی کھلم کھلا ان کی مدد کر رہی تھی۔ مسٹر ہنری ایسکومب جو مجلس وزراء کے سب سے با اثر رکن تھے بے تکلف ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

غرض قرنطینے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کمپنی کے ایجنٹوں کو یا مسافروں کو دھمکا کر جہاز ہندوستان واپس کر دیئے جائیں اب ہمارے پاس بھی تہدید آمیز پیام پہنچنے لگے "اگر تم واپس نہ جاؤ گے تو ہم تمہیں سمندر میں ڈبو دیں گے لیکن اگر تم جانے پر

راضی ہو جاؤ تو ممکن ہے تمہارا کرایہ تک واپس مل جائے" میں برابر اپنے جہاز کے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا اور ان کی دلدہی کرتا تھا۔ نلدیری کے مسافروں کو بھی تسلی آمیز پیام بھیجتا تھا ان کے سکون اور رحمت بھی ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

ہم نے مسافروں کی تفریح کے لیے جہاز پر طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کیا۔

کرسمس کے دن کپتان نے اول درجے کے مسافروں کو ڈنر پر بلایا علاوہ میرے اور میرے خاندان کے چند لوگ اور تھے۔ ڈنر کے بعد تقریریں ہوئیں اور میں نے مغربی تہذیب پر تقریر کی میں جانتا تھا کہ یہ موقع سنجیدہ تقریر کا نہیں ہے لیکن اپنی طبیعت سے مجبور تھا میں خوشی منانے میں شریک تھا لیکن میرا دل اس لڑائی میں لگا ہوا تھا جو ڈربن میں ہو رہی تھی کیونکہ یہ لڑائی اصل میں میرے ہی خلاف تھی مجھ پر دو الزام تھے:

ایک یہ کہ میں ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کو بیجا مطعون کیا۔

دوسرے یہ کہ میں خاص کر کے دو جہاز بھر کے ہندوستانی لایا ہوں کہ نٹال کو ہندوستانیوں سے بھر دوں۔

مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے دادا عبداللہ کمپنی بڑے خطرے میں مبتلا ہے مسافروں کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور اپنے خاندان کو بھی میں نے لا کر مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔

مگر میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے کسی کو نٹال آنے کی ترغیب نہیں دی تھی جب مسافر جہاز پر آئے تھے تو میں انہیں جانتا تک نہ تھا اور اب بھی بجز اپنے اور رشتے داروں کے جہاز میں سینکڑوں مسافروں میں کسی کے نام و نشان سے واقف نہیں تھا۔

اس لیے میں نے اپنی تقریر میں کہا افسوس ہے کہ اس تہذیب پر جس کا نمونہ نٹال کے یورپی پیش کرتے ہیں اور جس کی حمایت کا انہیں دعویٰ ہے کچھ عرصے سے میرے دل میں یہی خیال بسا ہوا تھا اس لیے میں نے اس چھوٹے سے مجمع کے سامنے اپنی تقریر میں اسی مسئلے پر بحث کی کپتان اور دوسرے دوستوں نے بڑی توجہ سے میری تقریر سنی اور ان پر میرے خیالات کا اثر ہوا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس سے ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی مگر اس کے بعد کئی بار کپتان اور جہاز کے دوسرے افسروں نے مجھ سے مغربی تہذیب کے متعلق طویل گفتگو کی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مغربی تہذیب زیادہ تر تشدد پر مبنی ہے مگر مشرقی تہذیب میں یہ بات نہیں ہے سوال کرنے والوں نے میری یہ بات پکڑ لی اور ان میں سے ایک نے غالباً کپتان نے مجھ سے پوچھا۔

''فرض کیجئے کہ یورپی اپنی دھمکیوں پر عمل کریں پھر آپ اپنے عدم تشدد کے اصول پر کس طرح قائم رہیں گے؟''

میں نے جواب دیا ''مجھے امید ہے خدا مجھے اتنی ہمت اور سمجھ دے گا کہ میں عفو سے کام لوں اور ان پر مقدمہ نہ چلاؤں مجھے تو محض ان کی جہالت اور تنگدلی پر افسوس آتا ہے میں جانتا ہوں کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اچھا اور مناسب سمجھ کر کر رہے ہیں پھر مجھے ان پر غصہ آنے کی کیا وجہ ہے؟۔''

سوال کرنے والا مسکرایا شاید اسے اس بات پر یقین نہ آیا۔

اسی طرح جوں توں دن گزرتے رہے ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ قرنطینہ کب ختم ہوگا قرنطینے کے افسر نے کہا کہ اب معاملہ میرے اختیار میں نہیں رہا جب حکومت کی طرف سے احکام آئیں گے میں آپ کو جہاز سے اترنے کی اجازت

دے دوں گا۔

آخر کار ایک دن میرے اور دوسرے مسافروں کے پاس یہ اعلان جنگ پہنچا کہ اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو جو ہم کہتے ہیں اسے چپ چاپ مان لو۔ اس کے جواب میں میں نے اور دوسرے مسافروں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں نٹال کی بندرگاہ میں اترنے کا پورا حق ہے اور ہم نے جی میں ٹھان لی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نٹال میں ضرور داخل ہوں گے۔

تیئس دن پورے ہونے پر جہازوں کو گودی میں آنے کی اور مسافروں کو اترنے کی اجازت مل گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آزمائش

جہاز گودی پر لائے گئے اور مسافر اترنے لگے مگر مسٹر الیکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو ''یورپی تم سے سخت بیزار ہیں تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ تم جھٹپٹے وقت جہاز سے اترو اور گودی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹیٹم کی حفاظت میں گھر جاؤ'' کپتان نے یہ پیام مجھ سے کہا اور میں اس پر عمل درآمد کرنے پر تیار ہوگیا مگر ابھی اسے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مسٹر لاٹن کپتان کے پاس آئے اور کہنے لگے ''اگر مسٹر گاندھی راضی ہوں تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں کمپنی کے مشیر قانونی کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ آپ پر مسٹر الیکومب کے مشورے کی پابندی لازمی نہیں ہے'' اس کے بعد انہوں نے مجھ سے بھی کہا ''اگر آپ ڈرتے نہ ہوں تو میری رائے کہ آپ کی بیوی اور بچے گاڑی میں رستم جی کے یہاں چلی جائیں۔ ہم آپ پیدل چلیں مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ چوروں کی طرح رات کو شہر میں داخل ہوں۔ میرے خیال میں اب آپ پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ شہر میں ہر طرف سکون ہے۔ یورپی منتشر ہو چکے ہیں بہر حال میرے نزدیک آپ کو شہر میں چھپ کر ہرگز نہیں جانا چاہیے۔'' میں فوراً راضی ہوگیا میرے بیوی اور بچے گاڑی میں سوار ہوکر حفاظت کے ساتھ رستم جی کے یہاں پہنچ گئے میں کپتان کی اجازت سے مسٹر لاٹن کے ساتھ روانہ ہوا۔ مسٹر رستم جی کا مکان گودی سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔

جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور ''گاندھی'' پکارنے

لگے پانچ چھ آدمی اور دوڑ آئے اور انہوں نے لڑکوں کے ساتھ مل کر چلانا شروع کیا مسٹر لاٹن ڈرے کہ کہیں مجمع زیادہ نہ ہو جائے اور انہوں نے ایک رکشا والے 36 کو پکارا مجھے رکشا پر بیٹھنا پسند نہ تھا آج پہلی بار اس کا اتفاق ہوتا مگر لڑکوں نے مجھے بیٹھنے نہیں دیا۔ انہوں نے رکشا والے کو ایسا دھمکایا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ راستہ بالکل رک گیا پھر انہوں نے مسٹر لاٹن کو پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کر دیا اس کے بعد مجھ پر اینٹ پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے مجھے غش آنے لگا اور میں ایک مکان کے جنگلے کے سہارے کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں مگر لوگوں نے اس کا موقع نہیں دیا انہوں نے پہنچ کر گھونسے اور مکے مارنا شروع کیے اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں ادھر سے گزر رہی تھیں یہ بہادر خاتون میری مدد کے لیے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمعے کے درمیان حائل ہو گئیں ان سے لوگوں کا ہلہ کچھ کم ہوا کیونکہ اگر مجھے مارتے تو مسز الیگزینڈر کے بھی چوٹ آتی۔

اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا دوڑ کر کوتوالی پہنچ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر الیگزینڈر نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا کہ مجھے حلقے میں لے کر گھر پہنچا دے۔ یہ سپاہی عین وقت پر پہنچے۔ کوتوالی ہمارے رستے میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کوتوالی میں پناہ لو مگر میں نے شکریئے کے ساتھ انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا "جب ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا تو خود ہی خاموش ہو جائیں گے مجھے ان کی انصاف پسندی پر اعتماد ہے" پولیس کی حفاظت میں بغیر کسی مزید وقت کے رستم جی کے یہاں پہنچ گیا۔ میرا بدن جا

بجا سے چھل گیا تھا۔ مگر سوائے ایک جگہ کے کہیں بھی زخم نہیں آیا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر وادی بارجور صاحب وہیں موجود تھے اور انہوں نے بہت توجہ سے میری مرہم پٹی کر دی۔

گھر کے اندر سکون تھا مگر باہر یورپی مکان گھیرے ہوئے تھے رات ہونے والی تھی اور مجمع گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا ''گاندھی کو ہمارے حوالے کر دو'' بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ پولیس موقعے پر پہنچ گئے اور مجمع کو دھمکا کر نہیں بلکہ پرچا کر قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دل میں وہ بھی پریشان تھے انہوں نے مجھ سے کہلا بھیجا ''اگر آپ اپنے دوست کے گھر بار کو اور اپنے خاندان کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچانا چاہتے ہیں تو جیسے میں کہوں بھیس بدل کر نکل جائیے۔''

اس طرح ایک ہی دن میں دو متضاد حالتوں سے سابقہ پڑا جب جان کا خطرہ محض خیالی تھا اس وقت مسٹر لاٹن نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کھلے بندوں شہر میں جاؤں اور میں نے اسے قبول کیا۔ جب خطرہ سچ مچ آ پہنچا تو ایک اور دوست نے مجھے اس کے خلاف رائے دی اور میں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ خدا جانے میں نے یہ اس لیے کیا کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آئی یا اس لیے کہ اپنے دوست کے گھر بار کو یا اپنے بیوی بچوں کو خطرے سے بچاؤں؟ کون شخص دعویٰ سے کہہ سکتا ہے کہ میں اس وقت بھی حق بجانب تھا جب میں نے بقول دوسروں کے بہادری سے مجمع کا مقابلہ کیا اور اس وقت بھی جب میں بھیس بدل کر ان کے مقابلے سے بھاگ نکلا؟

جو یہ باتیں ہو چکیں ان کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنا فضول ہے جو فائدہ ہے وہ اس میں ہے کہ انسان انہیں سمجھے اور اگر ممکن ہو تو ان سے آئندہ کے لیے سبق حاصل کرے پہلے سے یہ بتانا دشوار ہے کہ فلاں شخص فلاں موقعے پر کیا کرے گا اور پھر کسی

شخص کے ظاہری افعال سے اس کی نیت پر حکم لگانا بھی گویا نا کافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کرنا ہے۔

بہر حال بھاگنے کی تیاری میں میں اپنی چوٹوں کی تکلیف کو بھول گیا۔ سپر نٹنڈنٹ کے مشورے کے مطابق میں نے ایک ہندوستانی کانسٹیبل کی وردی پہن لی اور سر پر دھات کی ایک طشتری رکھ کر اس پر مدراسی صافا لپیٹ لیا کہ خود کا کام دے سکے، میرے ساتھ دو سراغ رساں تھے جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بھیس بدلا اور چہرے کو رنگ کر ہندوستانیوں کی سی شکل بنالی تھی دوسرے کا بھیس مجھے یاد نہیں ہم ایک چھوٹی سی گلی سے ہو کر قریب کی دکان پر پہنچے اور بوریوں کے ڈھیر میں سے جو گودام میں لگا ہوا تھا گزر کر دوکان کے دروازے سے نکل گئے یہاں مجمع میں گھس بیٹھ کر گلی کی نکڑ پر اس گاڑی تک پہنچے جو میرے لیے کھڑی تھی اس گاڑی نے ہمیں کوتوالی میں پہنچا دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے مسٹر الیگزینڈر نے مجھ سے پناہ لینے کا کہا تھا۔۔۔۔ میں نے ان کا اور سراغ رسانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ادھر میں بھاگ رہا تھا اور ادھر مسٹر الیگزینڈر یہ بول کر مجمع کو بہلا رہے تھے۔

پھانسی دے دو گاندھی کو

کھٹے سیب کے پیڑ پر

جب انہیں معلوم ہو گیا کہ میں حفاظت کے ساتھ کوتوالی پہنچا دیا گیا تو انہوں نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا "بھئی تمہارا شکار تو قریب کی دوکان سے ہو کر نکل گیا میری صلاح یہ ہے کہ اب تم بھی گھر کی راہ لو" بعض لوگ بگڑے، بعض ہنسنے لگے اور بعض کو اس بات پر یقین نہیں آیا۔

سپر نٹنڈنٹ نے کہا" اچھا اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو اپنی طرف

سے دو ایک نمائندے مقرر کر دو میں انہیں گھر کے اندر لے جانے پر تیار ہوں اگر وہ گاندھی کو ڈھونڈ نکالیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے تمہارے حوالے کر دوں گا لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر تم کو منتشر ہونا پڑے گا تم کوئی رستم جی کا مکان ڈھانے یا گاندھی کے بیوی بچوں کو ستانے تھوڑی آئے ہو۔''

مجمع نے اپنے نمائندے گھر کی تلاشی لینے کے لیے بھیجے وہ تھوڑی دیر میں ناکام واپس آئے اور مجمع خدا خدا کر کے منتشر ہوا اکثر لوگ سپر نٹنڈنٹ کی تعریف کر رہے تھے کہ انہوں نے بڑی موقع شناسی سے کام لیا اور بعضے غصے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔

مسٹر چیمبر لین آنجہانی جو اس زمانے میں وزیر نو آبادیات تھے نٹال کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مسٹر الیکومب نے مجھے بلایا اور کہا ''مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ اذیتیں اٹھانا پڑیں آپ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کی خفیف سی تکلیف بھی گوارا نہیں بے شک آپ کو یہ حق تھا کہ آپ مسٹر لاٹن کے مشورے کو مانیں اور بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کریں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے پر عمل کرتے تو یہ حادثہ پیش نہ آتا اگر آپ حملہ کرنے والوں کو شناخت کر سکیں تو میں اس کے لیے تیار ہوں کہ انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلاؤں مسٹر چیمبر لین نے بھی مجھ سے یہی خواہش کی ہے۔''

میں نے جواب دیا ''میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا ممکن ہے میں ان سے دو ایک کو پہچان لوں مگر انہیں سزا دلانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ اور میرے نزدیک ان لوگوں کا کوئی قصور بھی نہیں انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کیں اور انہیں بدنام کر دیا ان باتوں

کو سن کر انہیں طیش آ گیا تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ قصور جو کچھ ہے وہ ان کے لیڈروں کا یعنی دوسرے الفاظ میں خود آپ کا ہے آپ ان کی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے مگر آپ نے خود رپوٹر کے بھروسے پر یہ فرض کر لیا کہ میں نے ضرور مبالغے سے کام لیا ہو گا۔ میں کسی سے مواخذہ کرنا نہیں چاہتا مجھے یقین ہے کہ جب صحیح حالات معلوم ہوں گے تو لوگوں کو اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہو گی۔''

مسٹر الیکومب نے کہا ''اگر آپ کا کوئی حرج نہ ہو تو یہ الفاظ مجھے لکھ کر دے دیجیے کیونکہ مجھے مسٹر چیمبرلین کو اس مضمون کا تار دینا پڑے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی تحریر دیں۔ آپ کا جی چاہے تو آخری فیصلہ کرنے سے پہلے مسٹر لاٹن سے اور دوسرے دوستوں سے مشورہ کر لیجیے یہ میں ضرور مانتا ہوں کہ اگر آپ حملہ آوروں کو سزا دلانے کے حق سے دست بردار ہو جائیں تو مجھے امن قائم کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور آپ کی بھی نیک نامی ہو گی۔''

میں نے کہا ''میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں مجھے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں مجھے جو کچھ فیصلہ کرنا تھا میں نے آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی کر لیا۔ یہ میرے عقیدے کے خلاف ہے کہ میں حملہ آوروں پر مقدمہ چلاؤں اور میں اسی وقت اپنا فیصلہ لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے اپنا بیان لکھا اور ان کے حوالے کیا۔

☆☆☆☆☆☆

طوفان کے بعد سکون

جب میں مسٹر ایسکومب سے ملنے گیا تو مجھے کوتوالی میں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔میری حفاظت کے لیے دو کانسٹیبل ساتھ کر دیئے گئے مگر یہ احتیاط ضروری ثابت ہوئی۔

جس دن میں جہاز سے اترنے والا تھا، اسی روز زرد جھنڈے کے اترتے ہی نٹال ایڈور ''ٹائرز'' 37 کا نمائندہ مجھ سے سوال و جواب کرنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں اور میں نے ان تمام الزامات کی جو مجھ پر لگائے گئے تھے کماحقہ تردید کر دی۔سر فیروز شاہ مہتا کے مشورہ کی بدولت میں نے جتنی تقریریں کی تھیں سب لکھ کر کی تھیں اور میرے پاس ان کی اور اپنی دوہری تحریروں کی نقلیں موجود تھیں میں نے یہ سب چیزیں اخبار کے نمائندے کو دے دیں اور اس پر ثابت کر دیا کہ میں نے ہندوستان میں جتنی باتیں کہی ہیں وہ سب میں اس سے پہلے جنوبی افریقہ میں زیادہ سخت الفاظ میں کہہ چکا ہوں میں نے اسے یہ بھی یقین دلایا کہ کورلینڈ اور نادیری کے مسافروں کو جنوبی افریقہ لانے میں میرا کوئی دخل نہیں ہے ان میں تو بعض یہاں کے پرانے باشندے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو نٹال میں رہنے کے لیے نہیں آرہے ہیں بلکہ ٹرانسوال جا رہے ہیں۔جو لوگ دولت کی تلاش میں جنوبی افریقہ آتے ہیں ان کے لیے نٹال سے بہتر موقع ٹرانسوال میں ہے۔اس لیے اکثر ہندوستانی وہیں جانا پسند کرتے ہیں۔

ادھر تو یہ بیان شائع ہوا ادھر میں نے حملہ آوروں پر مقدمہ چلانے سے انکار کر

دیا۔ ان باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوا اور ڈربن کے یورپی اپنی حرکتوں پر نادم ہوئے۔ اخباروں نے میرا بے قصور ہونا تسلیم کر لیا اور عوام پر لعنت ملامت کی۔ اس لیے یہ حملہ آگے چل کر میرے لیے یعنی قومی مقصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوا اس سے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی وقعت بڑھ گئی اور میرے کام میں آسانی پیدا ہو گئی۔

تین چار دن کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں میں اطمینان سے کام کرنے لگا اس واقعے سے میرے پاس مقدمے بھی زیادہ آنے لگے۔

مگر اس واقعے سے جہاں ہماری قوم کی وقعت بڑھی وہاں مخالفوں کے دلوں میں تعصب کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستانی مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے تو لوگ ہندوستانیوں کو خطرناک سمجھنے لگے نٹال کی مجلس وضع قوانین میں دو قوانین کے مسودے پیش ہوئے جس میں ایک کا مقصد ہندوستانی تاجروں کے مفاد کو پامال کرنا اور دوسرے کا مقصد ہندوستانیوں کے داخلے کو محدود کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس جدوجہد کی بدولت جو ہم نے ووٹ کے حق کے لیے کی تھی، یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ آئندہ کوئی قانون خاص ہندوستانیوں کے خلاف پاس نہیں ہو سکے گا یعنی قانون میں رنگ اور نسل کی کوئی تمیز نہیں ہو گی مذکورہ بالا مسودوں کے الفاظ ایسے رکھے گئے کہ ان کا اطلاق سب پر ہو سکے مگر ان کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ نٹال کے ہندوستانی باشندوں پر مزید قیود حاصل کی جائیں۔

ان مسودات قانون کی بدولت میرا قومی کام بہت بڑھ گیا اور ہندوستانیوں کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے فرائض کا احساس پیدا ہو گیا ان مسودوں کے ہندوستانی

زبان میں ترجمے ہوئے اور تشریحیں کی گئیں تاکہ لوگ ان کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھ لیں ہم نے وزیر نو آبادیات کو اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی مگر انہوں نے مداخلت کرنے سے انکار کیا۔

اب میرا وقت زیادہ تر قومی کاموں میں صرف ہونے لگا من سکھ لال جی جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ڈربن میں موجود تھے وہ میرے ساتھ رہنے لگے اور چونکہ ان کا وقت قومی کاموں کے لیے وقف تھا اس لیے ان کے سبب میرا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا

میری عدم موجودگی میں سیٹھ آدم جی میاں خاں نے سیکرٹری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے تھے انہوں نے ممبروں کی تعداد بہت بڑھا لی تھی اور نٹال انڈین کانگریس کے پاس ایک ہزار پونڈ سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ ہندوستانی مسافروں کے خلاف مظاہرے نے اور مسودوں نے جو بیداری پیدا کر دی تھی اس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ بہت سے لوگ ممبر ہو گئے اور سرمائے کی تعداد 500 پونڈ تک پہنچ گئی میں چاہتا تھا کہ کانگریس کے لیے مستقل سرمایہ جمع ہو جائے جس سے جائیداد خرید لی جائے اور جائیداد کی آمدنی خرچ کی جائے۔ مجھے کسی قومی ادارے کے انتظام کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ میں نے اپنی تجویز اپنے رفیقوں کے سامنے پیش کی اور انہوں نے اسے بہت پسند کیا جو جائیداد خریدی گئی تھی وہ کرائے پر اٹھا دی گئی اور اس کی آمدنی سے معمولی اخراجات اچھی طرح چلنے لگے۔ جائیداد کے لیے معقول ٹرسٹی مقرر کر دیئے گئے۔ یہ جائیداد اب تک موجود ہے مگر اس کی بدولت آپس میں نزاع پیدا ہو گئی ہے چنانچہ اس کی آمدنی عدالت میں جمع ہونے لگی۔

یہ افسوس ناک صورت حال میرے جنوبی افریقہ سے چلے آنے کے بعد پیدا

ہوئی لیکن میرا خیال قومی اداروں کے لیے مستقل سرمایہ رکھنے کے بارے میں اس نزاع سے بہت پہلے بدل چکا تھا۔اور اب متعدد قومی اداروں کا وسیع تجربہ حاصل کرنے کے بعد میرا عقیدہ ہوگیا ہے کہ ان اداروں کو مستقل سرمائے کی مدد سے چلانا اچھا نہیں ہے۔قومی ادارہ وہ ہے جو قوم کی مرضی سے اور اس کے روپے سے چلایا جائے ۔ جب یہ ادارہ قوم کی مدد سے محروم ہو جائے تو اسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جو ادارے مستقل سرمائے سے چلتے ہیں ان کے کارکن اکثر رائے عامہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اس کے خلاف عمل کرتے ہیں ہمیں اپنے ملک میں روزمرہ اس کا تجربہ ہوتا ہے بعض نام نہاد مذہبی وقف ایسے ہیں جنھوں نے اپنے حسابات شائع کرنا موقوف کر دیا ہے ٹرسٹی مالک بن بیٹھے ہیں اور وہ اپنے آپ کو کسی کا ماتحت نہیں سمجھتے میرے نزدیک قومی اداروں کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان چیزوں کی طرح جو فطرت کی گود میں پلتی ہیں اپنی غذا روز کے روز حاصل کیا کریں۔

مگر میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہتا ہوں میرا خطاب ان اداروں سے نہیں جن کے لیے مستقل عمارت ہونا لازمی ہے۔میرے کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ معمولی خرچ ان چندوں سے چلنا چاہیے جو لوگ اپنی خوشی سے ہر سال دیا کریں۔

جنوبی افریقہ کی ستیا گرہ کے زمانے میں ان خیالات کی تصدیق ہوئی۔ یہ شاندار جنگ جس میں لاکھوں روپے صرف ہوئے صرف چھ سال تک بغیر مستقل سرمائے کے جاری رہی مجھے بعض ایسے موقعے یاد ہیں جب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر کل چندہ نہیں ملا تو کیا انجام ہوگا۔لیکن یہ ذکر ابھی قبل از وقت ہے۔آئندہ صفحوں کو پڑھ کر قارئین پر اس ادارے کی صحت اچھی طرح ثابت ہو جائے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

بچوں کی تعلیم

جنوری 1897ء میں جب میں ڈربن پہنچا تو میرے ساتھ تین بچے تھے میرا بھانجا جس کی عمر دس برس کی تھی اور میرے دونوں لڑکے جن میں سے بڑے کی عمر نو سال کی اور چھوٹے کی پانچ سال کی تھی میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ انہیں کہاں پڑھاؤں؟

میں انہیں یورپی بچوں کے سکولوں میں بھیج سکتا تھا مگر اس صورت میں خاص رعایت اور استثناء کی درخواست کرنا پڑتی۔ ان سکولوں میں ہندوستانی بچے داخل نہیں کیے جاتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے مشن سکول تھے مگر میں وہاں اپنے بچوں کو پڑھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے وہاں کی تعلیم پسند نہیں تھی ایک تو وہاں پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی یا شاید غلط ملط اردو یا تامل میں اور اس کا اہتمام بھی دقت سے خالی نہ تھا میں ان خرابیوں کو کسی طرح گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس عرصے میں میں انہیں اپنے طور پر تھوڑا بہت پڑھاتا تھا مگر اس میں اور کچھ نہیں تو یہ دقت ضرور تھی کہ پابندی سے پڑھائی نہیں ہوتی تھی اور کوئی گجراتی پڑھانے والا ملتا نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایسے انگریز معلم کے لیے اشتہار دیا جو ان بچوں کو میری نگرانی میں تعلیم دے سکے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ معلم انہیں تھوڑی دیر باقاعدہ تعلیم دیا کرے اور باقی وقت میں جب فرصت ملے میں پڑھا دیا کروں چنانچہ میں نے ایک انگریز معلّمہ سات پونڈ ماہوار پر رکھی۔ کچھ دن اس طرح کام چلتا رہا۔ مگر اس سے میرا اطمینان نہیں ہوا۔ میں بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ گجراتی میں گفتگو کرتا تھا جس کی بدولت انہیں اپنی مادری زبان تھوڑی بہت

آ گئی ۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں ہندوستان بھیجوں کیونکہ میں چھوٹے بچوں کو والدین سے جدا کرنے کا مخالف تھا۔ اگر گھر سلیقہ کا ہو تو جو تعلیم بچے خود بخود اس فضا میں حاصل کرتے ہیں وہ بورڈنگ ہاؤس میں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں نے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔ ہندوستان میں میں نے اپنے بڑے بیٹے اور بھتیجے کو چند مہینے کے لیے اقامتی (Resendential Schools) مدرسوں میں بھیج کر دیکھا تھا مگر انہیں واپس بلا لینا پڑا۔ آگے چل کر میرا لڑکا جسے بالغ ہوئے بہت دن ہو چکے تھے گھر سے بھاگ کر ہندوستان چلا گیا اور احمد آباد کے ہائی سکول میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھتیجا اس تھوڑی بہت تعلیم سے جو اسے میرے یہاں ملتی تھی مطمئن تھا۔ افسوس ہے کہ وہ تھوڑے دن بیمار رہ کر عین شباب میں مر گیا۔ میرے اور تینوں بیٹوں میں سے کوئی عام سکولوں میں نہیں پڑھا البتہ انہوں نے کچھ دن اس ہنگامی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم پائی ہے جو میں نے جنوبی افریقہ میں ستیا گرہیوں کے بچوں کے لیے کھولا تھا۔

ان میں سے کوئی تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا میں جتنا وقت ان بچوں میں صرف کرنا چاہتا تھا انہیں نہیں کر سکتا تھا ان کی طرف پوری توجہ نہ کرے اور بعض اور ناگزیر اسباب سے میں انہیں حسب دلخواہ ادبی تعلیم نہ دے سکا اور انہیں اس بارے میں مجھ سے اکثر شکایت رہی ہے جب کبھی وہ کسی ایسے شخص سے ملتے ہیں جو بی اے یا ایم اے یا صرف انٹرنس ہی پاس ہو۔ تو انہیں سکول میں تعلیم نہ پانے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

تاہم میرا یہ خیال ہے کہ اگر میں انہیں آنکھ بند کر کے عام سکولوں میں بھیج دیتا تو یہ اس تربیت سے محروم رہتے جو صرف تجربے کے مکتب میں یا والدین کی صحبت ہی

میں حاصل ہوتی ہے مجھے جیسا اطمینان ان کی طرف سے اب رہتا ہے ہرگز نہ رہتا اور مجھ سے بچھڑ کر انگلستان یا جنوبی افریقہ میں ان کو جو تعلیم ملتی وہ انہیں سادگی اور جوش خدمت نہ سکھاتی جو آج ان کی زندگی میں نمایاں ہے۔ پھر ان کے مصنوعی طرز معاشرت سے میرے قومی کام میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ اس لیے گو میں انہیں اتنی ادبی تعلیم نہیں دے سکا کہ میرے یا ان کے لیے قابل اطمینان ہوتی۔ لیکن جب میں گزرے ہوئے زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید میں نے ان کے حقوق ادا کرنے میں اپنے امکان بھر کوتاہی نہیں کی۔ مجھے اس کا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے انہیں عام سکولوں میں نہیں بھیجا۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ میرے بڑے بیٹے کی سیرت میں جو بے عنوانیاں نظر آتی ہیں یہ خود میری ابتدائی زندگی کی خامکاریوں کی بازگشت ہے۔ میں اپنی اس عمر کو ناقص علم اور نفس پرستی کا زمانہ سمجھتا ہوں۔ یہ دن میرے بڑے بیٹے کے بچپن کے تھے۔ جب اس کا دل خارجی اثرات کو آسانی سے قبول کرتا تھا۔ اسی سبب وہ اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ میرا نفس پرستی اور ناتجربہ کاری کا دور تھا۔ اسے یقین ہے کہ وہ زمانہ میری زندگی کی معراج کا تھا اور آگے چل کر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ فریب نفس کا نتیجہ ہیں جسے غلطی سے بصیرت کہتے ہیں اور ان میں تعجب کی کیا بات ہے؟ وہ یہ کیوں نہ سمجھے کہ میرا ابتدائی زمانہ بیداری کا دور تھا اور آگے چل کر جو انقلاب ہوا وہ محض خدع نفس اور خود پرستی ہے؟ مجھ سے اکثر میرے دوستوں نے ایسے سوال کیے جن کا جواب دینا مشکل ہے؟ اگر تم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تو کیا حرج تھا؟ تمہیں کیا حق تھا کہ ان کی دماغی نشوونما کو روک دو؟ تم نے انہیں یہ آزادی کیوں نہ دی کہ کالجوں سے سند لیں اور جو پیشہ انہیں پسند ہو اختیار کریں؟

میرے خیال میں اس قسم کے سوال بالکل فضول ہیں مجھے بہت سے طالب علموں سے سابقہ رہا مجھے جن تعلیمی تجربوں کا ''خبط'' ہے وہ میں نے خود یا دوسروں کے توسط سے اور بچوں پر بھی کر کے دیکھے ہیں آج میں بہت سے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو میرے لڑکوں کے ہم عمر ہیں اور میرے خیال میں میرے لڑکے ان سے ہرگز پیچھے نہیں ہیں۔

لیکن میرے تجربوں کا آخری نتیجہ ابھی مستقبل کے پردے میں پنہاں ہے۔ میری غرض ان باتوں کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ عمرانیات کا مطالعہ کرنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ گھر کی باضابطہ تعلیم میں اور سکول کی تعلیم میں کیا فرق ہوتا ہے اور بچوں پر ان کے والدین کی زندگی کے تغیرات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ حق کے طالب کو تلاش حق میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور آزادی کے شیدا یہ دیکھ لیں گے کہ یہ پرجلال دیوی کتنی قربانیاں مانگتی ہے اگر مجھ میں خودداری نہ ہوتی اگر میں اپنے بچوں کو وہ تعلیم دلا کر خوش ہوتا جو اور بچے نہیں پا سکتے تھے اور ان کی ادبی تعلیم تو ہو جاتی لیکن آزادی اور خودداری کی عملی تربیت سے وہ محروم رہتے جس کی خاطر میں نے اس ادبی تعلیم کو قربان کر دیا۔ ایسی صورت پیش آ جائے کہ آزادی اور علم میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنا ہو تو کون ایسا شخص ہے جو آزادی کو علم سے ہزار درجے بڑھ کر نہ سمجھے گا؟

جن نوجوانوں کو میں نے 1920ء میں غلامی کے گھروں یعنی سکولوں اور کالجوں کے چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا جن سے میں نے یہ کہا تھا کہ آزادی کی طرح ان پڑھ رہ کر پتھر پھوڑنا اس سے اچھا ہے کہ آدمی زنجیروں میں جکڑا ہوا ادبی تعلیم پاتا ہو۔ ان پر اب غالباً یہ کھل جائے گا کہ میرے مشورے کی بنیاد کیا تھی۔

☆☆☆☆☆☆

جوش خدمت

میری وکالت اچھی طرح چل رہی تھی۔ مگر یہ میرے اطمینان کے لیے کافی نہ تھا۔ مجھے بہت دن سے اس خیال نے بے چین کر رکھا تھا کہ میں اپنی زندگی میں اور سادگی پیدا کروں اور اپنے ہم جنسوں کی کوئی محسوس خدمت انجام دوں۔ ایک روز میرے پاس ایک کوڑھی آیا۔ میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ اسے کھانا کھلا کر رخصت کر دوں۔ اس لیے میں نے اسے اپنے گھر ٹھہرایا اور اس کی مرہم پٹی اور خبر گیری کرنے لگا مگر اس طرح کب تک کام چلتا نہ تو مجھ میں اتنی استطاعت تھی اور نہ میرا ارادہ تھا کہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔ اس لیے میں نے اسے پابند مزدوروں کے ہسپتال میں بھیج دیا۔

مگر اس سے مجھے تسکین نہیں ہوئی مجھے یہ آرزو تھی کہ رفاہ عامہ کا کوئی مستقل کام کروں۔ ڈاکٹر بوتھ سینٹ ایڈان کی مشن کے سردار تھے یہ بڑے رحمدل آدمی تھے اور مریضوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ پارسی رستم جی کی فیاضی کی بدولت ہم نے ڈاکٹر بوتھ کی نگرانی میں ایک خیراتی ہسپتال کھلوایا۔ میں اس ہسپتال میں تیمارداری کی خدمت انجام دینے لگا۔ دوا تقسیم کرنے میں مجھے ایک سے لے کر دو گھنٹے تک لگ جاتے تھے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اتنا وقت اپنے دفتر کے کام سے بچا کر ہسپتال کے دوا خانے میں کمپاؤنڈر کا کام کروں گا۔ وکالت میں مجھے زیادہ تر دفتری کام کرنا پڑتا تھا یعنی پنچایت اور انتقال جائیداد کا کام کبھی کبھی مجھے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کے لیے بھی جانا پڑتا تھا۔ لیکن اکثر مقدمے سیدھے سادے ہوتے تھے اور مسٹر خان

نے جو میرے بعد جنوبی افریقہ آئے تھے اور میرے ساتھ ہی رہتے تھے اس بات کا ذمہ لے لیا کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو ان مقدموں کو سنبھال لیا کریں گے۔ اس طرح مجھے اس چھوٹے سے ہسپتال میں کام کرنے کا وقت مل گیا۔ اس میں مجھے روز صبح کو (ہسپتال آنے جانے کا وقت ملا کر) دو گھنٹے صرف کرنا پڑتے تھے اس کام سے میرے قلب کو کچھ تسکین ہوئی میں مریضوں کے حالات دریافت کر کے ڈاکٹر سے بیان کرتا تھا اور پھر دوا بنا کر تقسیم کرتا تھا۔ اس طرح مجھے ہندوستانی مریضوں کو جن میں سے اکثر ثانی تیلیگو یا شمالی ہندوستان کے پابند مزدور تھے۔ ملنے جلنے کا موقع ملا۔

یہ تجربے اس وقت میرے بہت کام آئے جب میں جنگ بوئر میں رضا کار کی حیثیت سے بیمار اور زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کر رہا تھا۔

مجھے بچوں کی تربیت کا خیال ہر وقت رہتا تھا جنوبی افریقہ آنے کے بعد میرے دو لڑکے اور ہو چکے تھے۔ ہسپتال میں کام کرنے سے مجھے ان بچوں کی تربیت میں بڑی مدد ملی مجھے اپنی آزادی پسند طبیعت کی بدولت اکثر تکلیفیں اٹھانا پڑتیت ھیں جب میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا تو ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ بہترین طبی امداد حاصل کی جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر اور دائی نے وقت پر دھوکا دیا تو ہم کیا کریں گے؟ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ دائی ہندوستانی ہو لیکن تربیت یافتہ دائی کا ملنا ہندوستان ہی میں مشکل ہے پھر آپ قیاس کر سکتے ہے کہ جنوبی افریقہ میں کیا حال ہو گا۔ اس لیے میں نے طبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا کہ وضع حمل میں آسانی پیدا کرنے کے لیے جو ضروری باتیں ہیں وہ معلوم ہو جائیں میں نے ڈاکٹر تر بھووند اس کی کتاب ''ماںنے سکیمات رہنمائے مادران'' پڑھی اور دونوں بچوں کی پرورش

اس کی ہدایتوں کے مطابق شروع کی مگر اس میں کہیں کہیں اپنے تجربے سے بھی کام لیتا تھا۔ دونوں مرتبہ دو مہینے کے لیے دائی بھی رکھی گئی لیکن اس کا اصل کام میری بیوی کی مدد کرنا تھا بچوں کی پرداخت میں خود کرتا تھا۔

دوسرے بچے کی پیدائش میرے لیے بڑی آزمائش کا موقع تھا میری بیوی کو درد اچانک شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر فوراً نہیں آ سکتا تھا اور دائی کے لانے میں بھی دیر ہوئی اگر موجود بھی ہوتی تو اس وضع حمل میں کوئی مدد نہ ملتی۔ مجھے خود دائی کا کام کرنا پڑا۔ ڈاکٹر ٹروبھووند اس کی کتاب کا مطالعہ بہت کام آیا میرے اوسان قائم رہے۔ ذرا بھی ہراس نہیں ہوا۔

میرے خیال میں بچے کی مناسب تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ والدین ان کی پرورش اور پرداخت کے عام اصول جانتے ہوں ان اصولوں کے مطالعے سے ہر ہر قدم پر فائدہ محسوس ہوا۔ اگر میں ان باتوں کو سیکھ کر کام میں نہ لاتا تو میرے بچوں کی عام صحت اتنی اچھی نہ ہوئی تھی۔ اچھی اب ہے ہمارے دل میں ایک غلط خیال یہ جم گیا ہے کہ بچے کو اپنی زندگی کے پہلے پانچ سال میں کچھ سیکھنا نہیں پڑتا حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے بچہ پہلے پانچ سال میں جو چیز سیکھتا ہے وہ بڑا ہو کر کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ بچے کی تعلیم حمل قرار پاتے ہی شروع ہو جاتی ہے پھر حمل کے زمانے میں اس پر ماں کی کیفیتوں، خواہشوں، مزاج اور طرز معاشرت کا اثر پڑتا رہتا ہے ولادت کے بعد بچہ والدین کی حرکات وسکنات کی نقل کرتا ہے اس لیے بہت برسوں تک اس کی نشو ونما بالکل ان ہی پر منحصر ہوتی ہے۔

جو میاں بیوی ان باتوں کو سمجھ لیں گے وہ کبھی محض اپنی شہوانی خواہش پوری کرنے کے لیے مباشرت نہ کریں گے بلکہ صرف اس وقت ہمبستر ہوں گے جب

انہیں اولاد کی خواہش ہو۔ میرے نزدیک یہ خیال انتہائی جہالت پر مبنی ہے کہ جماع بھی کھانے پینے کی طرح جسم کی ایک مستقل ضرورت ہے یہ وہ فعل ہے جس پر دنیا کے وجود کا انحصار ہے اور چونکہ دنیا شاید حقیقی کی بازی گاہ اور اس کے حسن کی جلوہ گاہ ہے اس لیے اس فعل کو راہ پر لگا کر اس سے دنیا کی منظم نشوونما کا کام لینا چاہیے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے گی وہ دل میں ٹھان لے گا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے شہوانی خواہش کو ضبط کرنا چاہیے اور بچوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی فلاح کے طریقے خود سیکھنا اور آئندہ نسلوں کو سکھانا چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

''برہمچاریہ''(1)

اب ہم اس موقعے پر پہنچ گئے ہیں جب میں برہمچاریہ کا عہد کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہا کرتا تھا۔ میں شادی کے بعد سے ایک بیوی کا پابند رہنے کا قائل تھا۔ کیونکہ بیوی سے عہد وفا نباہنے کو بھی میں حق کی محبت کا ایک جزو سمجھتا تھا مگر یہ حقیقت مجھ پر جنوبی افریقہ آنے کے بعد کھلی کہ بیوی سے ''برہمچاریہ'' 38 برتنا ضروری ہے۔

میں یہ ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ کس چیز نے یا کس کتاب نے مجھے اس طرف توجہ دلائی مگر مجھے یہ خیال پڑتا ہے کہ اس میں جزو غالب رائے چند بھائی کا اثر تھا جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں میری ان سے اس معاملے میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ مجھے اب تک یاد ہیں، میں نے ان سے مسز گلیڈ اسٹن کی تعریف کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی بڑی وفادار ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ مسٹر گلیڈ اسٹن کے لیے دارالعلوم میں خود چائے بناتی ہیں اور یہ بھی ان دونوں کی با اصول زندگی کا ایک اصول بن گیا ہے میں نے یہ واقعہ رائے چند بھائی سے بیان کیا اور اسی سلسلے میں کہا میاں بیوی کی محبت بھی کیا اچھی چیز ہے انہوں نے مجھ سے پوچھا ''تم ان دونوں چیزوں میں سے کسے زیادہ قابل قدر سمجھتے ہو۔ اس محبت کو جو یہ خاتون بیوی کی حیثیت سے مسٹر گلیڈ اسٹن سے رکھتی ہیں یا اس پر خلوص خدمت کو جو وہ بغیر ان تعلقات کے انجام دیتی ہیں؟ فرض کرو وہ ان کی بہن یا خادمہ ہوتیں اور ان کا اتنا ہی خیال رکھتیں جتنا اب رکھتی ہیں تو کیا تم ان کی تعریف کرتے؟ کیا ایسی بہنوں یا پیش خدمتوں کی

مثالیں موجود نہیں ہیں؟ فرض کرو تمہارا کوئی خدمت گار تم سے اتنی ہی محبت رکھتا اور تمہاری ایسی ہی خدمت کرتا تو تمہیں ایسی ہی خوشی ہوتی جو مسٹر گلیڈ اسٹن کے معاملے میں ہوتی ہے؟ ذرا اس بات پر جو میں نے سمجھائی ہے غور کرنا۔''

رائے چند بھائی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ اس وقت ان کے الفاظ بہت تلخ معلوم ہوتے تھے مگر انہوں نے میرے دل کو تسخیر کر لیا۔ میں نے سوچا کہ واقعی خادم کی وفاداری بیوی کی محبت سے بدرجہاں قابل تعریف ہے، بیوی کا میاں سے محبت ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں وہ رشتہ ہوتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ ایک بالکل قدرتی چیز ہے کیونکہ ان دونوں میں وہ رشتہ ہوتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ ایک بالکل قدرتی چیز ہے لیکن نوکر کو آقا سے اتنی محبت پیدا کرنے کے لیے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے شاعر کا نقطہ نظر آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آنے لگا۔

میں نے اپنے دل میں کہا تو پھر مجھے اپنی بیوی سے کس طرح کا تعلق رکھنا چاہیے؟ کیا وفاداری اسی کا نام ہے کہ میں اسے اپنی شہوت رانی کا ذریعہ بناؤں؟ جب تک میں نفسانی خواہشوں کا بندہ ہوں میری وفاداری کوئی قدر قیمت نہیں رکھتی۔ انصاف کی یہ بات ہے کہ میری بیوی کبھی مجھے ترغیب نہیں دلاتیں۔ اس لیے اگر میں دل پر رکھ لوں تو ''برہمچاریہ'' کا عہد کرنا کوئی بڑی بات نہیں، جو کچھ وقت ہے وہ میرے ارادے کی کمزوری اور میری ابوالہوسی کے سبب سے ہے۔

میرے ضمیر میں یہ احساس پیدا ہونے کے بعد بھی مجھے دوبارہ ناکامی ہوئی اس ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ میری سعی کا محرک کوئی اعلیٰ جذبہ نہ تھا میرا اصلی مقصد یہ تھا کہ اور بچے نہ ہوں انگلستان کے قیام کے زمانے میں میں نے بالغ عمل تدبیروں کے

متعلق کتابیں پڑھی تھیں۔ میں نے جو باب نباتاتی مشرب کے متعلق لکھا ہے اس میں ڈاکٹر ایلنسن کی انضباط ولادت کا ذکر کیا ہے اس کا مجھ پر کچھ عارضی اثر ہوا تھا لیکن اس سے زیادہ اور دیر پا اثر ڈاکٹر ہلس کے خیالات کا ہوا جو ان طریقوں کے مخالف تھے اور بیرونی کوشش کے بجائے اندرونی کوشش پر یعنی ضبط نفس پر زور دیتے تھے اس لیے جب میں نے دیکھا کہ مجھے اور بچوں کی خواہش نہیں ہے تو میں ضبط نفس کی سعی کرنے لگا یہ بڑا کٹھن کام تھا ہم میاں بیوی الگ الگ کمروں میں سونے لگے۔ میں نے یہ التزام کیا کہ بستر پر اس وقت تک نہ جاؤں تک جب تک دن بھر کے کام سے تھک کر چور نہ ہو جاؤں گا۔ بظاہر یہ کوششیں زیادہ کارگر نہیں معلوم ہوتی تھیں لیکن جب میں پچھلے زمانے پر غور کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے۔ کہ ان ناکام کوششوں کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا رہا اور آخری فیصلہ اسی مجموعہ اثر کا نتیجہ تھا۔

قطعی ارادہ میں نے کہیں 1906ء میں جا کر کیا۔ اس وقت تک ستیا گرہ شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ مجھے اس کا سان گمان تک نہ تھا۔ میں جنگ بوئر کے تھوڑے دن بعد زولو بغاوت کے زمانے میں نٹال کے شہر جوہانسبرگ میں وکالت کر رہا تھا میں نے اپنا فرض سمجھ کر اپنی خدمات نٹال کی حکومت کے سامنے پیش کیں اور میری درخواست قبول ہوئی اس کی تفصیل آگے چل کر معلوم ہو گی یہاں تو مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس کام کے سلسلے میں میں نے بڑے انہاک سے ضبط نفس کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا اور معمول کے مطابق اپنے رفیقوں سے اس پر تبادلہ خیالات کیا مجھے یہ یقین ہو گیا کہ توالد وتیناسل کا مشغلہ قومی خدمت کے منافی ہے زولو ''بغاوت'' کی مہم میں کام کرنے کی وجہ سے میرا جوہانسبرگ کا گھر بار درہم برہم ہو گیا۔ اپنی خدمات پیش کرنے کے ایک مہینے کے اندر مجھے وہ مکان چھوڑنا پڑا جسے میں نے اتنی

محنت سے آراستہ کیا تھا میں اپنی بیوی بچوں کو فنیکس 39 لے گیا اور وہاں اس ہندوستانی ایمبولینس کور کی نگرانی کرنے لگا جو نٹال کی فوج کے ساتھ تھی ہمیں روز کڑی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں ایک بار چلتے چلتے یہ خیال بجلی کی لہر کی طرح میرے ذہن میں دوڑ گیا کہ اگر میں اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے وقت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے بال بچوں اور دھن دولت کا خیال چھوڑ کر ''دنا پرست''یعنی مرد مجرد کی زندگی بسر کرنا چاہیے۔

''بغاوت'' کی مہم میں میرے کل چھ ہفتے صرف ہوئے۔ مگر یہ مختصر عرصہ میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوا۔ نذر اور عہد کی حقیقت میرے دل پر پہلے سے زیادہ روشن ہو گئی مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ عہد سے سچی آزادی کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ کھلتا ہے اب تک مجھے کامیابی نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میرا ارادہ ضبط نہ تھا اور مجھے اپنی ذات پر اور توفیق الٰہی پر بھروسہ نہ تھا اور میرا دل شک کے طلاطم خیز سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا میں نے دیکھا کہ عہد نہ کرنے سے انسان ترغیبوں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور عہد کر لینا گویا نفس پرستی سے گزر کر سچی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنا ہے جو شخص یہ کہے ''میں کوشش کا قائل ہوں، عہد کر کے اپنے ہاتھ پیر باندھنا نہیں چاہتا'' تو وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی طبیعت کمزور ہے اور جس چیز سے وہ بچتا ہے اس کی تمنا اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی ہے ورنہ آخری فیصلہ کرنے میں کون سی ایسی دشواری ہے؟ کہ جس سانپ کے متعلق میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے ڈسے گا اس سے بھاگنے کا میں قطعی عہد کر لیتا ہوں محض بھاگنے کی کوشش پر قناعت نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ محض کوشش کرنے میں یقینی موت کا احتمال ہے محض کوشش کے معنی تو ہوئے کہ میں اس یقینی بات سے بے خبر ہوں کہ سانپ میری جان لے کر رہے گا۔

اسی طرح ہر معاملے میں محض کوشش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص عمل کی ضرورت بھی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتی ہے ہمارے دل میں اکثر اس قسم کے شبہے پیدا ہوتے ہیں ''فرض کرو کہ میرے خیالات آگے چل کر بدل جائیں'' میں عہد کر کے اپنی آزادی کیوں کھودوں؟ مگر ایسے شبہے بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ جس چیز کو چھوڑنا ہے اس کے ترک کے متعلق ابھی ہمارے خیالات پوری طرح صاف نہیں ہوئے اسی لیے نشکلا نند نے کہا ہے:

''اشیاء کا ترک بغیر خواہشات کے ترک کے کاغذات کی ناؤ ہے۔''

اس لیے اگر واقعی کسی شے کی خواہش دل سے نکل گئی ہے تو اس کے ترک کا عہد لازمی اور قدرتی بات ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

''برہمچاریہ''(2)

اچھی طرح بحث کرنے کے بعد اور خوب سوچ سمجھ کر میں نے 1906ء میں برہمچاریہ کا عہد کرلیا۔ میں نے ابھی تک اپنے خیالات کا ذکر اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا مگر عہد کرتے وقت میں نے ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بے تامل منظور کرلیا مگر آخری فیصلہ کرنا میرے لیے سہل نہ تھا میری ہمت جواب دے رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے جذبات کو کیونکر روکوں۔ اس زمانے میں عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ شوہر اپنی بیوی سے ہمبستری ترک کردے۔ مگر میں خدا کا نام لے کر اور اس کی مدد پر بھروسہ کرکے عہد کر گزرا۔

جب میں اس عہد کے بعد کی زندگی پر جسے اب بیس سال ہو گئے غور کرتا ہوں تو میرا دل خوشی اور حیرت سے معمور ہو جاتا ہے ضبط نفس کی کوشش میں 1901ء سے کر رہا تھا اور اس میں کم وبیش کامیابی ہی ہوئی تھی لیکن خوشی اور آزادی کا احساس جو عہد کرنے کے بعد ہوا وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا عہد کرنے سے پہلے مجھے ہر وقت ترغیب سے مغلوب ہو جانے کا خوف رہتا تھا اب یہ عہد ہر ترغیب کے مقابلے میں سپر کا کام دیتا تھا برہمچاریہ کی عظیم الشان قوت کا مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا تھا۔ عہد کرنے کے وقت میں فنیکس میں تھا ایمبولینس کے کام سے فارغ ہوتے ہی وہاں آیا تھا۔ فنیکس سے میں جوہانسبرگ واپس آ گیا یہاں آئے ایک مہینے کے قریب ہوا تھا کہ ستیا گرہ شروع ہو گیا۔ گویا برہمچاریہ کا عہد مجھے بغیر میرے علم کے اس کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ستیا گرہ کوئی پہلے سے سوچی ہوئی تجویز نہ تھی۔ یہ خود بخود میرے بغیر ارادے

کے شروع ہوگئی لیکن یہ میں جانتا تھا کہ یہ میری پچھلی تمام جد وجہد کا لازمی نتیجہ ہے میں نے جوہانسبرگ میں اپنے مصارف بہت گھٹا دیئے تھے اور فنیکس آ کر ''برہمچاریہ'' کا عہد کرلیا تھا۔

یہ بات شاستروں کے مطالعے سے نہیں سیکھی تھی کہ مکمل ''برہمچاریہ'' سے ''برہم'' کی معرفت حاصل ہوتی ہے مجھے تجربے سے آہستہ آہستہ یہ احساس ہوگیا تھا اس کے متعلق شاستروں کے ''اشلوک'' میری نظر سے آگے چل کر گزرے۔ عہد کے بعد سے مجھے روز بروز اس حقیقت کا علم ہوتا جاتا ہے کہ ''برہمچاریہ'' میں ہمارے جسم، ہمارے ذہن اور ہماری روح کی سلامتی ہے۔ کیونکہ اب ''برہمچاریہ'' میرے لیے کوئی کٹھن ریاضت کا معاملہ نہ تھا بلکہ تسکین اور راحت کا سرچشمہ ہر روز مجھے اس میں ایک نئی خوبی نظر آتی تھی۔

لیکن اگر یہ میرے لیے روز افزوں مسرت کا سرمایہ تھا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی سہل کام تھا اب چھپن سال کی عمر میں بھی مجھے اس کی دشواریاں محسوس ہوتی ہیں مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ ''برہمچاریہ'' برتنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے اور اس میں انسان کو ہر لحظہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں قدم ڈگمگا نہ جائے۔

اس عہد کی پابندی کے لے پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ انسان ذائقے کے معاملے میں ضبط نفس سے کام لے۔ میں نے دیکھا کہ ذائقے کو پوری پوری طرح قابو میں رکھنے سے اس کی پابندی بہت آسان ہوجاتی ہے اس لیے اب میں غذا کے متعلق جو تجربے کرتا تھا ان میں سے صرف نباتاتی مشرب کی رعایت نہ ہوتی تھی بلکہ برہمچاری، نقطہ کا بھی لحاظ تھا۔ ان تجربوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ''برہمچاری'' کی غذا قلیل، سادہ، بے مسالے کی اور ممکن ہو تو بے پکی ہونا چاہیے۔

چھ سال کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ برہمچاری کے لیے بہترین غذا تازہ پھل اور اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ ہیں۔ اس غذا کے استعمال کے دوران میں میرا دل شہوانی خواہشوں سے جس قدر پاک رہا تھا اس کے چھوڑنے کے بعد کبھی نہیں رہا۔ جنوبی افریقہ میں جہاں میں سوائے تر اور خشک میووں کے کچھ نہیں کھاتا تھا مجھے ''برہمچاریہ'' کے لیے کوئی خاص سعی نہیں کرنا پڑتی تھی لیکن جب سے میں نے دودھ کا استعمال شروع کیا ہے اس عہد کی پابندی کے لیے بڑی سخت کوشش کی ضرورت ہوتی ہے یہ آگے چل کر معلوم ہوا کہ میں نے پھل چھوڑ کر دودھ کی طرف کیوں رجوع کیا یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میرے نزدیک دودھ کے استعمال سے یقیناً ''برہمچاریہ'' برتنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہر برہمچاری کے لیے دودھ ترک کر دینا لازمی ہے۔ یہ تو متعدد تجربوں کے بعد بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مختلف غذاؤں کے استعمال کا ''برہمچاریہ'' پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے اب تک دودھ کا کوئی ایسا بدل نہیں مل سکا جو عضلات کی نشوونما میں بھی مدد دیتا ہو اور آسانی سے ہضم بھی ہو جاتا ہو۔ میں نے ڈاکٹروں، ویدوں، حکیموں سب سے پوچھ دیکھا مگر کوئی مجھے ایسی چیز نہ بتا سکا۔ اس لیے گو میں جانتا ہوں کہ دودھ ایک محرک ہے مگر میں فی الحال کسی کو اس کے ترک کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

''برہمچاریہ'' کو مدد دینے کی خارجی تدبیروں میں سے روزہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی غذا کی سادگی اور قلت حسی لذت کی خواہشیں اتنی قوی ہیں کہ انہیں قابو میں رکھنے کے لیے جب تک ہر طرف سے گھیرا نہ ڈالا جائے کام نہیں چلتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ غذا نہ ملنے سے ان کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک حیات کو قابو میں لانے کی غرض سے روزہ رکھنا بہت مفید ہے بعض لوگوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں

پہنچتا کیونکہ یہ سمجھ کر کہ محض فاقے سے شہوانی خواہشوں سے نجات مل جائے گی وہ معدہ کو خالی رکھتے ہیں مگر تصور میں طرح طرح کی لذتوں کے مزے لیا کرتے ہیں اور ہر وقت سوچا کرتے ہیں کہ جب روزہ کھولیں گے تو یہ کھائیں گے اور یہ پئیں گے۔ اس طرح کے روزے سے نہ تو ذائقے کو قابو میں لانے میں مدد ملتی ہے اور نہ شہوانی خواہش کو دبانے میں۔ روزہ تبھی مفید ہوتا ہے جب دل بھوکے جسم کا ساتھ دے یعنی جن چیزوں کو جسم نے ترک کیا ہے ان سے دل بھر جائے۔ دل ہی شہوانی خواہشوں کی جڑ ہے۔ اس لیے روزہ کا فائدہ محدود ہے کیونکہ ممکن ہے کہ روزہ رکھ کر انسان بدستور خواہشوں میں گھرا رہے پھر بھی شہوانی خواہشوں کا استیصال بغیر روزے کے ناممکن ہے اس لیے ''برہمچاریہ'' میں ایک ناگزیر چیز ہے ''برہمچاریہ'' کے بہت سے طالب اس وجہ سے ناکامیاب ہوتے ہیں کہ دوسری خواہشوں کی باگ وہ اس طرح ڈھیل چھوڑ دیتے ہیں جیسے غیر برہمچاری اس لیے ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو انتہائی گرمی میں یہ کوشش کرتا ہے کہ کڑاکے کے جاڑے کا لطف اٹھائے۔ برہمچاری اور غیر برہمچاری کی زندگی میں نمایاں حد فاضل ہونا چاہیے۔ دونوں میں جو مشابہت ہے وہ محض دیکھنے کی ہے اور وہ جو فرق ہے وہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ دونوں اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں مگر برہمچاری ان سے خدا کے جلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسرا شخص بے حقیقت کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ دونوں اپنے کانوں کو کام میں لاتے ہیں مگر پہلا ذرے ذرے سے خدا کی حمد سن کر وجد کرتا ہے اور دوسرا واہیات باتوں پر سر دھنتا ہے۔ دونوں اکثر رات کو دیر تک جاگتے ہیں مگر پہلا سارا وقت عبادت میں بسر کرتا ہے اور دوسرا بیہودہ رنگ رلیوں میں گنواتا ہے۔ دونوں کھانا کھاتے ہیں مگر پہلا صرف اس لیے کھاتا ہے کہ اس کا جسم جو خدا کا

گھر ہے صحت کے ساتھ قائم رہے اور دوسرا دنیا بھر کی چیزیں ٹھونس کو اس پاک گھر کو گندی نالی بنا دیتا ہے۔ غرض دونوں میں بعد المشرقین ہے اور جوں جوں دن گزرتے جائیں گے یہ فیصلہ کم نہیں ہوگا بلکہ اور بڑھتا جائے گا۔

''برہمچاریہ'' کے معنی ہیں خیال اور فعل میں ضبط نفس سے کام لینا مجھ کو روز بروز اس قسم کے ضبط کی ضرورت کا احساس بڑھتا جاتا ہے ترک لذت کی بھی ''برہمچاریہ'' کی طرح کوئی حد نہیں مکمل ''برہمچاریہ'' انسان کی کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتا بہت سے لوگوں کے لیے یہ محض ایک نصب العین رہے گا۔ ''برہمچاریہ'' کے طالب کو ہمیشہ اپنی کوتاہیوں کا احساس رہتا ہے اور اپنے دل کے گوشوں سے چھپی ہوئی خواہش کھود کھود کر نکالتا ہے اور ان سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے جب تک خیال پوری طرح ارادے کا تابع نہ ہو جائے مکمل ''برہمچاریہ'' حاصل نہیں ہوسکتا۔ غیر ارادی خیال ایک نفیسی کیفیت ہے اور اسے دبانے کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنے نفس کو دباتا ہے جو کرہ ہوا کو دبانے سے بھی زیادہ مشکل ہے تاہم چونکہ انسان کے دل میں خدا کا جلوہ موجود ہے اس لیے وہ نفس کو بھی قابو میں لاکر مانتا ہے یہ چیز مشکل ضرور ہے مگر یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ناممکن ہے یہ سب اعلیٰ مقصد ہے اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرنا پڑتی ہے۔

مگر یہ بات مجھے ہندوستان آ کر معلوم ہوئی کہ ایسا ''برہمچاریہ'' محض انسان کی کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس وقت میں اس دھوکے میں تھا کہ محض پھل کھانے کا التزام تمام نفسانی خواہشوں کو مٹا دینے کے لیے کافی ہے اور میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مجھے کسی اور تدبیر کی ضرورت نہیں۔

مگر مجھے اپنی روحانی کشمکش کی داستان وقت سے پہلے بیان نہیں کرنی چاہیے۔

البتہ یہاں میں اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ''برہمچاریہ'' برتنا چاہتے ہیں انہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ انہیں خدا پر عقیدہ اور اپنی سعی پر بھروسہ ہو۔

پرہیز گاروں کے نفس سے محسوس اشیاء کا خیال دور ہو جاتا ہے مگر ان کی لذت کا اثر رہ جاتا ہے جب خدائے برتر کی معرفت حاصل ہوئی ہے تو یہ اثر بھی زائل ہو جاتا ہے (بھگوت گیتا 2-59)

اس لیے ''موکشا'' کے طالب علموں کے لیے آخری وسیلہ خدا کا نام ہے اور اس کی توفیق ہے یہ حقیقت مجھ پر ہندوستان آنے کے بعد کھلی۔

☆☆☆☆☆

سادہ زندگی

میں نے عیش و آرام کی زندگی شروع کی تھی مگر یہ صرف چند روز رہی گو میں نے اپنے مکان کو آراستہ کرنے میں بہت اہتمام کیا تھا مگر مجھے اس سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔

تھوڑے ہی عرصے میں میں نے مصارف میں کز بیونت شروع کر دی۔ ہیرا دھوبی ایک تو دھلائی بہت لیتا تھا دوسرے وقت پر کپڑے نہیں دیتا تھا اس لیے دو تین درجن قمیض اور کالر بھی میرے لیے کافی نہیں ہوتے تھے۔ کالر روز بدلنا پڑتا تھا اور قمیض روز نہیں تو ایک دن بیچ اس سے بہت خرچ پڑ جاتا تھا جو میرے خیال میں بالکل فضول تھا اس خرچ کو بچانے کے لیے میں نے کپڑے دھونے کا سامان خریدا اور اس مضمون پر کتاب خرید کر پڑھی اس طرح میں نے کپڑے دھونا سیکھ لیا اور اپنی بیوی کو بھی سکھا دیا۔ اس سے میرا کام تو ضرور بڑھ گیا مگر ایک نئی چیز تھی اس لیے لطف بھی آتا تھا۔

''میں نے جو پہلا کالر اپنے ہاتھ سے دھویا تھا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں نے کالر میں پیچ ضرورت سے زیادہ تھوپ دی استری کافی گرم نہیں کی اور جلنے کے خوف سے کالر کو اچھی طرح دبایا بھی نہیں اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کالر سخت تو ہو گیا مگر اس میں پیچ ٹپکتی جاتی تھی یہی کالر لگا کر عدالت میں گیا۔''

میرے ہم چشم بیرسٹروں نے میرا مذاق اڑایا مگر مجھے اس زمانے میں بھی اس کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔

میں نے کہا ''بھئی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ہاتھ سے کالر دھونے کا یہ پہلا موقع ہے اس لیے پیچ بھری رہ گئی مگر میرا اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ فائدہ بھی ہے کہ آپ لوگوں کے لیے تفریح کا سامان ہو گیا۔''

ایک دوست نے پوچھا ''آخر کیوں؟ کیا یہاں دھوبیوں کی کمی ہے؟'' میں نے جواب دیا، ''دھلائی بہت دینا پڑتی ہے کالر کی دھلائی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی اس کی قیمت اور پھر ہمیشہ دھوبی کا پابند رہنا پڑتا ہے اس سے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوؤں۔''

مگر میں اپنے دوستوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی خوبی محسوس نہ کرا سکا۔ تھوڑے دن میں مجھے اتنی مہارت ہو گئی کہ اپنے کپڑے بڑی آسانی سے دھو لیتا تھا اور میرے دھوئے کپڑے دھوبی کے یہاں کے کپڑوں سے کسی طرح برے نہیں ہوتے تھے۔ میرے کالر ویسے ہی سخت اور چمکدار ہوتے تھے جیسے دوسروں کے۔ جب گو کھلے جنوبی افریقہ آئے تو ان کے پاس ایک مفلر تھا جو انہیں مہادیو گووند راناڈے نے تحفے کے طور پر دیا تھا وہ اس نشانی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے۔ جب جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا تو اس کے باندھنے کا موقع آیا۔ مگر یہ مل دیا گیا تھا اور اس پر استری کی ضروری تھی اتنا وقت نہ تھا کہ دھوبی کے یہاں دھلوایا جائے۔ میں نے کہا لائیے میں اپنا ہنر آزماؤں۔

گوکھلے نے کہا ''میں وکالت میں تمہاری قابلیت پر بھروسہ کر سکتا ہوں مگر دھوبی کے کام میں نہیں تم نے اسے خراب کر دیا تو پھر میں کیا کروں گا؟ تم جانتے ہو یہ مجھے کس قدر عزیز ہے؟''

یہ کہہ کر انہوں نے بڑے شوق سے اس تحفے کے ملنے کا قصہ سنایا۔ مگر میں نے اصرار کیا اور انہیں یقین دلایا کہ میں بہت عمدگی سے کام کروں گا آخر اجازت مل گئی اور میں نے اس پر استری کر دی جسے دیکھ کر وہ میرے ہنر کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا اس سے انکار کرتی مجھے کوئی پروا نہ تھی۔

جس طرح میں نے دھوبی کی پابندی سے نجات پائی اسی طرح نائی کا بھی محتاج نہیں رہا۔ وہ لوگ جو انگلستان جایا کرتے ہیں سب کے سب داڑھی مونڈھنا سیکھ جاتے ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اپنے ہاتھ سے بال کاٹنا کوئی بھی نہیں سیکھتا۔ مجھے یہ بھی سیکھنا پڑا۔ ایک بار میں پریٹوریا میں ایک انگریز حجام کے یہاں گیا اس نے حقارت کے انداز میں میرے بال کاٹنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی مگر میں نے فوراً ایک بال کاٹنے کی مشین خرید لی اور آئینہ سامنے رکھ کر اپنے بال کاٹنے لگا سامنے کے بال کاٹنے میں تو مجھے کم و بیش کامیابی ہوئی مگر گردن کے بال خراب ہو گئے عدالت میں میرے دوست انہیں دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

''گاندھی یہ تمہارے بالوں کو کیا ہوا چوہے کتر کر لے گئے؟''

''نہیں یورپی حجام نے میرے کالے بالوں کو ہاتھ لگانے میں اپنی ذلت سمجھی اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے ہاتھوں سے کاٹوں گا چاہے کیسے ہی خراب کیوں نہ کٹیں۔''

اس جواب سے میرے دوستوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔

حجام نے جو میرے بال کاٹنے سے انکار کیا اس میں اس کا قصور نہ تھا اگر کالے آدمیوں کا کام کرتا تو اس کے یورپی گاہک چھوٹ جاتے۔ ہم بھی تو اپنے نائیوں کو

اچھوتوں کا کام نہیں کرنے دیتے۔ مجھے اس سلوک کا بدلا جنوبی افریقہ میں ایک بار نہیں بیسیوں بار ملا اور چونکہ میرا عقیدہ تھا کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے اس لیے مجھے اس پر غصہ نہیں آیا۔

میری سادگی اور اپنی مدد آپ کرنے کے اصول نے آگے چل کر جو انتہائی صورتیں اختیار کرلیں ان کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا ان کا بیج بہت دن پہلے بویا جا چکا تھا اس کے جڑ پکڑنے اور پھولنے پھلنے کے لیے صرف پانی دینے کی ضرورت تھی اور یہ آبیاری آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆

جنگ بوئر

میں 1890ء سے 1896ء تک کے بہت سے واقعات کو چھوڑ کر صرف جنگ بوئر کا ذکر کرتا ہوں۔

اعلان جنگ کے وقت مجھے ذاتی طور پر بوئروں سے ہمدردی تھی مگر ان دنوں میرا خیال تھا کہ ایسے معاملات میں مجھے یہ حق نہیں کہ دوسروں کو اپنی انفرادی رائے پر چلاؤں۔ میں نے ''جنوبی افریقہ کو ستیا گرہ کی تاریخ''میں اس اندرونی کشمکش کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں کو اس کے معلوم کرنے کا شوق ہو وہ اس کتاب کو پڑھیں یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کے جذبے نے مجھے اس لڑائی میں انگریزوں کی طرف کھینچ لیا میں نے سوچا اگر میں سلطنت برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے حقوق کا طالب ہوں تو میرا فرض ہے کہ اس سلطنت کی حفاظت میں شرکت کروں۔ میرا ان دنوں یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو کامل آزادی صرف سلطنت برطانیہ کی مدد سے اور اس کے ماتحت رہ کر حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے مجھے جتنے ساتھی مل سکے سب کو جمع کر کے میں نے ایک ایمبولینس کور بنائی اور حکومت نے اس کی خدمات قبول کر لیں۔

انگریزوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ ہندوستانی بزدل ہوتے ہیں جوکھم سے گھبراتے ہیں اور ان کی نظر اپنے فوری فائدے سے آگے نہیں جاتی۔ اس لیے بہت سے انگریز دوستوں نے میری تجویز کی مخالفت کر کے میرے جوش کو ٹھنڈا کر دیا مگر

ڈاکٹر بوتھ نے دل و جان سے اس کی حمایت کی انہوں نے ہماری ایمبولینس کور کو کام سکھایا ہم نے اس کام کی اہلیت کے طبی تصدیق نامے حاصل کیے۔ مسٹر لاٹن اور مسٹر الیکومب آنجہانی نے بڑے جوش کے ساتھ ہماری تجویز کی تائید کی اور خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ ہم میدان جنگ میں جانے کی درخواست کریں۔ حکومت نے ہمارا شکریہ ادا کیا لیکن یہ کہا کہ ابھی آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں مگر میں اس سے انکار ماننے والا نہ تھا ڈاکٹر بوتھ کے ذریعے سے میں نٹال کے بشپ (اسقف) سے ملا۔ ہماری کور میں بہت سے عیسائی بھی تھے وہ میری تجویز سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ ہماری خدمات کو قبول کیے جانے میں مدد کریں گے۔

واقعات بھی ہمارا ساتھ دے رہے تھے بوروں نے توقع سے زیادہ جرأت، بہادری اور استقلال دکھایا۔ آخر ہماری خدمات قبول کر لی گئیں۔

ہماری کور میں کل گیارہ سو آدمی تھے جن میں چالیس افسر تھے ان میں سے تین سو آزاد ہندوستانی تھے اور باقی سب پابند مزدور تھے۔ ڈاکٹر بوتھ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری کور نے اچھا خاصا کام کیا۔ ہمارا مقام محاذ جنگ کے پیچھے تھا اور ہم صلیب احمر کی حفاظت میں تھے مگر ایک بار ایک نازک موقع پر ہم سے میدان جنگ میں کام لیا گیا۔ ہم تو خود یہی چاہتے تھے ابتداء میں جنگی افسر ہمیں گولہ باری کی زد میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے مگر اسپیئون کاپ کی پسپائی کے بعد صورتحال بدل گئی۔ ہمارے پاس جنرل بلر کا پیام آیا کہ گو آپ لوگ اس پر مجبور نہیں کہ اپنی جان خطرے میں ڈالیں لیکن آپ زخمیوں کو میدان جنگ سے لے آیا کریں تو حکومت آپ کی بہت ممنون ہو گی ہم نے بے تامل منظور کر لیا اس لیے اسپیئون کاپ کے معرکے میں ہم خط جنگ پر موجود تھے ان دنوں ہمیں زخمیوں کو ڈولی میں اٹھا کر بیس پچیس میل

روزانہ چلنا پڑتا تھا۔ بجز ان کے ہمیں جنرل وڈ گیٹ کے سپاہیوں کو اٹھانے کا فخر حاصل ہوا۔

چھ ہفتے کے کام کے بعد کور کے لوگ چھٹی پر بھیج دیئے گئے اسپیون کاپ اور وال کرانز کی شکستوں کے بعد برطانوی سپہ سالار نے لیڈی اسمتھ وغیرہ کو دھاوا کر کے مدد پہنچانے کا خیال ترک کر دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں تاکہ اس عرصے میں انگلستان سے اور ہندوستان سے مدد پہنچ جائے۔

اس موقع پر حقیر خدمت کی بہت تعریف کی گئی اور لوگوں کی نظر میں ہندوستانیوں کی وقعت بڑھ گئی اخباروں نے مدحیہ نظمیں شائع کیں ترجیع بند لکھے گئے جن کے آخر میں اس مضمون کا مصرعہ آتا تھا۔ ''لاکھ کچھ ہو پھر ہم سلطنت کے فرزند ہیں''

جنرل بلر نے اپنی رپورٹ میں کور کے کام کی تعریف کی اور اس کے افسروں کو تمغہ جنگ عنایت کیا۔

ہندوستانیوں میں تنظیم پہلے سے بہت بہتر ہوگئی مجھے پابند مزدوروں سے اچھی طرح ملنے کا موقع ملا۔ ان میں بیداری پیدا ہوگئی اور ان کے دل میں اسی خیال نے جڑ پکڑ لی کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، گجراتی، سندھی سب بھارت ماتا کے بیٹے ہیں ہر شخص کو یقین تھا کہ اب ہندوستانیوں کی شکایتیں رفع کر دی جائیں گی ان دنوں کے یورپیوں کے طرز عمل میں نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں ہم سے اور یورپیوں سے بہت اچھے تعلقات پیدا ہو گئے تھے ہمیں ہزاروں گوروں سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ہم سے اچھی طرح پیش آتے تھے اور ہمارے شکر گزار تھے کہ ہم ان کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔

میرا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ یہاں ایک واقعے کا ذکر کروں۔ جس کی یاد بہت

خوشگوار ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت کی انتہائی خوبی آزمائش کے وقت ظاہر ہوتی ہے ہم شیو کی کیمپ جا رہے تھے جہاں لارڈ رابرٹس کے بیٹے لیفٹیننٹ رابرٹس نے کاری زخم کھا کر جان دی تھی ہماری کور کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی لاش میدان جنگ سے اٹھا کر لائی اس روز بڑی سخت گرمی تھی ہر شخص پیاس سے بیتاب تھا راہ میں اک چھوٹا سا چشمہ تھا جہاں ہم اپنی پیاس بجھا سکتے تھے مگر سوال یہ تھا کہ پہلے کون پانی پینے جائے ہم چاہتے تھے کہ پہلے گورے پی لیں تب ہم جائیں مگر انہیں یہ گوارا نہ تھا اور وہ ہم سے اصرار کر رہے تھے دیر تک یہ خوشگوار مقالہ ہوتا رہا جس میں ہر فریق دوسرے کو آگے بڑھا کر خود پیچھے رہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حفظانِ صحت کا اہتمام اور قحط کا امدادی کام

مجھے یہ بات ہمیشہ سے بری معلوم ہوتی ہے کہ ہیئت اجتماعی کا کوئی رکن بیکار رہے۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ اپنی قوم کی کمزوریوں پر پردہ ڈالوں یا ان سے چشم پوشی کروں۔ اگر ایک طرف اپنی قومی کے حقوق کے لیے لڑتا ہوں تو دوسری طرف اس کے عیوب کی اصلاح بھی کرتا ہوں اس لیے جب میں نے نٹال کی سکونت اختیار کی تھی میں ہندوستانیوں کے سر سے ایک الزام دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ان پر لگایا جاتا تھا اور ایک حد تک بجا تھا اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی پھوہڑ ہوتے ہیں اپنے مکان اور گردوپیش کی زمین صاف نہیں رکھتے قوم کے سر برآوردہ افراد اپنے مکانوں کی صفائی کرنے لگے تھے مگر خانہ دار معائنہ صرف اس زمانے میں شروع ہوا جب ڈربن میں طاعون پھیلنے کا خوف تھا۔ میونسپلٹی کے ممبروں نے اس کام کو پسند کاے اور اس میں ہماری مدد کی۔ کیونکہ وہ خود چاہتے تھے کہ ہم ان سے اتحاد عمل کریں اس اتحاد عمل کی بدولت انہیں بھی آسانی ہوئی اور ہماری دقتیں بھی کم ہوگئیں کیونکہ جب کبھی وبا پھیلتی ہے تو انتظامی افسر عموماً بے صبری سے کام لے کر سختیاں شروع کر دیتے ہیں اور جن لوگوں سے خفا ہوتے ہیں ان سے تشدد کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ہماری قوم نے خود حفظان صحت کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے وہ اس تشدد سے محفوظ رہی۔

مگر مجھے بعض باتوں میں بڑی سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ جب میں اپنی قوم کے لیے حقوق کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ بڑی خوشی سے ساتھ دیتی ہے مگر جب

اس سے کہتا ہوں کہ اپنا فرض ادا کرے تو اتنی مستعدی نہیں دکھاتی۔ کہیں لوگوں نے مجھے ذلیل کیا اور کہیں اخلاق سے پیش آئے لیکن میری بات پر کوئی توجہ نہیں کی۔ لوگ اتنی زحمت نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ اپنے محلوں کو صاف رکھیں ان سے یہ توقع رکھنا کہ اس کام میں روپے سے امداد دیں بالکل فضول تھا۔ ان تجربوں سے مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ لوگوں کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے لیے بے حد صبر کی ضرورت ہے۔ اصلاح کی فکر صرف اصلاح کرنے والوں کو ہوتی ہے سماج کو نہیں ہوتی۔ اس سے ماسوائے مخالفت نفرت اور ایذا رسانی کے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اصلاح کرنے والا جس چیز کو جان کے برابر عزیز رکھتا ہے اسے سماج تنزل سے تعبیر کرتی ہے اور کیوں نہ کرے؟

تاہم اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو اس ضرورت کا احساس ہو گیا کہ اپنے مکان اور محلے صاف رکھنا چاہیے میری وقعت حکام کی نظر میں بڑھ گئی انہیں معلوم ہو گیا کہ ایک طرف میں اپنی قوم کی شکایتوں کو ظاہر کرتا ہوں اور حقوق پر زور دیتا ہوں تو دوسری طرف اس کی اندرونی اصلاح میں بھی اتنی ہی سرگرمی سے کام لیتا ہوں۔

البتہ ایک کام ابھی باقی تھا وہ یہ کہ نو آباد ہندوستانیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ بھارت ماتا کی محبت اور خدمت ان پر فرض ہے۔ ہندوستان غریب ملک ہے۔ نو آباد ہندوستانی دولت کی تلاش میں جنوبی افریقہ آتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنی کمائی کے ایک حصے سے اپنے ہم وطنوں کی آڑے وقت مدد کریں۔ یہ فرض ان لوگوں نے اس قحط کے زمانے میں جو 1897ء سے 1899ء تک پڑا تھا ادا کیا۔ انہوں نے 1897ء میں اس سے بھی زیادہ دیا۔ ہم نے انگریزوں سے بھی چندہ مانگا اور انہوں

نے اچھی خاصی رقم دی پابند مزدوروں تک میں چندے میں شرکت کی اور یہ طریقہ جنوبی افریقہ میں قحط کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور اب تک جاری ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہماری قوم پر مصیبت پڑتی ہے تو جنوبی افریقہ کے ہندوستانی برابر معقول رقمیں چندے میں بھیجتے ہیں۔

اس طرح میں نے جنوبی افریقہ میں جو خدمت ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر ہر قدم پر نئے نئے پہلو نظر آئے حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے اور اسے جتنا زیادہ سینچیں اتنا ہی زیادہ پھل دیتا ہے۔ حق کے معدن کو جتنا گہرا کھودیں اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہندوستان کو واپسی

جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی افریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے وقت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں نہ صرف ہو جائے۔

وطن میں میرے احباب میری واپسی پر مصر تھے اور مجھے یہ خیال ہوا کہ میں ہندوستان کی زیادہ خدمت کرسکوں گا۔ جنوبی افریقہ کے کام کو سنبھالنے کے لیے خان صاحب اور منسکھ لال جی نظر موجود تھے۔ اس لیے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی۔ یہ درخواست بڑی مشکل سے منظور ہوئی اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر میری ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔ مجھے یہ شرط بڑی سخت معلوم ہوئی مگر اس محبت کی وجہ سے جو مجھے اپنے وطنی بھائیوں سے تھی میں نے اسے منظور کرلیا۔ میرا بائی نے کہا ہے۔

''میرے مالک نے مجھے باندھ رکھا ہے محبت کے سچے دھاگے میں میں اس کا غلام ہوں'' میرے لیے بھی برادرانہ رشتہ محبت کا توڑنا ممکن نہ تھا زبان خلق نقارہ خدا کہلاتی ہے میں اپنے دوستوں اور وطنی بھائیوں کے کہنے کو کیونکر ٹال سکتا تھا؟ میں نے یہ شرط قبول کرلی اور مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔

میرے تعلقات اس زمانے میں صرف نٹال تک محدود تھے نٹال کے ہندوستانیوں نے مجھ پر مہر و محبت کا مینہ برسا دیا۔ ہر جگہ رخصتی جلسوں کا انتظام کیا گیا

اور مجھے قیمتی تحفے دیئے گئے۔

جب میں پہلی بار یہاں سے ہندوستان جا رہا تھا تب بھی مجھے تحفے دیئے گئے تھے مگر اس مرتبہ رخصت میں بے حد جوش و خروش تھا تحفوں میں سونے چاندی کی چیزوں کے علاوہ بعض جڑاؤ چیزیں بھی تھیں۔

مجھے ان تحفوں کے قبول کرنے کا کیا حق تھا؟ اگر میں انہیں قبول کر لیتا تو اپنے دل میں کیونکر سمجھتا کہ میں اپنے بھائیوں کی خدمت بلا معاوضے کر رہا ہوں؟ سوائے چند تحفوں کے جو میرے موکلوں نے دیئے تھے اور سب مجھے قومی خدمت کی وجہ سے دیئے گئے تھے پھر میں اپنے موکلوں اور رفیقوں میں فرق بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے موکل بھی مجھے قومی کاموں میں مدد دیتے تھے۔

ایک سونے کا کنٹھا جس کی قیمت پچاس گنی تھی میری بیوی کو دیا گیا تھا یہ تحفہ بھی میری قومی خدمات کی وجہ سے ملا تھا اس لیے میں اور دوسرے تحفوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جس شام کو یہ تحفے دیئے گئے تھے اس کے بعد کی میری رات جاگتے گزری۔ میں الجھن اور پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سینکڑوں کی قیمت کے تحفوں کو پھیر دینا کچھ سہل نہ تھا۔ مگر انہیں رکھ لینا میرے لیے اس سے زیادہ دشوار تھا۔

میں نے سوچا کہ فرض کیجئے میں انہیں رکھ لوں تو میرے بچوں پر اور میری بیوی پر اس کا کتنا خراب اثر پڑے گا۔ انہیں میں یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اپنی زندگی قومی خدمت میں گزاریں اور خدمت کو معاوضے سے بے نیاز سمجھیں۔

ہمارے گھر میں قیمتی زیور نہیں تھے کیونکہ ہم روز بروز سادگی اختیار کرتے جاتے

تھے ہم سے سونے کی گھڑیاں باندھنا، سونے کی زنجیریں اور انگوٹھیاں پہننا کیونکر نبھ سکتا تھا؟ ان ہی دنوں میں لوگوں کو تاکید کر رہا تھا کہ زیوروں کی ہوس چھوڑیں۔ پھر میں ان زیوروں کو کیسے لے لیتا؟

آخر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے بیٹھ کر خط کا مسودہ لکھا کہ میں ان چیزوں کو قومی کاموں کے لیے وقف کرتا ہوں اور پارسی رستم جی اور چند اشخاص کو وقف کا متولی مقرر کرتا ہوں صبح کو میں نے اپنی بیوی بچوں سے مشورہ کیا اور خدا خدا کر کے اس بوجھ کو اپنے سر سے ہٹایا۔

مجھے یقین تھا کہ اپنی بیوی کو اس بات پر آمادہ کرنے میں مجھے کسی قدر دقت ہو گی۔ مگر بچے آسانی سے مان لیں گے اس لیے میں نے سوچا کہ بیوی کو سمجھانے میں بچوں کو اپنا وکیل بناؤں گا۔

بچے فوراً راضی ہو گئے انہوں نے کہا ''ہمیں ان قیمتی زیوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ یہ زیور اپنے وطنی بھائیوں کو لوٹا دیں اگر ہمیں ضرورت ہو گی تو جب چاہیں گے دوسرے زیور خرید لیں گے۔''

مجھے بڑی خوشی ہوئی، میں نے ان سے پوچھا ''تو پھر تم اپنی والدہ کو بھی سمجھا لو گے؟'' انہوں نے کہا ''کونسی بڑی بات ہے یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجیے وہ خود تو زیور پہنتی نہیں اگر لیں گی تو ہمارے لیے ہی لیں گی پھر جب ہمیں یہ منظور نہیں تو انہیں واپس کرنے میں کیا عذر ہو گا؟''

انہوں نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر جب کرنے کا وقت آیا تو مشکل پڑی۔

میری بیوی نے کہا ''تمہارے بچے زیور نہیں چاہتے ہیں تو نہ چاہیں انہیں تم پھسلا کر جو چاہو کہلوا لو مگر میری بہوئیں جو آئیں گی؟ ان کو زیور کی ضرورت ہو گی یا

نہیں؟ کسی کو کیا خبر کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ مجھ سے یہ نہ ہو گا کہ لوگوں نے جو تحفے اتنی محبت سے دیئے ہیں وہ لوٹا دوں۔''

بحث کا دریا امنڈ آیا اور آخر میں آنسوؤں کا سیلاب آ گیا مگر بچے اپنی بات پر اڑے رہے اور میں بھی نہ پسیجا۔

میں نے نرمی سے کہا ''بچوں کی شادی کا ابھی کیا ہے ہمیں ان کا بیاہ کم سنی میں تو کرنا نہیں جب بڑے ہو جائیں گے تو اپنے آپ نپٹ لیں گے اور پھر ہم ان کے لیے ایسی دلہنیں کیوں لانے لگے جنہیں زیور کا شوق ہو؟ اور فرض کرو زیور کی ضرورت ہو تو میں تو موجود ہوں تم مجھ سے کہنا۔''

''اور کیا تم ہی سے تو کہوں گی۔ میں نے تمہیں اتنے دن میں خوب دیکھ لیا۔ تم نے میرے پیچھے پڑ کر میرا سارا زیور لے لیا بہوؤں کے لیے تم ضرور خرید و گے۔ بچوں کو گو تم ابھی سے سادھو بنانے کی فکر میں ہو نہیں صاحب میں یہ زیور واپس نہیں ہونے دوں گی اور یہ تو کہو میرا کنٹھا واپس کرنے کا تمہیں کون سا حق ہے؟ میں نے کہا'' اخو! یہ کنٹھا تمہیں میری ہی خدمت کی وجہ سے ملا ہے۔

یہ سچ ہے مگر وہ تمہاری خدمت ہوئی یا میری خدمت بات ایک ہی ہے۔ میں نے جو تمہارے کام کی خاطر دن رات مشقت اٹھائی وہ کسی گنتی ہی میں نہیں؟ تم نے دنیا بھر کے مردے میرے گھر میں لا کر بھر دیئے۔ مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلایا اور مجھے ان کی مرہم پٹی کرنا پڑی۔

یہ باتیں میرے دل پر تیر کی طرح لگیں مگر میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ زیور لوٹا کر رہوں گا اپنی بیوی کو میں نے کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ جتنے تحفے 1896ء سے 1901ء تک ملے تھے سب واپس کیئے گئے۔ایک وقف نامہ لکھا گیا اور یہ سب

چیزیں ایک بنک میں جمع کر دی گئیں کہ میں خود یا وقف کے متولی انہیں جس طرح چاہیں قومی کاموں میں صرف کریں۔

اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے قومی کاموں کے لیے روپے کی ضرورت ہوئی اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ وقف سے مدد لوں مگر ہمیشہ مجھے یہ روپیہ چندوں سے مل گیا اور وقف کی رقم کو ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آئی یہ وقف اب تک موجود ہے ضرورت ہے وقت اس سے روپیہ لیا جاتا ہے اور اس کی آمدنی جمع ہوتی ہوئی ایک معقول رقم ہو گئی ہے۔

مجھے آج تک کبھی اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا اور میری بیوی کو بھی رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ دانشمندی کا فعل تھا۔ اس نے ہمیں بہت سی ترغیبوں سے بچایا۔

میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ قومی کام کرنے والوں کو قیمتی تحفے قبول نہیں کرنا چاہیں۔

☆☆☆☆☆

پھر ہندوستان میں

غرض میں پھر دیس روانہ ہو گیا۔ جہاز کا ایک مقام ماریشش میں بھی تھا اور چونکہ یہاں کئی دن ٹھہرنا تھا اس لیے میں شہر جا کر وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کیا کرتا تھا ایک راستہ میں اس نو آبادی کے گورنر سر رابرٹ بروس کا مہمان رہا۔

ہندوستان پہنچ کر میں کچھ دن سارے **ملک** کا دورہ کرتا رہا۔ 1901ء میں کانگریس کلکتے میں ہو رہی تھی اور اس کے صدر مسٹر ڈنشا واچا تھے (جواب سر ڈانشا واچا کہلاتے ہیں) میں بھی اس میں شریک ہوا میرے لیے کانگریس میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔

بمبئی سے میں اسی گاڑی میں سوار ہوا جس میں سر فیروز شاہ مہتا تھے کیونکہ مجھے ان سے جنوبی افریقہ کے معاملات کے متعلق باتیں کرنا تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑی شان سے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ایک ڈبہ ریزرو کروالیا تھا اور مجھے یہ حکم تھا کہ ایک خاص اسٹیشن سے کچھ دور تک ان کے ڈبے میں سفر کروں اور جب موقع ملے گفتگو کر لوں۔ چنانچہ میں مقررہ اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کے ساتھ مسٹر واچا اور مسٹر چمن لال سیتلواد تھے (جواب سر چمن لال کہلاتے ہیں) یہ تینوں آپس میں سیاسی معاملات پر گفتگو کر رہے تھے۔ سر فیروز شاہ نے دیکھتے ہی کہا ''بھئی گاندھی ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جو ریزولیشن تم چاہتے ہو اسے ہم ضرور پاس کرا دیں گے مگر ہمیں اپنے ہی **ملک** میں کون سے حقوق حاصل ہیں؟ میرے خیال میں جب تک ہمیں اپنے **ملک** میں قوت حاصل نہ ہو جائے ہماری نو

آبادیوں کی بھی ایسی ہی خراب حالت رہے گی جیسی ہماری ہے۔''

میں ہکا بکا رہ گیا مسٹر ستیلواد کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی تھی مسٹر واچا نے میری طرف رحم اور تعلق کی نظر سے دیکھا۔

میں نے سر فیروز شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بھلا میرا جیسا شخص بمبئی کے بے تاج بادشاہ سے کیا پیش پاتا میں نے اس کو غنیمت سمجھا کہ مجھے ریزولیشن پیش کرنے کی اجازت مل گئی۔

مسٹر واچا نے میری ہمت افزائی کے لیے کہا'' بھئی ریزولیشن مجھے ضرور دکھا لینا''

غرض یہ کلکتے پہنچ گئے صدر کو مجلس استقبالیہ کے اراکین بڑی دھوم دھام سے کیمپ میں لے گئے میں نے ایک رضا کار سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں وہ مجھے رپن کالج لے گیا جہاں بہت سے ڈیلیگیٹ ٹھہرے ہوئے تھے میری قسمت نے یاوری کی لوکمانیہ بھی اسی حصے میں ٹھہرائے گئے جس میں میں تھا مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ ایک دن بعد آئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جہاں لوکمانیہ ہوں وہاں ان کا دربار بھی ضرور ہوگا۔ اگر میں مصور ہوتا تو آج بھی ان کی تصویر اسی انداز میں کھینچ دیتا جس طرح میں نے انہیں بستر پر بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ منظر میری نظروں میں پھر رہا ہے۔ ان کے پاس بے شمار اشخاص ملنے کے لیے آئے مگر مجھے ان میں سے صرف ایک صاحب یعنی امرت بازار پتر کا اڈیٹر بابو موتی لال گھوش آنجہانی یاد ہیں۔ ان لوگوں کا ہنسنا بولنا، قہقہے لگانا اور حاکم قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرنا مجھے کبھی نہ بھولے گا۔

مگر اس کیمپ کے انتظام کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کروں گا رضا کار آپس میں

لڑتے جھگڑتے رہتے تھے آپ ایک شخص سے کسی کام کو کہیے، وہ دوسرے پر ٹال دیتا تھا۔ دوسرا تیسرے پر اور یہ سلسلہ یوں ہی چلا جاتا تھا۔ رہے ڈیلیگیٹ تو وہ کسی شمار میں نہ تھے۔

میں نے چند رضا کاروں سے ملاقات پیدا کی۔ جب میں نے انہیں جنوبی افریقہ کے قصے سنائے تو انہیں کسی قدر شرم آئی میں نے انہیں خدمت کا راز سمجھانا چاہا وہ سمجھ تو گئے مگر خدمت کوئی خودرو درخت تو نہیں کہ ہر زمین پر اگ آئے۔ اس کے لیے پہلی شرط خلوص نیت ہے اور دوسری تجربہ۔ ان نیک دل بھولے نوجوانوں میں خلوص کی کمی نہ تھی مگر تجربہ انہیں ذرہ برابر بھی نہ تھا۔ کانگریس سال میں تین دن اپنی بہار دکھا کر غفلت کی نیند سو جاتی تھی یہ جو سال میں تین دن تماشا سا ہو کر رہ جاتا تھا اس میں انہیں کیا تجربہ ہو سکتا تھا؟ اور ڈیلیگیٹوں کا بھی وہی حال تھا جو رضا کاروں کا یہ بھی اس سے زیادہ یا اس سے بہتر تجربہ نہیں رکھتے۔ وہ خود کوئی کام نہیں کرنا چاہتے تھے بس بیٹھے رضا کاروں کو حکم دیا کرتے تھے ''جاؤ یہ کام کرلاؤ، جاؤ وہ کام کر لاؤ۔''

یہاں بھی چھوت چھات کا خاصا تجربہ ہوا۔ تامل لوگوں کا باورچی خانہ اور باورچی خانوں سے دور تھا تامل ڈیلیگیٹ کھانا کھانے کے وقت دوسروں کی جھلک بھی دیکھ لیں تو چھوت ہو جاتی تھی۔ اس لیے ان کے واسطے کالج کے احاطے میں علیحدہ باورچی خانہ بنایا گیا اور اس کے آس پاس ٹٹیاں لگائی گئیں۔ اس میں دھوئیں کا یہ عالم تھا کہ دم گھٹتا تھا اسی لیے دروازے کے صندوق میں کھانا پکتا تھا، یہیں کھایا جاتا تھا اور یہیں برتن دھلتے تھے مجھے تو ورن دھرم 40 کی مسخ کی ہوئی صورت معلوم ہوتی تھی میں نے اپنے جی میں کہا جب کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کا یہ حال ہے تو جن

لوگوں کی یہ نمائندگی کرتے ہیں ان کا حال تو اور بھی بدتر ہوگا۔ یہ خیال کر کے میں نے ایک آہ سرد کھینچی اور دم بخود ہو گیا۔

غلاظت کی کوئی انتہا نہ تھی ہر جگہ پانی گڑھوں میں جمع رہتا تھا پاخانے بہت تھوڑے تھے اور ان میں بلا کا تعفن تھا کہ اس کے خیال سے اب بھی تکلیف ہوتی ہے میں نے رضا کاروں کی اس پر توجہ دلائی انہوں نے صاف کہہ دیا "یہ کام ہمارا نہیں بھنگی کا کام ہے" میں نے ایک شخص سے جھاڑو مانگی۔ وہ حیرت سے منہ تکنے لگا میں نے کہیں سے جھاڑ لا کر پاخانہ صاف کیا مگر اس سے صرف میرا کام چلا آدمی بہت تھے اور پاخانے تھوڑے اس لیے بار بار صاف کرنے کی ضرورت تھی مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی اس لیے مجھے اسی پر قناعت کرنا پڑی کہ اپنی فکر کر لوں اور دوسروں کو اس بدبو اور غلاظت کی کوئی پرواہ بھی نہ تھی۔

اس سے بھی بڑھ کر سنیئے بعض ڈیلیگیٹ رات کو بے تامل اپنے کمروں سے آگے برآمدے میں رفع حاجت کرتے تھے ایک روز صبح کو میں نے رضا کاروں کو غلیظ دکھایا۔ کوئی اسے صاف کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس لیے مجھے تنہا یہ عزت حاصل کرنا پڑی۔ اب حالت بہتر ہوگئی ہے مگر اب بھی بعض ایسے ناسمجھ ڈیلیگیٹ ہیں جو کانگریس کیمپ کے اندر جہاں جی چاہتا ہے رفع حاجت کر کے کیمپ کو غلیظ کرتے ہیں اور بہت کم رضا کار اسے صاف کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔

یہ حالت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر کانگریس کے اجلاس میں کچھ روز کی توسیع کر دی جائے تو وبا پھیلنے کا پورا پورا سامان ہو جاتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

محرر اور خدمت گار

ابھی کانگریس کا اجلاس شروع ہونے میں دو دن تھے میں نے پہلے سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی خدمات کانگریس کے دفتر کے لیے پیش کروں گا تاکہ کچھ تجربہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ کلکتے پہنچتے ہی میں نے ہاتھ منہ دھو کر سیدھا کانگریس کے دفتر میں پہنچا۔

بابو بھوپندر ناتھ اسو اور گھوشال بابو سیکرٹری تھے میں نے بھوپندر بابو کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کیں انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا ''میرے یہاں تو کوئی کام نہیں مگر ممکن ہے گوشال بابو آپ کو کوئی کام دیں مہربانی کر کے ان کے پاس جائیے۔''

میں ان کے پاس گیا انہوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور مسکرا کر کہا ''میں تمہیں صرف محرری کا کام دے سکتا ہوں تم کرو گے؟''

میں نے جواب دیا ''ضرور کروں گا میں اسی لیے آیا ہوں کہ جو کام بھی ملے اسے انجام دوں بشرطیکہ وہ میری قابلیت سے بڑھ کر نہ ہو۔''

انہوں نے کہا'' شاباش نوجوانوں میں یہی خلوص ہونا چاہیے۔'' ان رضا کاروں کو مخاطب کر کے جو ان کے گرد کھڑے تھے کہنے لگے ''سنتے ہو یہ جوان کیا کہہ رہے ہیں؟''

پھر میری طرف مڑ کر بولے ''لو یہ خطوط کا انبار ہے جن کا جواب دینا ہے اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور کام شروع کر دو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس سینکڑوں آدمی آتے ہیں۔ اب میں ان سے باتیں کروں یا ان دخل در معقولات دینے والوں کو جواب دوں جنہوں نے خطوط کے مارے میرے ناک میں دم کر رکھا ہے؟ میرے پاس کوئی

ایسے محرر نہیں جن کے سپرد یہ کام کرسکوں ۔ بہت سے خطوط میں کوئی کام کی بات نہیں مگر مہربانی کر کے ان پر ایک نظر ڈال لو ان میں سے جو جواب کے قابل ہوں ان کا جواب دے دو اور اگر کوئی خاص ہو تو مجھ سے دریافت کر لو‘‘

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انہوں نے مجھ پر اتنا اعتبار کیا۔

گوشال بابو نے جب مجھے یہ کام دیا اس وقت تک مجھ سے بالکل واقف نہیں تھے بہت دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے میرا نام و نشان پوچھا۔

مجھے اس خطوط کے انبار کو پڑھنے اور اس کا جواب دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی ۔ ذرا سی دیر میں میں نے یہ کام نپٹا دیا ۔ گوشال بابو بہت خوش ہوئے وہ بڑے باتونی آدمی تھے، گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے جب انہیں میرے حالات معلوم ہوئے تو افسوس کرنے لگے کہ میں نے تمہیں محرری کا کام دیا ۔ مگر میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا ۔

’’آپ کچھ تردد نہ کیجئے میری آپ کے آگے کیا حیثیت ہے؟ آپ کی عمر کانگریس کی خدمت میں گزری ہے اور آپ میرے بزرگ ہیں میں محض ایک نا تجربہ کار نوجوان ہوں، یہ کام میرے سپرد کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے کیونکہ مجھے کانگریس کے کام کا شوق ہے اور آپ کی بدولت مجھے یہ نادر موقع ملا ہے کہ اس کام کی جزیات کو سمجھ لوں ۔‘‘

گوشال بابو نے کہا ’’شاباش ‘‘قومی کام کرنے والوں کا یہی خیال ہونا چاہیے مگر آج کل کے نوجوانوں کو اس کا احساس نہیں ہے، بے شک میں کانگریس کو اس وقت سے جانتا ہوں جب سے یہ قائم ہوئی بلکہ سچ پوچھو تو میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس کے قائم کرنے میں میں بھی مسٹر ہیوم کے ساتھ شریک تھا۔

اس طرح ہم دونوں میں خاصی دوستی ہوگئی۔ وہ بڑے اصرار سے مجھے دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

گوشال بابو کی قمیض کے بٹن ان کا خدمت گار لگایا کرتا تھا۔ میں نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور مجھے اس میں بڑی خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہمیشہ سے بزرگوں کی بڑی عزت کیا کرتا تھا جب انہیں یہ معلوم ہوا تو وہ اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے کام مجھ سے لینے لگے جب میں ان کی قمیض کے بٹن لگاتا تو وہ کہتے جاتے دیکھتے ہو کانگریس کے سیکرٹری کو اپنی قمیض میں بٹن لگانے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام رہتا ہے۔

گوشال بابو کے بھولے پن پر مجھے ہنسی آتی ہے لیکن اس سے میری خدمت کے شوق میں کمی نہیں ہوتی ان کی خدمت سے مجھے اتنا فائدہ پہنچا جس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔

چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح واقف ہوگیا مجھے اکثر لیڈروں سے ملنے اور گوکھلے اور سریندر ناتھ جیسے شیر مردوں کے طرز عمل کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اس بات پر غور کیا کہ یہاں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ہمارا سارا کاروبار انگریزی میں ہوتا ہے قوت عمل کو کفایت کے ساتھ خرچ کرنے کا کسی کو خیال تک نہ تھا۔ کہیں ایک شخص کا کام کئی آدمی کرتے تھے اور کہیں ضروری کام اس لیے رہ جاتے تھے کہ کوئی کام کرنے والا نہ تھا۔

گو میں ان چیزوں کو تنقیدی نظر سے دیکھتا تھا مگر میری طبیعت میں اتنی رواداری تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ شاید موجودہ حالت میں اس سے بہتر کام نہیں ہوسکتا اور اسی وجہ سے میں نے کسی کام کی بے قدری نہیں کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کانگریس میں

خدا خدا کر کے میں کانگریس پہنچا۔ اس دل بادل خیمے کو، رضا کاروں کی شاندار صفوں وک اور ڈائس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں میں دل میں کہتا تھا کہ اس عظیم الشان اجتماع میں مجھے کون پوچھے گا۔

خطبہ صدارت ایک مستقل کتاب تھی۔ اسے اول سے آخر تک پڑھنا بالکل نا ممکن تھا، اس لیے صرف اس کے چند حصے پڑے گئے۔

اس کے بعد سبجیکٹس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہوا گوکھلے مجھے کمیٹی کے جلسوں میں لے جایا کرتے تھے۔

سر فیروز شاہ نے میرے ریزولوشن کو پیش کرانے کا وعدہ کرلیا تھا۔ مگر میں اس فکر میں تھا کہ دیکھوں یہ سبجیکٹس کمیٹی میں کب پیش ہوتا ہے اور کون پیش کرتا ہے کیونکہ ہر ریزولوشن کے ساتھ طویل طویل تقریریں ہوتی تھیں اور وہ بھی انگریزی میں اور ہر ریزولیوشن کی تائید کوئی مشہور لیڈر کرتا تھا اس نقار خانے میں بھلا میرے طوطی جیسی آواز کو کون سنتا۔ جب میں نے دیکھا کہ رات ہونے آئی اور وہ ریزولوشن اب تک پیش نہیں ہوا تو میرا دل دھڑ کنے لگا جہاں تک مجھے یاد ہے آخری ریزولوشن بہت جلدی جلدی نپٹائے جا رہے تھے۔ اب گیارہ بج چکے تھے میں گوکھلے سے مل کر ان کو اپنا ریزولیوشن دکھا چکا تھا اس لیے میں نے ان کی کرسی کے پاس جا کر ان کے کان میں کہا ''مہربانی کر کے میرے معاملے میں کچھ کیجئے'' انہوں نے کہا ''میں تمہارے ریزولوشن کو بھولا نہیں ہوں تم دیکھتے ہو کتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے دم لینے کی فرصت

نہیں مگر میں اس کا خیال رکھوں گا کہ تمہارا ریزولوشن نظر انداز نہ ہونے پائے''

اتنے میں سر فیروز شاہ مہتا نے کہا ''اب تو سب ریزولوشن ہو گئے''

گھو کھلے چلا اٹھے ''نہیں نہیں ابھی جنوبی افریقہ والا ریزولوشن باقی ہے مسٹر گاندھی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔''

سر فیروز شاہ نے پوچھا ''آپ نے وہ ریزولوشن دیکھا ہے''

''جی ہاں، دیکھا ہے۔''

''آپ کو پسند ہے''

''ہاں اچھا خاصا ہے''

''اچھا گاندھی اپنا رزولیوشن پڑھ کر سناؤ۔''

میں نے کانپتے ہوئے وہ ریزولیوشن پڑھا

گوکھلے نے اس کی تائید کی

سب چلا اٹھے ''بالاتفاق منظور''

مسٹر واچا نے کہا '' گاندھی تمہیں اس پر تقریر کرنے کے لیے پانچ منٹ ملیں گے۔''

مجھے اس کارروائی سے بالکل خوشی نہیں ہوئی کسی شخص نے ریزولوشن کو سمجھنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہر شخص کو جانے کی بہت جلدی تھی اور چونکہ گوکھلے اس ریزولوشن کو دیکھ چکے تھے اس لیے یہ ضروری نہیں خیال کیا گیا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں یا سمجھیں۔

صبح اٹھ کر میں اپنی تقریر کی فکر میں الجھ گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ پانچ منٹ میں کیا کہہ سکوں گا۔ میں نے اچھی طرح تیاری کر لی تھی مگر اس وقت مناسب الفاظ

سمجھ میں نہیں آتے تھے میں یہ طے کر چکا تھا کہ اپنی اسپیچ پہلے سے نہیں لکھوں گا۔ بلکہ وقت کے وقت تقریر کروں گا جنوبی افریقہ میں روانی سے تقریر کرنے کی مشق ہو گئی تھی وہ اس وقت کام آئی۔

جیسے ہی میرے ریزلوشن کا وقت آیا مسٹر واچا نے میرا نام لے کر پکارا، میں کھڑا ہو گیا میرے سر میں چکر آرہے تھے۔ کسی شخص نے ایک نظم چھپوا کر ڈیلیگیٹوں میں تقسیم کی تھی۔ جس میں غیر ملکوں میں جا کر رہنے کی تعریف کی تھی میں نے یہ نظم پڑھی اور اسی سلسلہ میں ان مصیبتوں کا ذکر کرنے لگا جو نوآباد ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں اٹھانا پڑتی ہیں عین اس وقت مسٹر واچا نے گھنٹی بجائی مجھے یقین تھا کہ ابھی پانچ منٹ نہیں ہوئے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس گھنٹی سے اطلاع دینا مقصود ہے کہ دو منٹ میں تقریر ختم کر دو میں نے دوسروں کو تیس تیس بلکہ پینتالیس پینتالیس منٹ تقریر کرتے سنا تھا اور ان کے لیے کبھی گھنٹی نہ بجائی گئی تھی مجھے یہ بہت ناگوار ہوا اور میں گھنٹی بجتے ہی بیٹھ گیا۔ میرا یہ طفلانہ خیال تھا کہ یہ نظم سر فیروز شاہ کی بے توجہی کا کافی جواب ہے۔ ریزلوشن کے پاس ہونے میں تو کوئی شک ہی نہ تھا۔ ان دنوں وزیٹروں اور ڈیلیگیٹوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا ہر شخص ہاتھ اٹھا دیتا تھا اور سب ریزولوشن بالاتفاق پاس ہوتے تھے میرے ریزولوشن کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس لیے میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ مگر میرے لیے کچھ کم خوشی کی بات نہ تھی کہ اسے کانگریس نے پاس کر دیا اور مجھ پر کیا موقوف ہے جس کو یہ علم ہوتا کہ کانگریس کی تائید گویا سارے ملک کی تائید ہے وہی اس بات پر خوش ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

لارڈ کرزن کا دربار

کانگریس ختم ہوگئی مجھے جنوبی افریقہ کے کام کے سلسلے میں ایوان تجارت کے ممبروں اور کچھ اور لوگوں سے ملنا تھا اس لیے میں کلکتہ میں ایک مہینہ اور ٹھہر گیا۔ اس بار میں نے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند نہیں کیا بلکہ بعض دوستوں نے انڈیا کلب کے منتظموں سے میرا تعارف کرادیا۔ اور مجھے وہاں ایک کمرہ مل گیا۔ اس کے ممبر بعض ممتاز ہندوستانی تھے اور میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں سے مل کر انہیں جنوبی افریقہ کے معاملات کی طرف توجہ دلاؤں۔ گوکھلے اکثر اس کلب میں انٹا کھیلنے جایا کرتے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ابھی کچھ دن کلکتے میں رہوں گا تو انہوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میرے ساتھ آ کر ٹھہرو میں نے اس دعوت کو شکریے کے ساتھ قبول کرلیا مجھے بغیر ان کے دربار بلائے وہاں جانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ انہوں نے دو ایک دن انتظار کیا اس کے بعد خود آ کر مجھے لے گئے۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ میری طبیعت دیر آشنا ہے اور انہوں نے مجھ سے کہا ”گاندھی! تمہیں اس ملک میں رہنا ہے ایسی دیر آشنائی سے کام نہیں چلے گا تمہیں تو چاہیے جتنے زیادہ لوگوں سے ممکن ہو میل جول پیدا کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کانگریس کا کام کرو۔“

گوکھلے کی صحبت کا ذکر کرنے سے پہلے میں انڈیا کلب کا ایک واقعہ بیان کرونگا۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن نے دربار منعقد کیا بعض راجا مہاراجا جو دربار میں بلائے گئے تھے کلب کے ممبر تھے کلب میں میں نے انہیں ہمیشہ بنگالی دھوتی باندھے، قمیض پہنے اور گلے میں چادر ڈالے دیکھا تھا۔ دربار کے دن کیا دیکھتا ہوں

کہ دھوتی کی جگہ پتلون ہے جیسی خانساماں پہنتے ہیں اور پیر میں چمکدار بوٹ ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا کہ آپ نے اپنی وضع کیوں تبدیل کی؟

انہوں نے جواب دیا ''ہم جس شامت میں مبتلا ہیں اسے ہم ہی جانتے ہیں ۔ کسی کو کیا خبر کہ ہمیں دولت اور خطاب کی خاطر کیا کیا ذلتیں اٹھانا پڑتی ہیں ۔''

میں نے پوچھا ''مگر یہ خانساماؤں جیسی پگڑی باندھنے اور چمکدار بوٹ پہننے کا کیا سبب ہے؟''

انہوں نے کہا ''ہم میں اور خانساماؤں میں فرق ہی کیا ہے ، وہ ہمارے ''خانساماں'' ہیں اور ہم لارڈ کرزن کے ''خانساماں'' ہیں اگر میں دربار نہ جاؤں تو آفت آ جائے ۔ اگر اپنے معمولی کپڑے پہن کر جاؤں تو مجرم ٹھہرایا جاؤں اور کیا آپ کے خیال میں وہاں مجھے لارڈ کرزن سے گفتگو کرنے کا موقع ملے گا؟ اجی توبہ کیجئے؟''

مجھے ان صاف گو دوست پر بڑا رحم آیا

اسی سلسلے میں مجھے اور دربار یاد آ گیا ۔

جب لارڈ ہارڈنگ نے ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تو ایک دربار منعقد کیا گیا اور ظاہر ہے کہ وہاں راجا مہاراجا ہی بلائے گئے تھے مگر پنڈت مالوی جی نے مجھے بھی بڑے اصرار سے دعوت دی چنانچہ میں بھی گیا ۔

مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ سب مہاراجے عورتوں کی طرح بن ٹھن کر آئے ہیں ۔ یہ لوگ ریشمی پاجامے اور ریشمی اچکنیں پہنے تھے ۔ ان کے گلے میں موتیوں کے مالے تھے ہاتھوں میں کنگن تھے پگڑیوں میں زرتار طرے اور کمر میں تلواریں جن

کے قبضے سونے کے تھے۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ نشانیاں ان کی بادشاہی کی نہیں ان کی غلامی کی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے یہ نامردی کے طوق اپنی خوشی سے گلے میں ڈالے ہوں گے مگر معلوم ہوا کہ راجاؤں کے لیے لازمی ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنے سارے زیور اور ہیرے موتی لاد کر آئیں میں نے یہ بھی سنا کہ ان میں سے بعض ان چیزوں کے پہننے کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں اور سوائے دربار وغیرہ کے کہیں بھی پہنتے۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے مگر چاہے وہ اور موقعوں پر یہ چیزیں پہنتے ہوں یا نہ پہنتے ہوں یہی کیا کم قابل افسوس ہے کہ انہیں وائسرائے کے دربار میں ایسے زیور پہن کر آنا پڑے جو صرف بعض مخصوص عورتیں پہنتی ہیں۔

دولت، قوت اور عزت کی خاطر انسان کو کن کن ذلتوں اور گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

☆☆☆☆

ایک مہینہ گوکھلے کی صحبت میں (1)

میں گوکھلے کے یہاں جا کر رہا تو وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ میں پہلے ہی دن سے بے تکلف ہو گیا وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے ہوتی ہے وہ مجھ سے میری ضروریات معلوم کر کے ایک ایک کی فراہمی کا اہتمام کرتے تھے۔ اتنا اچھا تھا کہ میری ضروریات بہت کم تھیں اور چونکہ میں نے اپنی مدد آپ کی عادت ڈالی تھی اس لیے مجھے نوکر کی حاجت بھی بہت کم ہوتی تھی ان پر اس بات کا کہ میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں اور میری صفائی یا ضابطگی اور استقلال کا بڑا اثر ہوا اور وہ اکثر میری تعریفیں کر کے مجھے شرمندہ کر دیتے تھے۔

وہ مجھ سے کوئی بات نہ چھپاتے تھے مجھے ان سب بڑے آدمیوں سے جو ان کے پاس آیا کرتے تھے، ملاتے تھے۔ ان لوگوں میں سے ڈاکٹر پی سی رائے (جواب سر پی سی رائے کہلاتے ہیں) کی تصویر میرے حافظے میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ بہت قریب رہتے تھے اور اکثر آیا جایا کرتے تھے۔

انہوں نے ڈاکٹر رائے کو مجھ سے یہ کہہ کر ملایا ''یہ پروفیسر رائے ہیں جو آٹھ سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں سے چالیس روپیہ خود لیتے ہیں اور باقی قومی کاموں میں صرف کر دیتے ہیں شادی انہوں نے نہ کی ہے نہ کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے ڈاکٹر رائے کو اس وقت بھی قریب قریب ویسا ہی دیکھا تھا جیسا اب دیکھتا ہوں ان کے لباس میں وہی سادگی تھی جواب ہے فقط اتنا فرق ہوا ہے کہ اس زمانے میں وہ ہندوستانی ملوں کا کپڑا پہنتے تھے اور اب کھادی پہنتے ہیں۔ گوکھلے اور

ڈاکٹر رائے کی گفتگو سننے سے میرا جی کبھی نہیں بھرتا تھا کیونکہ یہ گفتگو قومی مفاد کے متعلق ہوتی تھی یا دوسری حیثیتوں سے تعلیمی اہمیت رکھتی تھی کبھی کبھی ان دونوں کی باتیں سن کر تکلیف بھی ہوتی تھی کیونکہ وہ قومی لیڈروں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ جنہیں میں شیر سمجھتا تھا اب بھیڑ نظر آنے لگے۔

گوکھلے کو کام کرتے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی تھی اور تعلیمی فائدہ بھی پہنچتا تھا۔وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ان کے ذاتی تعلقات اور ان کی دوستی بھی قومی مفاد کے لیے ہوتی تھی ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ ملک کی بھلائی ہوتی تھی اور اس میں مبالغے یا بناوٹ کا نام بھی نہ تھا۔وہ ہمیشہ ہندوستان کی غلامی اور افلاس کے رنج میں گھلا کرتے تھے۔اس کے سوا انہیں کوئی فکر نہ تھی مختلف لوگ انہیں مختلف کاموں میں کھینچنا چاہتے تھے مگر وہ سب کو یہی جواب دیتے تھے ''یہ آپ خود ہی کیجئے مجھے میرا کام کرنے دیجئے مجھے تو ملک کو آزاد کرانے کی دھن ہے، آزادی مل جائے تو پھر اور کاموں کی طرف توجہ کرنے کا وقت آئے گا۔یہی کام اتنا بڑا ہے کہ میرا سارا وقت اور ساری قوت اس میں کھپ جاتی ہے۔''

انہیں راناڈے سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار ہر لحظہ ان کے قول اور عمل سے ہوتا تھا میری ان کی یکجائی کے زمانے میں ایک بار راناڈے کی ولادت کا یا شاید وفات کا دن آیا۔گوکھلے ان دونوں دنوں کی یادگار مناتے تھے۔اس روز ان کے ساتھ میرے علاوہ پروفیسر کٹھوآٹے اور ایک سب جج بھی تھے۔انہوں نے ہم لوگوں کو بھی اس رسم میں شریک کیا اور ایک تقریر کی جس میں راناڈے کے بہت سے قصے سنائے۔دوران تقریر وہ ضمناً راناڈے، تیلانگ اور سنڈلک میں باہم مقابلہ کرنے لگے۔انہوں نے کہا تیلانگ کا دلکش اسلوب اور منڈلک کا اصلاحی جوش قابل تعریف

ہے۔ منڈ لک کو اپنے موکلوں کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ ایک بار انہیں ایک مقدمے میں باہر جانا تھا اور گاڑی چھوٹ گئی تو انہوں نے ایک سپیشل ٹرین کرائے پر لی تا کہ عدالت میں وقت پر پہنچیں اور ان کے موکل کا حرج نہ ہو مگر رانا ڈے ان سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کا ذہن ہمہ گیر تھا وہ صرف ایک قابل جج ہی نہیں تھے بلکہ مورخ، ماہر اقتصادیات اور مصلح کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ باوجود جج ہونے کے وہ کانگریس میں شریک ہوتے تھے اور سب لوگوں کو ان کی دانشمندی پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ان کے فیصلوں کو بے چوں وچرا تسلیم کر لیتے تھے۔ گوکھلے ان ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے جو ان کے گرد کی ذات میں جمع تھیں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

اس زمانے میں گوکھلے کے پاس ایک گھوڑا گاڑی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ بعض وجوہ سے وہ گھوڑا گاڑی رکھنے پر مجبور ہیں اس لیے میں نے ان سے شکایت کے طور پر کہا ’’آپ ٹرام میں کیوں نہیں جایا کرتے؟ کیا یہ لیڈری کی شان کے خلاف ہے؟‘‘

انہیں اس سے کسی قدر تکلیف ہوئی اور انہوں نے کہا ’’تمہیں بھی میری نیت کا اندازہ نہیں ہو سکا! مجھے کونسل سے جو الاؤنس ملتا ہے اسے میں اپنی ذاتی آسائش پر صرف نہیں کرتا۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ تم آزادی سے ٹرام میں بیٹھ سکتے ہو۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ جب تم میری طرح شہرت کی بلا میں گرفتار ہو گئے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ٹرام میں آنا جانا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ تم نے خواہ مخواہ یہ کیوں سمجھ لیا کہ لیڈر جو کچھ کرتے ہیں اپنے آرام کے لیے کرتے ہیں۔ مجھے تمہاری سادگی بہت پسند ہے میں اپنے امکان بھر سادگی سے رہتا ہوں مگر میرے جیسے شخص کے لیے

کچھ نہ کچھ مصارف ضرور ہیں۔‘‘

اس معاملے میں انہوں نے مجھے مکمل طور پر مطمئن کر دیا مگر مجھے ایک اور شکایت تھی جس کا وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔

’’لیکن آپ ٹہلنے بھی تو نہیں جاتے۔اسی وجہ سے آپ کی صحت خراب رہتی ہے کیا قومی کام میں یہ بھی شرط ہے کہ ورزش کا وقت نہ ملے؟‘‘

انہوں نے کہا تم دیکھتے ہو مجھے کبھی اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ٹہلنے جاؤں؟

میرے دل میں گوکھلے کا احترام اس قدر تھا کہ میں کبھی ان سے محبت نہیں کرتا تھا۔اگر چہ اس جواب میں میرا اطمینان نہیں ہوا مگر میں چپ ہو رہا۔میرا اس وقت بھی یہی خیال تھا اور اب بھی ہے کہ خواہ انسان کو کتنا ہی کام کرنا وہ اسے ورزش کے لیے بھی اسی طرح وقت نکالنا چاہیے جیسے کھانے کے لیے نکالتا ہے۔میری ناقص رائے ہے کہ اس سے مجموعی کام کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

ایک مہینہ گوکھلے کی صحبت میں (2)

گوکھلے کے ساتھ قیام کے زمانے میں گھر پر بہت رہتا تھا۔

میں نے جنوبی افریقہ میں اپنے عیسائی دوستوں سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان کے عیسائی بھائیوں سے ملوں گا اوران کی حالت کا مشاہدہ کروں گا۔ میں نے بابو کالیچرن بزجی کا نام سنا تھا اوران کا بہت احترام کرتا تھا وہ کانگریس میں بہت پیش پیش تھے اور مجھے ان کی طرف سے وہ شکوک نہ تھے جو عام عیسائیوں کی طرف سے۔ ان کے کانگریس میں شریک نہ ہونے اور ہندو مسلمانوں سے الگ رہنے کی وجہ سے تھے۔ جب میں نے گوکھلے کے سامنے ان سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے کہا ''ان سے مل کر کیا کرو گے؟ اس میں شک نہیں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں مگر مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم ان سے مل کر مطمئن نہ ہوگے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ پھر بھی تمہارا جی ان سے ملنے کو چاہتا ہے تو ضرور ملو۔''

میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جسے انہوں نے فوراً منظور کرلیا جب میں ان کے یہاں گیا تو دیکھا کہ ان کی بیوی بستر مرگ پر ہیں ان کا گھر بار بالکل سیدھا سادھا ہے کانگریس میں میں نے انہیں کوٹ پتلون پہنے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ قمیض پہنے اور بنگالی دھوتی باندھے ہیں گو میں خود اس زمانے میں کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ مگر مجھے ان کی سادگی بہت پسند آئی میں نے بغیر کسی تمہید کے اپنی مشکلات ان کے سامنے بیان کردیں۔ انہوں نے پوچھا۔

''آپ گناہ آدم کے مسئلے کو مانتے ہیں یا نہیں''

میں نے کہا ’’میں مانتا ہوں‘‘

وہ کہنے لگے ’’بس تو پھر معاملہ صاف ہے، ہندو دھرم میں اس گناہ کے عذاب سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ عیسائیت میں موجود ہے گناہ کی جزا ہلاکت ہے اور انجیل کہتی ہے کہ نجات کی صرف ایک صورت ہے مسیح پر ایمان لانا‘‘

میں نے ’’بھگوت گیتا‘‘ کی ’’بھگتی مرگ‘‘ کا ذکر کیا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی میں نے ان کی عنایت کا شکریہ ادا کیا وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ مگر ان کی گفتگو سے مجھے کچھ فائدہ ضرور پہنچا۔

ان دنوں میں کلکتے کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اکثر مقامات پر پیدل جایا کرتا تھا میں جسٹس مترا اور گرو داس بز جی سے ملا جن سے میں جنوبی افریقہ کے کام میں مدد لینا چاہتا تھا اسی زمانے میں مجھے راجا سر پیارے موہن مکر جی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

کالی چرن بز جی نے مجھ سے کالی مندر کا ذکر کیا تھا اور مجھے پہلے سے بھی اس کے دیکھنے کا شوق تھا۔ کیونکہ میں نے کتابوں میں ان کا ذکر اکثر پڑھا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس مندر میں پہنچا۔ جسٹس مترا کا گھر بھی اسی محلے میں تھا۔ اس لیے جس دن میں ان سے ملنے گیا اسی دن مندر چلا گیا۔ راہ میں بھیڑوں کا گلہ نظر آیا جو گالی پر بلدان کی جانے والی تھیں۔ مندر کی گلی میں فقیروں کی قطار تھی جن میں سادھو بھی تھے میں ان دنوں بھی ہٹے کٹے فقیروں کے بھیک دینے کا مخالف تھا۔ ان کا ایک غول میرے پیچھے لگ گیا۔ اسی شکل کا ایک شخص غلام گردش میں بیٹھا نظر آیا۔ اس نے مجھے روک کر کہا ’’بچہ کہاں جاتا ہے؟‘‘ ’’میں نے کہا ’’مندر دیکھنے جاتا ہوں۔‘‘

اس نے مجھ سے اور میرے ساتھی سے بیٹھنے کو کہا چنانچہ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں

نے اس سے پوچھا ''آپ اس بلدان کو دھرم کے مطابق سمجھتے ہیں؟''

''کون شخص جانوروں کی جان لینے کو دھرم سمجھے گا؟''

''پھر آپ اس کے خلاف ایڈیشن کیوں نہیں دیتے''

''یہ ہمارا کام نہیں ہمارا کام بھگتی کرنا ہے۔''

''مگر آپ کو بھگتی کرنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ملتی۔''

''ہمارے لیے ہر جگہ یکساں ہے۔ دنیا کے لوگ بھیڑ کے گلے کی طرح ہیں۔ جدھر ان کے رکھوالے جائیں چلے جاتے ہیں۔ ہم سادھوؤں کو اس سے کیا؟''

ہم نے زیادہ بحث نہیں کی بلکہ آگے بڑھے۔ مندر کے قریب خون کے نالوں نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھ سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔ مجھے بڑے جھلاہٹ اور بے چینی تھی وہ منظر آج تک میرے دل سے محو نہیں ہو سکا۔

اسی رات کو مجھے چند بنگالی دوستوں کی طرف سے کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہاں میں نے ایک دوست سے اس وحشیانہ طریقہ عبادت کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا ''بھیڑوں کو کچھ محسوس تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ شور وغل سے اور ڈھولک کی آواز سے الم کی حس جاتی رہتی ہے۔''

مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا اور میں نے ان سے کہا کہ ''اگر بھیڑوں کی زبان ہوتی تو وہ کچھ اور داستان سناتیں'' میں نے محسوس کیا کہ اس ظالمانہ رسم کو موقوف کرنا ضروری ہے۔ مجھے گوتم بدھ کا قصہ یاد آ گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔

میری آج بھی وہی رائے ہے جو اس زمانے میں تھی۔ میرے نزدیک ایک میمنے کی زندگی انسان کی زندگی سے کم قیمتی نہیں ہے۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ انسان کے جسم

کی خاطر ایک میمنے کی جان لی جائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کمزور جانور اتنا ہی اس کا مستحق ہے کہ انسان کے ظلم سے بچایا جائے۔ لیکن جو شخص اس خدمت کا اہل نہیں وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ میں ابھی اور تزکیہ نفس اور قربانی کروں تب جا کر ہی امید کی جا سکتی ہے کہ میں ان میمنوں کو اس ناپاک بلدان سے بچا سکوں گا میرا خیال ہے کہ میں اس تزکیہ نفس اور قربانی کی آرزو میں گھل گھل کر مر جاؤں گا۔ میں ہمیشہ خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ دنیا میں کوئی نفس قدسی خواہ وہ مرد ہو یا عورت ایسا پیدا ہو جس کا دل ابدی رحم سے معمور ہو جو ہمیں اس شرمناک گناہ سے نجات دے بے چارے معصوم جانوروں کی جان بچائے اور مندر کو اس آلودگی سے پاک کر دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنگال والے باوجود اس علم، ذہانت، قربانی اور زود حسی کے اس خونریزی کو کیونکر برداشت کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

ایک مہینہ گوکھلے کی صحبت میں (3)

اس خوفناک بھینٹ کو دیکھ کر جو دھرم کے نام سے کالی پر چڑھائی جاتی ہے مجھے اور بھی شوق پیدا ہوا کہ بنگالیوں کی زندگی کا مشاہدہ کروں۔ میں نے برہمو سماج کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ میں پرتاپ چندر موزمدار کی زندگی کے حالات سے واقف تھا۔ بعض جلسوں میں ان کی تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ میں نے ان کی کیشب چندر سین کی سوان عمری بہم پہنچائی اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا۔ اسے پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ سدھروں برہمو سماج اور ادی برہمو سماج میں کیا فرق ہے۔ میں پنڈت شیو ناتھ شاستری سے ملا اور پروفیسر کٹھوٹے کے ساتھ مہارشی دیویندر ناتھ ٹگور کی زیارت کے لیے گیا۔ لیکن وہ اس زمانے میں کسی سے نہیں ملتے تھے اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر ان کے گھر برہمو سماج کا ایک جلسہ ہوا جس میں ہم دونوں بلائے گئے یہاں بہترین بنگالی گانا سننے میں آیا۔ اس دن سے مجھے بنگالی گانے کا بڑا شوق ہو گیا ہے۔

برہمو سماج کے دیکھنے کے بعد سوامی دیو آنند کو دیکھے بغیر چین نہیں آ سکتا تھا اس لیے میں بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ بیلور روانہ ہوا اور دور تک یا شاید سارے رستے پیدل گیا۔ مجھے یہ جگہ جو دنیا کے شور و شر سے الگ تھی بہت پسند آئی مگر جب وہاں یہ سنا کہ سوامی جی اپنے کلکتہ والے مکان میں بیمار پڑے ہیں اور کسی سے مل نہیں سکتے تو بہت افسوس اور مایوسی ہوئی۔

پھر میں نے بھگتی لیو دتیا کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور چورنگی کے ایک عالیشان مکان

میں ان سے ملا۔ ان کی شان وشوکت کو میں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور گفتگو میں بھی میری ان کی میزان نہ پٹی۔ میں نے گوکھلے سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا اس سیماب وش خاتون سے تمہارا دل نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مجھے ان سے ایک بار پشتو نجی بادشاہ کے یہاں پھر ملاقات ہوئی۔ جب میں پہنچا تو وہ پستون جی کی بوڑھی ماں سے باتیں کر رہی تھیں اور میں نے ان کی ترجمانی کی خدمت انجام دی گو مجھ میں اور ان میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا مگر میں نے دیکھا کہ ان کا دل ہندو دھرم کی محبت سے معمور ہے اور مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی ان کی کتابوں کا مطالعہ میں نے بعد میں کیا۔

میں دن کا کچھ حصہ کلکتے کے سر برآوردہ لوگوں سے مل کر جنوبی افریقہ کے متعلق گفتگو کرنے میں صرف کرتا تھا اور باقی وقت شہر کے مذہبی اور قومی اداروں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ میں نے ایک جلسے میں جس کے صدر ڈاکٹر ملک تھے ''جنگ بوئر میں ہندوستانی ایمبولینس کور کی خدمات'' پر تقریر کی۔ اس موقع پر بھی انگلش مین کے ایڈیٹر کی ملاقات میرے کام آئی مسٹر سانڈرس اس زمانے میں علیل تھے پھر بھی انہوں نے مجھے اتنی ہی مدد دی جتنی 1896ء میں دی تھی۔ گوکھلے کو میری یہ تقریر پسند آئی جب انہوں نے ڈاکٹر رائے کو اس کی تعریف کرتے سنا تو انہیں بڑی خوشی ہوئی۔

غرض گوکھلے کے ساتھ ٹھہرنے کی بدولت مجھے کلکتہ میں اپنا کام کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور بنگال کے ممتاز خاندانوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا اسی لیے ان تعلقات کی بنیاد پڑی جو میرے اور اہل بنگال کے ہیں۔

جگہ کی کمی کے سبب سے میں اس یادگار مہینے کے بہت سے واقعات نظر انداز کرتا

ہوں صرف برما کے سفر کا ذکر کروں گا کلکتہ سے میں چند دن کے لیے برما گیا اور وہاں کے پھوگیتوں سے ملا مجھے ان کا کاہلی دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے سنہری مندر کی بھی زیارت کی مجھے وہاں بے شمار چھوٹی چھوٹی قندیلوں کا بلنا پسند نہ آیا اور اس مقدس گھر میں چوہوں کی کثرت کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جو سوامی دیانند کو موز کی میں پیش آیا تھا۔ بری عورتوں کی آزادی اور مستعدی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور مردوں کی آرام طلبی نے اس خوشی پر پانی پھیر دیا۔ ان چند دنوں کے قیام میں مجھے یہ بات محسوس ہوئی کہ جیسے بمبئی ہندوستان نہیں ہے اسی طرح رنگون بھی برما نہیں ہے اور جیسے ہم ہندوستانی انگریزوں کے کمیشن ایجنٹ بن گئے ہیں اسی طرح ہم نے برما میں انگریز تاجروں سے مل کر برہموں کو اپنا کمیشن ایجنٹ بنالیا ہے۔

برما سے لوٹ کر میں گوکھلے سے رخصت ہو گیا۔ ان سے جدا ہونا مجھ پر بہت شاق تھا مگر چونکہ اب بنگال میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کلکتہ میں میرا کوئی کام نہیں رہا تھا اس لیے یہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

میرا یہ ارادہ تھا کہ کسی جگہ مستقل قیام کرنے سے پہلے تیسرے درجے میں ہندوستان کا سفر کروں اور یہ معلوم کروں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ میں نے گوکھلے سے اس کا تذکرہ کیا۔ پہلے تو انہوں نے اس خیال کا مضحکہ اڑایا۔ جب میں نے اپنی تجویز تفصیل سے بیان کی تو انہوں نے بڑی خوشی سے اس کی تائید کی اس زمانے میں مسز بینٹ بنارس میں بیمار تھیں میں نے سوچا کہ سب سے پہلے وہاں جا کر ان کے درشن کرلوں۔

تیسرے درجے کے سفر کے لیے نیا سامان مہیا کرنا ضروری تھا گوکھلے نے اپنے پاس سے مجھے ایک پیتل کا ناشتہ دان اور اس میں پوریاں اور لڈو بھروا دیئے۔ میں

نے ایک کرمچ کا تھیلا بارہ کرنے میں خریدا اور چھاپا کے 41ء اونی کپڑے کا ایک لمبا سا اونی کوٹ بنوایا تھیلا اس لیے تھا کہ اس میں یہ کوٹ، ایک دھوتی ایک تولیا اور ایک قمیض رکھ لوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک کمبل اور لوٹا بھی تھا۔ اس ساز و سامان سے میں نے اپنا سفر شروع کیا گوکھلے اور ڈاکٹر رائے مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ میں نے ان دونوں سے درخواست کی کہ یہ زحمت نہ اٹھائیں مگر وہ نہ مانے۔ گوکھلے نے کہا ''اگر تم اول درجے میں جاتے تو میں نہ چلتا مگر اب ضرور چلوں گا'' گوکھلے کو کسی نے پلیٹ فارم پر جانے سے نہیں روکا۔ وہ ریشمی پگڑی اور دھوتی باندھے اور کوٹ پہنے تھے۔ ڈاکٹر رائے بنگالی وضع میں تھے انہیں ٹکٹ کلکٹر نے ٹوکا مگر گوکھلے نے کہا کہ یہ میرے دوست ہیں تو انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

غرض ان دونوں کی دعائیں لے کر میں روانہ ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بنارس میں

مجھے کلکتہ سے راجکوٹ جانا تھا اور راستے میں میں بنارس، آگرہ، جے پور اور پالن پور ٹھہرنے کا مقصد تھا اور مقامات پر بھی ٹھہرنا۔ مگر اتنا وقت نہ تھا ہر شہر میں میں نے ایک ایک دن قیام کیا اور سوائے پالن پور کے سب کہیں معمولی جاتریوں کی طرح دھرم سالوں میں یا پنڈتوں کے یہاں مہمان رہا۔ اس سارے سفر میں (مع ریل کے کرائے کے) اکتیس روپے سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔

اس تیسرے درجے کے سفر میں میں نے اکثر پسنجر میں جانے کو ڈاک گاڑی میں جانے پر ترجیح دی۔ کیونکہ ڈاک میں ایک تو مسافروں کی بہت کثرت ہوتی تھی دوسرے کرایہ کسی قدر زیادہ تھا۔

اب بھی تیسرے درجے کی گاڑی اتنی ہی میلی ہیں اور پاخانہ کا انتظام اتنا ہی خراب ہے جتنا اس زمانے میں تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ تھوڑی سی ترقی ہوئی ہو، لیکن اب بھی اول درجے اور تیسرے درجے میں جتنا فرق ہے وہ کرائے کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ تیسرے درجے کے مسافروں سے بھیڑوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے اور ان کے ڈبے بھی بھیڑوں کے باڑے معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ میں میں تیسرے درجے میں سفر کرتا تھا مگر ایک بار میں نے اول درجے میں سفر کیا کہ دیکھوں دونوں میں کیا فرق ہے۔ وہاں مجھے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ جنوبی افریقہ میں تیسرے درجے کے مسافر عموماً حبشی ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہاں تیسرے درجے میں ہندوستان سے کہیں زیادہ آسائش ہے۔ جنوبی افریقہ کے بعض حصوں میں تو

تیسرے درجے کے مسافروں کے لیے گدے دار بنچیں اور سونے کا بھی انتظام ہے۔ مسافروں کے بٹھانے میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بہت بھیڑ نہ ہوجائے مگر ہندوستان میں عموماً ہر ڈبے میں مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر بھر جاتے ہیں۔

ایک تو ریلوے کے منتظمین تیسرے درجے کے مسافروں کی آسائش کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ دوسرے یہ مسافر خود اتنے میلے اور بے لحاظ ہوتے ہیں کہ جس شخص کے مزاج میں صفائی ہو اس کے لیے تیسرے درجے میں سفر کرنا ایک مصیبت ہے ان لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر طرح کا کوڑا کچرا ریل کے ڈبے کے فرش پر پھینکے جاتے ہیں ہر جگہ اور ہر وقت تمباکو پیتے رہتے ہیں پان چبایا کرتے ہیں اور سارے ڈبے کو گالدان بنا دیتے ہیں۔ ان کے شور وغل گالی گلوچ سے دوسرے مسافروں کو چاہے جتنی تکلیف ہو انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی میں نے 1902ء میں تیسرے درجے کا سفر کیا تھا پھر 1902ء سے 1919ء تک مسلسل کرتا رہا۔ مگر اتنے عرصہ میں مجھے تیسرے درجے کی حالت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔

مجھے اس صورت حال کا صرف ایک علاج نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اپنے اوپر لازم کرلیں کہ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کریں گے۔ عام مسافروں کی عادتوں کو سدھاریں گے اور ریل کے ملازموں کو بھی چین نہ لینے دیں گے۔ بلکہ جب ضرورت ہوگی شکایتوں کی بھرمار کردیں گے۔ اپنے آرام کے لیے رشوت یا دوسرے ناجائز ذرائع سے کام نہ لیں گے اور کسی کو قواعد کی خلاف ورزی نہ کرنے دیں گے اگر ایسا ہو تو مجھے یقین ہے کہ بہت کچھ اصلاح ہوجائے گی۔

افسوس ہے کہ 19-1918ء کی شدید علالت کے سبب سے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرنے کا معمول ترک کرنا پڑا۔ مجھے اس کا بڑا رنج اور بڑی شرمندگی

ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ یہ معذوری ایسے زمانے میں پیش آئی جب تیسرے درجے کے مسافروں کی شکایات رفع کرنے کی تحریک اچھی خاصی چل رہی تھی۔ ریل اور جہاز کے غریب مسافروں کی تکلیفیں جو خود ان کی نامعقول عادتوں اور بڑھ جاتی ہیں، وہ ناجائز رعایتیں جو حکومت نے غیر ملکوں کی تجارت کو دے رکھی ہیں اور اسی قسم کی اور چیزیں بجائے خود ایسے اہم مسائل ہیں کہ دو ایک حوصلہ مند اور مستقل مزاج آدمیوں کو اپنا سارا وقت ان کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

تیسرے درجے کے مسافروں کا ذکر یہیں چھوڑ کر میں وہ واقعات بیان کرتا ہوں جو بنارس میں پیش آئے میں صبح کے وقت وہاں پہنچا۔ میں نے یہ طے کیا کہ کسی پنڈے سے کے یہاں ٹھہروں گا۔ جیسے ہی میں گاڑی سے اترا مجھے بہت سے برہمنوں نے آ گھیرا۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کا انتخاب کیا جو دوسروں کے مقابلہ میں صاف ستھرا اور معقول معلوم ہوتا تھا آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ انتخاب صحیح تھا۔ اس کا مکان دو منزل تھا صحن میں ایک گائے بندھی ہوئی تھی مجھے اس نے اوپر کی منزل میں ٹھہرایا۔ میں پرانی رسم کے مطابق کھانا کھانے سے پہلے گنگا اشنان کرنا چاہتا تھا۔ پنڈا اس کا سامان کرنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں سوا روپیہ سے زیادہ دکشنا نہیں دوں گا تم اسی لحاظ سے سب کام کرنا۔

وہ اس پر راضی ہو گیا اور کہنے لگا۔ چاہے جاتری امیر ہو یا غریب دونوں کی سیوا ایک کرنا چاہیے۔ اب رہی دکشنا جو جس کی جیسی حیثیت ہوتی ہے دے دیتا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے پنڈے نے پوجا وغیرہ کے سوا ادا کرنے میں کسی طرح کی کمی نہیں کی۔ پوجا گیارہ بجے ختم ہوئی اور میں درشن کے لیے کاشی وشوا ناتھ پہنچا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی 1891ء میں جب میں

بمبئی میں وکالت کرتا تھا میں نے پر راتھنا سماج میں کاشی جاترا پر ایک لکچر سنا تھا۔ اس لیے میں پہلے سے سمجھتا تھا کہ یہاں آ کر مایوسی ہوگی لیکن اتنی سخت مایوسی کی توقع نہ تھی۔

مندر میں ایک تنگ گلی سے ہو کر جانا پڑتا تھا جہاں پیر پھسلتا تھا۔ خاموشی اور سکون نام کو نہ تھا کھیوں کے ہجوم سے اور دکانداروں اور جاتریوں کے شوروغل سے ناک میں دم آنے لگا۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں دھیان گیان کی فضا ہونا چاہیے تھی مگر معاملہ بالکل الٹا تھا۔ یہ فضا تلاش کرنے کے لیے انسان کو اپنے قلب کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ میں نے بعض عبادت گزار بہنوں کو دیکھا کہ دھیان میں ڈوبی ہوئی ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے لیکن اس میں مندر کے منتظمین کی کوئی تعریف نہ تھی ان کا یہ کام تھا کہ مندر میں ایک پاکیزہ، پر سکون اور دلکش جسمانی اور روحانی فضا پیدا کریں۔ اس کے بجائے مجھے وہاں ایک بازار نظر آیا جس میں چالاک دکاندار مٹھائیاں اور جدید ترین وضع کے کھلونے بیچ رہے تھے۔

مندر کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ سڑے ہوئے پھولوں کا ڈھیر لگا ہے جن کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے مندر کا فرش نفیس سنگ مرمر کا ہوتا مگر کسی بد مذاق خوش عقیدہ شخص نے اسے جابجا سے اکھڑا کر روپے جڑوا دیئے تھے جن سے بہتر گرد میں اٹھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہو سکتی میں جنن دپی کے قریب آ گیا اس کے آس پاس کی جگہ بہت میلی تھی میں نے یہاں خدا کو ڈھونڈا مگر وہ مجھے نہ ملا۔ میں جھلایا ہوا تھا اور میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ دکھتا دوں۔ میں نے ایک پائی نکال کر اس پنڈے کے سامنے پیش کی جو ''جنن دپی'' کا نگران تھا وہ مجھ پر برس پڑا اور کہنے لگا تو اس

ایمان کی سزا میں نرک میں جائے گا۔

مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے کہا ''مہاراج میرا جو کچھ انجام ہوتا ہے وہ ہوگا مگر آپ کو برہمن ہو کر رام کا ف زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔''

اس نے جواب دیا، چل دور ہو مجھے تیری پانی نہیں چاہیے اور اس کے بعد گالیوں کی باڑھ چلی میں نے وہ پانی اٹھا لی خوش خوش چلا کر برہمن کے ہاتھ سے پانی بچا لی۔ مگر وہ کب چھوڑنے والا تھا اس نے پکار کر کہا اچھا پانی یہاں دھر دے میں تیرا جیسا نہیں ہونا چاہتا اگر میں تجھ سے یہ پانی نہ لوں تو تیرے لیے بہت برا ہوگا۔

میں نے بادل ناخواستہ پانی اس کے حوالے کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد مجھے دوبارہ کاشی وشوا ناتھ جانے کا اتفاق ہوا مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ میرے نام کے ساتھ مہاتما کا دم چھلا لگایا جا چکا تھا جن واقعات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان کا پیش آنا اب ناممکن تھا۔ لوگ میرے درشن کے شوق میں اُمڈے آتے تھے اور مجھے مندر کا درشن نہیں کرنے دیتے تھے۔ مہاتماؤں پر جو کچھ گذرتی ہے ان ہی کا دل جانتا ہے پھر بھی اتنا میں نے دیکھ لیا کہ یہاں کے میلے پن اور شور وشغب کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔

اگر کسی کو خدا کے بے حساب عفو اور رحم کی شان دیکھنا ہو تو ان مقدس مقامات کو دیکھے۔ یہ جوگیوں کا داتا لوگوں کو اپنے نام سے کیسی کیسی ریا کاری اور بے دینی کرتے تھے ہے اور در گذر کرتا ہے۔ اس نے مدت ہوئی ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔ ''جیسا کرنا ویسا بھرنا'' ''کرم'' کے اٹل قانون سے کسی کو مفر نہیں۔ پھر اخدا کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے تو قانون بنا کر گویا دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

مندر کی زیارت کے بعد میں مسز بیسنٹ کے درشن کے لیے گیا مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں۔ میری اطلاع ہوتے ہی وہ باہر تشریف لے آئیں میں نے صرف سلام کے لیے کہا تھا اس لیے میں نے عرض کیا ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے بس صرف سلام کرنا تھا میں آپ کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں کہ باوجود علالت کے آپ نے مجھ سے ملنا قبول فرمایا۔ میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔''

☆☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بمبئی میں بس جانے کا ارادہ ہے

گوکھلے کا اصرار تھا کہ میں بمبئی میں بس جاؤں اور وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں۔ قومی کام سے مراد ان دنوں کانگریس کی خدمت تھی اور انہوں نے جو ادارہ قائم کیا تھا وہ بھی زیادہ تر کانگریس ہی کا کام کرتا تھا۔

مجھے گوکھلے کا مشورہ پسند آیا مگر مجھے وکالت چلنے کی کچھ زیادہ امید نہ تھی میں اب تک پہلی ناکامی کی تلخی کو نہیں بھولا تھا اور مقدمے حاصل کرنے کے لیے خوشامد کرنا مجھے اب زہر لگتا تھا۔

اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے راجکوٹ میں کام شروع کروں۔ وہاں میرے پرانے عنایت فرما کیول رام ماوجی دیو جنہوں نے مجھے انگلستان جانے پر آمادہ کیا تھا، موجود تھے۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی دن مقدمے لا کر دیئے دو اپیلیں تھیں جو پولیٹیکل ایجنٹ کاٹھیاوار کے جوڈیشنل اسسٹنٹ کے یہاں پیش ہونے والی تھیں اور ایک ابتدائی مقدمہ جام نگر کا تھا۔ یہ معاملہ کسی قدر اہم تھا میں نے کہا مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں کہ اس مقدمے کی پیروی، جیسی چاہیے کر سکوں گا۔ کیوں رام دیو بولے ''تمہیں ہارنے جیتنے سے کیا غرض تم تو اپنی کوشش کر ڈالو۔ آخر میں بھی تو تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں۔''

دوسری طرف سے سر تھاجی آنجہانی وکیل تھے میں نے خاصی تیاری کی تھی میں خود تو ہندوستان کے قانون سے اچھی طرح واقف نہ تھا مگر کیول رام دیو نے مجھے ساری اونچ نیچ سمجھا دی۔ میں نے جنوبی افریقہ سے پہلے دوستوں سے سنا تھا کہ سر

فیروز شاہ مہتا کو قانون شہادت ازبر یاد ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے میں نے یہ بات دل میں رکھی تھی اور سفر کے دوران میں نے قانون شہادت اور اس کی شرحوں کا مطالعہ اچھی طرح کر لیا تھا پھر جنوبی افریقہ میں اتنے دن وکالت کر کے جو تجربہ حاصل ہوا تھا وہ بھی اس وقت کام آیا۔

میں مقدمہ جیت گیا اور مجھے اپنی قابلیت پر تھوڑا بہت بھروسہ ہو گیا۔ اپیلوں کے بارے میں مجھے کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ ان دونوں میں کامیابی ہوئی ان سب باتوں سے میری ڈھارس بندگئی کہ شاید بمبئی میں بھی کام چلا لوں۔

لیکن بمبئی جانے کے اسباب بیان کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کروں گا جس سے مجھے انگریز افسر کی جہالت اور بدسلوکی کا تجربہ ہوا۔ جوڈیشنل اسسٹنٹ کی عدالت کا کوئی مقام متعین نہ تھا۔ وہ ہمیشہ دورے پر رہتا تھا اور وکیلوں اور موکلوں کو اس کے پیچھے پیچھے جانا پڑتا تھا۔ وکیل جب صدر مقام سے باہر جاتے تھے تو فیس زیادہ لیتے تھے اس لیے بے چارے موکل پر دہرا خرچ پڑتا تھا اس کی اس مصیبت کی جج کو کوئی پروا نہ تھی۔

جس اپیل کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ویراوال میں سنی جانے والی تھی۔ جہاں شدت سے طاعون پھیلا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس چھوٹی سی جگہ میں جس کی آبادی ساڑھے پانچ ہزار تھی، روز پچاس کیس تک ہو جاتے تھے قصبہ قریب قریب خالی ہو گیا تھا میں ایک دھرم سالے میں ٹھہر گیا جو شہر سے کچھ دوری کے فاصلے پر واقع تھا لیکن بے چارے موکل کہاں ٹھہرتے ان میں سے جو غریب تھے ان کا خدا ہی حافظ تھا۔

میرے ایک دوست نے جن کے چند مقدمے اسی عدالت میں تھے مجھے تار دیا

کہ تم دیرا دال میں طاعون ہونے کی بناء پر درخواست دے دو کہ پڑاؤ کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔ جب میں نے یہ درخواست دی تو صاحب نے کہا'' آپ ڈرتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا'' میرے ڈرنے نہ ڈرنے کا سوال نہیں میں تو اپنی فکر کر لوں گا مگر موکل کیا کریں گے'' صاحب بولے'' طاعون نے تو اب ہندوستان میں ڈیرا ڈال دیا ہے اس سے ڈرنا کیا؟ دیرا دال کی آب و ہوا بڑی اچھی ہے (صاحب قصبے سے دور سمندر کے کنارے ایک عالیشان خیمے میں رہتے تھے) لوگوں کو کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔''

اس فلسفے کی آگے ساری دلیلیں بیکار ثابت ہوئیں صاحب نے رشتہ دار سے کہا'' مسٹر گاندھی جو کہتے ہیں اسے نوٹ کر لیجئے اور یہ دریافت کر لیجئے کہ کیا واقعی وکیلوں یا موکلوں کو یہاں آنے میں بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔''

ظاہر ہے کہ'' صاحب نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے مناسب سمجھ کر کیا لیکن اسے کیا خبر کہ غریب ہندوستانیوں پر کیا مصیبتیں گزرتی ہیں؟ وہ کیا جانے کہ ہندوستانیوں کی ضرورتیں، عادتیں اور خصوصیتیں کیا ہیں؟ جو شخص سونے کی گنیوں سے حساب کرنے کا عادی ہو وہ ایک دم تانبے کے پیسوں کی گنتی کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ جس طرح ہاتھی چاہے اپنی طرف سے کتنی ہی کوشش کرے دنیا کو چیونٹی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح انگریز جو ہاتھی کی سی ضرورتیں رکھتا ہے چیونٹی کی زندگی بسر کرنے والے ہندوستانیوں کے طرز خیال کو اختیار کرنے اور اس کے مطابق قانون بنانے سے معذور ہے۔''

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل قصے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ باوجود

اس کی کہ میری وکالت خوب چل رہی تھی میرا مقصد ابھی اور کچھ دن راجکوٹ ہی میں رہنے کا تھا مگر ایک دن کیول رام دیو آ کر مجھ سے کہنے لگے ''بھئی گاندھی ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم راجکوٹ میں پڑے سوکھا کرو۔ اب تو تمہیں بمبئی میں جا کر رہنا چاہیے۔''

میں نے پوچھا ''مگر وہاں میرے لیے کام کون فراہم کرے گا؟ کے ا آپ میرے اخراجات کا ذمہ لیتے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا ''ہاں میں اس کا ذمہ لیتا ہوں ہم لوگ تمہیں کسی دن بڑے نامی بیرسٹر کی حیثیت سے یہاں بلائیں گے اور عرضداشتیں لکھنے کا کام وہیں بھیج دیا کریں گے۔ یہ تو ہم وکیلوں کے ہاتھ میں ہے کہ جس بیرسٹر کو چاہیں بڑھا دیں جسے چاہیں گھٹا دیں۔ تم نے جام نگر اور دیرا وال کے مقدموں میں اپنی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ اس لیے مجھے تمہاری طرف سے پورا اطمینان ہے تمہیں خدا نے قومی کام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے ہم تمہیں کاٹھیاوار میں گمنامی کی زندگی بسر نہیں کرنے دیں گے۔ اب بتاؤ بمبئی کب جاؤ گے؟''

میں نے کہا ''مجھے نٹال سے ایک رقم کا انتظار ہے اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا۔ کوئی دو ہفتے میں روپیہ آ گیا اور میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ میں نے چین گلبرٹ اور سیانی کے دفتر میں کمرے کرائے پر لے لیے اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب مستقل قیام بمبئی میں رہے گا۔''

☆☆☆☆☆☆☆

دھرم کی آزمائش

اگرچہ میں نے فورٹ میں دفتر کے لیے کمرے اور گرم گام میں مکان لے لیا تھا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ میں یہاں مستقل قیام کروں۔ نئے مکان میں آتے ہی میرا منجھلا بیٹا منی لال جسے چند سال پہلے چیچک کا شدید دورہ ہو چکا تھا تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اس کے پھیپھڑے میں ورم ہوا اور رات کو ہذیان کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ دوا سے کچھ کام نہیں چلے گا مگر انڈے اور چوزے کی یخنی دیجیے اس سے فائدہ ہوگا۔

منی لال اس زمانے میں صرف دس برس کا تھا۔ اس سے تو میں کیا پوچھتا مجھے اس کے ولی کی حیثیت سے خود ہی فیصلہ کرنا تھا۔ یہ ڈاکٹر پارسی تھا اور بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم سب نباتاتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بچوں کو نہیں دی جا سکتیں۔ آپ کوئی چیز بتائیے۔

نیک ڈاکٹر بولا ”آپ کے لڑکے کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے دودھ میں پانی ملا کر دیا جائے مگر اس میں کافی غذائیت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بہت سے ہندو گھرانوں میں بلایا جاتا ہوں ان لوگوں کو میں جو کچھ بتاتا ہوں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ خدا کے لیے آپ اپنے بچے پر یہ ظلم نہ کیجیے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ بجا کہتے ہیں ڈاکٹر کو یہی کہنا چاہیے۔ مگر میری ذمہ داری بہت بڑا ہے اگر لڑکا سیانا ہوتا تو میں یقیناً اسی سے پوچھتا اور جو کہتا وہی کرتا مگر مجھے تو

اس کے بجائے خود فیصلہ کرنا ہے۔ میرے خیال میں ایسے ہی موقعے پر انسان کے عقیدے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اب چاہے یہ ٹھیک ہو یا نہ ہو مگر میرا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو گوشت انڈے وغیرہ نہیں کھانا چاہیے، زندگی کی ضروریات کی بھی آخر حد ہوتی ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو جان بچانے کی خاطر بھی نہیں کرنا چاہئیں۔ میرا مذہب مجھے ایسے موقعوں پر بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں گوشت اور انڈے کھاؤں یا اپنے بچوں کو کھلاؤں۔ اس لیے مجھے چار و ناچار اس خطرے کا مقابلہ کرنا ہے جس کا آپ کو احتمال ہے۔ آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ آپ کی تدبیر پر عمل کرنے سے تو میں معذور ہوں۔ اس لیے میرا مقصد ہے کہ پانی کے علاج سے کام لوں جس سے مجھے واقفیت ہے مگر میں نہ بچے کی نبض دیکھ سکوں گا اور نہ اس کے سینے سے پھیپھڑے وغیرہ کا معائنہ کر سکوں گا۔ اگر آپ کبھی کبھی آکر اس کا معائنہ کر لیا کریں اور مجھے اس کی حالت بتا دیا کریں تو بڑا احسان ہو۔''

نیک ڈاکٹر میری مشکلوں کو سمجھ گیا اور اس نے میری درخواست قبول کر لی۔ گو منی لال خود کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا مگر میں نے اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو اس کو سنائی اور پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا ''آپ تو پانی کا علاج کیجیے مجھے انڈے وانڈے یخنی وخنی نہیں چاہیے۔'' اس سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ میں اسے یہ چیزیں دیتا تو وہ انکار نہ کرتا۔

میں کوہنے کے طریقۂ علاج سے واقف تھا اور اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ فاقے سے بھی فائدہ ہوگا۔ اس لیے میں نے منی لال کو کوہنے کی ہدایت کے مطابق تین تین منٹ کے ''ہپ باتھ'' دینا شروع کیے اور تین دن تک سوائے لیمو

کے آبخورے کی کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا۔

مگر بخار کسی طرح 104 درجے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ رات کو اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ مجھے بڑا تردد ہو گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ بڑے بھائی میری نسبت کیا خیال کریں گے؟ کسی اور ڈاکٹر کو نہ بلا لوں۔ وید کا علاج کیوں نہ کروں؟ ماں باپ کو کیا حق ہے کہ جس چیز کا انہیں خبط ہے اس پر خواہ مخواہ بچوں کو بھی مجبور کریں؟

اس قسم کے وسوسے میرے دل میں پیدا ہوتے تھے مگر پھر خیال کا رخ بدل جاتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ خدا یقیناً اس بات سے خوش ہو گا کہ میں اپنے بچے کا وہی علاج کر رہا ہوں جو اپنا کرتا۔ مجھے پانی کے علاج پر عقیدہ ہے اور ڈاکٹری علاج پر نہیں۔ ڈاکٹر اس بات کا دعویٰ کر سکتے کہ ضرور صحت ہو گی۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ تجربہ ہی کر سکتے ہیں۔ موت زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے توکل سے کام لینا چاہیے اور جس علاج کو میں مناسب سمجھتا ہوں وہی کرنا چاہیے۔

مجھے ان متضاد خیالات نے کشمکش میں ڈال رکھا تھا۔ رات کا وقت تھا میں منی لال کے پاس اسی کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے میں نے یہ طے کیا کہ کپڑا بھگو کر اس کے جسم پر لپیٹوں۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک چادر پانی میں بھگوئی اور خوب نچوڑ کر منی لال کے سارے دھڑ پر لپیٹ دی۔ اوپر سے دو کمبل ڈال دیئے اور سر پر ایک گیلا تولیا رکھ دیا۔ سارا بدن گرم لوہے کی طرح تپ رہا تھا۔ پسینے کا نام بھی نہ تھا۔

اس وقت میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ میں منی لال کی ماں کو اس کے پاس چھوڑ کو چوپاٹی کی طرف ٹہلنے نکل گیا کہ ذرا حواس درست کر لوں۔ دس بج چکے تھے۔

راہ گیرا کا دکا نظر آتے تھے۔ میں اپنے خیال میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا یا اللہ اس امتحان میں عزت تیرے ہاتھ ہے۔ اور زبان کو ''رام نام'' کی رٹ لگی تھی۔ کچھ دیر کے بعد گھر لوٹا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے گھر میں قدم رکھا۔ منی لال نے کہا۔ ''باپو تم آ گئے؟''

''ہاں بیٹا آ گیا۔''

''یہ چادر تو ہٹائیے۔ میرا گرمی کے مارے برا حال ہے۔''

''کیا پسینہ نکل رہا ہے؟۔''

''سارا بدن تر بتر ہے۔ خدا کے لیے اب ہٹائیے۔''

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پسینے کے قطرے موتی کی طرح جھلک رہے تھے۔ بخار کم ہو رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''منی لال۔ بس اب تمہارا بخار اترنے ہی والا ہے، ذرا دیر اور پسینہ نکل لے۔ پھر میں چادر ہٹائے لیتا ہوں۔''

''نہیں میرے باپو میں ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے اس بھٹی سے نکالیے۔ چاہے پھر کبھی لپیٹ دیجیے۔''

میں نے اسے سمجھا بجھا کر چند منٹ اور چادر لپٹی رہنے دی۔ اس کے ماتھے سے پسینے کی اولتی ٹپک رہی تھی میں نے چادر ہٹائی اور اس کا بدن سکھایا۔ پھر ہم باپ بیٹے ایک ہی پلنگ پر سو گئے۔

دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح کو منی لال کا بخار کم ہو گیا۔ چالیس دن تک اسے صرف پانی ملا۔ دودھ اور پھلوں کا عرق دیا گیا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ یہ بڑا

موذی بخار تھا مگر اب قابو میں آ گیا۔

آج منی لال میرے لڑکوں میں سب سے زیادہ تندرست ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے محض خدا کے فضل سے صحت ہوئی، یا پانی کے علاج سے یا غذا اور تیمارداری میں احتیاط کرنے سے؟ ہر شخص اپنے عقیدہ کے مطابق جو چاہے سمجھ لے۔ مجھے تو یہ یقین تھا کہ خدا نے میری عزت رکھ لی اور یہی یقین آج تک قائم ہے۔

............☆☆............

پھر جنوبی افریقہ چلا

منی لال اچھا ہو گیا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ گرگام والا گھر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس میں سیلن تھی اور کافی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ اس لیے ریوا شنکر جگ جیون جی کے مشورے سے میں نے یہ طے کیا کہ بمبئی کے مضافات میں کوئی ہوادار بنگلہ لوں۔ میں باندرا اور سانتا کرز میں گشت لگاتا رہا۔ باندرا اس لیے پسند نہیں آیا کہ وہاں مسلخ تھا۔ گھاٹ کوپار اور اس کے گردونواح کے مقامات سمندر سے دور تھے۔ آخر ہم نے سانتا کرز میں ایک خوبصورت بنگلہ کا انتخاب کیا اور چونکہ وہ حفظان صحت کے اعتبار سے بہت اچھا تھا اس لیے اسی کو کیا۔

میں نے سانتا کرز سے چرچ گیٹ تک کا اول درجے کا سیزن ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات درجے میں میرے سوا کوئی مسافر نہیں ہوتا تھا اور اس پر میرے نفس کو ایک غرور سا بعض اوقات محسوس ہوتا تھا۔ اکثر میں باندرا تک پیدل جاتا تھا اور وہاں سے تیز گاڑی میں بیٹھتا تھا۔ جو چرچ گیٹ تک بیچ میں کسی اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی۔

مجھے اپنے پیشے میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ میرے جنوبی افریقہ کے موکل اکثر مجھے اپنے عقد مے دیا کرتے تھے اور میری گذر اوقات کے لیے کافی تھے۔

ابھی تک مجھے ہائیکورٹ کا کام نہیں ملا تھا۔ ان دنوں ہائیکورٹ کے وکلاء مشق کے لیے فرضی مقدموں میں بحثیں کیا کرتے تھے اور میں بھی وہاں جایا کرتا تھا۔ اگرچہ بحث میں شریک ہونے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جمیت مرا مرنانا

بھائی اس میں نمایاں حصہ لیا کرتے تھے۔ دوسرے نوشق بیرسٹروں کی طرح میں بھی ہائیکورٹ میں مقدموں کی بحثیں سننے جایا کرتا تھا۔ لیکن سچ پوچھیے تو مجھے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی اتنی خواہش نہ تھی جتنی سمندر کی ہوا کی۔ جو تھپکیاں دے کر سلا دیتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ صرف میں ہی اس نیند کے مزے نہیں لیتا ہوں بلکہ اور لوگ بھی ہیں۔ وہاں یہ فیشن سا ہو گیا تھا۔ اس لیے میں کوئی شرم کی بات نہ تھی۔

تاہم میں ہائیکورٹ کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتا تھا اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ تھوڑے دن میں ہائیکورٹ کا کام ملنے لگے گا۔

غرض ادھر تو میری وکالت میں کسی قدر اطمینان کی صورت میں پیدا ہو رہی تھی اور ادھر گوکھلے جو مجھے ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے۔ میرے لیے کچھ اور ہی تدبیر میں سوچ رہے تھے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار میرے دفتر میں آجاتے تھے۔ اکثر اپنے ساتھ دوستوں کو لاتے تھے جن سے وہ مجھے ملانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے طریقہ کار سے ہمیشہ باخبر رکھتے تھے۔

مگر میری زندگی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے خود جتنے منصوبے سوچے خدا نے کسی کو پورا نہ ہونے دیا۔ اس مجھ سے وہی کام لیا جو اسے منظور تھا۔

عین اس وقت جب میں یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا۔ جنوبی افریقہ سے یہ تار پہنچا کہ ''یہاں چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے۔ مہربانی کر کے فوراً چلے آیئے۔'' مجھے اپنا وعدہ یاد آیا اور میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ ''میں آنے کو تیار ہوں، جب آپ روپیہ بھیجیں گے فوراً روانہ ہو جاؤں گا۔'' تار پہنچتے ہی روپیہ آ گیا۔ میں نے اپنا دفتر چھوڑ دیا اور جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔

میرا قیاس تھا کہ جس کام کے لیے جا رہا ہوں اس میں کم از کم اس سال لگے گا۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ بنگلہ رہنے دوں اور بال بچوں کو اسی میں چھوڑ جاؤں۔

ان دنوں میرا خیال تھا کہ من چلے نوجوانوں کو اپنے ملک میں کام نہ ملے تو انہیں ترک وطن کر کے دوسرے ملکوں میں چلا جانا چاہیے۔ اس لیے میں نے اپنے ساتھ ایسے چار پانچ نوجوانوں کو لے لیا جن میں مگن لال گاندھی بھی تھے۔

ہمارا خاندان ان دنوں بڑا تھا اور اب بھی بڑا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں سے جتنے پرانی لکیر کو چھوڑ کر باہر جانے کی ہمت رکھتے ہوں انہیں ساتھ لے جاؤں۔ میرے والدین ان میں سے اکثر کو ریاستوں میں نوکر رکھا دیتے تھے۔ میں انہیں اس طلسم سے نکالنا چاہتا تھا۔ انہیں کسی دوسری جگہ نوکری دلانا میرے اختیار میں نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو بھی میں کبھی نہ دلاتا۔ میری تو یہ خواہش تھی کہ یہ اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں۔

لیکن جوں جوں میرا نصب العین بلند ہوتا گیا میں ان نوجوانوں کو بھی اپنی تقلید پر آمادہ کرتا گیا اور مگن لال گاندھی کی تربیت میں مجھے بڑی کامیابی ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بیوی بچوں سے بچھڑنا، جمے جمائے کارخانے کو توڑنا، ٹھور سے بے ٹھور ہونا تھوڑی دیر مجھ پر شاق گذرا۔ مگر میں بے اطمینانی کی زندگی کا عادت ہو چکا تھا میرے خیال میں اس دنیا میں اطمینان کی توقع رکھنا بڑی غلط بات ہے۔ یہاں سوائے حق کے یعنی ذات الٰہی کے کسی چیز کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ یہ سارے کھیل جو دنیا کے پردے پر نظر آتے ہیں چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ کسی کا بھروسہ نہیں، کسی کو ثبات

نہیں، ہاں اس پردے کے اندر ایک بلند اور برتر ذات ہے اور وہ سراپا حقیقت ہے ۔خوش حال اس کے جو حقیقت کی جھلک دیکھ لے۔ جو حق کا دامن تھام لے حق کی تلاش ہی زندگی کی معراج ہے۔

میں عین وقت پر ڈربن پہنچا۔ میرے لیے کام تیار رکھا تھا۔ مسٹر چیمبر لین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے عرضداشت مرتب کرنا تھی اور وفد کے ساتھ جانا تھا۔

............☆☆............

حصہ چہارم

محبت کے سارے جتن بیکار گئے

مسٹر چمبر لین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذر لینے اور انگریزوں اور بوئروں کی دلجوئی کرنے آئے تھے۔ اس لیے انہیں نے ہندوستانی وفد کو سوکھا ٹال دیا۔

انہوں نے کہا ''آپ جانتے ہیں کہ جن نوآبادیوں کو حکومتی خود اختیاری حاصل ہے ان کے معاملات میں دخل دینے کا امپیریل گورنمنٹ کو بہت کم حق ہے۔ آپ کی شکایتیں بجا معلوم ہوتی ہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا کروں گا۔ مگر آپ کو یورپیوں کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔''

اس جواب سے وفد کے ارکان کی امیدوں پر اداسی پڑ گئی۔ مجھے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہمیں بتا دیا کہ سارا کام از سرِ نو شروع کرنا پڑے گا۔ میں نے یہ صورت حال اپنے رفیقوں کو سمجھائی۔

سچ پوچھیے تو مسٹر چمبر لین کا جواب کچھ بے جا نہیں تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ انہیں نے اصل بات صاف صاف کہہ دی۔ انہوں نے ہمیں نرم الفاظ میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول یا تلوار کا قانون سمجھا دیا۔

مگر ہم تلوار تو کیا تلوار کھانے کا بل بوتہ بھی نہ رکھتے تھے۔ مسٹر چمبر لین نے اتنے بڑے ملک کو تھوڑے سے وقت میں دیکھا۔ اگر سری نگر سے راس کماری تک

انیس سو میل کا فاصلہ ہے تو ڈربن سے کیپ ٹاؤن بھی 1100 میل سے کم نہیں۔ مسٹر چمبرلین نے یہ فاصلہ آندھی کی سی رفتار سے طے کیا۔

نٹال سے وہ ٹرانسوال گئے۔ مجھے ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے مطالبات بھی مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کرنا تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں پریٹوریا کیونکر جاؤں؟ وہاں کے ہندوستانی میرے داخلے کے قانونی مراحل اتنی جلدی طے نہیں کر سکتے تھے۔ لڑائی نے ٹرانسوال کو ویران کر دیا تھا۔ نہ وہاں کھانے پینے کا سامان بہم پہنچتا تھا، نہ کپڑا ملتا تھا۔ بہت سی دوکانیں خالی تھیں بہت سی بند پڑی تھیں۔ خالی دوکانوں کا بسنا اور بند دوکانوں کا کھلنا ذرا دیر طلب تھا۔ جن لوگوں نے یہاں سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لی تھی ان تک کو واپسی کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ تاوقتیکہ دوکانوں میں کھانے پینے کا سامان نہ ملنے لگے۔ اس لیے ہر ٹرانسوال کے باشندے کو وہاں جانے کے لیے پروانہ راہداری لینا پڑتا تھا۔ یورپیوں کو یہ پروانہ آسانی سے مل جاتا تھا مگر ہندوستانیوں کے لیے بڑی دشواریاں تھیں۔

جنگ کے زمانے میں ہندوستان اور لنکا سے بہت سے فرنگی افسر اور گورے سپاہی جنوبی افریقہ آئے تھے۔ برطانی حکام کو یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ ان میں سے جو لوگ یہاں بسنا چاہیں ان کے لیے معاش کا کچھ بندوبست کریں۔ آخر انہیں نئے عہدہ دار رکھنا تھے پھر ان تجربہ کار لوگوں کو کیوں نہ رکھتے؟ ان لوگوں نے جوڑ توڑ لگا کر ایک نیا محکمہ قائم کرا لیا۔ حبشیوں کی نگرانی کے لیے ایک خاص محکمہ تھا ہی پھر کیا وجہ تھی کہ ایشیائیوں کے واسطے نہ ہو؟ بات بظاہر معقول تھی جب میں ٹرانسوال پہنچا تو یہ محکمہ کھل چکا تھا اور اس کا جال آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ جو حکام پناہ گزینوں کی واپسی کے لیے پروانہ راہداری جاری کرتے تھے وہ اوروں کو تو خود پروانے دے دیتے تھے

مگر ایشیائیوں کے داخلے کے بارے میں بھلا نیا محکمہ بے مداخلت کیئے کیسے رہ سکتا تھا؟ اس کے اہل کاروں نے ان حکام سے کہا کہ آپ ایشیائیوں کو ہماری سفارش کے پروانے دے دیا کیجیے۔ اس سے آپ کا کام بھی ہلکا ہو جائے گا اور ذمہ داری بھی کم ہو جائے گی۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ نئے محکمے کو کچھ نہ کچھ کام دکھانا تھا اور اس کے اہل کاروں کو اپنا پیٹ پالنا تھا۔ اگر کوئی کام نہ ہوتا تو یہ محکمہ غیر ضروری سمجھ کر توڑ دیا جاتا۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح کام نکالا گیا۔

ہندوستانیوں کو داخلے کی اجازت کے لیے اس محکمے میں درخواست دینی پڑتی تھی۔ مدت کے بعد درخواست کا جواب ملتا تھا۔ داخلے کے خواہشمند بے شمار تھے اور اجازت میں یہ دشواریاں۔ اس لیے بہت سے دلال پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے افسروں کے ساتھ مل کر غریب ہندوستانیوں کو خوب لوٹا۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ بغیر سفارش کے پروانہ نہیں مل سکتا اور بعض وقت تو سفارش بھی کافی نہیں ہوتی بلکہ سو پونڈ تک کی رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس لیے تمہاری اجازت ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں نے اپنے پرانے دوست ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ سے جا کر کہا ’’مہربانی کر کے پرمٹ کے افسر سے میرا تعارف کرا دیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ٹرانسوال میں عرصہ تک رہ چکا ہوں۔‘‘ انہوں نے فوراً ہیٹ سر پر رکھی اور میرے ساتھ جا کر مجھے پروانہ دلوایا۔ میری گاڑی چھوٹنے میں مشکل سے ایک گھنٹہ باقی تھا مگر میرا سامان پہلے سے بندھا رکھا تھا۔ میں نے مسٹر الیگزینڈر کا شکریہ ادا کیا اور پریٹوریا روانہ ہو گیا۔

اب مجھے اپنے کام کی دشواریوں کا اندازہ ہوا۔ پریٹوریا پہنچتے ہی میں نے عرضداشت مرتب کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈربن میں ہندوستانیوں سے وفد

کے ارکان کی فہرست پہلے مانگی گئی تھی مگر یہاں تو نیا محکمہ موجود تھا۔ اس نے یہ پخ لگا دی۔ پریٹوریا کے ہندوستانیوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ اس محکمے کے افسر میرا نام وفد سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔

یہ واقعہ افسوسناک بھی تھا کہ مضحک بھی مگر اسے بیان کرنے کے لیے ایک اور باب کی ضرورت ہے۔

............☆☆............

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایشیا سے آئے ہوئے صاحب بہادر

نئے محکمے کے افسر حیران تھے کہ میں ٹرانسوال میں کیونکر داخل ہوا۔ انہوں نے ان ہندوستانیوں سے جو ان سے ملنے جایا کرتے تھے دریافت کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ انہیں یہ شبہہ تھا کہ شاید میں پرانے تعلقات سے فائدہ اٹھا کر بے اجازت چلا آیا۔ اگر یہ صورت تھی تو میں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

عام قاعدہ ہے کہ جب بڑی لڑائی ختم ہوتی ہے تو حکومت کی غیر معمولی اختیارات دے دیئے جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں بھی یہی ہوا تھا۔ حکومت نے ضابطہ تحفظ امن کے نام سے ایک ہنگامی قانون پاس کیا تھا جس کی رو سے وہ شخص جو بغیر پروانہ راہداری کے ٹرانسوال میں داخل ہو گرفتاری اور قید کا مستوجب تھا۔ نئے محکمے کے افسروں میں صلاح ہوئی کہ اس ضابطے کے ماتحت مجھے گرفتار کریں۔ مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مجھ سے پروانہ مانگے۔

ان افسروں نے ڈربن تار دے کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں پروانہ لے کر آیا ہوں انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر یہ ہار ماننے والے آسامی نہ تھے۔ انہوں نے کہا یہ شخص ٹرانسوال آ گیا تو آ جائے مگر اسے چمبرلین سے نہ ملنے دیں گے۔

اسی لیے ہندوستانیوں سے کہا گیا کہ وفد کے ارکان کے نام بھیجیں۔ رنگ کا تعصب تو جنوبی افریقہ میں ہر جگہ نظر آتا تھا۔ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہاں کے افسروں میں بھی وہیں کمینے پن کی حرکتیں اور کاٹ چھانس کی ترکیبیں ہوں گی جن سے مجھے ہندوستان میں سابقہ پڑا کرتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں پبلک محکمے وہاں کے باشندوں

کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کئے گئے تھے اور رائے عامہ کے ماتحت تھے۔ اس لیے ان کے عہدے داروں میں شائستگی اور بردباری پائی جاتی تھی جس کا تھوڑ بہت فائدہ لے آدمیوں کو بھی پہنچتا تھا۔ ایشیا سے جو افسر آئے وہ ایشیا کے مطلق العنانی اور دوسری عادتیں جو مطلق العنانی سے پیدا ہوتی ہیں ساتھ لائے۔ جنوبی افریقہ میں تو کسی قدر آئینی حکومت اور جمہوریت بھی تھی مگر ایشیا سے جس مال کی کھیپ آئی اس میں خالص مطلق العنانی تھی۔ ایشیا والے غیر قوم کے ماتحت تھے انہیں ذمہ دار حکومت کہاں نصیب؟ جنوبی افریقہ میں فرنگی لوگ باہر سے آکر آباد ہوئے تھے۔ انہیں افریقی شہریوں کے حقوق اور محکمے افسروں پر اقتدار حاصل تھا۔ اب ایشیا کے صاحب بہادر پہنچے اور بیچارے ہندوستانی غم صیاد و فکر باغباں کی دوعملی میں پھنس گئے۔

میں خود مطلق العنانی کا شکار رہا۔ اس لیے مجھے اس کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا۔ پہلے مجھے اس محکمے کے افسر اعلیٰ نے بلا بھیجا۔ شاید ''بلا بھیجنے'' کے لفظ سے کسی کو غلط فہمی ہو اس لیے میں تصریح کیے دیتا ہوں۔ مجھے کوئی حکم نہیں بھیجا گیا تھا۔ ہندوستانی لیڈر اکثر اس محکمے کے افسروں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار سیٹھ طیب جی حاجی خان محمد افسر اعلیٰ سے ملنے گئے تو انہیں نے پوچھا کہ یہ گاندھی کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟ سیٹھ طیب نے کہا ''وہ ہمارے مشیر ہیں اور ہمارے بلانے پر آ گئے ہیں۔''

صاحب بہادر نے پوچھا۔ ''پھر ہم لوگ کس لیے ہیں؟ ہم اسی لیے تو مقرر کیے گئے ہیں کہ تمہارے حقوق کی حفاظت کریں۔ گاندھی کو یہاں کے حالات کی کیا خبر؟'' طیب سیٹھ سے جو کچھ جواب بن پڑا انہوں نے دیا۔

''بیشک آپ ہماری حمایت کے لیے موجود ہیں۔مگر گاندھی ہمارے آدمی ہیں۔ وہ ہماری زبان جانتے ہیں اور ہماری طبیعتوں کو سمجھتے ہیں۔آپ لاکھ کچھ ہوں پھر بھی سرکاری عہدیدار ہیں۔''

صاحب بہادر نے طیب سیٹھ کو حکم دیا کہ مجھے لے جا کر ان کے سامنے پیش کریں۔میں سیٹھ طیب اور کچھ اور لوگوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔کسی سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا گیا۔ہم سب کھڑے رہے۔

صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔''تم یہاں کیوں آئے؟''

میں نے جواب دیا۔''میں اپنے ہموطنوں کے کہنے سے آیا ہوں کہ انہیں مشورہ دوں۔''

''مگر کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ٹرانسوال آنے کا کوئی حق نہیں؟ جو پروانہ تمہارے پاس ہے وہ غلطی سے دے دیا گیا تھا۔تم نو آباد ہندوستانی قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ تمہیں فوراً واپس جانا پڑے گا۔مسٹر چمبر لین سے ملنے کی اجازت نہیں جائے گی۔'' ایشیائی محکمہ'' خاص طور سے ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔اچھا اب تم جاؤ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے بغیر جواب کا موقع دیئے رخصت کر دیا مگر میرے ساتھیوں کو روک لیا۔ان لوگوں کو انہوں نے خوب ڈانٹا اور کہا گاندھی کو رخصت کر دو۔

وہ کھسیائے ہوئے لوٹے۔اب ہمارے سامنے ایسی صورت حال تھی جس کے لیے ہم بالکل تیار نہ تھا۔

............☆☆............

ذلت چپ چاپ سہہ لی

مجھے اس توہین سے بڑی تکلیف ہوئی مگر میں پہلے بہت ذلتیں اٹھا چکا تھا اور ان کا عادی ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ یہ ذلت بھی چپ چاپ سہہ لوں گا اور جو کچھ کروں گا صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد کروں گا۔

''ایشیائی محکمے'' کے افسر اعلیٰ کے یہاں سے ایک خط آیا کہ چونکہ گاندھی ڈربن میں مسٹر چمبرلین سے مل چکے ہیں اس لیے ان کا نام اس وفد سے خارج کر دیا گیا۔ جواب موصوف کی خدمت میں جانے والے ہیں۔

اس خط کو دیکھ کر میرے رفیقوں میں ضبط کی تاب نہیں رہی۔ انہوں نے یہ تجویز کی کہ وفد کا خیال ہی ترک کر دیا جائے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''یہ مناسب نہیں اگر آپ لوگ اپنے مطالبہ مسٹر چمبرلین کے سامنے پیش نہ کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ کے کوئی مطالبات ہی نہیں ہیں۔ اصل چیز تو عرضداشت ہے اور وہ لکھی جا چکی ہے اسے میں پڑھی یا کوئی اور بات ایک ہی ہے۔ مسٹر چمبرلین ہم سے بحث تو کریں گے نہیں۔ میرے خیال میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس ذلت کو چپ چاپ سہہ لیں۔''

ابھی میں نے بات ختم نہ کی تھی کہ طیب سیٹھ بول اٹھے ''کیا تمہاری ذلت ساری برادری کی ذلت نہیں ہے؟ آخر تم ہمارے نمائندے ہو یا نہیں؟''

میں نے جواب دیا ''یہ بالکل بجا ہے۔ مگر اس طرح کی ذلتیں برادری کو بھی سہنا پڑیں گی۔ سوائے اس کے چارا ہی کیا ہے؟''

طیب سیٹھ نے کہا ''چاہے جو کچھ ہو مگر ہمیں یہ ذلت برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ آخر کوئی ہمارا کر کیا لے گا؟ ہمارے ایسے کون سے بہت حقوق ہیں جو چھن جائیں گے؟''

مجھے یہ تیکھا جواب پسند آیا مگر میں جانتا تھا کہ اسے تیکھے پن سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اپنی برادری کی کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ میں نے اپنے دوست کو دھیما کیا اور انہیں یہ صلاح دی کہ میری جگہ مسٹر گاڈفرے (ایک ہندوستانی بیرسٹر) کو لے جائیں۔

چنانچہ مسٹر گاڈفرے کی سرکردگی میں وفد گیا۔ مسٹر چمبرلین نے اپنے جواب میں میرے واقعے کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے تالیف قلوب کی غرض سے کہا ''کیا یہ بہتر نہیں کہ بار بار ایک ہی نمائندے کے آنے کے بجائے اب کے نیا شخص آیا ہے؟''

مگر ان باتوں سے بجائے اس کے کہ کوئی فیصلہ ہو میرا اور میری برادری کا کام اور بڑھ گیا۔ ہمیں نئے سرے سے ابتدا کرنی پڑی۔

لوگ مجھے یہ کہہ کر طعنے دینے لگے ''تمہارے ہی کہنے سے برادری نے لڑائی میں مدد کی تھی۔ اب تم ہی دیکھو کہ اس کا کیا نتیجہ ہوا۔'' مگر مجھ پر اس طعن کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں نے جو مشورہ دیا تھا اس کا مجھے ذرا بھی افسوس نہیں۔ میرے نزدیک تو ہم لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ جنگ میں شریک ہوئے۔ یہ ہمارا فرض تھا جو ہم نے ادا کر دیا۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنی محنت کے معاوضے کی توقع رکھیں۔ مگر مجھے دل سے یقین ہے کہ اچھے کام کا پھل ضرور ملتا ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب ہمیں آئندہ کی فکر کرنی چاہیے۔'' اس بات سے سب نے اتفاق کیا۔

پھر میں نے کہا۔ ''سچ پوچھیے تو جس کام کے لیے آپ نے مجھے بلایا تھا وہ اب ختم

ہو گیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے بھی ٹرانسوال ہی میں رہنا چاہیے۔ گو آپ مجھے واپسی کی اجازت بھی دے دیں۔ بجائے نٹال میں رہ کر کام کرنے کے اب میرے لیے یہیں رہنا مناسب ہے۔ مجھے ایک سال کے اندر ہندوستان واپس جانے کا خیال چھوڑ کر ٹرانسوال کی عدالت عالیہ سے اجازت لے لینی چاہیے۔ مجھے اپنے اوپر بھروسہ ہے کہ اس نئے محکمے سے اچھی طرح نبٹ لوں گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہماری برادری خوب لٹے گی۔ اور ہمارا اس ملک میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ روز نئی ذلتوں کا سامنا ہوگا۔ مسٹر چمبر لین کا مجھ سے نہ ملنا یا اس عہدے دار کا اہانت آمیز برتاؤ اس ذلت کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جو ہماری برادری کو اٹھانا پڑے گی۔ ہم سے یہ چاہا جائے گا کہ ہم کتوں کی سی زندگی بسر کریں اسے ہم کیونکر برداشت کریں گے۔"

غرض میں نے ہر چہ باداباد کہہ کر کام شروع کر دیا اور پریٹوریا اور جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں سے مشورہ کر کے جوہانسبرگ میں اپنا دفتر قائم کر دیا۔

مجھے ٹرانسوال کی عدالت عالیہ سے وکالت کی اجازت ملنا بہت مشتبہ تھا مگر مجلس وکلاء نے میری درخواست کی مخالفت نہیں کی اور عدالت نے منظوری دے دی۔

دفتر کے معاملے میں یہ دشواری تھی کہ اچھے محلوں میں کسی ہندوستانی کو مکان نہیں ملتا تھا۔ مگر میرا وہاں کے ایک تاجر مسٹر رچ سے میل جول ہو گیا تھا۔ ان کے ایک ملاقاتی مکانوں کے ایجنٹ تھے۔ ان کی مہربانی سے مجھے شہر کے اس حصے میں جہاں عدالتیں تھیں، معقول کمرے مل گئے اور میں نے وکالت شروع کر دی۔

............☆☆............

جوشِ ایثار میں ترقی

ٹرانسوال میں تو آباد ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے جو لڑائی لڑنا پڑی اور ایشیائی محکمے سے جو معرکے پیش آئے ان کے بیان سے پہلے مجھے اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا تھوڑا سا ذکر کر دینا چاہیے۔

اب تک میرے دل میں ایک دورنگی سی تھی۔ آثار کے جوش کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ آئندہ کے لیے کچھ سرمایہ جمع کر لوں۔

جس زمانے میں میں نے بمبئی میں اپنا دفتر قائم کیا تھا وہاں ایک امریکی بیمہ ایجنٹ آیا۔ یہ ایک خوش رو اور شیریں زباں شخص تھا اور مجھ سے اس طرح گھل مل کے باتیں کرنے لگا جیسے برسوں کا دوست ہو۔ اس نے میری آئندہ زندگی کی فلاح و بہبود کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''امریکہ میں آپ جیسی حیثیت کے لوگ سب اپنی زندگی کا بیمہ کراتے ہیں۔ آپ کو بھی آئندہ کی فکر کر لینا چاہیے۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟ ہم امریکہ والے بیمہ کرانا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ میرا کہنا مانیے اور ایک چھوٹی سی بیمہ پالیسی خرید لیجیے۔''

اس سے پہلے مجھے جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں جتنے بیمہ ایجنٹ ملے میں نے سب کو سوکھا ٹال دیا تھا۔ کیونکہ میں زندگی کا بیمہ کرانے کو بزدلی اور منافی توکل سمجھتا تھا۔ مگر اس وقت مجھ پر اس امریکی ایجنٹ کا جادو چل گیا۔ ادھر وہ یہ گفتگو کر رہا تھا اور ادھر میری نظروں میں بیوی بچوں کی تصویر پھر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا'' بھلے آدمی تو نے اپنی بیوی کا سارا زیور ٹھکانے لگا دیا۔ کل کو تجھے سانحہ پیش آ جائے تو

تیزی بیوی بچوں کی کفالت غریب بھائی کے سر ہو گی جس نے اپنے اوپر تکلیفیں اٹھا کر تجھے بیٹے کی طرح رکھا۔اس وقت تجھے شرم تو نہ آئے گی؟'' اس قسم کی دلیلوں سے میں نے اپنے دل کو سمجھایا اور دس ہزار روپے کی پالیسی خرید لی۔

مگر جنوبی افریقہ پہنچ کر میری زندگی بدل گئی اور اسی کے ساتھ خیالات بھی بدلے۔اس امتحان کے وقت میں نے جو کچھ کیا خدا کے لیے کیا اور اسی کے بھروسے پر کیا۔مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ جنوبی افریقہ میں کب تک رہنا ہے۔یہ ڈر تھا کہ شاید کبھی ہندوستان واپس نہ جا سکوں۔اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ بیوی بچوں کو ساتھ رکھنا چاہیے تاکہ وہ میری جدائی میں نہ تڑپیں اور صرف اتنا کمانا چاہیے کہ ان کی پرورش کے لیے کافی ہو جائے۔ان خیالات کے سبب میں بہت پچھتایا کہ میں نے بیمہ ایجنٹ کے فقروں میں آ کر پالیسی خرید لی۔میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میرے بھائی واقعی باپ کے برابر ہیں تو ضرورت کے وقت میری بیوہ کی پرورش ان پر ہرگز بار نہ ہو گی اور آخر یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ مجھے دوسروں سے پہلے موت آ جائے گی؟ حافظِ حقیقی خداوند تعالیٰ کی ذات ہے میری یا میرے بھائی کی کیا بساط ہے۔میں نے اپنی زندگی کا بیمہ کرا کر اپنے بیوی بچوں کو اپنے بل سے محروم کر دیا۔انہیں کیوں نہ ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ آخر دنیا میں اتنے غریب آدمی مرتے ہیں ان کے بیوی بچے کیسے بسر کرتے ہیں؟ میں بھی اپنے آپ کو ان میں سے کیوں نہ سمجھ لوں؟

اس قسم کے بیشمار خیالات میرے دل میں آئے مگر ان پر فوراً عمل نہیں کیا۔مجھے یاد ہے کہ میں نے جنوبی افریقہ میں بیمہ پالیسی کی کم از کم ایک قسط ضرور ادا کی تھی۔

مگر خارجی واقعات سے میرے ان خیالات کو اور مدد ملی۔پہلی بار جنوبی افریقہ کے قیام کے زمانے میں میرے دل میں مذہبی احساس کو عیسائیوں کے اثر نے قائم

کر رکھا تھا۔ اس مرتبہ تھیوسوفی اثر نے اسے گہرا کر دیا اور مسٹر رچ تھیوسوف نے اور ان کے ذریعے سے میری رسائی جوہانسبرگ کی تھیوسوفی جماعت میں ہوئی۔ مجھے اس کے عقائد سے بہت سی باتوں میں اختلاف تھا اس لیے میں اس کا ممبر تو نہیں ہوا مگر مجھے قریب قریب کل تھیوسوفیوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا۔ میری ان سے روزانہ مذہبی بحث ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تھیوسوفی کتابیں پڑھتی جاتی تھیں۔ اور ایک آدھ بار مجھے ان کے جلسوں میں تقریر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ تھیوسوفی میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اخوت کے اصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر اکثر بحث ہوتی تھی اور اگر مجھے کسی بات میں ممبروں کا عمل ان کے نصب العین کے منافی معلوم ہوتا تھا تو میں ان پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اس تنقید سے مجھے بھی فائدہ پہنچا۔ اس کی بدولت مجھے مشاہدہ نفس کا موقع ملا۔

............☆☆............

مشاہدۂ نفس کا نتیجہ

1993ء میں جب مجھے عیسائی دوستوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا میں محض مبتدی تھا۔ یہ لوگ انتہائی کوشش کرتے تھے کہ مجھے مسیح کا پیام سمجھا کر ان کا پیرو بنالیں۔ میں کھلے دل سے ادب اور عاجزی کے ساتھ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ اسی کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

1903ء میں صورت حال ذرا بدل گئی تھی اب تھیوسوف دوست مجھے اپنی صحبت میں کھینچ لاتے تھے مگر ان کی غرض یہ تھی کہ مجھ سے ہندو دھرم کے متعلق کچھ معلومات حاصل کریں۔ تھیوسوفی کتابیں ہندو دھرم کے اثرات سے بھری ہوئی ہیں۔ ان دوستوں کو یہ بہت توقع تھی کہ مجھ سے انہیں ان کتابوں کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میری سنسکرت کی استعداد بہت معمولی ہے۔ میں نے ہندو دھرم کی اصلی کتابوں کی مطالعہ نہیں کیا اور ترجمے بھی بہت سرسری طور پر پڑھے ہیں۔ مگر چونکہ وہ ''سمسکار'' (پہلے جنم کے اثرات) اور ''پنرجنم'' (دوبارہ پیدا ہونے) کے قائل تھے اس لیے انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور دے سکوں گا۔ غرض میری وہ مثل تھی کہ اندھوں میں کانا راجا۔ میں نے بعض دوستوں کے ساتھ سوامی دیویکانند کی ''راج یوگ'' اور بعض اور ساتھ م، ن دیویدی کی ''راج یوگ'' کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک دوست کے ساتھ پتن جلی کی ''یوگ شاستر'' اور کچھ اور حضرت کے ساتھ ''بھگوت گیتا'' بھی پڑھتا تھا۔ ہم سب طالبان حق نے ایک کلب سا بنا لیا جہاں سب مل کر پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ گیتا کا میں پہلے ہی سے

معتقد تھا اور میرے دل کو اس سے ایک خاص تعلق تھا۔ اب مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اس کا اور گہرا مطالعہ کروں۔ میرے ساتھ دو ایک ترجمے تھے جن کی مدد سے میں اصل سنسکرت متن کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور روز دو ایک اشلوک زبانی یاد کر لیتا تھا۔ اس کے لیے میں نے صبح کا وقت مخصوص کر لیا۔ مجھے روز دانت مانجھنے میں پندرہ منٹ اور نہانے میں بیس منٹ لگتے تھے۔ اسی دوران میں گیتا کے اشلوک یاد کرتا تھا۔ کاغذ کے پرچوں پر لکھ کر چپکا دیتا تھا اور اشلوک پڑھتے پڑھتے جہاں بھولتا تھا ان پرچوں کو دیکھ لیتا تھا۔ اتنا وقت روز کا سبق یاد کرنے اور آموختہ دہرانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس طرح تیرہ باب حفظ کر لیے تھے مگر کچھ دن بعد اور کاموں کے ہجوم میں یہ مشغلہ چھوٹ گیا۔ ستیا گرہ کا بیج بونے کے بعد میرا سارا وقت اسی پودے کے سینچنے میں صرف ہونے لگا اور اب تک ہوتا ہے۔

گیتا کے مطالعہ کا میرے دوستوں پر جو اثر ہوا ہے اسے وہی بتا سکتے ہیں مگر میرے لیے تو یہ کتاب قانون عمل بن گئی ہے۔ روزمرہ کے کاموں میں اس کا حوالہ یوں ڈھونڈھتا تھا۔ جیسے کوئی لغت دیکھا کرتا ہے۔ جس طرح مشکل انگریزی الفاظ کے معنی ہیں انگریزی کی ڈکشنری سے نکالتا تھا اسی طرح اپنی عملی مشکلوں کو اس قاموس اخلاق سے حل کرتا تھا۔ ''اپری گرہ'' (ترک املاک) اور ''سمبھو'' (عدل) جیسے الفاظ میرے دل کو مسخر کر لیتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ یہ ''عدل'' اختیار کیونکر کیا جائے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس حکم کے کیا معنی ہیں کہ میں ان دل آزار، بدتمیز، رشوت خور عہدے داروں سے جو کل تک میرے رفیق تھے اور آج میری راہ میں بے کار روڑے اٹکا رہے تھے اسی طرح پیش آؤں جیسے اپنے پرانے محسنوں سے؟ اور انسان کل املاک کو کیونکر ترک کر سکتا ہے؟ خود ہمارا جسم بھی تو ہماری ملک ہے؟

بیوی بچے بھی تو املاک میں داخل ہیں؟ کیا میں اپنی کتابوں کی الماری کو آگ لگا دوں ؟ کیا میں اپنی کشتی پھونک دوں اپنا گھر بار لٹا دوں اور اس کے پیچھے ہو لوں؟'' میرے دل کی گہرائیوں سے یہ جواب ملا۔میرا قانون انگلستان کا مطالعہ اس وقت بہت کام آیا۔ مجھے اسٹیل کی بحث اصول عدالت پر یاد آ گئی۔ میں اس میں ''ٹرسٹی'' (امین یا متولی) کا لفظ دیکھا کرتا تھا مگر اس کا صحیح مفہوم اب جا کر گیتا کی تعلیم کی بدولت سمجھ میں آیا۔ میں نے گیتا کے ''ترک املاک'' کے حکم کا مطلب یوں سمجھا کہ جو لوگ نجات ابدی چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے مال سے ٹرسٹی کا سا تعلق رکھیں جو بڑی بڑی رقموں اور جائیدادوں کا انتظار کرتا ہے مگر اس میں سے ایک کوڑی کو بھی اپنی ملک نہیں سمجھتا۔ مجھ پر یہ بات اچھی طرح روشن ہو گئی کہ ''املاک'' اور ''عدل'' کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنا طرز خیال بالکل بدل دے۔

میں نے ریوا شنکر بھائی کو لکھا کر بیمہ پالیسی کو ضبط ہو جانے دیں۔ اگر کچھ مل جائے تو لے لیں۔ ورنہ جتنی قسطیں دی جا چکی ہیں ان سے ہاتھ دھو لیں کیونکہ اب میرا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ وہ خدا جس نے مجھے اور میری بیوی بچوں کو پیدا کیا ہے، ان کو رزق پہنچائے گا۔ اپنے بھائی کو جنہوں نے مجھے ہمیشہ بیٹے کی طرح رکھا تھا میں نے یہ اطلاع دی کہ اب تک میں اپنا اندوختہ آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ مگر اب آپ مجھ سے کچھ توقع نہ رکھیے۔ کیونکہ اب میں جو کچھ جمع کروں گا وہ ہندوستانی برادری کی بہبود کے لیے صرف کیا جائے گا۔

بھائی کو اس فیصلہ کے وجوہ سمجھانے میں مجھے بڑی دقت ہوئی۔ انہوں نے خفگی کے الفاظ میں مجھے میرے فرائض اور اپنے حقوق سے آگاہ کیا۔ انہوں نے لکھا کہ تمہیں والد سے زیادہ دانشمند بننے کا حوصلہ نہیں کرنا چاہیے اور جس طرح میں

خاندان کی مدد کرتا ہوں تمہیں بھی کرنی چاہیے۔ میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ میں بھی وہی کر رہا ہوں جو والد کیا کرتے تھے۔ آپ خاندان کے مفہوم کو کسی قدر وسیع کر دیجیے تو میرے طرز عمل کی مصلحت سمجھ میں آجائے گی۔

بھائی صاحب میری طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے خط و کتابت بند کر دی۔ مجھے بہت رنج ہوا مگر جس چیز کو میں اپنا فرض سمجھتا تھا اسے چھوڑ دیتا تو اس سے بڑا کر رنج ہوتا۔ اس لیے میں اپنی بات پر قائم رہا۔ مگر مجھے ان سے جو محبت اور عقیدت تھی اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ انہیں زیادہ صدمہ اسی لیے تھا کہ وہ مجھ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ میرے روپے کی انہیں اتنی پروا نہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں اپنے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ مگر آخری وقت میں انہیں میرے نقطہ نظر کی قدر ہوئی۔ بستر مرگ پر انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ ایک دردناک خط میں انہیں نے مجھ سے اس انداز میں معذرت کی جیسے باپ بیٹے کے آگے اظہار ندامت کرتا ہے اور لکھا کہ میں اپنے بیٹوں کو تمہارے سپرد کرتا ہوں جس طرح جی چاہے ان کی تربیت کرو۔ پھر ان کا تار آیا کہ میں جنوبی افریقہ آنا چاہتا ہوں۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ ضرور تشریف لائیے۔ مگر تقدیر کو یہ منظور نہ تھا روانگی سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بیٹوں کے بارے میں بھی ان کی خواہش پوری نہ ہونے پائی۔ ان لوگوں نے پرانی فضا میں پرورش پائی تھی اور اب وہ اپنا طرز زندگی بدل نہیں سکتے تھے۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے مانوس ہو جائیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ ہر شخص کی طبیعت ایک دریا ہے جس کے دھارے کو وہ روکنا بھی چاہے تو نہیں روک سکتا۔ پیدائش کے وقت اس کے دل کی لوح پر جو گہرے نقوش ہوتے ہیں وہ اس کے مٹائے نہیں

مٹتے۔ یہ امید فضول ہے کہ کسی کو اولاد یا وہ بچے جو اس کے ولایت میں ہیں اسی راہ ارتقاء پر چلیں گے جس پر وہ خود چلتا ہے۔

اس مثال سے کسی قدر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب اولاد ہونا کتنی بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔

............☆☆............

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

نباتاتی مشرب کے لیے ایک قربانی

جوں جوں میں سادگی اور ایثار کے نصب العین سے قریب تر ہوتا جاتا تھا میری روزمرہ زندگی میں احساس اور نباتات مشرب کی تبلیغ کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے تبلیغ کا صرف ایک ہی طریقہ معلوم ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے عمل کی مثال پیش کرے اور جو لوگ حق کے طالب ہیں ان سے بحث مباحثہ کرے۔

جوہانسبرگ میں ایک جرمنے نے جو کوہنے کے ''پانی کے علاج'' کا قائل تھا ایک نباتاتی ریستوران قائم کیا تھا۔ میں خود اس ریستوران میں جاتا اور اپنے انگریز دوستوں کو بھی لے جاتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ یہ ریستوران چلنے والا نہیں کیونکہ یہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتا ہے۔ میں اسے جتنی مدد کا مستحق سمجھتا تھا اس میں میں نے دریغ نہیں کیا مگر آخر میں اس کے مالک کو ریستوران بند ہی کرنا پڑا۔

اکثر تھیوسوف کم وبیش نباتاتی مشرب رکھتے ہیں۔ ایک باہمت خاتون نے جو تھیوسوفی انجمن کی ممبر تھیں اور ایک نباتاتی ریسوران بڑے پیانے پر کھولنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کی طبیعت کو اس کام سے مناسبت نہ تھی۔ وہ فنون لطیفہ کی شائق، فضول خرچی کی عادی اور حساب کتاب سے ناواقف تھیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ انہوں نے ابتداء میں چھوٹا سا ریستوران کھولا تھا۔ مگر اب وہ یہ چاہتی تھیں کہ اس کے لیے بڑا مکان لیں اور اسے وسیع پیانے پر لے آئیں۔ انہوں نے مجھ سے اس کام میں مدد مانگی۔ مجھے اس وقت تک ان کی مالی حالت معلوم نہیں تھی۔ میں نے ان کے اعتبار پر یہ سمجھ لیا کہ جو تخمینہ انہوں نے بتایا ہے صحیح ہے۔ میرے لیے ان

کی مدد کرنے کی ایک صورت بھی نکل آئی۔ میرے موکل میرے پاس بڑی بڑی رقمیں رکھوایا کرتے تھے۔ ان میں ایک سے اجازت لے کر میں نے اس کی طرف سے ایک ہزار پونڈ ان خاتون کو قرض دے دیئے۔ یہ بڑا والا آدمی تھا اور جس پر اعتبار کرتا تھا اس پر پوری طرح کرتا تھا۔ یہ ابتداء میں ''پابند مزدور'' کی حیثیت سے جنوبی افریقہ آیا تھا۔ جب میں نے اس سے روپیہ قرض دینے کی اجازت مانگی تو اس نے کہا ''آپ کا جی چاہے تو یوں ہی دے ڈالیے۔ میں ان باتوں کو نہیں جانتا۔ میں تو آپ کو جانتا ہوں'' اس شخص کا نام بدری تھا۔ اس نے آگے چل کر ستیا گرہ میں بہت نمایاں حصہ لیا اور قید بھی بھگتی۔ غرض میں نے اس اجازت کو کافی سمجھ کر روپیہ قرض دے دیا۔

دو تین مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ روپیہ واپس ملنے کی کوئی امید نہیں۔ میرے لیے اس نقصان کو برداشت کرنا سہل نہ تھا مگر روپیہ تو ڈوب ہی گیا تھا۔ اتنے روپے سے میرے بہت سے کام چلتے۔ میں نے سوچا بے چارہ بدری جو مجھ پر اتنا اعتبار کرتا ہے کیوں نقصان اٹھائے۔ اس نے تو میرے بھروسے پر دیا تھا۔ میں نے رقم اپنے پاس سے ادا کر دی۔

ایک موکل نے جس سے میں نے اس معاملے کا ذکر کیا تھا، مجھے بہت ملامت کی۔ انہوں نے کہا ''بھائی'' خوش قسمتی سے میں اس وقت تک ''مہاتما'' کیا ''باپو'' بھی نہیں کہلاتا تھا۔ میرے دوست مجھے ''بھائی'' کے پیارے لقب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھے۔ یہ تو سوچیے کہ ہم لوگ آپ پر کتنا بھروسہ کرتے ہیں۔ اب اس رقم سے ہاتھ دھو رکھیے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آپ بدری کا نقصان نہ ہونے دیں گے اور یہ روپیہ اپنے پاس سے بھریں گے لیکن آپ اپنے

اصلاحی کاموں کی امداد موکلوں کے روپے سے کرتے رہے تو ایک دن یہ بے چارے بھی تباہ ہو جائیں گے اور آپ بھی بھیک مانگنے لگیں گے۔ آپ ہمارے رہنما میں اگر آپ کی یہ نوبت ہوئی تو ہمارا سارا قومی کام رک جائے گا۔

یہ دوست خدا کے فضل سے اب تک زندہ ہیں۔ میں نے جنوبی افریقہ میں بلکہ کہیں بھی ان سے بڑھ کر پاک نفس آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر انہیں کسی شخص پر شبہہ ہو جائے اور ان کا شبہہ بے بنیاد ثابت ہو تو وہ جا کر اس سے معافی مانگتے تھے اور عرق ندامت سے اپنے دل کو دھو کر پاک کرتے تھے۔

ان کی تنبیہہ بالکل بجا تھی۔ میں نے بدری کے نقصان کی تلافی کر دی۔ لیکن اگر پھر کسی معاملے میں اس طرح نقصان ہوتا تو میں ہزار پونڈ کہاں سے لاتا؟ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے قرض لینا پڑتا جو میں نے آج تک کبھی نہیں لیا اور جس سے مجھے سخت نفرت ہے۔ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ اصلاح کے جوش میں بھی انسان کو جائز حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ میں نے اپنے موکل کی احسان مندی سے فائدہ اٹھا کر اس کا روپیہ قرض دے دینے میں گیتا کے اس اہم ترین حکم کی خلاف ورزی کی تھی کہ عادل کو کسی کام میں معاوضے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ ٹھوکر میرے لیے شمع ہدایت بن گئی۔

یہ قربانی جو میں نے نباتاتی مشرب کے لیے کی جان بوجھ کر نہیں کی اور نہ مجھے پہلے سے اس کی خبر تھی، یہ تو مارے باندھے کی نیکی تھیں۔

............☆☆............

مٹی پانی کے علاج کے تجربے

میری زندگی میں جتنی سادگی بڑھتی گئی اسی قدر میرا دل دواؤں سے پھرتا گیا۔ جن دنوں میں ڈربن میں وکالت کرتا تھا مجھے کچھ عرصے تک گنٹھیا کی شکایت رہی جس کے سبب سے بدن سوج گیا اور نقاہت بہت بڑا گئی۔ مگر ڈاکٹر پ۔ج۔مہتا کے علاج سے صحت ہوگئی اور اس کے بعد سے ہندوستان جانے تک کبھی کوئی ایسی شکایت نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو۔

مگر جوہانسبرگ آنے کے بعد مجھے اکثر قبض اور درد سر رہتا تھا۔ کھانے میں احتیاط رکھنے سے اور کبھی کبھی ملین دواؤں کے استعمال سے میری طبیعت سنبھلی رہی۔ مگر اس حالت میں میں اپنے آپ کو تندرست نہیں کرسکتا تھا۔ اور اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح ملین دواؤں کے جنجال سے نجات ملے۔

اسی زمانے میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا کہ مانچسٹر میں ایک انجمن ان لوگوں کی بنی ہے جنہوں نے ناشتہ ترک کردیا ہے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ انگریز بار بار کھاتے ہیں اور بہت کھاتے ہیں، صبح سے آدھی رات تک کھانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹروں کی فیس دیتے دیتے ان کا دیوالیہ نکل جاتا ہے اگر انہیں اس کی اصلاح منظور ہے تو انہیں کم سے کم ناشتہ ترک کردینا چاہیے۔ اگر چہ میری حالت انگریزوں جیسی نہ تھی پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک حد تک یہ الزام مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں دن میں تین بار پیٹ بھر کے کھانا کھاتا اور سہ پہر کی چائے اس کے علاوہ تھی۔ میں ہمیشہ سے خوش خوراک واقع ہوا تھا اور جتنے مزے دار نباتاتی

کھانے بے مرچ مسالے کے پک سکتے تھے سب اڑایا کرتا تھا۔ میں صبح چھ سات بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا تھا اور چند گھنٹے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت آجایا کرتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں بھی ناشتہ چھوڑ دوں۔ شاید اس طرح سے سر کا درد جاتا رہے۔ میں نے اس کا تجربہ کیا۔ چند روز تک ذرا بھوک کی تکلیف تو رہی مگر سر کا درد بالکل جاتا رہا۔ اس لیے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میری غذا ضرورت سے زیادہ تھی۔

مگر ناشتے کے ترک کرنے سے قبض کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے کوہنے کے ''کمر اور کولہے کے غسل'' کا تجربہ کیا۔ اس سے کچھ تخفیف تو ہوئی مگر پوری طرح ازالہ نہیں ہوا۔ اس اثنا میں اس جرمن نے جو ریستوران کا مالک تھا یا کسی اور دوست نے مجھے جسٹ کی کتاب ''رجوع بہ فطرت'' دی۔ اس کے پڑھنے سے مجھے مٹی کے علاج کا طریقہ معلوم ہوا۔ مصنف نے اس پر بھی زور دیا تھا کہ تازے پھل اور نٹ (اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ) انسان کی قدرتی غذا ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کیا کہ سوائے پھلوں کے اور سب چیزیں یک لخت چھوڑ دی ہوں مگر مٹی کا علاج فوراً شروع کر دیا اور اس سے حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ علاج کا طریقہ یہ تھا کہ ایک باریک کپڑے کی پٹی لے کر اس پر صاف مٹی کی تہہ جما دی اور اسے پانی سے تر کر کے پیٹ پر باندھ لیا۔ میں سوتے وقت یہ پٹی باندھ لیتا تھا اور صبح کو یا رات میں جس وقت آنکھ کھلے کھول ڈالتا تھا۔ یہ تدبیر تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اس کے بعد میں نے بارہا اس علاج کا تجربہ خود کیا اور اپنے دوستوں کو کرایا ہے اور ہمیشہ فائدہ ہوا۔ ہندوستان میں مجھے اس کا پورا تجربہ کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ایک جگہ جم کر رہنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر مجھے اس پر اب بھی وہی عقیدہ ہے جو پہلے تھا۔ آج بھی میں ایک حد تک اور

مٹی پانی کے علاج پر عامل ہوں اور ضرورت کے وقت اپنے دوستوں کو بھی یہی بتاتا ہوں۔ گو میں اپنی عمر میں دو بار سخت بیمار ہوا مگر میرا عقیدہ ہے کہ انسان کو دواؤں کے استعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہزار مریضوں میں سے نوسو ننانوے محض غذا میں احتیاط کرنے، مٹی پانی کے علاج اور اسی قسم کے گھریلو چٹکلوں سے اچھے ہو سکتے ہیں۔ جو شخص ذرا ذرا سی بات کے لیے ڈاکٹر، وید یا حکیم کے پاس دوڑا جاتا ہے اور دنیا بھر کی نباتاتی اور معدنی دوائیں نگلا کرتا ہے اس کی زندگی ہی نہیں گھٹ جاتی بلکہ وہ اپنے جسم کا غلام بن کر ضبط نفس کھو دیتا ہے اور انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔

میں یہ باتیں اس وقت لکھ رہا ہوں جب میں خود بستر علالت پر ہوں۔ مگر اس بنا پر کسی کو ان کی سچائی میں شبہ نہیں کرنا چاہیے مجھے اپنی بیماری کے اسباب معلوم ہیں۔ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ اس میں سراسر میرا ہی قصور ہے اور اسی احساس کی وجہ سے میں بے صبری نہیں بلکہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے میری غلطیوں پر تنبیہہ کر دیا اور ہر قسم کی دواؤں سے پرہیز کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری اس ضد سے میرے معالج ڈاکٹروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر ان کی مہربانی ہے کہ وہ ان باتوں کو برداشت کرتے ہیں اور میرے علاج سے دست کش نہیں ہوتے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب مجھے اصل قصے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مگر اس سے پہلے اس کتاب کے پڑھنے والوں کو متنبہہ کر دینا ضرورت سمجھتا ہوں۔ جو لوگ اس باب کے مطالعے کی بناء پر جسٹ کی کتاب خریدیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے حرف بحرف صحیح ہے۔ جو شخص کوئی کتاب لکھتا ہے وہ اکثر ایک خاص نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے حالانکہ ہر مسئلہ پر غور کرنے کے مختلف نقطہ نظر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر نقطہ نظر اپنی اپنی جگہ صحیح ہو مگر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی

صورت حال میں سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی کتابیں خریدار بہم پہنچانے کے لیے اور نام و نمود کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کو چاہیے کہ بہت سمجھ بوجھ سے کام لیں اور نئے تجربے کرنے سے پہلے کسی تجربہ کار سے مشورہ کر لیں یا خود ہی ان کتابوں کو غور سے پڑھیں کہ ان کے مطالب پر پوری طرح حاوی ہو جائیں اور اس کے بعد ان پر عمل کریں۔

............☆☆............

تنبیہہ

بیچ میں ایسی بات چھڑ گئی ہے کہ مجھے یہ پورا باب اسی کی نذر کرنا پڑے گا۔ مٹی کے علاج کے تجربوں کے ساتھ ساتھ میں غذائیات کے تجربے بھی کرتا رہا۔ یہاں میں ان کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں اور آگے بھی مناسب موقعوں پر ان کی طرف اشارہ کروں گا۔

غذائیات کے تجربوں پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان پر گجراتی میں ایک سلسلہ مضامین لکھ چکا ہوں۔ بہت دن ہوئے یہ مضامین ''انڈین اوپینین'' میں چھپے تھے اور پھر انگریزی میں ''رہنمائے صحت'' کے نام سے ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئے۔ میری مختصر تصانیف بھی بھی رسالہ مشرق اور مغرب میں میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اصل میں یہ ''انڈین اوپینین'' پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کا اثر مشرق اور مغرب میں بہت سے ایسے لوگوں کی زندگی پر پڑا ہے۔ جنہوں نے کبھی ''انڈین اوپینین'' کی شکل تک نہیں دیکھی۔ بہت سے لوگ مجھ سے اس بارے میں خط و کتابت کرتے رہے اور اب تک کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کا ذکر کر دیا جائے۔ میں نے جو خیالات اس میں ظاہر کئے تھے ان پر اب بھی قائم ہوں۔ لیکن میرے عمل میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں جن سے اس رسالے کے پڑھنے والے واقف نہیں ہیں۔ انہیں ان تبدیلیوں سے آگاہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دوسری کتابوں کی طرح میں نے یہ رسالہ بھی روحانی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ میرا ہر عمل اس مقصد کا تابع ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ آج کل میں اس رسالے کے بعض اصولوں پر عمل نہیں کر سکتا۔

میرا قطعی عقیدہ ہے کہ انسان کو بغیر ماں کے دودھ کے جو وہ بچپن میں پیتا ہے دودھ کے استعمال کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس کی غذا میں سوائے دھوپ میں پکے ہوئے پھلوں اور مونگ پھلی، اخروٹ وغیرہ کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے رگ پٹھوں کے لیے جتنی غذا کی ضرورت ہے وہ انگور جیسے تازہ پھل اور بادام جیسے خشک میوے سے حاصل ہو سکتی ہے جو شخص ان چیزوں پر زندگی بسر کرتا ہے اسے شہوت جنسی اور دوسرے جذبات کی روک تھام میں آسانی ہوتی ہے۔ میں نے اور میرے رفیقوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ ہندوستان کی مثل "آدمی جس قسم کی غذا کھائے گا ویسی ہی اس کی طبیعت بن جائے گی" بڑی حد تک صحیح ہے۔ یہی خیالات اس رسالے میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں مجھے اپنے بعض اصولوں کے خلاف عمل کرنا پڑا۔ جن دنوں میں کھیدا میں رنگروٹ بھرتی تھا کھانے میں کچھ بے احتیاطی ہوئی اور میں ایسا بیمار پڑا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ اس بیماری نے میرے جسم کو توڑ دیا اور میں نے لاکھ کوشش کی کہ بغیر دودھ کے قوت آئے مگر کسی طرح کام نہ چلا۔ میں نے اپنی جان پہچان کے سارے ڈاکٹروں، ویدوں اور سائنس دانوں سے پوچھا کہ دودھ کا بدل کیا ہو سکتا ہے۔ بعض نے مونگ پانی بتایا بعض نے مہورا کا تیل اور بادام کا شیرہ تجویز کیا۔ میں نے ان چیزوں کا تجربہ کر کے اپنے جسم کو گھلا ڈالا مگر کسی طرح اتنی قوت نہ آئی کہ بستر سے اٹھ سکوں...... ویدوں نے مجھے چرک پڑھ کر سنائی کہ

دوا و علاج میں مذہبی خدشوں کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے ان سے یہ توقع بے کار تھی کہ مجھے بغیر دودھ کے جینے کی کوئی تدبیر بتائیں گے۔ جب ان کا یہ حال تھا تو وہ لوگ جو گائے کے گوشت کی یخنی اور براڈی تجویز کرتے ہیں مجھے دودھ سے بچنے کی تدبیر کیسے بتا سکتے تھے؟ گائے بھینس کے دودھ کا استعمال کرنے سے تو میں اپنے عہد کی وجہ سے معذور تھا۔ اصل میں عہد کا منشا تو یہی تھا کہ ہر قسم کا دودھ ترک کر دیا جائے مگر کچھ اس خیال سے کہ عہد کرتے وقت میرے پیش نظر گائے اور بھینس کا دودھ تھا اور کچھ اس لیے کہ مجھے زندگی کی خواہش تھی میں نے اپنے دل کو پھسلا کر اس پر راضی کر لیا کہ عہد کے الفاظ کی پابندی پر قناعت کرے اور میں بکری کا دودھ استعمال کرنے لگا۔ جب میں نے پہلی بار بکری کا دودھ پیا تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اپنے عہد کے اصل مقصد کو برباد کر رہا ہوں۔

مگر مجھے اس زمانے میں رولٹ ایکٹ کو منسوخ کرانے کی دھن تھی۔ اس لیے زندگی کی خواہش غالب آ گئی اور میری زندگی کا اہم ترین تجربہ ادھورا رہ گیا۔

مجھے معلوم ہے بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ روح کھاتی پیتی نہیں۔ اس لیے ہمارے کھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انسان پیٹ میں کیا چیز ڈالتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دل و دماغ سے کیا بات نکالتا ہے۔ مگر میں اس کا جواب دینے کے بجائے محض اس پر قناعت کرتا ہوں کہ اپنا دلی عقیدہ ظاہر کر دوں۔ میرے نزدیک طالب حق کے لیے جو خوف خدا میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور دیدار الٰہی کی آرزو رکھتا ہے اپنے خیال اور کلام کی طرح اپنی غذا کے کیف و کم میں بھی ضبط نفس سے بھی کام لینا ضروری ہے۔

مگر جب میں خود اس معاملے میں اپنے اصول پر عمل نہ کر سکا تو مجھے محض

واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ دوسروں کو متنبہ بھی کر دینا چاہیے۔ جن لوگوں نے میرے اصول کے مطابق دودھ کا استعمال چھوڑ دیا ہے انہیں میں تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اسے ترک کر دیں۔ البتہ اگر انہیں اس میں ہر طرح فائدہ محسوس ہوتا ہو یا تجربہ کار طبیبوں کی رائے ہو تو ضرور جاری رکھیں۔ اب تک مجھے ہندوستان کے تجربے سے یہی معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ صاحب فراش ہیں یا جن کا ہاضمہ کمزور ہے ان کے لیے دودھ جیسی ہلکی اور مقوی اور کوئی غذا نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص ہے جسے ان معاملات میں درک ہو، کتابوں کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربے سے مجھے دودھ کا کوئی نباتاتی بدل بتا سکے جو اسی قدر مقوی اور زود ہضم ہو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

............☆☆............

حکومت سے مقابلہ

اب ایشیائی محکمے کا حال سنیے:

اس کے عہدے داروں کا جتنا زور جوہانسبرگ میں تھا اور کہیں نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں، چینیوں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے بجائے الٹا انہیں پیس رہے تھے۔ روزمرہ اس قسم کی شکایتیں سننے میں آتی تھیں ''جو داخلے کے حقدار ہیں وہ داخل نہیں ہونے پاتے اور جنہیں کوئی حق نہیں وہ سو پونڈ دے کر مزے میں چلے آتے ہیں۔ اگر تم اس اندھیر کی روک تھام نہیں کرو گے تو کون کرے گا۔'' میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں دل میں کہتا تھا کہ اگر میں اس بلا کو دور نہ کر سکا تو میرا ٹرانسوال میں رہنا بے کار ہے۔

اس لیے میں نے ان شکایتوں کے ثبوت فراہم کرنا شروع کیے اور جب کافی مسالہ جمع ہو گیا تو میں پولیس کمشنر کے پاس پہنچا۔ وہ منصف مزاج آدمی نکلا۔ مجھے ٹالنے کے بجائے اس نے بہت صبر سے میری باتیں سنیں اور کہا کہ تمہارے اپس جو کچھ ثبوت ہے مجھے دکھاؤ۔ اس نے خود گواہوں کی شہادت سن کر اپنا پورا اطمینان کر لیا۔ مگر وہ بھی جانتا تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ جنوبی افریقہ میں کوئی فرنگیوں کی جیوری کالے آدمیوں کے مقابیل میں گورے افسروں کو ملزم نہیں ٹھہرائے گی۔ مگر اس نے کہا ''کم سے کم ایک بار کوشش تو کرنا چاہیے۔ یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ ایسے مجرموں پر محض اس خوف سے ہاتھ نہ ڈالا جائے کہ جیوری انہیں رہا کر دے گی۔ میں تو انہیں گرفتار کیے بغیر نہ مانوں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے کوئی

دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا۔‘‘

مجھے اس کے بے کہے اس بات کا یقین تھا۔ مجھے بہت سے عہدیداروں پر شبہ تھا مگر چونکہ میرے پاس ان سب کے خلاف قطعی شہادت نہیں تھی اس لیے میں نے صرف دو شخصوں کے نام وارنٹ جاری کرائے جن پر جرم بالکل ثابت تھا۔

میری یہ عادت نہیں کہ اپنی نقل وحرکت پوشیدہ رکھوں۔ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ میں قریب قریب روزانہ پولیس کمشنر کے یہاں جاتا ہوں۔ جن دو عہدیداروں کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری ہوئے تھے انہوں نے مخبر لگا رکھے تھے۔ یہ لوگ میرے دفتر کے گرد چکر کاٹا کرتے تھے۔ اور میری نقل وحرکت کی رپورٹ ان عہدیداروں کو پہنچاتے تھے۔ مگر یہ دونوں اس قدر بدطنیت تھے کہ انہیں جاسوس بھی مشکل سے ملتے ہوں گے۔ ہندوستانی اور چینی تو ان سے اس قدر نالاں تھے کہ انہوں نے ان کی گرفتاری میں پولیس کی امداد کی ورنہ ان کا ہاتھ آنا مشکل تھا۔

ان میں سے ایک تو فرار ہو گیا تھا۔ کمشنر پولیس نے اس کی سپردگی کے لیے وارنٹ جاری کرا کر دوسری حکومت کے پاس بھیجا اور وہ گرفتار کر کے ٹرانسوال لایا گیا۔ ان دونوں کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور باوجود یہ کہ ان کے خلاف بہت قوی شہادت تھی اور جیوری کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں سے ایک فرار ہو گیا تھا مگر دونوں بے قصور قرار دے کر بری کر دیئے گئے۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کمشنر پولیس کو بھی رنج ہوا۔ میرا دل قانون کے پیشے سے پھر گیا بلکہ مجھے سرے سے ذہنی قابلیت سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ روپے کے بدلے مجرموں کے جرم پر پردہ ڈالنے میں صرف کی جاتی ہے۔

مگر ان دونوں عہدیداروں کا جرم اتنا کھلا ہوا تھا کہ ان کے بری ہو جانے پر بھی

حکومت انہیں اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکی۔ دونوں برخاست کر دیئے گئے۔ ایشیائی محکمہ پہلے کے مقابلے میں پاک صاف ہو گیا اور ہندوستانیوں کے تھوڑے بہت آنسو پچھ گئے۔

اس واقعے سے میری دھاک بیٹھ گئی اور میرے پاس کثرت سے مقدمے آنے لگے۔ ہماری برادری جو سینکڑوں پونڈ رشوت کے ہر مہینے دیا کرتی تھی اس میں سے بھی بہت بڑا حصہ بچ گیا۔ سب اس لیے نہیں بچ سکا کہ بے ایمان لوگوں نے اب بھی اپنی حرکتیں نہیں چھوڑیں مگر کم سے کم اتنا ہو گیا کہ اب ایماندار لوگ اپنی ایمانداری رکھ سکتے تھے۔

گو یہ عہدیدار اس قدر بدکردار تھے مگر مجھے ان سے کوئی ذاتی مخالفت نہیں تھی۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ آڑے وقت مجھے انہوں نے اپنا سہارا ڈھونڈا اور میں نے اپنے مقدور بھر ان کی مدد کی۔ انہیں جوہانسبرگ کی میونسپلٹی میں ملازمت مل رہی تھی مگر یہ اسی صورت ممکن تھا کہ میں اس تجویز کی مخالفت نہ کروں۔ ان کے ایک دوست کے کہنے سننے سے میں اس پر راضی ہو گیا کہ اس معاملے میں مزاحمت نہ کروں گا۔ چنانچہ دونوں کو جگہ مل گئی۔

میرے اس طرز عمل کا یہ اثر ہوا کہ جن عہدیداروں سے مجھے سابقہ تھا ان کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا اور باوجود اس کے کہ مجھے اکثر ان کے محکمے میں لڑنا پڑتا تھا اور اکثر سخت سست کہنے کی بھی نوبت آجاتی تھی ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ اس وقت تک مجھے پوری طرح اس بات کا احساس نہ تھا کہ یہ رواداری میری سرشت میں ہے۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ ''ستیا گرہ'' کی جان اور ''اہنسا'' کی شان ہے۔

انسان کی ذات اور اس کے افعال یہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اچھے فعل پر تحسین اور برے پر یقین کرنا چاہیے۔ لیکن فاعل اگر اچھا ہے تو عزت کا برا ہے تو رحم کا مستحق ہے۔ ''نفرت جرم سے نہ کرو۔'' ایسی تعلیم ہے جس کا سمجھنا تو سہل ہے مگر اس پر عمل بہت کم کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نفرت کا زہر دنیا میں پھیل رہا ہے۔

یہی ''اہمسا'' تلاش حق کی بنیاد ہے۔ مجھ پر زور بروز یہ بات روشن ہوتی جاتی ہے۔ کہ حق تک رسائی کی کوشش بے ''اہمسا'' زینے کے بالکل فضول ہے۔ کسی نظام کی مزاحمت یا تخریب کی کوشش جائز ہے مگر اس کے بانی کے آزار کے درپے ہونا خود اپنے ساتھ بدسلوکی کرنا ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بحر حقیقت کا قطرہ ہے اور قطرہ بحر کی طرح نامحدود ہے۔ کسی قطرے کو حقیر سمجھنا دریا کی حقارت کرنا ہے۔۔ کسی بندے کا دل دکھانا ساری خدائی کا دل دکھا دینا ہے۔

ایک گناہ اور اس کی ندامت

میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مجھے مختلف مذہب و ملت کے لوگوں سے سابقہ رہا اور ان تجربوں کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اپنے اور غیر، دیسی اور بدیسی، گورے اور کالے، ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، یہودی میں فرق نہیں کیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میری طبیعت میں اس طرح کا فرق کرنے کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس میں میری کوئی تعریف نہیں کیونکہ میں نے یہ صفت اپنی سعی سے حاصل نہیں کی بلکہ یہ میری سرشت میں ہے۔ برخلاف اس کے ''اہمسا'' ''برہمچاریہ'' ''اپری گرہ'' اور دوسری بنیادی نیکیوں کے حصول کے لیے مجھے مسلسل کوشش کرنا پڑی اور اب بھی کرنا پڑتی ہے۔

جب میں ڈربن میں وکالت کرتا تھا تو میرے دفتر کے محرر اکثر میرے گھر میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض گجراتی ہندو تھے اور بعض تامل عیسائی۔ میں انہیں اپنے عزیزوں کی طرح رکھتا تھا اور میری بیوی کبھی اس میں مزاحمت کرتی تھیں تو میری ان سے ان بن ہو جاتی تھیں۔ ان ہی محرروں میں ایک عیسائی تھا جس کے ماں باپ ''پنچم'' تھے۔

ہمارا مکان مغربی وضع کا تھا۔ اس کے کمروں میں نالیاں نہیں تھیں اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھیں۔ ہر کمرے میں ''پاٹ'' رکھ دیئے گئے تھے۔ مجھے یہ پسند نہ تھا کہ انہیں مہتر تھیں۔ جو محرر ہم لوگوں میں گھل مل گئے تھے وہ اپنے ''پاٹ'' آپ صاف کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ عیسائی محرر نیا نیا آیا تھا اس لیے اس کے کمرے کی صفائی کرنا

ہمارا فرض تھا۔ دوسرے کے "پاٹ" صاف کرنے میں میری بیوی نے کبھی عذر نہیں کیا۔ مگر جو شخص "پنچم" سے عیسائی ہوا تھا اس کا میلا اٹھانا انہیں کسی طرح گوارا نہیں ہوا۔ اس بات پر ہم دونوں میں ان بن ہو گئی۔ ان سے نہ تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ میں اس شخص کا پاٹ اٹھاؤں اور نہ وہ خود اٹھانا پسند کرتی تھیں۔ میری آنکھوں میں آج تک وہ تصور پھرتی ہے کہ وہ پاٹ ہاتھ میں لیے سیڑھی سے اتر رہی ہیں، آنکھیں غصے سے لال ہیں، رخساروں پر آنسو بہہ رہے ہیں اور مجھے برا بھلا کر رہی ہیں مگر مجھے ان سے جو محبت تھی وہ ظلم کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ میں اپنے آپ کو ان کا معلم سمجھتا تھا۔ میری اندھی محبت سے ان کی جان عذاب میں تھی۔

صرف ان کا "پاٹ" اٹھالینا میرے اطمینان کے لیے کافی نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ خدمت خندہ پیشانی سے انجام دیں۔ اس لیے میں نے درشتی کے ساتھ کہا "مجھے اپنے گھر میں بیہودگی پسند نہیں۔"

یہ لفظ ان کے دل میں تیر کی طرح لگے۔

انہوں نے جھنجھلا کر جواب دیا "تمہیں اپنا گھر مبارک ہو مگر میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔"

میں یہ سن کر اپنے آپ میں نہ رہا اور میرے دل میں رحم کا سرچشمہ خشک ہو گیا۔ میں ان بے چاری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا سیڑھی کے سامنے پھاٹک میں لے گیا اور دروازہ کھولنے لگا کہ انہیں باہر دھکیل دوں۔ وہ زار و قطار روتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں "تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی، آدمیت سے گزر جاتے ہو، آخر میں جاؤں کہاں؟

یہاں نہ میرے ماں باپ ہیں نہ بھائی بند ہیں جو میرے سر پر ہاتھ رکھیں۔ میں

تمہاری بیوی ہوں اس لیے تم چاہتے کہ میں ٹھوکریں کھاؤں اور اف نہ کروں، خدا کے لیے ہوش میں آؤ دروازہ بند کرو، لوگ ہمیں اس حالت میں دیکھیں گے تو کہیں گے؟''

بظاہر میں تیس ماہ خان بنا رہا لیکن دل میں بہت شرمندہ ہوا اور میں نے دروازہ بند کر دیا۔ نہ میری بیوی مجھے چھوڑ سکتی تھی نہ میں انہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہم دونوں میں اکثر لڑائیاں ہوئیں مگر ہمیشہ صلح پر خاتمہ ہوا۔ میری بیوی کو اپنے بے مثل صبر و تحمل کی بدولت ہر معرکے میں فتح ہوئی۔

آج میں اس واقعہ کو کسی قدر بے تکلفی سے بیان کر سکتا ہوں کیونکہ یہ اس دور کا ذکر ہے جس سے میں خوش قسمتی سے گزر چکا ہوں۔ اب میں وہ محبت سے اندھا شوہر نہیں ہوں اور نہ اپنی بیوی کا معلم بنتا ہوں۔ اب اگر وہ چاہیں تو مجھے اتنا ہی ستا سکتی ہیں جتنا میں انہیں پہلے ستایا کرتا تھا۔ ہم دونوں میں دوستی ہے جو بہت سے امتحانوں میں پوری اتر چکی اور اب ہم ایک دوسرے کو خواہشات نفسانی کا موضوع نہیں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے میری بیماریوں میں ہمیشہ بے نفسی سے میری تیمارداری کی۔

یہ واقعہ 1898ء میں ہوا جب مجھے برہمچاریہ کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ان دنوں میں بیوی کو شوہر کی رفیق، مددگار، اس کی رنج و راحت کی شریک نہیں بلکہ اس کی خواہشات نفسانی کا کھلونا سمجھتا تھا۔

1900ء میں ان خیالات کی کایا پلٹ گئی اور 1906ء میں انہوں نے ایک معینہ صورت اختیار کر لی۔ مگر اس کا ذکر میں مناسب موقعہ پر کروں گا یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ میری نفسانی خواہشوں کے معدوم ہو جانے سے میری گھریلو زندگی

روز بروز پرامن، خوشگوار اور مسرت بخش ہوتی جاتی ہے۔

اس واقعے سے، جس کی یاد کو میں تبرک سمجھ کر عزیز رکھتا ہوں کوئی یہ نہ سمجھے لے کر ہم دونوں کے تعلقات میاں بیوی کے اتحاد کا کامل نمونہ ہیں یا میرا اور میری بیوی کا نصب العین بالکل ایک ہے۔ یوں تو ان بے چاری کو احساس بھی نہیں کہ وہ کوئی علیحدہ نصب العین رکھتی ہیں مگر بہت ممکن ہے کہ میری بعض باتیں انہیں اب بھی پسند نہ ہوں۔ ہم دونوں میں بھی ان چیزوں پر گفتگو نہیں ہوتی۔ میں اسے بے کار سمجھتا ہوں کیونکہ ان غریب کو نہ تو ان کے ماں باپ نے پڑھایا اور نہ میں نے اس زمانے میں تعلیم دی جوان کے لیے مناسب تھا۔ ان میں یہ بہت بڑا وصف ہے جو ایک حد تک سب ہندو بیویوں میں ہوتا ہے کہ چاہے ان کا جی چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو، انہیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو، انہوں نے ہمیشہ میری پیروی کو باعث سعادت سمجھا اور میری ضبط نفس کی سعی میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس لیے گو ہم دونوں کی ذہنی قابلیت میں بڑا فرق ہے مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہماری زندگی اطمینان، مسرت اور ترقی کی زندگی ہے۔

............☆☆............

فرنگیوں سے میل جول (1)

اس مقام پر قارئین کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ آپ بیتی میں نے ہفتہ وار مضامین کی شکل میں لکھی ہے۔

جب میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تو میرے پیش نظر کوئی معینہ خاکہ نہ تھا میرے پاس کوئی روزنامچہ یا دوسری تحریریں نہیں ہیں جن سے اپنے تجربوں کی داستان لکھنے میں مدد لے سکوں۔ مجھ سے استاد ازل جو لکھواتا ہے قلم برداشتہ لکھ دیتا ہوں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا ہر خیال اور ہر فعل خدا کی طرف سے ہے مگر جب میں ان چھوٹے بڑے کاموں پر غور کرتا ہوں۔ جو میرے ہاتھ سے انجام کو پہنچے تو یہ کہنا بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ ان سب میں کچھ ادھر کا اشارہ ضرور تھا۔

مجھے نہ خدا کا دیدار نصیب ہوا نہ اس کی معرفت حاصل ہوئی۔ ساری خدائی کو خدا کا قائل دیکھ کر میں بھی قائل ہو گیا۔ مگر میرا عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ میں اسے تجربے کے برابر سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے لوگ یہ اعتراض کریں کہ عقیدے کو تجربہ کہنا حق کا منہ چڑانا ہے۔ اس لیے غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مجھے خدا پر جو عقیدہ ہے اسے بیان کرنے کے لیے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا۔

اب شاید لوگوں کو میرا فقرہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ یہ آپ بیتی اسی طرح لکھتا ہوں جیسے استاد ازل لکھواتا ہے۔ جب میں نے پچھلا باب لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اس کا عنون وہ رکھتا تھا جو اس بات کا ہے مگر پھر یہ خیال آیا کہ فرنگیوں سے میل جول کا ذکر کرنے سے قبل تمہید کے طور پر ایک واقعہ جو کئی سال پہلے گزرا تھا بیان کر دینا چاہیے

۔اس لیے میں نے عنوان بدل کر وہ واقعہ لکھ دیا۔

مگر یہ باب شروع کرتے وقت میں پھر الجھن میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جن انگریز دوستوں کا ذکر کرنے والا ہوں ان کی کون سی باتیں لکھوں اور کون سی نہ لکھوں۔ اگر ضروری باتیں چھوٹ گئیں تو حقیقت دھندلی ہو کر رہ جائے گی۔ سرسری نظر میں یہ کیسے معلوم ہو کہ کونسی چیز ضروری ہے؟ مجھے تو اسی میں شبہ ہے کہ اس کتاب کا لکھنا بھی ضروری ہے یا نہیں۔

بہت دن ہوئے میں نے پڑھا تھا کہ آپ بیتی بحیثیت تاریخ کے ناقص ہوتی ہے۔ آج اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ مجھے جتنی باتیں معلوم ہیں سب تو میں اس کتاب میں لکھ نہیں سکتا۔ اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حق کی صحیح تفسیر کے لیے ان میں سے کیا کیا لے لینا چاہیے اور کیا کیا چھوڑ دینا چاہیے؟ اور پھر میری زندگی کے متعلق میری یک طرفہ شہادت جتنے باب میں لکھ چکا ہوں ان کے متعلق مجھ سے جرح کرنے لگے تو شاید ان کا مطلب زیادہ واضح ہو جائے گا اور اگر اس کی جرح مخالفانہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسے "میرے دعوؤں کی پول کھول دینے" پر فخر کا موقع ملے۔

ذرا دیر کے لیے میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس دفتر کو تہ کر دوں ۔مگر جب تک اندرونی آواز مجھے منع نہ کرے گی میں لکھتا جاؤں گا۔ مجھے اس حکیمانہ اصول پر عمل کرنا چاہیے کہ جو کام ایک بار شروع کر دیا جائے اسے کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے بغیر اس صورت کے کہ اس میں کوئی اخلاقی برائی نظر آئے۔

میں یہ آپ بیتی نقادوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں۔ اس کا لکھنا خود تلاش حق کا ایک تجربہ ہے۔ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے رفیقوں کے لیے روحانی غذا اور تسکین فراہم کروں بلکہ ان ہی کے اصرار سے میں نے یہ کتاب لکھنا شروع

کیا۔ اگر جے رام داس اور سوامی آنند کا اصرار نہ ہوتا تو یہ کبھی نہ لکھی جاتی۔ اگر یہ تجویز قابل الزام ہے تو میرے ساتھ یہ دونوں بھی ملزم ہیں۔

اب اصل مطلب یہ آتا ہوں جس کی طرف اس باب کے عنوان میں اشارہ ہے۔ جس طرح ڈربن میں میرے ساتھ ہندوستانی مہمان عزیزوں کی طرح رہتے تھے اسی طرح انگریز بھی رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں کو میرے یہاں رہنا پسند نہ تھا مگر میں اصرار سے رکھتا تھا۔ اس معاملے میں میں نے غلطیاں بھی کیں اور کچھ لوگوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ ہوا۔ جن میں ہندوستانی بھی تھے اور فرنگی بھی۔ مگر باوجود ان تجربوں کے اور باوجود اس پریشانی اور تکلیف کے جو میرے دوستوں کو میری وجہ سے اٹھانا پڑی میں نے اپنا یہ معمول ترک نہیں کیا اور وہ بے چارے بھی میری خاطر سب کچھ سہتے رہے۔ جب کبھی میرے دوستوں کو میرا اجنبیوں سے میل جول رکھنا گوارا ہوا میں نے ہمیشہ انہیں ملامت کی۔ میرا عقیدہ ہے کہ جن لوگوں کو دوسروں میں اور اپنے آپ میں ایک ہی خدا کا جلوہ نظر آتا ہے انہیں باہمہ اور بے ہمہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور یہ عادت اس طرح پڑتی ہے کہ جب آپ ہی آپ دوسروں سے میل جول کا موقع نکل آئے تو انسان پہلو نہ بچائے بلکہ سچے جذبہ خدمت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرے مگر اپنے دل کو ان سے وابستہ نہ ہونے دے۔

اس لیے گو جنگ بوئر کے آغاز کے وقت میرا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا میں نے دو انگریزوں کو جو ہانسبرگ سے آئے تھے اور ٹھہرالیا۔ یہ دونوں تھیوسوف تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر کچن تھے جن کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔ ان دوستوں کی بدولت میری بیوی اکثر آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں۔ وہ میرے ہاتھوں پہلے بھی اس قسم

کی تکلیفیں اٹھا چکی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریز میرے ساتھ بے تکلفی سے عزیزوں کی طرح آ کر رہے تھے۔ میں انگلستان میں انگریزوں کے گھر رہ چکا تھا مگر وہاں ان کے طریقوں کی پابندی کرتا تھا اور پھر اتنی بے تکلفی بھی نہ تھی۔ یہاں معاملہ بالکل الٹا تھا۔ انگریز دوست ہم میں گھل مل گئے تھے۔ اور انہوں نے بہت سی باتوں میں انگریزی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ میرے گھر میں ظاہری ساز و سامان تو مغربی تھا مگر اندرونی زندگی زیادہ تر ہندوستانی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ گو مجھ کو ان سے بے تکلف ہونے میں کسی قدر دقت ہوئی مگر وہ بہت جلد میرے گھر کی زندگی سے مانوس ہو گئے۔ جوہانسبرگ میں اس قسم کے میل جول کے موقعے ڈربن سے بھی زیادہ ملے۔

فرنگیوں سے میل جول (2)

جوہانسبرگ میں ایک زمانے میں میرے یہاں چار محرر تھے جنہیں میں اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا تھا۔ مگر کام اتنا تھا کہ کرایہ بھی کافی نہ ہوئے۔ کاغذات ٹائپ کرنے کی بہت ضرورت پڑتی اور ٹائپ نویسی ہم سب میں اگر کوئی تھوڑا بہت جانتا تھا تو میں ہی جانتا تھا۔ میں نے دو محرروں کو سکھانا چاہا مگر ان کی استعداد انگریزی میں بہت کم تھی اس لیے ترقی نہ کر سکے۔ پھر ان میں سے ایک کو میں محاسب کا کام سکھانا چاہتا تھا۔ نٹال سے کسی کو بلا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ٹرانسوال میں بغیر پروانے کے داخل ہونے کی ممانعت تھی اور مجھے اپنے ذاتی کام کے لیے پرمٹ افسر کا ممنون احسان ہونا منظور نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ کام کی بقایا کا انبار بڑھتا جاتا تھا۔ میں بڑی محنت کرتا تھا لیکن پیشے کا کام اور قومی کام مل کر اتنا ہو گیا کہ کسی طرح نہ سنبھلتا تھا۔ میں اس پر تیار تھا کہ فرنگی محرر رکھوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ کوئی فرنگی مرد یا عورت میرے جیسے کالے آدمی کا کام کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ بہر حال میں نے یہ طے کیا کہ کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ میں نے ایک ٹائپ نویسوں کے ایجنٹ سے فرمائش کی کہ مجھے ایک مختصر نویس ڈھونڈ دو۔ اس نے کہا کہ نوجوان عورتیں مل سکتی ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو نوکری پر راضی کر لوں گا۔ اسے ایک نوجوان کالی خاتون مس ڈک مل گئی جو سیدھی اس کاتستان سے آئی تھیں۔ یہ جائز طریقہ پر روزی کمانے پر تیار تھیں۔ چاہے کسی کا بھی کام کرنا پڑے اور حاجت مند بھی تھیں۔ اس لیے ایجنٹ نے

انہیں میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے صورت دیکھتے ہی ان کی طرف سے اچھا خیال قائم کرلیا۔

میں نے پوچھا ''آپ کو ہندوستانی کے یہاں کام کرنے میں تامل تو نہیں؟

انہوں نے جواب دیا۔ ''مطلق نہیں۔''

''آپ تنخواہ کیا چاہتی ہیں؟''

''یہی سولہ سترہ پونڈ یہ تنخواہ زیادہ تو نہیں؟''

''نہیں اگر آپ کا کام میرے حسب منشا ہو تو زیادہ نہیں۔ آپ کب سے کام شروع کرسکتی ہیں؟''

''آپ چاہیں تو اسی وقت شروع کردوں۔''

میں بہت خوش ہوا اور میں نے فوراً خط لکھوانا شروع کر دیئے۔

تھوڑے ہی دن میں انہیں محرر نہیں بلکہ اپنی چھوٹی بہن یا بیٹی کی طرح سمجھنے لگا۔ ان کا کام ہر طرح قابل اطمینان تھا۔ اکثر ان کی تحویل میں ہزارہا پونڈ رہتے تھے اور سارا حساب کتاب وہی رکھتی تھیں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہوگیا اور وہ بھی مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگیں کہ اپنے دلی خیالات اور جذبات کا مجھ پر اظہار کر دیا کرتی تھیں۔ انہوں نے شوہر کے انتخاب میں بھی مجھ سے مدد لی اور ان کا نکاحی باپ بھی میں ہی بنا۔ جب مس ڈک مسز سیکنڈ اںلڈ ہوگئی تو انہیں میری ملازمت ترک کرنا پڑی۔ لیکن اس کے بعد بھی جب کبھی کام کی کثرت ہوئی اور میں نے ان سے مدد کی درخواست کی انہوں نے میری بات کبھی نہیں ٹالی۔

مگر اب ان کی جگہ ایک مستقل مختصر نویس کی ضرورت تھی اور خوش قسمتی سے مسٹر کیلن باخ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ مس شلیزن کو میرے پاس لے آئے۔ آج کل

وہ ٹرانسوال کے ایک ہائی سکول میں معلّمہ ہیں۔ جس زمانے میں وہ میرے یہاں آئیں ان کی عمر سترہ برس کی تھیں۔ بعض وقت ان کی سنک سے مجھے اور مسٹر کیلین باخ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ انہیں کام کرنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی تجربہ حاصل کرنے کی۔ رنگ کا تعصب ان میں بالکل نہ تھا۔ مگر ان لوگوں کو جو عمر یا تجربے میں ان سے بڑے تھے بالکل ادب نہیں کرتی تھیں۔ انہیں کسی شخص کی توہین کرنے میں یا اسے اس کے منہ پر برا بلا کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ ان کی تنک مزجی سے بعض وقت بڑی مشکل پڑ جاتی تھیں مگر ان کی صاف دلی اور سادگی کی بدولت فوراً ہی رفع بھی ہو جاتی تھی۔ میں اکثر ان کے لکھے ہوئے خطوں پر بے نظر ثانی کئے ہوئے دستخط کر دیتا تھا۔ مگر ان کی انگریزی مجھ سے اچھی تھی اور ان کی دیانت داری پر مجھے پورا بھروسہ تھا۔

انہوں نے بڑے ایثار سے کام لیا۔ عرصے تک وہ صرف چار پونڈ ماہوار تنخواہ لیتی رہیں اور انہوں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ کبھی دس پونڈ سے زیادہ نہیں لیں گی جب کبھی میں ان کی تنخواہ بڑھانے پر اصرار کرتا تھا وہ مجھے یہ کہہ کر جھڑک دیتی تھیں ''میں یہاں تنخواہ کے لالچ میں کام نہیں کرتی ہوں۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے سے خوشی ہوئی ہے اور میں آپ کے نصب العین کی قدر کرتی ہوں۔ ''

ایک بار انہیں مجھ سے چالیس پونڈ لینے کی ضرورت ہوئی مگر انہیں یہ اصرار تھا کہ یہ رقم انہیں قرض کے طور پر دی جائے اور گزشتہ سال انہوں نے یہ روپیہ ادا کر دیا۔ ان کی ہمت بھی ان کے ایثار سے کم نہ تھی اور وہ ان معدودے چند عورتوں میں سے ہیں جن کی ملاقات کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں جن کا دل آئینہ کی طرح صاف

ہے جن کی ہمت پر سورماؤں کو رشک آتا ہے اب وہ سن کہولت کو پہنچ گئی ہیں۔ مجھے اب ان کی سیرت کا اتنا اندازہ نہیں جتنا اس زمانے میں تھا۔ مگر ان نوجوان خاتون کی یاد کو میں ہمیشہ تبرک سمجھ کر عزیز رکھوں گا۔ اگر میں ان کے اوصاف بیان کرنے میں کمی کروں تو اظہار حق کا حق ادا نہ ہوگا۔

وہ قومی کام کے انجام دینے میں دن رات ایک کر دیتی تھیں۔ جب ضرورت ہو اندھیری راتوں میں بے دھڑک اکیلی باہر چلی جاتی تھیں اور اگر کوئی ساتھ چلنے کو کہے تو خفا ہوتی تھیں۔ ہزاروں ہندوستانی جواں مردان سے رہنمائی کی توقع رکھتے تھے۔ ستیا گرہ کے دنوں میں جب قریب قریب سارے لیڈر جیل میں تھے وہ اکیلی اس تحریک کو چلاتی رہیں۔ ان کے ذمے ہزاروں آدمیوں کی نگرانی، بیشمار خطوط کے جواب دینا اور ''انڈین اوپینین'' کو چلانا تھا مگر تھکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

میں مس شلیزن کی پوری تعریف لکھوں تو ایک دفتر ہو جائے مگر میں ان کے متعلق گوکھلے کی رائے لکھ کر اس بات کو ختم کرتا ہوں۔ گوکھلے میری ہر رفیق کو جانتے تھے۔ وہ ان میں سے اکثر کو پسند کرتے تھے اور اکثر کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر مس شلیزن کو وہ میرے سارے ہندوستانی اور فرنگی رفیقوں پر فوقیت دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''میں نے مس شلیزن میں جو ایثار، پاکبازی اور ہمت دیکھی ہے آج تک کسی شخص میں نہیں دیکھی۔ میرے نزدیک تمہارے رفیقوں میں سب سے زیادہ قابل قدر وہی ہیں۔''

..........☆☆..........

''انڈین اوپینین''

قبل اس کے کہ میں فرنگیوں کے سابقے کا ذکر کروں مجھے دو تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے۔ مگر ایک فرنگی دوست کا ذکر فوراً کر دینا ضروری ہے۔ مس ڈک کا تقرر میرے لیے کافی نہیں ہوا مجھے اور مددگاروں کی ضرورت تھی۔ مسٹر رچ کا نام اس کتاب میں پہلے بھی آ چکا ہے۔ ان سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ایک تجارتی کارخانے کے مینجر تھے۔ انہوں نے میرے کہنے سے ملازمت ترک کر دی اور میرے ساتھ کام کرنے لگے۔ ان کی بدولت میرا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

اسی زمانے میں مدن جیت جی نے میرے سامنے ایک اخبار ''انڈین اوپینین'' کے نام سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ وہ ایک مطبع پہلے سے چلا رہے تھے اس لیے میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہ اخبار 1904ء میں جاری کیا گیا اور سکھ لال جی نظر پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر زیادہ تر کام مجھ ہی کو کرنا پڑتا تھا بلکہ اکثر ادارت کے فرائض بھی میں ہی انجام دیتا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سکھ لال جی اخبار کو چلا نہیں سکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں عرصہ تک اخبار نویسی کر چکے تھے مگر جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسائل پر وہ میرے ہوتے ہوئے قلم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں میری سوجھ بوجھ پر پورا بھروسہ تھا اس لیے مقالہ افتتاحیہ لکھنے کی ذمہ داری انہوں نے مجھ پر ڈال دی۔ یہ اخبار اس وقت سے اب تک ہفتہ وار ہے۔ ابتداء میں یہ گجراتی، ہندی، تامل، انگریزی میں نکلتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ تامل اور ہندی کے حصے محض برائے نام ہیں۔ ان کا جو مقصد تھا وہ پورا

نہیں ہوتا تھا اور ان کا باقی رکھنا ایک طرح کا دھوکا تھا۔ اس لیے میں نے انہیں نکال دیا۔

مجھے پہلے یہ خیال نہ تھا کہ مجھے اس اخبار میں روپیہ لگانا پڑے گا مگر تھوڑے ہی دن میں یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ میری مالی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ہندوستانی اور فرنگی دونوں جانتے تھے کہ گو ''انڈین اوپینین'' کی ادارت میں میرا نام نہیں ہے مگر اصل میں اس کے چلانے کی ذمہ داری مجھ ہی پر ہے۔ اگر اخبار جاری نہ ہوا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی مگر جاری ہونے کے بعد بند ہونا بہت برا تھا۔ اس میں ذلت کی ذلت تھی اور نقصان کا نقصان۔ اس لیے اس پر برابر روپیہ لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر میں میرے پاس جو کچھ بچتا تھا سب اس میں کھپ جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک زمانے میں پچھتر پونڈ ماہوار دیا کرتا تھا۔

مگر آج اتنے دنوں کے بعد بھی میرا یہی خیال ہے کہ اس اخبار نے ہماری برادری کی مفید خدمت انجام دی۔ اس کی حیثیت ابتدا سے تجارتی نہ تی۔ جب تک یہ میرے انتظام میں رہا اس کی حالت میری زندگی کے ساتھ بدلتی رہی۔ جس طرح آج ''ینگ انڈیا'' اور ''نجیون'' میری زندگی کا آئینہ ہیں ان دنوں ''انڈین اوپینین'' تھا۔ ہر ہفتہ میں اس میں اپنی واردات قلب کی داستان اور اپنے دار دل کی کہانی کہا کرتا تھا اور ستیا گرہ کے اصول اور عمل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیا کرتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یعنی 1914ء تک بجز اس زمانے کے جو میں نے قید میں گزارا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس میں مضمون نہ لکھا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ ان مضامین میں میں نے ایک لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے لکھا ہو یا کبھی جان بوجھ کر مبالغہ یا خوشامد کی ہو۔ سچ پوچھیے تو یہ اخبار نویسی میرے لیے ضبط نفس کی تربیت تھی اور میرے دوستوں

کے لیے میرے خیالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ۔ نقادوں کو اس پر اعتراض کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ''انڈین اوپینین'' کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اگر یہ اخبار نہ ہوتا تو ستیا گرہ کبھی نہ چل سکتی۔ قارئین اسی سے ستیا گرہ کی تحریک کی معتبر کیفیت اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے صحیح حالات معلوم کرتے تھے۔ میرے لیے یہ انسانی فطرت کی نیرنگیوں کے مطالعے کا ذریعہ تھا کیونکہ مجھے ہمیشہ یہ بات مدنظر رہی ہے کہ ایڈیٹر اور قارئین میں ایک گہرا اور پاک رابطہ قائم ہے۔ میرے پاس بے شمار خطوط آتے تھے جن میں لوگ اپنے دلی خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا لہجہ لکھنے والوں کی مزاجی کیفیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا کسی کا دوستانہ، کسی کا نقادانہ اور کسی کا شدید مخالفانہ۔ ان خطوط کو پڑھنا، ان کے مضمون پر غور کرنا اور ان کا جواب دینا میرے لیے بہت اچھی تعلیم تھی۔ یہ خط و کتابت گویا ایک ساز تھی جس کے پردوں میں مجھے اپنی برادری کے دل کی حرکت سنائی دیتی تھی۔ اس نے مجھے اخبار نویس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ کر دیا اور برادری میں میرا اثر قائم کر دیا۔ جس کی بدولت آگے چل کر ستیا گرہ کے معرکہ میں عملی آسانی، اخلاقی شان اور بے پناہ قوت پیدا ہوگئی۔

''انڈین اوپینین'' کے جاری ہونے کے بعد پہلے ہی مہینے میں مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اخبار نویسی کا مقصد محض خدمت خلق ہے۔ اخبار بہت بڑی قوت ہے۔ مگر جس طرح پانی کے بے قید سیلاب میں علاقے کے علاقے ڈوب جاتے ہیں اور فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اسی طرح اخبار نویس کے بے روک قلم سے سوائے تخریب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ روک تھام اگر کسی بیرونی قوت کی طرف سے ہو تو

مطلق العنانی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو دنیا میں کون سا اخبار اس معیار پر پورا اترے گا؟ مگر کسی پڑی ہے کہ بیکار اخباروں کو روکے؟ اور پھر اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟ دنیا میں نیکی کی اور بدی کی طرح مفید اور غیر مفید چیزیں ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں اور اسی طرح چلی جائیں گی۔ ہر انسان کو خود ہی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کسے لے اور کسے چھوڑے۔

............☆☆............

قلیوں کے باڑے یا ''گھیٹو''

بعض ذاتوں کو جو بڑھ کر ہماری ساجی خدمت کرتی ہیں ہم ہندوؤں نے نہ جانے کیوں ''اچھوت'' قرار دے رکھا ہے۔ یہ لوگ شہر یا گاؤں کے بیرونی محلوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ گجراتی میں یہ محلے ''دھیدھاوو'' کہلاتے ہیں اور اس میں حقارت کی بو آتی ہے۔ مسیحی فرنگستان میں بھی ایک زمانے میں یہودی ''اچھوت'' سمجھے جاتے تھے۔ اور ان کے لیے جو محلے مخصوص تھے انہیں لوگ حقارت سے ''گھیٹو'' کہتے تھے۔ اسی طرح آج ہم لوگوں کی حیثیت بھی جنوبی افریقہ میں اچھوتوں کی سی ہو گئی ہے۔ دیکھیں اینڈ ریوز کا ایثار اور شاستری کا جادو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی عزت واپس دلانے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں یہودی اپنے آپ کو دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں خدا کے برگزیدہ بندے سمجھتے تھے۔ جن کی پاداش میں انہیں یہ اور حد سے زیادہ سخت سزا بھگتنا پڑی۔ قریب قریب اسی طرح ہندو اپنے آپ کو ''آریا'' یعنی مہذب اور اپنے بعض بھائی ندروں کو ''اناریا'' یعنی غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ جس کی انوکھی اور شدید مکافات میں جنوبی افریقہ میں وہ خود بھی مبتلا ہیں اور مسلمان اور پارسی بھی محض ان کے ہم وطن اور ہم رنگ ہونے کے جرم میں لپیٹ میں آ گئے ہیں۔

اب قارئین ''باڑے'' کے لفظ کو سمجھ گئے ہوں گے جو اس بات کے عنوان میں آیا ہے۔ ہم لوگ جنوبی افریقہ میں حقارت سے ''قلی'' کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں ''قلی'' کے معنی محض حمال یا مزدور کے ہیں۔ مگر جنوبی افریقہ میں یہ حقارت کا کلمہ سمجھا

جاتا ہے۔اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے یہاں ''اچھوت'' کا ہے اور وہ محلے وہ'' قلیوں'' کے لیے مخصوص ہیں ''قلی باڑے'' کہلاتے ہیں۔ جوہانسبرگ میں بھی ایک اس طرح کا محلّہ تھا۔ دوسرے مقامات پر تو ہندوستانی ان محلوں میں میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے مگر یہاں انہوں ڈ نے ننانوے سال کا پٹہ حاصل کرلیا تھا۔ اس محلے میں آبادی پڑھتی جاتی تھی مگر رقبہ نہیں بڑھتا تھا۔ اور تھوڑی جگہ میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ میونسپلٹی نے پاخانوں کی صفائی کا تو کچھ برائے نام انتظام کردیا تھا مگر حفظان صحت کی اور تدبیروں سے بالکل غافل تھی۔ سڑکوں اور روشنی کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے؟ جب اسے محلے والوں کی فلاح و بہبود کی پروا نہ تھی محلے کی صفائی کون کرتا؟ جو ہندوستانی یہاں رہتے تھے وہ بے چارے عام صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں سے ناواقف تھے اس لیے بغیر میونسپلٹی کی نگرانی اور مدد کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر یہ سب رابنسن کروسو ہوتے تو اور بات تھی۔ مگر دنیا میں کہیں بھی وہ لوگ جو اپنا وطن چھوڑ کر نوآبادیاں بساتے ہیں رابنس کروسو نہیں ہوتے۔ عموماً لوگ دولت اور کاروبار کی تلاش میں پردیس جاتے ہیں اور جنوبی افریقہ جانے والے ہندوستانیوں میں اکثر جاہل اور مفلس کاشتکار تھے جنہیں دوسروں کی خبر گیری اور امداد کی ضرورت تھی۔ ان کے بعد تاجر اور تعلیم یافتہ ہندوستانی آ گئے تھے مگر بہت کم۔

ایک طرف میونسپلٹی کی مجرمانہ غفلت اور دوسری طرف نوآباد ہندوستانیوں کی جہالت سے یہ محلّہ نہایت گندا ہو گیا تھا۔ میونسپلٹی نے محلّہ کی حالت سدھارنے کے بجائے اس گندگی کو جو خود اس کی غفلت کا نتیجہ تھی حیلہ بنا کر اس محلے کو اجاڑنے کی فکر کی اور مجلس وضع قوانین سے نوآباد ہندوستانیوں کے بے دخل کرانے کی اجازت لے لی۔ یہ صورتحال تھی جب میں نے جوہانسبرگ میں بود و باش اختیار کی۔

ظاہر ہے کہ اس محلے کے رہنے والوں کو اپنی زمین پر ملکیت کا حق تھا اس لیے وہ ہرجانے کے مستحق تھے۔ انتقال اراضی کے مقدموں کی سماعت کے لیے ایک خاص عدالت قائم کی گئی۔ اگر مکان دار کو میونسپلٹی کی پیش کی ہوئی لغزئیں منظور نہ ہوں تو اسے یہ حق تھا کہ اس عدالت میں اپیل کرے اور اگر عدالت میونسپلٹی کی مقرر کی ہوئی رقم سے زیادہ کی ڈگری دے تو مقدمے کا خرچہ میونسپلٹی کو دینا پڑتا تھا۔

اکثر مکان داروں نے مجھے وکیل کیا۔ مجھے ان مقدموں سے روپیہ کمانا منظور نہ تھا۔ اس لیے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں ہر مقدمے میں صرف دس پونڈ لوں گا اور جتنے مقدمے کامیاب ہوں گے ان میں عدالت سے جو خرچہ ملے گا میرا ہوگا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنے محنتانے کی آدھی رقم سے میں غریبوں کے لیے ایک ہسپتال یا اسی قسم کا کوئی اور ادارہ بنوا دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز سے سب کو خوشی ہوئی۔

ستر مقدموں میں سے صرف ایک میں ناکامی ہوئی۔ میری فیس کی اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ مگر ''انڈین اوپینین'' کو ہمیشہ روپے کی ضرورت رہتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ سولہ پونڈ اسی کی نذر ہو گئے۔ مجھے ان مقدموں میں سخت محنت کرنا پڑی۔ موکل مجھے ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر بہار اور اس کے قرب و جوار کے ضلعوں کے یا جنوبی ہندوستان کے رہنے والے تھے اور ابتداء میں پابند مزدوروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی شکایتوں کی چارہ جوئی کے لیے ہندوستانی تاجروں کی انجمن سے الگ جماعت قائم کی تھی۔ ان میں سے بعض صاف دل، فیاض اور عالی منش لوگ تھے۔ ان کے لے رہنما دو شخص تھے۔ جیرام سنگھ جی صدر تھے اور بدری جی ان کے دست راست۔ ان دونوں کا انتقال ہو چکا

ہے۔ بدری جی کا اور میرا بہت ساتھ رہا اور انہوں نے ستیا گرہ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان دونوں صاحبوں اور بعض اور دوستوں کے توسط سے میرا شمالی اور جنوبی ہندوستان کے بہت سے لوگوں سے میل جو ہو گیا۔ میں ان کا وکیل ہی نہیں بلکہ ان کا بھائی بھی بن گیا اور ہمیشہ ان ک دکھ درد میں چاہے وہ ذاتی ہو یا ساری برادری سے تعلق رکھتا ہو، برابر شریک رہا۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی مجھے کیا کہہ کر پکارتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ میرا نام لینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے۔ یہ بڑی خیر ہوئی کہ کسی نے بھی مجھے صاحب کہہ کر ذلیل نہیں کیا۔ عبداللہ سیٹھ نے ایک بڑا پیاں لقب ڈھونڈ نکالا۔ وہ مجھے بھائی کہنے لگے۔ دوسرے بھی ان کی تقلید میں مجھے ہمیشہ بھائی کہتے رہے۔ مگر ان لوگوں کی زبان سے جو کبھی پابند مزدور رہ چکے تھے مجھے بھائی کا لقب اور بھی پیارا معلوم ہوتا تھا۔

............☆☆............

کالا طاعون (1)

میونسپلٹی ''قلی باڑے'' کے مکانوں پر قبضہ پانے کے بعد ان کے مکینوں کو فوراً نہیں ہٹایا تھا۔ ان کو بے دخل کرنے سے پہلے ان کے لیے دوسرے مناسب گھر ڈھونڈنا تھے۔ اس میں میونسپلٹی کو بڑی دقت پیش آئی۔ اس لیے ہندوستانیوں کو اس گندے محلے میں رہنے دیا۔ اگر فرق ہوا تو یہ ہوا کہ ان کی حالت اور بدتر ہو گئی۔ پہلے وہ مکانوں کے مالک تھے اب میونسپلٹی کے کرائے دار بن گئے اور ان کے گردوپیش گندگی اور بڑھ گئی۔ جب وہ مالک تھے تو انہیں اور کچھ نہیں تو قانون کے خوف سے تھوڑی بہت صفائی رکھنا پڑتی تھی۔ مگر میونسپلٹی کو قانون کو قانون کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کرایہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اسی کے ساتھ غلاظت بھی بڑھتی گئی۔

ادھر ہندوستانی اس مصیبت کو رو رہے تھے۔ ادھر کالا طاعون بھی پھوٹ پڑا۔ یہ نمونیا 42 کا طاعون بھی کہلاتا ہے۔ اور گلٹی کے طاعون سے کہیں زیادہ مہلک ہے۔

بڑی خیر ہوئی کہ وبا ہندوستانیوں کے محلے میں نہیں بلکہ شہر کے باہر ایک سونے کی کان میں شروع ہوئی۔ یہاں زیادہ تر حبشی کام کرتے تھے جن کی صفائی کے ذمہ داران کے فرنگی آقا تھے۔ بعض ہندوستانی مزدور بھی تھے۔ جن میں سے تئیس پر وبا کا اثر ہو گیا اور ایک روز شام کو یہ لوگ اپنے محلے میں آتے ہی شدید طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ اتفاق سے مدن جیت جی جو اس زمانے میں ''انڈین اوپینین'' کے خریدار بنا رہے تھے اور چندہ جمع کر رہے تھے وہاں موجود تھے۔ وہ بڑے جری آدمی تھے۔ ان و

بازووں کو دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور انہوں نے مجھے ایک رقعہ پنسل سے لکھ کر بھیجا جس کا مضمون تھا۔ کالا طاعون ایک دم سے پھوٹ پڑا ہے۔ آپ کو فوراً آ کر اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ سمجھ لیجیے کہ اس کا انجام بڑا مہلک ہے۔ خدا کے لیے جلد آئیے۔

مدن جیت نے دلیری سے ایک خالی گھر کا قفل توڑ ڈالا اور سب مریضوں کو اس میں رکھا۔ میں بائیسکل پر بیٹھ کر ہندوستانیوں کے محلے میں گیا اور میں نے میونسپلٹی کے ہیڈ کلرک کو لکھ دیا کہ ایسی ایسی حالت تھی اس لیے ہم نے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔

ڈاکٹر ولیم گاڈفرے جو جوہانسبرگ میں مطلب کرتے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی مدد کے لیے دوڑے آئے اور مریضوں کا علاج اور تیمارداری کرنے لگے۔ لیکن تیئس مریض ہم تین آدمیوں سے نہیں سنبھل سکتے تھے۔

میرا یہ عقیدہ ہے اور تجربہ پر مبنی ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو اس کا چارہ اور چارہ گر خودبخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں میرے دفتر میں چار ہندوستانی تھے کلیان داس جی، مانک لال جی، گنونت رائے جی دیسائی اور شخص جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ کلیان داس کو ان کے والد نے میرے سپرد کیا تھا۔ مجھے جنوبی افریقہ میں کوئی شخص ان سے زیادہ بامروت اور دل و جان سے اطاعت کرنے والا نہیں ملا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور میں ان سے بے تامل بڑے خطرے کے کام لے سکتا تھا۔ مانک لال مجھے جوہانسبرگ میں ملے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے میں نے دل میں ٹھان لی کہ ان چاروں کو جو میرے محرر، رفیق بیٹے سبھی کچھ تھے قربان کر دوں۔ کلیان داس

سے تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، دوسرے بھی کہنے کے ساتھ ہی آمادہ ہو گئے۔ ان کا چھوٹا سا پیارا جواب یہ تھا ''جہاں آپ رہیں گے ہم بھی رہیں گے۔''

مسٹر رچ کا بہت بڑا خاندان تھا۔ وہ تیار تھے کہ اس آگ میں کود پڑیں مگر میں نے انہیں روک دیا۔ انہیں اس ہلاکت میں گھسیٹتے ہوئے میرا دل دکھتا تھا۔ اس لیے ان کے سپرد وہ کام کیا گیا جس میں خطرہ نہیں تھا۔

وہ شب بیداری اور تیمارداری کی رات تھی۔ تیمارداری میں پہلے بہت کر چکا تھا۔ مگر کالے طاعون کے مریضوں کی کبھی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر گاڈفرے کی ہمت سے ہم سب کو بڑی تقویت ہوئی۔ تیمارداری میں کچھ ایسی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ہمارا کام بس اتنا تھا کہ مریضوں کو دوا پلا دیا کریں، ان کی خبر گیری کرتے رہیں، ان کے بستر صاف ستھرے رکھیں اور انہیں ملول نہ ہونے دیں۔

جس جوش اور دلیری سے نوجوان کام کرتے تھے اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر گاڈفرے یا مدن جیت جی کے سے پرانے سپاہی کا ایسی جرأت دکھانا کوئی تعجب کی سی بات نہیں تھی مگر ناکردہ کار نوجوانوں کے جوش کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے سب مریضوں کی وہ رات بخیر و خوبی گزر گئی۔

مگر یہ واقعہ اتنا پر اثر اور دلچسپ ہے اور میرے لیے اتنی مذہبی اہمیت رکھتا ہے کہ مجھے کم سے کم دو باب اس کے لیے وقف کرنا پڑیں گے۔

............☆☆............

کالا طاعون (2)

میونسپلٹی کے ہیڈ کلرک نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے خالی مکان پر قبضہ کر لیا اور مریضوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس نے صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا کہ میونسپلٹی خود اس ناگہانی حادثے کا فوری تدارک کرنے سے معذور ہے۔ مگر یہ وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہے ہم لوگوں کی مدد کرے گی۔ اسے ایک بار اس کے فرض کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت تھی پھر اس نے مستعدی سے کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن اس نے ایک خالی گودام میرے حوالے کر دیا اور مجھے یہ رائے دی کہ مریضوں کو وہاں منتقل کر دوں لیکن اس مکان کی صفائی کا میونسپلٹی نے کوئی انتظام نہیں کیا۔ سارے مکان میں کوڑے کرکٹ کے انبار تھے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دی اور مخیر ہندوستانیوں کی امداد سے پلنگ، بستر اور دوسری چیزیں مہیا کر کے ایک عارضی ہسپتال بنا لیا۔ میونسپلٹی نے ایک نرس بھیج دی جو اپنے ساتھ برانڈی اور دوسری چیزیں جن کی ہسپتال میں ضرورت پڑتی تھی لیتی آئی۔ نگرانی بدعنوانی بدستور ڈاکٹر گاڈفرے ہی کی رہی۔

نرس بڑی نیک دل عورت تھی۔ اسے مریضوں کی خدمت کا سچا شوق تھا۔ مگر ہم اس ڈر سے کہ کہیں اسے چھوت نہ لگ جائے اسے حتی الامکان مریضوں کے قریب نہیں جانے دیتے تھے۔

ہمیں یہ ہدایت تھی کہ مریضوں کو برانڈی بار بار دیتے رہیں۔ بلکہ نرس نے تو کہا کہ تم لوگ بھی حفظ ماتقدم کے لیے میرے طرح برانڈی پی لیا کرو۔ مگر ہم اسے ہاتھ

تک نہ لگاتے تھے۔ مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ یہ مریضوں کے لیے مفید ہے۔ میں نے ڈاکٹر گاڈفرے کی اجازت سے تین مریضوں پر جو برانڈی سے بچنا چاہتے تھے۔ مٹی کے علاج کا تجربہ کیا اور ان کے سر اور سینے پر گیلی پٹیاں باندھیں۔ ان میں سے دو بچ گئے۔ باقی میں گودام ہی میں مر گئے۔

اس عرصے میں میونسپلٹی دوسری تدبیریں کر رہی تھی۔ جوہانسبرگ سے سات میل کے فاصلے پر لگ جانے والی بیماری کا ہسپتال تھا۔ دو مریض جو بچ رہے تھے اس ہسپتال کے قریب ایک خیمے میں رکھے گئے۔ روز نئے بیماروں کو وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ اس طرح ہمیں اس کام سے چھٹی مل گئی۔

چند روز بعد سنا کہ نیک دل نرس طاعون میں مبتلا ہو کر چٹ پٹ مر گئی۔ اب خدا جانے وہ دو مریض کیسے بچ گئے اور ہم کیونکر محفوظ رہے۔ مگر اس تجربے سے میں مٹی کے علاج کا اور بھی قائل ہو گیا اور برانڈی کے طبی فوائد کی طرف میری بدعقیدگی اور بڑھ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں نہ یہ عقیدہ معقول وجوہ پر مبنی ہے اور نہ یہ بدعقیدگی۔ مگر میرے دل پر اس وقت یہی اثر پڑا اور اب تک ہے میں اسے کسی طرح مٹا نہیں سکتا۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کا ذکر کر دوں۔

جب طاعون شروع ہوا ہے تو میں نے اخباروں میں ایک خط چھپوایا تھا جس میں میونسپلٹی کو اس محلے کے زمیندار کی حیثیت سے غفلت کا ملزم بلکہ طاعون کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس خط کی بدولت مسٹر ہنری پولک میرے رفیق بن گئے، پادری جوزف ڈوک آنجہانی سے میری دوستی کی بنا بھی ایک حد تک یہی تھی۔

میں اوپر کے کسی باب میں کہہ چکا ہوں کہ میں نباتاتی ریستوران میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ یہاں مسٹر البرٹ ویسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ روز شام کو ریستوران

میں ملتے تھے اور کھانے کے بعد میرے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے مطبع میں حصہ دار تھے۔ انہوں نے اخبار میں میرا خط وبا پھوٹنے کے متعلق پڑھا اور میری تلاش میں ریستوران پہنچے۔ میں وہاں نہیں ملا تو انہیں کچھ تردد سا پیدا ہو گیا۔

میں نے اور میرے ساتھیوں نے وبا پھوٹنے کے بعد سے اپنی غذا میں کمی کر دی تھی۔ میرا عرصے سے یہ دستور تھا کہ وبا کے زمانے میں بہت ہلکی غذا استعمال کرتا تھا۔ اس لیے میں اس نے اس زمانے میں شام کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں دوسرے مہمانوں کے آنے سے پہلے کھا لیا کرتا تھا۔ ریستوران کے مالک سے میری مراسم تھے اور میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں طاعون کے مریضوں کی تیمارداری کر رہا ہوں اس لیے جہاں تک ہو سکے میں اپنے دوستوں سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔

مسٹر ویسٹ نے مجھے دو تین دن ریستوران میں نہیں پایا تو ایک دن صبح تڑکے جب میں ٹہلنے کے لیے جانے کا قصد کر رہا تھا انہوں نے میرے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو مسٹر ویسٹ کہنے لگے۔ ”آپ ریستوران میں نہیں ملے تو میں گھبرایا کہ کوئی حادثہ نہ گزرا ہو۔ اس لیے میں نے کہا کہ صبح تڑکے چل کر دیکھوں تاکہ آپ کے ملنے میں شبہ نہ رہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں مریضوں کی تیماری ک لیے تیار ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اکیلا آدمی ہوں۔ نہ بیوی بچے ہیں اور نہ اور کوئی عزیز جس کی مجھے فکر کرنا ہو۔“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا ”تیمارداری کے لیے آپ کی ضرورت نہیں اگر

نئے کیس نہ ہوئے تو ہم لوگ خود دو ایک روز میں فارغ ہو جائیں گے البتہ ایک کام ہے۔"

"کہیے کہیے کیا کام ہے۔"

"کیا آپ ڈربن جا کر "انڈین اوپنین" کی نگرانی کر سکتے ہیں؟ مدن جیت جی کو غالباً ابھی یہاں رہنا پڑے گا۔ اس لیے ڈربن میں ایک شخص کی ضرورت ہے۔ اگر آپ جا سکیں تو مجھے ادھر سے اطمینان ہو جائے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرا یہاں مطبع ہے۔ غالباً میں جا سکتا ہوں۔ مگر قطعی جواب شام کو دوں گا۔ شام کو جب آپ ٹہلنے چلیں گے۔ تو اس کے متعلق گفتگو ہوگی۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ شام کو باتیں ہوئیں اور وہ جانے پر راضی ہو گئے۔ تنخواہ کی انہیں کوئی پروا نہ تھی کیونکہ ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں تھا۔ پھر بھی یہ طے ہوا کہ دس پونڈ ماہوار ان کی تنخواہ ہو اور اگر کچھ نفع ہو تو اس کا ایک حصہ دیا جائے۔ دوسرے ہی دن شام کی ڈاک سے مسٹر ویسٹ روانہ ہو گئے ان کا کچھ روپیہ لوگوں پر باقی تھا۔ جس کی وصولی وہ میرے سپرد کر گئے۔ اس دن سے لے کر جب تک میں جنوبی افریقہ میں رہا وہ میرے دکھ درد کے شریک رہے۔

مسٹر ویسٹ اوتھ (لنکن شائر) کے کسانوں کے خاندان سے تھے۔ انہوں نے سکول کی معمولی تعلیم پائی تھی مگر تجربہ کے مکتب میں اپنے بل پر بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں نے اتنے دن کے سابقے میں دیکھا کہ وہ ایک پاکباز، پرہیز گار، خدا پرست، رحم دل انگریز ہیں۔

ان کے اور ان کے خاندان کے مزید حالات آگے چل کر معلوم ہوں گے۔

............☆☆............

ہندوستانی محلے میں آگ لگ گئی

مجھے اور میرے رفیقوں کو مریضوں کی تیمارداری سے تو چھٹی مل گئی مگر کالے طاعون کے سبب سے اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کا تدارک باقی تھا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میونسپلٹی ہندوستانی محلے یا ''قلی باڑے'' کی طرف سے بالکل بے پرواہ تھی۔ مگر شہر کے فرنگی باشندوں کی صحت کی اسے بڑی فکر تھی۔ ان کی صحت کی خاطر اس نے بہت کچھ صرف کیا تھا اور اب طاعون کو دور کرنے کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ گو میں نے ہندوستانیوں کے بارے میں میونسپلٹی کو لعل اور ترک فعل کے بہت سے گناہوں کا مرتکب ٹھہرایا تھا مگر فرنگی باشندوں کے ساتھ اس کی یہ خیر خواہی دیکھ کر میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اور مجھ سے اس کار خیر میں جو کچھ مدد ممکن تھی دیتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ میں ساتھ نہ دیتا تو میونسپلٹی کی بڑی دقت پیش آتی۔ اسے مسلح قوت سے کام لینا پڑتا اور وہ ہر طرح کی سختی بلا تامل کر بھی گزرتی۔

مگر ان باتوں کی ضرورت نہیں پڑی اور ان کا دامن اس دھبے سے پاک رہا۔ میونسپل حکام ہندوستانیوں کے طرز عمل سے بہت خوش ہوئے اور آئندہ کے لیے طاعون کے دفعیہ کی تدابیر اختیار کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ میں نے ہندوستانیوں سے میونسپلٹی کی ہدایت پر عمل کرانے میں اپنے پورے اثر سے کام لیا۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ بکھیڑے کرنا سہل نہ تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے کسی نے میرے مشورے کو قبول کرنے میں تامل نہیں کیا۔ محلے کی نگرانی کے لیے پولیس کا

ایک بڑا دستہ تعینات کیا گیا۔ بغیر اجازت کے کوئی شخص آنے جانے نہیں پاتا تھا۔ مجھے اور میرے رفیقوں کو داخلے اور واپسی کے پاس مل گئے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ سارے محلے والوں سے مکان خالی کرا لیے جائیں اور وہ تین ہفتے تک جوہانسبرگ سے تیرہ میل کے فاصلے پر کھلے میدان میں خیموں میں رکھے جائیں۔ ظاہر ہے کہ کھانے پینے کا سامان اور دوسرے ضروریات فراہم کر کے خیموں میں بسنا ذرا دیر طلب کام تھا۔ اسی لیے اثناء میں پولیس کے پہرے کی ضرورت پڑی۔

لوگ بہت ڈرے ہوئے تھے مگر میری ہر وقت کی موجودگی سے انہیں تسکین رہتی تھی۔ بہت سے غریب لوگوں نے اپنی چھوٹی سے پونجی کو زمین میں گاڑ رکھا تھا۔ یہ روپیہ نکال کر کہیں رکھوانا تھا۔ نہ ان کا کوئی بینک تھا اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتے تھے جسے اپنا روپیہ سپرد کر سکیں۔ اس لیے میں ان کا خزانچی بن گیا۔ میرے دفتر میں روپے کے ڈھیر لگ گئے۔ بھلا یہ کیونکہ ممکن تھا کہ میں ایسے وقت میں ان سے اس کا کوئی معاوضہ لیتا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اس کام کو بھی سمیٹا۔ میرے بینک کا مینجر میرا دوست تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ روپیہ تمہارے یہاں امانت رکھوانا ہے۔ تانبے اور چاندی کے اتنے سکے لینے پر کوئی بینک راضی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ خوف تھا کہ بینک کے محرر طاعون زدہ محلے سے آئے ہوئے روپے کو ہاتھ لگانے سے انکار نہ کریں۔ مگر مینجر کو میری خاطر ہر طرح منظور تھی۔ یہ طے کیا گیا کہ روپیہ بینک میں بھیجنے سے پہلے جراثیم سے پاک کر لیا جائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی ساٹھ ہزار پونڈ روپیہ اس طرح جمع کیا گیا۔ جن لوگوں کے پاس کافی روپیہ تھا انہیں میں نے مشورہ دیا کہ میعادی تحویل میں رکھوا دیں اور وہ اس بات پر راضی ہو گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض کو بینک میں روپیہ رکھنے کی عادت پڑ گئی۔

محلے کی سب باشندے اسپیشل ٹرین سے جوہانسبرگ کے قریب کلپ اسپروٹ فارم میں پہنچا دیئے گئے اور ان کے لیے میونسپلٹی کی طرف سے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہ خیموں کا شہر ایک فوجی پڑاؤ سا معلوم ہوتا تھا۔ جو لوگ اس طرح کی زندگی کے عادی نہیں تھے ان کے لیے یہاں انتظامات تعجب انگیز اور تکلیف دہ تھے۔ مگر اصل میں انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں روزانہ بائیسکل پر بیٹھ کر وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر یہی دیکھتا تھا کہ لوگ گانے بجانے، ہنسنے کھیلنے میں مگن ہیں۔ تین ہفتے کھلی ہوا میں رہنے سے ان کی صحت کو بڑا فائدہ ہوگا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے محلے جس دن خالی ہوا اس کے دوسرے ہی دن وہاں آگ لگ گئی۔ میونسپلٹی نے کسی چیز کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ انہیں دنوں میونسپلٹی نے اپنی ساری عمارتی لکڑی میں جو بازار میں پڑی تھی خود آگ لگا دی اور دس ہزار پونڈ کا نقصان برداشت کیا۔ اس حرکت مذبومی کا سبب یہ تھا کہ بازار میں چند مردہ چوہے پائے گئے تھے۔

میونسپلٹی کو بہت روپیہ صرف کرنا پڑا۔ مگر اس نے طاعون کو آگے پھیلنے نہیں دیا اور خدا خدا کر کے شہر کے لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا۔

............☆☆............

ایک کتاب کا جادو

کالے طاعون کے سبب سے میرا اثر غریب طبقے کے ہندوستانیوں میں بڑھ گیا۔ میری وکالت خوب چمکی اور میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ بعض فرنگی حضرت سے بڑے گہرے تعلقات ہو گئے اور مجھ پر نئی اخلاقی پابندیاں عائد ہو گئیں۔

مسٹر پولک سے بھی نباتاتی ریستوران میں ملاقات ہوئی جیسے مسٹر ویسٹ سے ہوئی تھی۔ ایک دن میں اس ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک نوجوان نے جو قریب کی میز پر بیٹھے تھے اپنا کارڈ میرے پاس بھیجا جس کا مطلب تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی میز پر بلا لیا۔ انہوں نے کہا "میں کریٹک کا سب ایڈیٹر ہوں۔ میں نے اخباروں میں آپ کا خط طاعون کے متعلق پڑھا تو بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملوں۔ شکر ہے کہ موقع مل گیا۔"

مسٹر پولک کی اس بے تکلفی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میرا دل ان کی طرف کھینچنے لگا۔ ایک ہی روز میں ہم دونوں میں اچھی خاصی ملاقات ہو گئی اور یہ معلوم ہوا کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ہم دونوں میں اچھی خاصی ملاقات ہو گئی اور یہ معلوم ہوا کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ہم دونوں کی رائے بہت ملتی جلتی ہے۔ انہیں سادہ زندگی پسند تھی۔ ان میں یہ عجیب ملکہ تھا کہ جس بات سے ان کا ذہن متاثر ہوتا تھا اسے فوراً عملی صورت میں لے آتے تھے۔ بعض تبدیلیاں جو انہوں نے اپنی زندگی میں کیں فوری بھی تھیں اور قطعی بھی۔

''انڈین اوپینین'' کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ مسٹر ویسٹ کی پہلی ہی رپورٹ بڑی پریشان کن تھی۔ انہوں نے لکھا ''آپ کو توی امید تھی کہ اس کام میں منافع ہوگا مگر میرے خیال میں اس کی کوئی توقع نہیں بلکہ مجھے تو خسارے کا خوف ہے، حساب کتاب باقاعدہ نہیں ہے۔ لوگوں پر بہت سارو پیہ باقی ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت کچھ کاٹ چھانٹ کر کے نئے سرے سے انتظام کرنا پڑے گا مگر آپ گھبرائیے نہیں۔ میں اپنے امکان بھر اصلاح کی پوری کوشش کروں گا۔ چاہیے منافع ہو یا نہ ہو میں ہٹنے والا نہیں۔''

ایسی صورت میں کہ فائدے کی کوئی امید نہ تھی مسٹر ویسٹ چاہتے تو علیحدہ ہو جاتے مجھے شکایت کا کوئی حق نہ ہوتا بلکہ وہ الٹا مجھے الزام دے سکتے تھے کہ تم نے بغیر کافی ثبوت کے یہ کہہ دیا کہ یہ نفع کا کام ہے۔ مگر انہوں نے ذرا بھی شکایت نہیں کی۔ البتہ مجھے یہ خیال ہے کہ اس واقعے سے مسٹر ویسٹ مجھے زود اعتقاد سمجھنے لگے اور ہے بھی یہی کہ میں نے مدن جیت جی کے تخمینہ کو بغیر جانچ پڑتال کے صحیح مان لیا اور مسٹر ویسٹ سے کہہ دیا کہ منافع کی امید ہے۔

اب مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا ہے کہ قومی خدمت کرنے والے کو کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہیے جس کی اس نے اچھی طرح تحقیق نہ کر لی ہو خصوصاً حق کے پرستار کو اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی دوسرے کو ایسی بات کا یقین دلانا جس پر خود میری زود اعتقادی کی عادت اب تک نہیں گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ذمے اتنا کام لے لینے کا شوق ہے جو مجھ سے سنبھل نہیں سکتا۔ میرے اس شوق کی بدولت مجھ سے زیادہ میرے رفیقوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

مسٹر ویسٹ کا خط آتے ہی نٹال روانہ ہو گیا۔ میں نے مسٹر پولک سے سارا واقعہ

بیان کر دیا تھا وہ مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ انہوں نے مجھے ایک کتاب رستے میں پڑھنے کے لیے دی اور کہا کہ یہ تمہیں۔ یقیناً پسند آئے گی۔ یہ رسکن کی Units this iast تھی۔

یہ کتاب اپنی دلچسپ تھی کہ جب اسے پڑھنا شروع کیا تو ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اس نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ جوہانسبرگ سے ڈربن تک چوبیس گھنٹے کا سفر تھا۔ گاڑی شام کے وقت ڈربن پہنچی وہ ساری رات میری جاگتے گزری۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ اس کتاب کے نصب العین کے مطابق اپنی زندگی بدل دوں گا۔

اس سے پہلے رسکن کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے درسی کتابوں کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اور دنیا کے دھندے میں لگ جانے کے بعد مجھے مطالعے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس لیے میرا کتابی علم بہت محدود ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مطالعہ کا محدود ہونا میرے حق میں برا نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے جو کچھ پڑھا وہ دماغ میں اچھی طرح رچ بچ گیا۔ ان میں سے Units this last ایسی کتاب تھی جس کی بدولت میری زندگی میں فوری اور عملی تغیر ہو گیا۔ بعد میں میں نے اس کا ترجمہ گجراتی میں ''سر دو دیا'' (رفاہ عام) کے نام سے کیا۔

مجھے رسکن کی اس جید کتاب میں اپنے بعض گہرے عقیدوں کی جھلک نظر آئی۔ اسی لیے اس نے میرے دل کی کو موہ لیا اور میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگا دے۔ شاعروں کے کلام کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا کیونکہ جوہر قابل کسی شخص میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ۔

میں نزدیک Units this last کی تعلیم کا لب لباب یہ تھا۔

1۔ ہر فرد کا بھلا اسی میں ہے جس میں سب کا بھلا ہو۔

2۔ ایک حجام کے کام کی قیمت وہی ہے جو ایک وکیل کے کام کی ہے کیونکہ ہر شخص کو حق ہے جس طرح چاہے روزی کمائے۔

3۔ سب سے اچھی اور پر لطف زندگی مزدور کی یعنی کسان اور کاریگر کی زندگی ہے۔

پہلی بات میں پہلے سے جانتا تھا۔ دوسری کا بھی بہت خفیف سا احساس تھا۔ مگر تیسری کا بھی خیال تک نہیں آیا تھا۔ Units this last کے مطالعے سے مجھ پر یہ روشن ہو گیا کہ پہلی بات میں دوسری اور تیسری بھی شامل ہے۔ ادھر تڑکا ہوا ادھر میں دل میں یہ ٹھان کر اٹھا کر ان اصولوں پر عمل کروں گا۔

............☆☆............

فنیکس کی بستی

میں نے سارا ماجرا مسٹر ویسٹ سے بیان کیا کہ Units this last کے مطالعے کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ اور میری تجویز ہے کہ ''انڈین اوپینین'' کا دفتر ایک زراعتی فارم میں رکھا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا اور خالی وقت میں مطبع کا کام کرے اور سب کو مساوی اجرت دی جائے۔ جو پیٹ کی روٹی اور تن کے کپڑے کو کافی ہو۔ مسٹر ویسٹ نے اس تجویز کو پسند کیا اور یہ قرار پایا کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کا ہو تین پونڈ ماہوار اجرت دی جائے گی۔

مگر یہ بڑا مشکل سوال تھا کہ دس اور بارہ آدمی جو مطبع میں کام کرتے ہیں سب کے سب ایک دور افتادہ فارم میں جا کر بسنے اور اتنی کم اجرت لینے پر راضی بھی ہونگے یا نہیں۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ جو لوگ اس تجویز پر عمل نہ کرتے ہوں وہ موجودہ تنخواہ پر کام کرتے رہیں اور آہستہ آہستہ اس بستی کے نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

میں نے سب رفیقوں سے اس کے متعلق گفتگو کی۔ مدن جیت جی کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ محض حماقت ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کام جس کی خاطر انہوں نے سب کچھ دے دیا تھا بیٹھ جائے گا، سارے ملازم کام چھوڑ کر بھاگ جائے گے۔ ''انڈین اوپینین'' اور مطبع دونوں بند ہو جائیں گے۔

مطبع کے ملازموں میں میرے رشتے کے بھائی چھگن لال گاندھی بھی تھے۔ میں نے جس وقت مسٹر ویسٹ سے اس تجویز کا ذکر کیا وہ بھی موجود تھے۔ وہ بال بچوں

والے آدمی تھے مگر انہوں نے بچپن سے میری تربیت میں رہنے اور میرے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ اس لیے انہوں نے بغیر کسی بحث کے یہ تجویز منظور کر لی اور اس دن سے آج تک میرے ساتھ ہیں۔ گروند سوامی مشن میں شریک ہو گئے۔ دوسروں نے پوری تجویز تو منظور نہیں کی مگر اس پر راضی ہو گئے کہ میں جہاں کہیں مطبع لے جاؤں گا وہ ساتھ چلیں گے۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ان لوگوں سے یہ بحث دپز کرنے میں مجھے دو روز سے زیادہ نہیں لگے۔ اس کے بعد میں نے فوراً اشتہار دیا کہ ایک زمین کے قطعے کی ضرورت ہے جو ڈربن کے مضافات میں کسی ریل کے اسٹیشن کے قریب واقع ہو۔ اس کے جواب میں فنیکس سے پیغام آیا۔ میں اور مسٹر ویسٹ اس زمین کو دیکھنے گئے اور ایک ہفتہ کے اندر ہم نے بیس ایکڑ کا قطعہ خرید لیا۔ اس میں ایک چھوٹا سا خوبصورت چشمہ بہتا تھا اور آم اور نارنگی کے چند درخت بھی تھے۔ اس سے ملا ہوا ایک اسی ایکڑ کا قطعہ تھا جس میں بہت سے درخت اور ایک ٹوٹا پھوٹا بنگلہ تھا۔ ہم نے اسے بھی خرید لیا۔ اس میں سب ملا کر ایک ہزار پونڈ صرف ہوئے۔

مسٹر رستم جی آنجہانی اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ میری مدد کیا کرتے تھے۔ انہیں یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے ایک بڑے گودام کی پرانی لوہے کی چادریں میرے حوالے کر دیں اور بہت سا اور عمارت کا مسالہ بھی دیا۔ ہم نے اس سامان سے تعمیر شروع کر دی۔ چند ہندوستانی معمار اور بڑھئی مل گئے جو میرے ساتھ جنگ بوئر کے زمانے میں کام کر چکے تھے اور ان کی مدد سے ہم نے چھاپے خانے کے لیے ایک پچھتر فٹ لمبا اور پچاس فٹ چوڑا سائبان ایک مہینے کے اندر تیار کر لیا۔ مسٹر ویسٹ اور بعض اور لوگ بڑی جوکھم اٹھا کر ان کاریگروں کے ساتھ رہتے تھے۔

ساری زمین پر گھاس ہی گھاس تھی اور سانپوں کی اتنی کثرت تھی کہ وہاں رہنے میں جان کا خطرہ تھا۔ پہلے سب خیموں میں رہتے تھے۔ ہم لوگ ہفتے میں ایک بار اپنا سامان چھکڑوں میں بھر کر فنیکس لے جایا کرتے تھے۔ یہ جگہ ڈربن سے چودہ میل اور فنیکس اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی۔

''انڈین اوپینین'' کا صرف ایک نمبر باہر مرکزی پریس میں چھپوانے کی ضرورت پڑی۔ اب میں نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو جو ہندوستان سے روزگار کی تلاش میں میرے ساتھ آئے تھے اور مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے تھے فنیکس لے آؤں۔ یہ لوگ روپیہ کمانے کے شوق میں آئے تھے اور انہیں اس زندگی پر آمادہ کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر پھر بھی چند لوگ تھوڑے دن کے بعد چھوڑ کر چلے گئے اور اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ مگن لال گاندھی عمر بھر کے لیے اپنے کاروبار سے ہاتھ دھو کر میرے ساتھ ہو گئے اور میرے اخلاقی تجربوں میں وہ اپنی قابلیت، ایثار، خلوص اور محنت کے لحاظ سے میرے سب پرانے ساتھیوں سے ممتاز رہے اور دستکاری میں تو انہوں نے بغیر کسی سے سیکھے وہ کمال پیدا کیا کہ ہم میں سے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس طرح 1904ء میں فنیکس کی بستی کی بنیاد پڑی اور شدید مشکلات کے باوجود اب تک ''انڈین اوپینین'' اسی بستی سے نکلتا ہے۔

مگر اس مہم کی ابتدائی مشکلوں مختلف تبدیلیوں اور ہماری امیدوں اور مایوسیوں کے بیان کے لیے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔

............☆☆............

پہلی برات

فنیکس سے ''انڈین اوپنین'' کا پہلے نمبر نکالنے میں دانتوں پسینا آ گیا۔ اگر میں نے دو باتوں کی احتیاط نہ کی ہوتی تو پہلا نمبر نہ نکل سکتا یا دیر میں نکلتا۔ مجھے چھاپے خانے میں انجن سے کام لینا پسند نہیں تھا۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ جہاں کھیتی باڑی کا کام ہاتھ سے کیا جائے وہاں مشینوں کو بھی ہاتھ سے چلانا زیادہ مناسب حال ہوگا۔ مگر اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو ہم نے ایک تیل کا انجن لگا دیا۔ پھر بھی میں نے ویست سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسا انتظام کر لینا چاہیے کہ اگر انجن اتفاقاً بند بھی ہو جائے تو مشین نہ رکیں۔ انہوں نے ایک چرخی لگائی جو ہاتھ سے چلائی جا سکتی تھی۔ اخبار کی تقطیع اب تک وہی تھی جو روزانہ اخباروں کی ہوتی ہے مگر فنیکس جیسے دور افتادہ مقام پر اس تقطیع کی چھپائی مشکل تھی، اس لیے اس کی فل اسکیپ سائز اختیار کی گئی کہ بر وقت ضرورت اخبار چھوٹی مشین پر چھاپا جا سکے۔

ابتداء میں اخبار کی اشعات کے دن ہم سب کو رات کو دیر تک جاگنا پڑتا تھا۔ چھوٹے بڑے سب مل کر چھپے ہوئے تختوں کو موڑتے تھے اور یہ کام عموماً رات کے دس اور بارہ بجے کے درمیان ختم ہوتا تھا۔

پہلی رات کبھی نہ بھولے گی۔ مشین پر فرمہ کس دیا گیا مگر انجن چلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہم نے ڈربن سے ایک انجینئر بلوایا تھا کہ مشین کو جما کر چالو کر دے اس نے اور ویسٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر انجن ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہر شخص پریشان تھا۔ ویسٹ بے چارے کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ میرے پاس آئے تو ان کی آنکھوں

میں آنسو چھلک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے ''انجن کسی طرح نہیں چلتا۔ میرے خیال میں پرچہ وقت پر نکلنے کی کوئی امید نہیں۔''

میں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔ ''اگر یہ صورت ہے تو مجبوری ہے۔ رونے پیٹنے سے کیا فائدہ؟ پھر بھی ہمیں اپنی جیسی کر لینا چاہیے۔ کیا اس چرخی سے کام نہیں چلے گا ؟''

انہوں نے جواب دیا ''چرخی چلانے کے لیے آدمی کہاں سے آئیں گے؟ یہ اتنے آدمیوں کے بس کی بات نہیں چار چار کو باری باری سے کام کرنا پڑے گا اور ہم لوگ سب تھکے ہوئے ہیں۔''

تعمیر کا کام ہنوز ختم ہوا تھا اس لیے بڑھئی تک موجود تھے۔ سب چھاپے خانے کے سائبان میں پڑے سو رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا ایسا کیوں نہ کریں کہ ان لوگوں سے مدد لیں اور رات بھر جاگ کر کام ختم کر ڈالیں؟ میرے خیال میں تو یہ تدبیر ضرور آزمانا چاہیے۔

ویسٹ نے کہا ''میری ہمت نہیں پڑتی کہ ان آدمیوں کو جگاؤں اور چھاپے خانے کے آدمی سچ مچ شل ہو گئے ہیں۔''

میں نے کہا ''خیر یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

ویسٹ نے کہا ''پھر تو ممکن ہے کہ ہم کام کر لے جائیں۔''

میں نے سونے والوں کو جگایا اور ان سے مدد کی درخواست کی وہ فوراً راضی ہو گئے۔ اصرار کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا ''اگر ہم ایسے وقت میں کام میں نہ آئے تو پھر ہم کس مرض کی دوا ہیں؟'' ''آپ آرام کیجیے ہم چرخی چلاتے ہیں ہمارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔'' ہمارے آدمی تو پہلے ہی سے تیار تھے۔''

ویسٹ بہت خوش ہوئے اور جب ہم لوگوں نے کام شروع کیا تو جوش میں آ کر ایک مناجات گانے لگے میں اس فریق میں تھا جس میں بڑھئی تھے۔ دوسرے بھی اپنی اپنی باری کام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ صبح سات بجے تک جاری رہا ابھی بہت سا کام باقی تھا۔ اس لیے میں نے ویسٹ سے کہا کہ انجینئر کو جگا کر ان سے کہو ایک بار پھر انجن چلانے کی کوشش کریں۔ اگر اب بھی انجن چل جائے تو کام وقت پر ختم ہو سکتا ہے۔

ویسٹ نے جا کر انہیں جگایا اور وہ فوراً آ پہنچے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ ان کے ہاتھ لگاتے ہی انجن چلنے لگا۔ سارا مطبع خوشی کے نعروں سے گونجنے لگا۔

میں نے پوچھا "یہ کیا بات ہے؟ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ رات ہم محنت کرتے کرتے تھک گئے اور کچھ نہ ہوا اور صبح انجن خود بخود چلنے لگا جیسے کبھی بگڑا ہی نہ تھا؟"

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اس کے جواب میں یہ الفاظ انجینئر نے کہے یا ویسٹ نے "اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا سبب تھا۔ مشینوں کی بھی بعض اوقات یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ہماری طرح وہ بھی سستانا چاہتی ہیں۔"

میرے نزدیک انجن کا بند ہونا ہم سب کی آزمائش کے لیے تھا اور اس کا عین ضرورت کے وقت چلنا ہمارے خلوص اور محنت کا اجر تھا۔

اخبار وقت پر بھیج دیا گیا۔ ہم میں سے ہر ایک خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ پہلی ہی بار وقت کی پابندی پر اس قدر زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اخبار ہمیشہ باقاعدہ شائع رہا اور فنیکس کے لوگوں میں اعتمادِ نفس کی روح پیدا ہو گئی۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ ہم نے اپنی خوشی سے انجن کا استعمال ترک کر دیا اور ہاتھ سے کام کرنے لگے۔

میرے نزدیک یہی دن فنیکس کی اخلاقی معراج کے تھے۔

............☆☆............

پولک آگے بڑھے

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ میں نے فنیکس کی بستی بسائی مگر میرے قیام کی صورت یہی رہی کہ کبھی کبھی جا کر کچھ دن وہاں رہ آتا تھا۔ اس میں میرا ارادہ یہ تھا کہ میں آہستہ آہستہ وکالت ترک کر دوں۔ اس بستی میں جا کر بس جاؤں۔ محنت مزدوری سے روزی کماؤں اور فنیکس کی ترقی میں کوشش کر کے ذوق خدمت حاصل کروں۔ مگر یہ میری قسمت میں نہ تھا۔ مجھے اکثر تجربہ ہوا ہے کہ انسان کچھ سوچتا ہے اور خدا کچھ اور کرتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ دیکھا ہے کہ اگر اصلی مقصد طلب حق ہے تو خواہ انسان کی ساری تدبیریں الٹی ہو جائیں نتیجہ کبھی اس کے حق میں برا نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر اس کی توقع سے بڑھ کر اچھا ہوتا ہے فنیکس میں جو غیر متوقع واقعات پیش آئے وہ ہرگز مضر نہیں تھے۔ البتہ یہ مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے پہلے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں ان سے بہتر نتیجے حاصل ہوئے۔

ہم نے چھاپے خانے کے آس پاس کی زمین کو تین تین ایکڑ کے قطعوں میں تقسیم کر دیا تا کہ ہر شخص کھیتی کر کے گزر بسر کے لائق کما لے۔ ایک قطعہ میرے حصے میں بھی آیا۔ ان سب قطعوں میں ہمیں چار و نا چار لوہے کی نالی دار چادروں کے مکان بنانا پڑے ہم تو یہ چاہتے تھے کہ کچی خس پوش جھوپڑیاں یا اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے مکان کسانوں کے رہنے کے لائق بنا لیں مگر اس کا موقع نہ ملا۔ اس مکانوں میں خرچ بھی زیادہ ہوتا اور وقت بھی بہت لگتا اور ہم کو یہ فکر تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ٹھکانے سے بیٹھ کر کام شروع کر دیں۔

اخبار کے ایڈیٹر ابھی تک سکھ لال نظر تھے۔ انہوں نے نئی تجویز منظور کی تھی اور اخبار کی نگرانی ڈربن میں رہ کر کرتے تھے۔ جہاں ہمارے دفتر کی شاخ تھی۔ گو ہم تنخواہ دار کمپوزیٹروں سے کام لیتے تھے مگر تجویز یہ تھی کہ ہم میں سے ہر شخص کمپوزنگ کا کام جو سب سے سہل مگر نہایت تکلیف دہ ہے سیکھ لے۔ بعض لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے انہوں نے اب سیکھ لیا۔ میں سب سے پھسڈی رہا اور مگن لال گاندھی سب سے بڑھ گئے۔ اب تک انہوں نے کبھی چھاپے خانے میں کام نہیں کیا تھا مگر تھوڑے ہی دن کی مشق میں وہ نہ صرف ''کمپوزنگ'' میں بلکہ چھپائی کے سارے کاموں میں برق ہو گئے تھے۔ ان کی ترقی دیکھ کر تعجب اور خوشی ہوئی۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ان میں جتنی قابلیت ہے اس کا انہیں خود احساس نہیں۔

ابھی ہم ٹھکانے سے بیٹھے نہیں پائے تھے اور عمارتیں پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھیں کہ مجھے اپنا نیا نشیمن چھوڑ کر جوہانسبرگ جانا پڑا۔ کچھ ایسی صورت تھی کہ میں وہاں کے کام سے زیادہ دن بے توجہی نہیں برت سکتا تھا۔

جوہانسبرگ پہنچ کر میں نے پولک سے اپنے نئے انتظام کا ذکر کیا۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب نے، جو انہوں نے مجھے عاریتاً دی تھی یہ انقلاب پیدا کر دیا تو وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ میں اس تجربہ میں شریک ہو سکوں؟'' میں نے کہا'' ہے کیوں نہیں آپ کا جی چاہے تو آپ نئی بستی میں چل کر ہماری برادری میں داخل ہو جائیے'' وہ کہنے لگے ''تو پھر میں بالکل تیار ہوں۔''

ان کی اولوالعزمی نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے افسر کو ایک مہینے کا نوٹس دیا کہ ''کرٹیک'' کی ادارت سے سبک دوش کر دیے جائیں اور اس مدت کے

گزرنے کے بعد فنیکس پہنچ گئے۔ وہ اس قدر ملنسار تھے کہ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے سب کے دل کو موہ لیا اور ہمارے خاندان میں گھل مل گئے اور سادگی تو ان کی سرشت میں تھی فنیکس کی زندگی انہیں ذرا بھی غیر مانوس یا دشوار نہیں معلوم ہوئی بلکہ ایسی راس آئی جیسے بطخ کو پانی۔ مگر میں انہیں زیادہ دن وہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ مسٹر رچ اپنی تعلیم کے لیے انگلستان جار ہے تھے اور میں اکیلا دفتر کا کام نہیں سنبھال سکتا تھا۔ اس لیے میں نے پولک سے کہا کہ تم دفتر کے کام میں میری مدد کرو اور وکالت کا امتحان پاس کرلو۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دن کے بعد ہم دونوں کام چھوڑ کر فنیکس میں بس جائیں گے۔ مگر اس کی کبھی نوبت نہ آئی۔ پولک اتنے بھولے آدمی تھے کہ جب انہیں کسی دوست پر اعتماد ہو جاتا تھا تو جو وہ کہتا تھا بغیر بحث کے مان لیتے تھے۔ انہوں نے فنیکس سے لکھا کہ مجھے یہ زندگی دل سے پسند ہے، یہاں سچی راحت ومسرت حاصل ہے اور میرے دل میں اس بستی کو ترقی دینے کے ولولے اور امیدیں ہیں۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسے چھوڑ کر آپ کے ساتھ دفتر میں کام کرنے اور وکیل بننے سے ہمارا نصب العین جلد حاصل ہو جائے گا تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مجھے اس خط کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ پولک فنیکس سے جوہانسبرگ آئے اور انہوں نے میرے ساتھ کام کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔

اسی زمانے میں میں نے اس اسکاتی تھیوسوف سے جو مجھ سے ایک ابتدائی قانون امتحان کی کتابیں پڑھتے تھے کہا کہ تم بھی پولک کی طرح میرے ساتھ کام کرنے کا معاہدہ کرلو اور وہ راضی ہو گئے اس کا نام میک انٹائر تھا۔

غرض میری نیت تو یہ تھی کہ جس طرح جلد ممکن ہو فنیکس کے نصب العین تک پہنچوں مگر اس کے لیے جو طریقہ میں نے اختیار کیا تھا وہ مجھے منزل مقصود سے دور

لے جا رہا تھا اور اگر مشیت ایزدی کا دخل ہوتا تو میں اس جال میں جو میں نے سادہ زندگی کے نام سے پھیلا رکھا تھا پھنس کر رہ جاتا۔

جس طریقے سے خدا نے مجھے اور میرے نصب العین کو تباہی سے بچایا اس کا کسی کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے بیان کرنے کے لیے کئی باب چاہئیں۔

............☆☆............

خدا حافظ حقیقی ہے

اب میرے ہندوستان واپس جانے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے ایک سال میں لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ سال ختم ہو گیا اور واپسی کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے میں نے طے کیا کہ بیوی بچوں کو اپنے پاس بلاؤں۔

جس جہاز میں یہ لوگ جنوبی افریقہ آ رہے تھے اس میں ایک دن میرا منجھلا لڑکا رام داس کپتان کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ یکا یک اس کا بازو اکھڑ گیا۔ کپتان نے اس کی دیکھ بھال بہت اچھی طرح کی اور جہاز کے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا مگر پوری طرح فائدہ نہیں ہوا۔ اس لیے جب وہ جہاز سے اترا تو اس پٹی کے سہارے ہاتھ لٹکائے تھا۔ جہاں کے ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی کسی اچھے ڈاکٹر سے مرہم پٹی کرانا چاہیے مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مجھے مٹی کے علاج کی اتنی ڈھن تھی کہ میں نے اپنے بعض موکلوں کو جو مجھ جیسے نیم حکیم پر عقیدہ رکھتے تھے، یہ علاج شروع کرا دیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ رام داس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ وہ پورے آٹھ برس کا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''اپنی مرہم پٹی مجھے کرنے دو گے؟'' اس نے مسکرا کر کہا ''بڑی خوشی ہے۔'' اسے اس عمر میں اتنا شعور نہ تھا کہ اپنے برے بھلے کو سمجھتا مگر وہ عطائی علاج اور با قاعدہ علاج کا فرق ضرور جانتا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کانپتے ہاتھوں سے پٹی کھولی، زخم دھویا اور صاف مٹی کی پلٹیس رکھ کر بازو پر پٹی باندھ دی۔ عمل ایک مہینے تک جاری رہا یہاں تک کہ زخم بھر کر سوکھ گیا۔ اس درمیان کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی اور وقت بھی اس سے زیادہ نہیں لگا جتنا

بقول جہاز کے ڈاکٹر کے معمولی علاج میں لگتا۔

اس طرح کے تجربوں سے میرا عقیدہ گھریلو علاج پر اور پختہ ہو گیا اور اب میں زیادہ وثوق سے ان باتوں کا مشورہ دینے لگا۔ میں نے ان طریقوں کے استعمال کا دائرہ وسیع کر دیا اور مٹی پانی اور فاقے کے علاج سے مختلف قسم کے زخموں میں، بخار، ضعف معدہ اور یرقان وغیرہ میں کام لیا اور اکثر کامیاب ہوا۔ مگر اب مجھے اتنا وثوق نہیں جتنا جنوبی افریقہ میں تھا۔ بلکہ اتنے دن کی آزمائش سے یہ ثابت ہوا کہ اس قسم کے تجربوں میں صریحی خطرے ہیں۔

یہاں ان تجربوں کا ذکر کرنے سے یہ غرض نہیں کہ ان کی کامیابی ظاہر کی جائے مجھے اپنے کسی تجربے کے پوری طرح کامیاب ہونے کا دعویٰ نہیں ہے اور مجھ پر کیا موقوف ہے ڈاکٹر بھی اپنے تجربوں کے متعلق اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس شخص کو نئے تجربے کرنا ہوں وہ اپنی ذات سے ابتدا کرے۔ اس سے حق کی تلاش میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جو شخص خلوص نیت سے تجربے کرتا ہے اسے خدا ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔

فرنگیوں سے میل جول پیدا کرنے کے جو تجربے میں نے کیے ان میں بھی گھریلو علاج کے تجربوں سے کم خطرے نہیں تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ ان خطروں کی نوعیت دوسری تھی۔ مگر میں نے ان کی کبھی ذرا بھی پروا نہیں کی۔

میں نے پولک کو اپنے گھر ہی میں رکھا اور ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔ ان کی نسبت مسز پولک سے کئی سال قبل ہو چکی تھی۔ مگر شادی کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ میرا خیال ہے کہ پولک خانہ داری کی زندگی شروع کرنے سے پہلے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہتے تھے۔ وہ رسکن کی تعلیم کو مجھ سے بہتر سمجھتے تھے مگر اس پر

فوری عمل کرنے میں ان کا مغربی ماحول حائل تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا ''جب دو دلوں میں ایسا اتحاد ہو جیسا تم دونوں میں ہے تو مالی مصلحتوں سے شادی کو ملتوی کرنا جائز نہیں اگر افلاس شادی میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ غریب آدمی کبھی شادی کر ہی نہیں سکتے اور پھر تم تو میرے ساتھ رہتے ہو روزمرہ کے خرچ کی تو فکر ہی نہیں کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں تو تمہیں جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لینا چاہیے۔'' میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے پولک سے کوئی بات دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس نے میری دلیل تسلیم کر لی اور فوراً مسز پولک سے جو ان دنوں انگلستان میں تھیں اس معاملے کے متعلق خط و کتابت شروع کر دی۔ مسز پولک خوشی سے راضی ہو گئیں اور چند مہینے میں جوہانسبرگ پہنچ گئیں۔ شادی میں کچھ خرچ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ دلہن کے لیے نیا لباس بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ان دونوں کو عقد کے لیے مذہبی رسوم کی حاجت نہیں تھی۔ مسز پولک عیسائی مذہب پر پیدا ہوئی تھیں اور پولک یہودی مذہب پر۔ ان دونوں کا مشترک مذہب، مذہب اخلاق تھا۔

لگے ہاتھوں اس عقد کے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کر دوں۔ ٹرانسوال میں اس رجسٹرار کو، جو ٹرنگیوں کی شادی کا اندراج کرتا تھا۔ کالے آدمیوں کی شادیوں کا درج رجسٹر کرنے کا اختیار نہ تھا۔ پولک کی شادی میں دولہا کا ساتھی میں تھا۔ اس کام کے لیے فرنگی دوست بھی مل سکتے تھے مگر پولک کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا۔ غرض ہم تینوں رجسٹرار کے دفتر میں گئے اور اس نے مجھ سے کہا کہ جب تم دولہا کے ساتھ ہو تو مجھے کیونکر یقین آئے کہ دولہا دلہن فرنگی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لے اس شادی کے اندراج کو ملتوی رکھے۔ دوسرے دن اتوار تھا اور اس کے

اگلے دن سال نو کی تعطیل تھی بھلا ہم کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ٹھہرائی شادی اتنی سی بات کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ میری چیف مجسٹریٹ سے جو رجسٹری کے محکمہ کا افسر تھا ملاقات تھی۔ اس لیے میں دولہا دولہن کو ساتھ لے کر ان کے پاس گیا۔ انہوں نے رجسٹرار کے نام ایک رقعہ لکھ دیا اور شادی کا باضابطہ اندراج ہو گیا۔

اب تک جو فرنگی میرے ساتھ رہتے تھے ان سے پہلے کی ملاقات تھی مگر اب ایک انگریز خاتون، جو ہمارے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ ہمارے خاندان میں داخل ہوئیں جہاں تک مجھے یاد ہے ان میاں بیوی کا ہم سے کبھی بگاڑ نہیں ہوا اور فرض کیجیے کہ مسز پولک میں اور میری بیوی میں کبھی ناچاقی ہوئی بھی ہو تو ایسی باتیں تو اچھے اچھے خاندانوں میں بھی پیش آ جاتی ہیں۔ ہمارا خاندان تک اس قدر مخلوط تھا کہ اس میں ہر قسم کے اور ہر مزاج لوگ جمع تھے اور اگر غور کیجیے تو ہم جنس اور غیر جنس کا فرق محض خیالی ہے۔ ہم سب ایک ہی خاندان کے رکن ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ اس باب میں ویسٹ کی شادی کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ اس وقت میرے خیالات ''برہمچاریہ'' کے متعلق پختہ نہیں ہونے پائے تھے۔ اس لیے مجھے اپنے سب کنوارے دوستوں کی شادی کرانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ کچھ دن کے بعد ویسٹ اپنے والدین سے ملنے لوتھ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ہو سکے تو شادی کر لینا اور اپنی بیوی کو ساتھ لیتے آنا۔ فنیکس ہمارا مشترکہ گھر تھا کہ اور ہم سب کسان بن گئے اور اس لیے ہمیں شادی کا اور اس کے لازمی نتائج کا ڈر نہیں رہا تھا۔ ویسٹ نے لیسٹر کی ایک نوجوان حسین خاتون سے شادی کر لیا اور انہیں ساتھ لے کر لوٹے۔ ان کے خاندان والے موچی تھے اور لیسٹر کے ایک کارخانے میں مزدوری کرتے تھے۔ مسز ویسٹ خود بھی کچھ دن اس کارخانے میں کام کر چکی تھی۔ میں نے

انہیں حسین اس لیے کہا ہے کہ ان کے حسن سیرت نے فوراً میرے دل کو موہ لیا۔ سچ پوچھیے تو سچا حسن پاکدامنی اور باطنی میں ہے۔ مسز ویسٹ کے ساتھ ان کی والدہ بھی آئی تھیں۔ ضعیفہ اب تک زندہ ہیں ان کی محنت، مستعدی اور خوش مزاجی پر سب کو رشک آتا ہے۔

جس طرح میں نے فرنگی دوستوں کو شادی کی ترغیب دی۔ اسی طرح ہندوستانی دوستوں کو بھی اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے بال بچوں کو وطن واپس بلا لیں۔ فنیکس آہستہ آہستہ چھوٹا سا گاؤں بن گیا۔ اب وہاں چند خاندان بس گئے تھے اور ان کے بال بچوں سے آبادی بڑھتی جاتی تھی۔

............☆☆............

گھر گرہستی کی ایک جھلک

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ڈربن میں میرے گھر کا خرچ بہت تھا مگر میرا میلان سادگی کی طرف ہو چلا تھا۔ جوہانسبرگ میں رسکن کی تعلیم کے مطابق میں نے اس معاملے میں بہت سختی شروع کردی۔

ایک بیرسٹر کے گھر میں جتنی سادگی ممکن تھی وہ میں نے اختیار کی۔ تھوڑے بہتے فرنیچر کے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا تھا۔ مکان کی صورت میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرنے کا شوق بڑھ گیا میں نے اپنے بچوں کو بھی اس کی تربیت دینی شروع کردی۔

نان پاؤ خریدنا چھوڑ دیا گیا اور کوہنے کی ہدایت کے مطابق بے خمیری روٹی گھر پر پکنے لگی۔ معمولی کل کی چکی کا پسا ہوا میدہ اس کام کا نہیں تھا۔ اس لیے سادگی صحت اور کفایت کے خیال سے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ہم خود ہاتھ کی چکی میں آٹا پیسیں۔ میں نے سات پونڈ میں ایک چکی خریدی۔ اس میں ایک لوہے کی چرخی لگی تھی جو ایک آدمی کے بس کی نہ تھی جو ایک آدمی کے بس کی نہ تھی مگر دو آدمی اسے اچھی طرح چلا سکتے تھے۔ عام طور پر میں پولک اور بچے اسے چلایا کرتے تھے۔ میری بیوی بھی کبھی کبھی ہاتھ بٹا لیتی تھیں۔ اگرچہ چکی چلانے کا وقت وہی تھا جب وہ پکانا ریندھنا شروع کرتی تھیں۔ جب مسز پولک آئیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوگئیں۔ بچوں کی چکی چلانے میں بڑی اچھی ورزش ہو جاتی تھی۔ یہ کام بلکہ کوئی کام بھی، ان سے جبراً نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ان کے لیے ایک کھیل سا تھا۔ جب جی چاہتا آ کر ہاتھ

لگا دیتے اور جب تھک جاتے تو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ مگر ان بچوں نے اور دوسروں نے جن کا میں آگے ذکر کروں گا میری مدد میں کبھی کمی نہیں کی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں کوئی کام چور تھا ہی نہیں مگر اکثر ایسے تھے جو جی سے کام کرتے تھے۔ مجھے بہت کم لڑکے یاد ہیں جو کام سے جی چراتے ہوں یا تھکنے کا بہانہ کرتے ہوں۔

ہم نے اوپر کے کام کے لیے ایک نوکر رکھ لیا تھا وہ بھی عزیزوں کی طرح گھر میں رہتا تھا اور بچے کام میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ میونسپلٹی کا مہتر میلا اٹھایا کرتا تھا مگر پاخانے کی صفائی ہم نوکر سے نہیں کراتے تھے بلکہ اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ بچوں کے لیے بڑی اچھی تربیت ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں میں سے کسی کو مہتر کا کام کرنے میں عار نہیں اور انہیں قدرتی طور پر حفظان صحت کے عام اصولوں پر عمل کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہمارے گھر میں بہت کم یہ اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی بیمار پڑے۔ جب کبھی ایسی صورت پیش آتی تھی تو بچے بڑے شوق سے تیمار داری کرتے تھے۔ میں ان کی کتابی تعلیم کی طرف سے بالکل غافل تو نہیں تھا مگر اسے اس عملی تعلیم پر قربان کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اگر میرے بچوں کو مجھ سے شکایت ہو تو ایک لحاظ سے بجا ہے۔ بعض موقعوں پر انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے اور مجھے ایک حد تک اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ انہیں تعلیم دلانے کی خواہش میرے دل میں تھی بلکہ میں نے خود انہیں پڑھانے کی کوشش کی مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہوگئی اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ مجھے ان کے لیے کوئی اتالیق نہ مل سکا اس لیے میں انہیں روزانہ اپنے ساتھ دفتر لے جاتا تھا۔ یہ پانچ میل کا فاصلہ وہ آتے جاتے پیدل ہی طے کرتے تھے۔ اس سے انہیں اچھی خاص

ورزش ہو جاتی تھی اور اگر کوئی اور ساتھ نہ ہوا جس سے باتیں کرنا ضروری ہو تو میں بچوں کو چلتے چلتے گفتگو کے ذریعے تعلیم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے سب بچوں نے بغیر ہری لال کے جو ہندوستان ہی میں رہ گیا تھا جوہانسبرگ میں اسی طرح تعلیم پائی۔ اگر میں انہیں ایک گھنٹہ روز بھی پابندی کے ساتھ ادبی تعلیم دے سکتا تو میرے خیال میں ان کی تعلیم مکمل ہو جاتی مگر اس کا موقع نہ ملا اور ان کی ادبی تعلیم ناقص رہ گئی۔ جس کا انہیں بھی افسوس ہے اور مجھے بھی۔ میرے بڑے بیٹے نے اکثر نجی کی گفتگو میں اور اخباروں میں شکایت ظاہر کی ہے۔ دوسرے بچوں نے کریم النفسی سے میرا قصور ناگزیر سمجھ کر معاف کر دیا۔ میں اس صورت حال سے ہرگز دل شکستہ نہیں ہوں۔ مجھے جو کچھ افسوس ہے وہ یہ ہے کہ میں نے باپ کی حیثیت سے اپنا فرض پوری طرح نہیں ادا کیا۔ لیکن میرا عذر یہ ہے کہ میں نے ان کی ادبی تعلیم کو اس چیز پر قربان کر دیا جسے میں اپنے عقیدے میں، چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، قومی خدمت سمجھتا ہوں۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے ان کی سیرت کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور میرے نزدیک ہر بچے کے ماں باپ کا فرض ہے کہ اس کا کافی اہتمام کرے۔ اگر میرے بچوں میں باوجود میری انتہائی کوشش کے خامیاں رہ گئی ہیں تو مجھے دل سے یقین ہے کہ یہ میری تربیت کی کوتاہی کی علامت نہیں بلکہ میرے اور میری بیوی کے نقائص کی جھلک ہے۔

بچوں کو ماں باپ سے صرف صورت شکل ہی نہیں بلکہ ذہنی اور اخلاقی صفات بھی وارثت میں ملتی ہیں۔ ماحول کا بھی ایک حد تک اثر ہوتا ہے مگر اصل سرمایہ جسے لے کر بچہ زندگی میں قدم رکھتا ہے اسے اپنے آبا ؤاجداد ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض بچے موروثی برائیوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ

ہے کہ نیکی روح کی خلقی صفت ہے۔

مجھ سے اور پولک سے اکثر اس پر بحث ہوا کرتی تھی کہ بچوں کو انگریزی پڑھانا مناسب ہے یا نہیں۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ ہے کہ جو ہندوستانی ماں باپ بچے کو بچپن سے انگریزی میں سوچنا اور انگریزی بولنا سکھاتے ہیں اور وہ اپنے بچوں اور اپنے **ملک** دونوں کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں۔ وہ انہیں قوم کی روحانی اور سماجی آرٹ سے محروم کر دیتے ہیں اور ایک حد تک انہیں **ملک** کی خدمت کے ناقابل بنا دیتے ہیں۔ اس عقیدے کی وجہ سے میں اپنے بچوں سے خاص کر کے ہمیشہ گجراتی میں باتیں کرتا تھا۔ پولک کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں بچوں کی آئندہ ترقی کی جڑ کاٹ رہا ہوں وہ انتہائی محبت اور اصرار سے کہتے تھے کہ اگر لڑکے بچپن سے انگریزی جیسی عالمگیر زبان سیکھ لیں تو وہ زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے رہیں گے۔ ان کی دلیلوں سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں اپنے طرز کی صحت کا قائل کر دیا یا وہ مجھے خود سرے اور ضدی سمجھ کر چپ ہو رہے ہیں۔ یہ بیس برس کی بات ہے اور اس عرصے میں تجربے نے میرے عقیدے کو اور بھی راسخ کر دیا۔ گو میرے لڑکوں کو مکمل ادبی تعلیم نہ ملنے سے نقصان پہنچا ہے مگر اس کی بدولت انہوں نے مادری زبان میں اور زیادہ ترقی کر لی ہے جس میں ان کا اور ان کے **ملک** کا سراسر فائدہ ہے کیونکہ اب وہ اپنے دیس میں پردیسی نہیں۔ انگریز دوستوں کے وسیع حلقے میں اٹھنے بیٹھنے اور ایسے **ملک** میں رہنے سے جہاں زیادہ تر انگریزی بولی جاتی ہے انہیں خود بخود انگریزی بولنے اور لکھنے کی خاصی مشق ہو گئی ہے۔

............☆☆............

''زولو بغاوت''

بظاہر میں جوہانسبرگ میں بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب میں نہ تھی۔ عین اس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ ذرا اطمینان سے بیٹھوں گا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بالکل توقع نہ تھی۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں ''زولو بغاوت'' شروع ہوگئی ہے۔ مجھے زولو قوم سے کوئی خلش نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی ہندوستانیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اس زمانے میں میرا یہ عقیدہ تھا کہ دولت برطانیہ دنیا کی بہبود کے لیے قائم ہے۔ میں برطانیہ کا اتنا سچا وفادار تھا کہ دل میں بھی اس دولت عظمیٰ کو ضرر پہنچنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے مجھے اس سے سروکار نہ تھا کہ بغاوت بجا ہے یا بے جا۔ نٹال میں ایک والنٹیر ڈیفنس فورس 43 تھی اور اسے مزید رنگروٹوں کے بھرتی کرنے کا اختیار تھا۔ میں نے اخبار پڑھا کہ بغاوت کو فرد کرنے کے لیے اس دستے کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

میں اپنے آپ کو نٹال کا شہری سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایمبولینس کو قائم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انہوں نے فوراً منظوری بھیج دی۔

مجھے اپنی درخواست اس قدر جلد قبول ہو جانے کی امید تھی۔ اچھا ہوا کہ میں نے یہ خط لکھنے سے پہلے ضروری انتظام کر لیا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا۔ کہ اگر میری درخواست قبول ہوئی تو جوہانسبرگ کے گھر کو چھوڑ دوں گا۔ پولک ایک چھوٹے سے مکان میں رہیں گے اور میری بیوی فنیکس چلی جائیں گی۔ وہ اس فیصلے سے بالکل

میری ہم رائے تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ اس قسم کے معاملوں میں انہوں نے کبھی میری راہ میں رکاوٹ ڈالی ہو۔ اس لیے جیسے ہی گورنر کا جواب آیا میں نے مالک مکان کو ایک مہینے کا معمولی کرایہ دیا اور اپنا سامان کچھ فینکس بھجوا دیا اور کچھ پولک کے یہاں رکھوا دیا۔

میں نے ڈربن جا کر رنگروٹوں کے لیے تحریک کی۔ بہت بڑے دستے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم کُل چوبیس آدمی تھے۔ جن میں میرے علاوہ چار گجراتی تھے اور سب جنوبی ہند کے لوگ تھے جو ابتدا میں ''پابند مزدوروں'' کی حیثیت سے آئے تھے۔ ایک پٹھان تھا جو کسی کا پابند نہیں تھا۔

چیف میڈیکل افسر نے دستور کے مطابق مجھے سرجنٹ میجر کا عارضی منصب دے دیا تاکہ میری ایک حیثیت بھی ہو جائے اور کام میں بھی آسانی ہو اور میری تجویز سے انہوں نے تین آدمیوں کو سرجنٹ اور ایک کو کارپورل بنا دیا۔ ہمیں حکومت کی طرف سے وردیاں بھی ملیں۔ ہماری کور چھ ہفتے تک لام پر رہی۔ ''بغاوت'' کے مقام پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ''بغاوت'' کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ کسی قسم کی مزاحمت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ شورش محض اتنی بات پر ''بغاوت'' کہی جانے لگی کہ ایک زولو سردار نے ایک نئے ٹیکس کے ادا کرنے سے انکار کیا تھا اور جو سرجنٹ وصولی کے لیے گیا تھا۔ اسے نیزہ مار کر ختم کر دیا تھا۔ بہرحال مجھے زولو قوم سے دلی ہمدردی تھی اور جب صدر کیمپ پہنچ کر میں نے یہ سنا کہ ہم لوگوں کا کام زیادہ تر زولو زخمیوں کی تیمارداری کرنا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میڈیکل افسر کو ہمارا آنا بہت غنیمت معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ گورے لوگ زولو زخمیوں کی تیمارداری دل سے نہیں کرتے۔

ان غریبوں کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔اس نے ہم لوگوں کے پہنچنے کو ان بے گناہوں کے لیے ایک نعمت سمجھا۔ ہمیں پٹیاں، زخم صاف کرنے کی دوائیں وغیرہ دے کر عارضی ہسپتال میں لے گئے ۔زولو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

گورے سپاہی ہسپتال کے باہر کھڑے جنگلے کی سلاخوں سے جھانکا کرتے اور ہمیں سمجھاتے کہ ان زخمیوں کی دیکھ بھال نہ کرو۔ جب ہم ان کی باتوں پر توجہ نہ کرتے تو وہ جھلا کر زولو قیدیوں کو بری بری گالیاں دینے لگتے۔

رفتہ رفتہ ان گوروں کا مجھ سے میل جول بڑھ گیا اور انہوں نے میرے کام میں مداخلت ترک کر دی۔ کمانڈنگ افسروں میں کرنل اسپارکس اور کرنل وائلی بھی تھے جنہوں نے 1896ء میں بڑی سختی سے میری مخالفت کی تھی ۔انہیں میرے اس طرز عمل سے بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے خاص طور پر مجھے بلا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مجھے جنرل مکنزی سے ملایا۔ یہ لوگ پیشہ ور سپاہی نہیں تھے۔کرنل وائلی ڈربن کے ایک نامی وکیل تھے۔ کرنل اسپارکس ڈربن کے ایک مشہور گوشت کے کارخانے کے مالک تھے۔ جنرل مکنزی کے نٹال میں بہت اچھے فارم تھے۔ یہ حضرات والنٹیر تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے فوجی تربیت اور تجربہ حاصل کیا تھا۔

جو زخمی ہماری نگرانی میں تھے وہ لڑائی میں مجروح نہیں ہوتے تھے۔ان میں سے بعض شبہ سمجھ کر گرفتار کر لیے گئے اور جنرل نے ان کو کوڑے لگوائے تھے۔کوڑوں نے ان کے بدن میں گہرے زخم ڈال دیئے تھے اور مرہم پٹی نہ ہونے کے سبب سے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ سپاتی وفادار زولو تھے۔انہیں دشمن سے ممتاز کرنے

کے لیے خاص بلے دلے گئے تھے۔ پھر بھی گوروں نے غلطی سے ان پر بندوقیں چلادی تھیں۔

ان کے علاوہ مجھے گوروں کے ہسپتال میں کمپونڈری بھی کرنا پڑی تھیں۔ اس میں مجھے کوئی دقت نہ تھی۔ کیونکہ میں ڈاکٹر بوتھ کے چھوٹے ہسپتال میں ایک سال تک کام کرچکا تھا۔ اس سلسلے میں مجھ سے بہت سے فرنگیوں سے ملاقات ہوگئی۔

ہم لوگ ایک تیز رو دستے کے ساتھ کردیئے گئے۔ اسے یہ حکم تھا کہ جس جگہ سے خطرے کی خبر آئی وہاں فوراً پہنچ جائے۔ اس میں زیادہ تر پیدل سپاہی تھے جو جلدی کے خیال سے گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ جیسے ہی ہمارا کیمپ روانہ ہوتا تھا۔ ہمیں بھی ڈولیاں کندھوں پر رکھ کر پیچھے پیچھے چلنا پڑتا تھا۔ دو تین بار تو ہمیں دن میں چالیس چالیس میل چلنے کا اتفاق ہوا۔ مگر شکر ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے۔ خلق خدا کی خدمت ہی کرتے تھے۔ ہمارا یہ کام تھا کہ جو وفادار زولو غلطی سے زخمی کر دیئے جائیں انہیں ڈولی میں اٹھا کرلے جائیں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔

............☆☆............

احتسابِ نفس

زولو بغاوت کے سلسلے میں ہمیں نئے نئے تجربے ہوئے۔ جنگ بوئر میں مجھے لڑائی کے خوفناک نتائج کا اتنا اندازہ نہیں ہوا تھا اس بغاوت میں ہوا، یہ نام کو لڑائی تھی مگر اصل اصل میں آدمیوں کا شکار تھا۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ بہت سے انگریز جن سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا، یہی کہتے تھے، روز صبح اٹھ کر بے گناہوں کی جھونپڑیوں پر رائفلوں کی باڑھ چلتے سننا، جیسے شب برات میں پٹاخے چھوٹتے ہوں۔ ہمارے لیے ایک عذاب تھا۔ مگر میں مجبوراً یہ زہر کے گھونٹ پیتا تھا۔ اس خیال سے تسکین ہو جاتی تھی کہ ہماری کور کا کام صرف زولو زخمیوں کی خدمت کرنا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ہم لوگ نہ ہوتے تو غریب زولو کسمپرسی میں پڑے رہتے۔

لیکن اور بہت سی چیزیں تھیں جن سے غور و فکر اور مشاہدہ نفس کی تحریک ہوئی تھی۔ ملک کا یہ حصہ کم آباد تھا۔ سیدھی سادی اور ''وحشی'' زولو قوم کی بستیاں پہاڑیوں اور وادیوں میں دور دور واقع تھیں۔ جب میں زخمیوں کو لے کر یا خالی ان سنسان رستوں سے جہاں ہو کا عالم رہتا تھا گزرتا تو اکثر گہرے خیالات میں ڈوب جاتا۔

میں نے ''برہمچاریہ'' بن کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور میرا عقیدہ اور بھی گہرا ہو گیا۔ میں نے اپنے رفیقوں سے اس بارے میں گفتگو کی۔ مجھے اس وقت تک احساس نہ تھا۔ کہ ''برہمچاریہ'' معرفت نفس کے لیے کس قدر ناگزیر چیز ہے۔ مگر اتنا جانتا تھا کہ جو شخص دل و جان سے اپنے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کام بغیر اس کے کسی طرح نہیں چل سکتا۔ میں نے دیکھا کہ جس قسم کی خدمت میں

کر رہا ہوں اس کے موقعے اکثر پیش آئیں گے اور اگر میں گرہست کی زندگی میں مگن رہا تو اپنے فرض سے عہدہ برآ نہ ہوسکوں گا۔

مختصر یہ ہے کہ میں جسم اور روح دونوں کی بندگی ساتھ ساتھ نہیں کرسکتا تھا۔ مثلاً اس زمانے میں اگر میری بیوی حاملہ ہوتیں تو میں اس معرکے میں شریک نہ ہوسکتا۔ ''برہمچاریہ'' کے خاندان کی خدمت کے ساتھ جمع ہونا محال تھا۔ ''برہمچاریہ'' کے ہوتے ہوئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔

اس خیالات نے مجھے قطعی عہد کرنے کے لیے بیتاب کردیا۔ اس عہد کے تصور سے روح کو ایک طرح کی بالیدگی محسوس ہونے لگی۔ تخیل کی بلند پروازی خدمت کی نامحدود فضا کے منظر دکھانے لگی۔

ادھر میں اس جسمانی اور ذہنی شفقت میں مبتلا تھا ادھر یہ خبر آئی کہ بغاوت کے فرد کرنے کا کام قریب قریب ختم ہولیا اور ہم لوگ بہت جلد سبک دوش کردیئے جائیں گے۔ اس کے دو تین دن بعد سبک دوشی کا حکم بھی پہنچ گیا اور ہم سب گھر واپس آ گئے۔

کچھ عرصے کے بعد میرے نام گورنر کا خط آیا جس میں انہوں نے ایمبولینس کور کی خدمات کا شکریہ ادا کیا تھا۔

فنیکس پہنچ کر میں نیب ڑے شوق سے چھگن لال، مدن لال، ویسٹ اور دوسرے دوستوں سے برہمچاریہ کا ذکر چھیڑا۔ انہیں یہ بات پسند آئی اور انہوں نے تسلیم کرلیا کہ عہد کرنا ضروری ہے مگر اس کی مشکلات کا بھی ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے ہمت کرکے اس پر عمل کرنا شروع کردیا جن میں بعض کو کامیابی ہوئی۔

میں نے ہر چہ بادا باد کہہ کر عمر بھر کے لیے ''ہمچاریہ'' کا عہد کرلیا۔ مجھے اعتراف

ہے کہ میں اس وقت تک اس راہ کی صعوبتوں سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ آج تک مجھے اس میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مگر اس کی خوبیاں بھی مجھ پر روز بروز روشن ہوتی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک بغیر ''برہمچاریہ'' کے زندگی بے لطف ہے۔ یہ نہ ہوتو انسان حیوان بن جاتا ہے۔ ہم اپنی فطرت کے تقاضے سے ضبط نفس پر قادر نہیں ہوتے۔ انسان کا جوہر اور انسانیت کا معیار یہی ضبط نفس ہے۔ ہماری مذہبی کتابوں میں ضبط نفس کی جتنی تعریف کی گئی ہے وہ مجھے پہلے مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھی مگر اب روز بروز یہ حقیقت کھلتی جاتی ہے کہ یہ تعلیم حرف بحرف صحیح اور تجربے پر مبنی ہے۔

میں نے دیکھا کہ ''برہمچاریہ'' جس میں عجیب وغریب قوتیں پنہاں ہیں، کچھ کھیل نہیں ہے اسے محض جسم تک محدود سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ اس کی ابتداء بے شک جسمانی خواہشات کے ضبط سے ہوتی ہے مگر انتہا یہ نہیں ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ ناپاک خواہش دل میں نہ آنے پائے۔ سچے ''برہمچاری'' کو خواب میں بھی جسمانی لذت کا خیال نہیں آتا۔ جب تک انسان اس درجے پر نہ پہنچ جائے وہ منزل سے بہت دور ہے۔

مجھے تو جسمانی ''برہمچاریہ'' میں بھی بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے ایک حد تک اپنے اوپر بھروسا ہے۔ مگر خیال پر پورا قابو، جو ''برہمچاریہ'' کی جان ہے اب تک حاصل نہیں ہوا۔ میری طرف سے اس ارادے یا کوشش کی کمی نہیں مگر یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ناپاک خواہشیں کس رخ سے دبے پاؤں آ کر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انسان کے پاس وہ چیز موجود ہے جس سے بری خواہشوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی تلاش ہر شخص

کو اپنے طور پر کرنا ہے۔ رشیوں اور عارفوں نے اپنی واردات قلب کے تذکرے ہماری ہدایت کے لیے چھوڑے ہیں لیکن کوئی ایسی تدبیر نہیں بتائی جو ہر موقعے پر کام دے اور ہر شخص کے کام آئے۔ روحانی کمال یا عصمت بغیر توفیق ایزدی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے طالبان حق ہمیں ''رام نام'' جیسے منتر بتا گئے ہیں جن میں ان کی پاک نفسی اور پاک بازی کا رنگ جھلکتا ہے۔ کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پورا قابو حاصل ہونا محال ہے۔ ہر مذہبی صحیفہ یہی تعلیم دیتا ہے اور مجھے کامل ''برہمچاریہ'' کی کوشش میں ہر لحظہ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس جد و جہد اور کشمکش کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔ یہاں میں صرف یہ کہے دیتا ہوں کہ میں نے ''برہمچاریہ'' کی ابتدا کیونکر کی۔ پہلے پہل جوش میں مجھے اس کی پابندی بالکل سہل معلوم ہوئی۔ سب سے پہلی تبدیلی میں نے اپنے طرز زندگی میں یہ کی کہ جس پلنگ پر میری بیوی سوتی تھیں اس پر سونا اور ان سے تنہائی میں ملنا جلنا ترک کر دیا۔

غرض جو ''برہمچاریہ'' میں 1900ء سے جبراً قہراً برت رہا تھا۔ اس پر 1906ء کے وسط میں دائمی عہد کی مہر لگ گئی۔

............☆☆............

ستیاگرہ کا آغاز

جوہانسبرگ میں حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر رہے تھے کہ میرا یہ تزکیہ نفس گویا ستیاگرہ کا دیباچہ تھا۔ مجھے اب یہ احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی کے خاص خاص واقعات جن میں سب سے اہم "برہمچاریہ" کا عہد تھا مجھے درپردہ اس چیز کے لیے تیار کر رہے تھے۔

ستیاگرہ کی تحریک پہلے شروع ہوئی اور یہ نام بعد میں رکھا گیا۔ جب یہ اصول دریافت ہوا تو مجھے اس کے لیے کوئی نام نہیں ملتا تھا۔ ہم لوگ گجراتی میں بھی اس کے لیے انگریزی لفظ Passive Resistance (مفاہمت مجہول) استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے یورپیوں کے ایک جلسے میں یہ معلوم ہوا کہ Passive Resistance کے معنی بہت محدود ہیں، یہ کمزوروں کی تلوار سمجھی جاتی ہے، اس میں نفرت کا مفہوم بھی آ سکتا ہے اور تشدد کی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے تو مجھے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت پڑی کہ ہندوستانی تحریک ان سب چیزوں سے بڑی ہے اور اس کی ماہیت بالکل دوسری ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جدوجہد کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی نیا لفظ تلاش کرنا ضروری ہے۔

میں نے لاکھ کوشش کی مگر مجھے کوئی نیا نام نہیں سوجھا۔ اس لیے میں نے "انڈین اوپینین" میں اعلان کیا کہ اس کے پڑھنے والوں میں جو شخص سب سے اچھا نام تجویز کرے گا اسے ایک چھوٹا سا انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ مگن لال گاندھی نے "ست اراده (ست حق، آگرہ، ثبات) کا لفظ وضع کیا مگر میں نے سہولت کے خیال سے

اسے بدل کر ''ستیا گرہ'' کر دیا۔ اس وقت سے گجراتی میں اس تحریک کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس معرکے کی تاریخ اصل میں سرگزشت ہے میری بقیہ زندگی کی جو میں نے جنوبی افریقہ میں گزاری خصوصاً ان تجربوں کی جو میں نے اس عرصے میں تلاش حق میں کیے۔ اس تاریخ کا بہت بڑا حصہ میں نے یراودی جیل میں لکھا اور جو کچھ باقی رہ گیا اسے رہا ہونے کے بعد پورا کر دیا۔ پہلے یہ نوجیون میں نکلتی رہی پھر کتاب کی شکل میں شائع ہوگئی۔ والجی دیسائی اس کا ترجمہ 44Current brought میں چھاپنے کے لیے کر رہے ہیں۔ مگر میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ انگریزی ترجمہ بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع ہو جائے تاکہ جن لوگوں کو شوق ہو وہ میرے اہم ترین تجربوں سے، جو میں نے جنوبی افریقہ میں کیے تھے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ جن قارئین کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو انہیں میں مشورہ دیتا ہوں کہ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔ میں جن واقعات کا ذکر اس میں کر چکا ہوں انہیں یہاں نہیں دہراؤں گا۔ مگر آئندہ بیس اکیس ابواب میں اپنی جنوبی افریقہ کی زندگی کے چند ذاتی واقعات بیان کروں گا جو اس تاریخ میں ترک کر دیئے گئے ہیں اور اس کے بعد اپنے ہندوستان کے تجربے لکھوں گا۔ اس لیے جو لوگ اس تجربوں کا مطالعہ صحیح تاریخی ترتیب کے ساتھ کرنا چاہیں انہیں مناسب ہے کہ جنوبی افریقہ کی ستیا گرہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھیں۔

............☆☆............

غذائیات کے مزید تجربے

میری دلی خواہش تھی کہ خیال وقول اور عمل میں ''برہمچاریہ'' برتوں۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ''ستیا گرہ'' کی جدوجہد میں صرف کروں اور اس تیاری کے لیے ضبط نفس بہت ضروری تھا۔ اس لیے مجھے غذا کے معاملے میں اور تبدیلیاں کرنا پڑیں اور مزید احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس سے پہلے جتنی تبدیلیاں ہوئیں وہ زیادہ تر صحت کے خیال سے ہوئی تھیں مگر اب جو تجربے کیے جانے والے تھے ان میں مذہبی مقصد مدنظر تھا۔

اب میری زندگی میں فاقہ اور غذا کی احتیاط نے خاص اہمیت حاصل کر لی۔ انسان کے دل میں اکثر ہوائے نفس اور زبان کی چاٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے یہی صورت میرے ساتھ بھی تھی۔ مجھے اپنی شہوانی خواہش اور اپنے ذائقے پر قابو پانے می بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں اور اب بھی میں یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ میں نے ان دونوں چیزوں کو بالکل مغلوب کرلیا ہے۔ میں اپنے نزدیک بہت زیادہ کھاتا ہوں۔ میرے دوست سمجھتے ہیں کہ میں ضبط نفس سے کام لیتا ہوں لیکن میرا خیال نہیں ہے۔ اگر میں اتنی احتیاط بھی نہ کرتا تو میری زندگی جانوروں سے بدتر ہوتی اور اب تک ٹھکانے لگ چکا ہوتا۔ بہر حال چونکہ مجھے اپنے نقائص اچھی طرح معلوم ہیں میں نے ان سے نجات پانے کی کوشش کی اور اسی کی برکت ہے کہ میں جسم کو اتنے دن گھسیٹتا رہا اور تھوڑا بہت کام بھی کرگیا۔

مجھے اپنی کمزوری کا احساس تو تھا ہی اتفاق سے کچھ ہم خیال بھی مل گئے اور میں

نے یہ معمول کرلیا کہ اکاوشی کے دن صرف پھل یا خشک میوہ کھاتا تھا یا بالکل فاقہ کرتا تھا۔ جنم اشٹمی اور دوسرے تعطیلوں میں بھی یہی التزام تھا۔

میں نے میوے پر بسر کرنے کی عادت ڈالنا شروع کی مگر ضبط نفس کے اعتبار سے مجھے لے اور میوے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔ میوہ خوری میں غذا کی مقدار تو کم ہوگئی مگر ذائقے کی لذت اتنی ہی رہی بلکہ عادت پڑنے بعد اور بڑھ گئی۔ تہوار کے دن فاقہ کرنا یا صرف ایک وقت کھانا زیادہ مفید معلوم ہوا۔ اس لیے میں نے اسی کو اختیار کیا اور اگر کفارے وغیرہ کا موقع آتا تھا تو بھی میں فاقہ ہی کرتا تھا۔

مگر اس میں بھی میں نے دیکھا کہ جسم کی رطوبت کم ہو جانے کے سبب کھانے میں زیادہ مزا آنے لگا اور بھوک بڑھ گئی۔ مجھ پر راز کھل گیا کہ فاقے سے ضبط نفس اور لذت نفس دونوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ خود میرے اور دوسرے لوگوں کے تجربے اس حیرت انگیز کی شہادت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنا جسم میں بنانا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت تو مجھے زیادہ تر ذائقے کو قابو میں لانے کی فکر تھی۔ اس لیے میں برابر غذائیں بدلتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ مقدار میں بھی کمی کرتا رہا۔ مگر ذائقہ بلا بن کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ جب میں ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کرتا تھا تو مجھے اس میں اور زیادہ مزا آتا تھا۔

ان تجربوں میں میرے کئی ساتھی تھے جن میں ہرمان کیلن باخ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں نے ''جنوبی افریقہ کی ستیا گرہ کی تاریخ'' میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، مسٹر کیلن باخ فاقوں میں اور غذا کے تجربوں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیتے تھے۔ ستیا گرہ کے شباب کے زمانے میں میں ان ہی کے گھر پر رہتا تھا۔ ہم دونوں اپنی غذا کی تبدیلیوں کے بارے میں گفتگو کیا کرتے

اور نئی غذاؤں کے تصور سے زیادہ خوش ہوتے تھے۔ ان دنوں یہ باتیں دل کو بھلی لگتی تھیں۔ اور ان میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔ مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ غذا کے معاملے میں ذائقہ پر زور دینا بڑی غلطی ہے۔ غذا کا مقصد کام و ذہین کی ذلت نہیں بلکہ جسم کی بقاء ہے۔ اگر ہمارے کلی حواس ہمیشہ جسم کی اور جسم کے واسطے سے روح کی خدمت میں مصروف رہیں تو ان کی مخصوص لذت باقی نہیں رہتی اور وہ منشاء جس کے لیے فطرت نے انہیں خلق کیا ہے پورا ہو جاتا ہے۔

فطرت سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل الٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمیں ذرا شرم نہیں آتی کہ ہم جسم فانی کو سنوارنے اور اس کی زندگی چند لمحہ بڑھانے کے لیے ہزاروں جانوں کا خون کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہماری جسمانی اور روحانی ہلاکت ہے۔ ایک بیماری کو دور کرنے کے لیے ہم سینکڑوں نئی بیماریاں مول لیتے ہیں۔ حسی لذت کا لطف اٹھانے کی فکر میں ایک دن لطف اٹھانے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ تماشے روز مرہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن جو دیکھنا نہ چاہے اس سے بڑھ کر اندھا کوئی نہیں۔ غذائیاتی تجربوں کا مقصد اور اصول بتانے کے بعد اب میں ان تجربوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کروں گا۔

............☆☆............

کستوری بائی کی ہمت

میری بیوی اپنی زندگی میں تین بار اتنی سخت بیمار ہوئیں کہ مرتے مرتے بچیں۔ ہر بار انہیں گھریلو دواؤں سے فائدہ ہوا۔ پہلا موقع وہ تھا جب ستیاگرہ شروع ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ ان پر مرض کا سخت حملہ ہوا۔ خون نکلنے سے بہت ہی کمزور ہو گئیں۔ ایک ڈاکٹر دوست نے آپریشن کی رائے دی جس پر وہ کچھ تامل کے بعد راضی ہو گئیں۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں اس لیے ڈاکٹر کو بے کلوروفارم سنگھائے آپریشن کرنا پڑا۔ آپریشن تو کامیاب ہوا مگر انہیں بڑی سخت اذیت ہوئی۔ انہوں نے ان تکلیفوں کو جس استقلال سے برداشت کیا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی نے، جو تیماردار تھیں، ان کی بڑی خدمت کی۔ یہ ڈربن کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے جوہانسبرگ جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ آپ مریضہ کی طرف سے بالکل اندیشہ نہ کیجیے۔

مگر چند روز میں میرے پاس یہ خط پہنچا کہ کستوری بائی کی حالت اور خراب ہو گئی ہے۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ نہیں سکیں اور ایک بار بے ہوش بھی ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ مریضہ کو بغیر میری اجازت کے شراب یا گوشت نہیں دے سکتا۔ اس لیے اس نے مجھے جوہانسبرگ میں ٹیلیفون کیا اور گائے کے گوشت کی یخنی دینے کی اجازت مانگی۔ میں نے جواب دیا کہ ”میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر میری بیوی اس قابل ہوں کہ اپنی رائے ظاہر کر سکیں تو ان سے پوچھیے انہیں اختیار ہے جیسے چاہیں کریں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا ”میں اس معاملہ میں مریضہ سے ہرگز رائے

نہیں لوں گا۔ آپ کو خود یہاں آنا چاہیے۔ اگر آپ مجھے یہ آزادی نہیں دیتے کہ جو غذا چاہوں تجویز کروں تو میں آپ کی بیوی کی زندگی کا ذمہ دار نہیں۔''

میں اسی دن ڈربن پہنچا اور ڈاکٹر سے ملا۔ انہوں نے سہولت سے مجھے یہ افسوسناک خبر سنائی۔ ''تمہیں ٹیلیفون کرنے سے پہلے ہی مسز گاندھی کو یخنی دے چکا ہوں۔''

میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب میرے نزدیک تو یہ دغابازی ہوئی۔''

اس نے بہت استقلال سے جواب دیا۔ ''مریض کے لیے دوا یا غذا تجویز کرنے میں دغابازی کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ ہمیں تو اگر مریضوں کی جان بچانے کے لیے انہیں یا ان کے رشتے داروں کو دھوکا دینا پڑے تو ہم اسے نیکی سمجھتے ہیں۔''

مجھے بہت دکھ ہوا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ ڈاکٹر بڑا اچھا آدمی تھا اور میرا دوست تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے مجھ پر بڑا احسان کیا تھا لیکن مجھ میں اس کے طبی اخلاق کو برداشت کرنے کی تاب نہ تھی۔

''ڈاکٹر صاحب اب یہ بتایئے کہ آئندہ آپ کیا صورت اختیار کریں گے۔ مجھے اپنی بیوی کی موت گوارا ہے مگر انہیں گوشت دینا گوارا نہیں۔ ہاں اگر وہ خود چاہیں تو اور بات ہے۔''

''آپ کو اپنا فلسفہ مبارک ہو۔ میں نے تو آپ سے کہہ دیا کہ جب تک آپ کی بیوی میرے علاج میں ہیں مجھے یہ اختیار رہنا چاہیے کہ انہیں جو جی چاہے دوں۔ اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ آپ انہیں یہاں سے لے جائیے۔ میں انہیں اپنے گھر میں دم توڑتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''کیا آپ کا یہ منشاء ہے کہ میں انہیں فوراً لے جاؤں؟''

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ انہیں لے جایئے، میں تو علاج میں پوری آزادی چاہتا ہوں۔ آپ اس پر راضی ہیں تو میں اور میری بیوی دونوں ان کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔ آپ اطمینان سے اپنے کام پر جایئے مطلق اندیشہ نہ کیجیے لیکن اگر یہ سیدھی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو گویا آپ خود مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ آپ کی بیوی کے علاج سے دست بردار ہو جاؤں۔"

مجھے خیال ہے کہ میرا لڑکا میرے ساتھ تھا۔ وہ میری رائے سے بالکل متفق تھا کہ اس کی ماں کو یخنی نہ دی جائے۔ اس کے بعد میں نے خود کستوری بائی سے گفتگو کی۔ سچ پوچھیے تو وہ اتنی کمزور تھیں کہ انہیں اس معاملے میں زحمت دینا مناسب نہ تھا۔ لیکن میں نے اسے اپنا ناگوار فرض سمجھا اور دل کڑا کر کے انہیں اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو سنائی۔ انہوں نے عزم اور استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ "میں یخنی نہیں پیوں گی دنیا میں انسان کا جنم بار بار نصیب نہیں ہوتا، مجھے آپ کو گود میں مر جانا قبول ہے مگر اپنے جسم کو ان ناپاک چیزوں سے آلودہ کرنا قبول نہیں۔"

میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ اس معاملے میں میرے تقلید آپ پر لازم نہیں اور بہت سے ہندو دوستوں کی مثالیں دیں جو گوشت اور شراب دوا کے طور پر استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مگر انکے قدم کو لغزش نہ ہوئی۔ انہوں نے کہا۔

"نہیں صاحب۔ خدا کے لیے مجھے اسی دم یہاں سے لے چلیے۔"

مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ کچھ دیر پس و پیش کرنے کے بعد میں نے انہیں لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے ارادے سے مطلع کیا۔ وہ غصے میں چلا اٹھے "اس بے دردی کی کوئی انتہا ہے؟ اس بے چاری کی تو یہ حالت ہے اور آپ نے ان سے اس معاملے کا ذکر کر دیا۔ آپ کو شرم بھی نہیں آئی۔ میں آپ سے

کہے دیتا ہوں آپ کی بیوی میں ہرگز یہ طاقت نہیں کہ سفر کر سکیں۔ وہ ذرا سی حرکت بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ رستے ہی میں ان کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ اب بھی اس پر مصر ہیں تو آپ کو اختیار ہے۔ اگر آپ انہیں یخنی دینے پر راضی نہیں ہوتے تو ایک دن بھی انہیں اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ میں اس خطرے کی ذمہ داری اپنے سر کیسے لے لوں؟''

اس لیے ہم نے یہ فیصلے کر لیا کہ مریضہ کو لے کر فوراً روانہ ہو جائیں۔ اس وقت بوندیں پڑ رہی تھیں اور اسٹیشن کس قدر دور تھا۔ ہمیں ڈربن سے فنیکس اسٹیشن تک ریل میں جانا تھا اور وہاں سے ہماری بستی سڑک کے رستے سے ڈھائی میل تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میں بڑے خطرے کا کام کر رہا تھا مگر میں خدا کے بھروسے پر چل کھڑا ہوا۔ میں نے ایک شخص کو پہلے سے فنیکس روانہ کر دیا اور ویسٹ کو کہلا بھیجا کہ ایک گرم دودھ کی بوتل، ایک پانی کی بوتل، ایک بیمار ڈولی اور چھ آدمی اسے اٹھانے کے لیے لے کر اسٹیشن پہنچ جائیں۔ پھر ہم لوگ مریضہ کو اس خطرناک حالت میں ایک رشکا میں بٹھا کر لے چلے کہ سب سے پہلے گاڑی سے فنیکس روانہ ہو جائیں۔

مجھے کستوری بائی کی دلدہی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی بلکہ الٹی وہ مجھے تسکین دیتی رہیں ''میں اچھی طرح پہنچ جاؤں گی۔ آپ بالکل نہ گھبرایئے۔''

انہیں مدت سے غذا نہیں ملی تھی اس لیے ان میں ہڈی چمڑے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم بہت بڑا تھا اور رکشا اندر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے گاڑی تک پہنچنے کے لیے کچھ دور پیدا چلنا تھا۔ میں نے مریضہ کو گود میں اٹھا کر ریل کے ڈبے میں پہنچایا۔ فنیکس کے اسٹیشن سے ہم انہیں بیمار ڈولی میں لے گئے اور گھر پہنچ کر پانی کا علاج شروع ہوا۔ جس سے ان کے بدن میں رفتہ رفتہ تھوڑی

بہت طاقت آئی۔

فنیکس پہنچنے کے دوسرے دن ہمارے یہاں ایک سوامی جی آئے انہوں نے سنا تھا کہ ہم نے کس عزم و استقلال سے ڈاکٹر کا مشورہ رد کر دیا اور وہ بزرگانہ شفقت سے ہمیں سمجھانے کے لیے آئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس وقت میرا منجھیلا لڑکا منی لال اور سنجھلا رام داس بھی موجود تھا۔ سوامی جی نے اپدیشن دیا کہ دھرم کی رو سے گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں اور منو کے اقوال سند میں پیش کیے۔ مجھے ان کا میری بیوی کے سامنے یہ بحث چھیڑنا ناگوار ہوا لیکن میں اخلاقاً خاموش رہا۔ میں منوسمرتی کے ان مقامات سے واقف تھا لیکن میرے عقیدے پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اول تو مجھے معلوم تھا کہ بعض لوگ ان عبارتوں کو الحاقی سمجھتے ہیں دوسرے جو میرے خیالات نباتاتی مشرب کے متعلق تھے وہ مذہبی کتابوں کے پابند نہ تھے۔ کستوری بائی کا عقیدہ بھی بڑا راسخ تھا، وہ مذہبی کتابوں کے سمجھنے سے معذور تھیں مگر ان کے لیے وہ دھرم جو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا تھا، کافی تھا۔ بچے بھی اپنے باپ کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اس لیے ان میں سوامی جی کے اپدیش کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کستوری بائی نے یہ کہہ کر بحث کا خاتمہ کر دیا ''سوامی جی آپ کچھ بھی کہیں مجھے تو یخنی پی کر اچھا ہونا قبول نہیں۔ خدا کے لیے آپ مجھے دق نہ کیجیے۔ آپ کا جی چاہے تو میرے شوہر اور بچوں سے بحث کیجیے۔ مجھے جو فیصلہ کرنا تھا میں کر چکی۔''

گھر کے اندر ستیا گرہ

مجھے جیل جانے کا اتفاق پہلے پہل 1908ء میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قیدیوں کے لیے جو ضابطے بنائے گئے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ہر ''برہمچاری'' یعنی ضبطِ نفس کے طالب کو اپنی خوشی سے اختیار کرنا چاہیں مثلاً یہ کہ شام کا کھانا غروبِ آفتاب سے پہلے کھالیا جائے۔ ہندوستانی اور افریقی قیدیوں کو چائے اور کافی کی ممانعت تھی۔ کھانے میں وہ چاہیں تو اوپر سے نمک ڈال سکتے تھے۔ مگر محض ذائقے کی خاطر انہیں کوئی چیز نہیں دی جاتی تھی۔ میں نے جیل کے میڈیکل افسر سے درخواست کی کہ ہمیں گرم مسالہ وغیرہ دیا جائے اور نمک کھانا پکتے میں پڑ جایا کرے۔ اس نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ یہاں ذائقے کا لطف اٹھانے کے لیے نہیں آئے ہیں، صحت کے اعتبار سے گرم مسالے کی کوئی ضرورت نہیں اور نمک چاہے پکتے میں ڈالا جائے یا اوپر سے ایک ہی بات ہے۔''

آگے چل کر بڑی مشکلوں سے یہ بندشیں کچھ کم ہوئیں۔ مگر اصل میں یہ دونوں قاعدے صحت کے لیے بہت مفید تھے۔ جو سختیاں کسی بیرونی قوت کی طرف سے عائد کی جائیں ان کی پابندی میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے لیکن اگر ان ہی کو انسان اپنے اوپر خود عائد کرے تو ان دونوں قاعدوں کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ جہاں تک ممکن تھا میں چائے کے استعمال سے پرہیز کرتا تھا۔ اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے کھالیتا تھا اب ان دونوں باتوں کی پابندی میں مطلق دقت نہیں ہوتی۔

مگر ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے نمک بالکل ترک کر دینا پڑا اور یہ صورت متواتر دس سال تک باقی رہی۔ میں نے بناتاتی مشرب کی بعض کتابوں میں پڑھا تھا کہ نمک غذا کا کوئی جز نہیں ہے۔ بلکہ بے نمک کی غذا صحت کے لیے بہتر ہے۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ برہمچاری کے لیے بھی بے نمک کی غذا مفید ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ جو لوگ کمزور ہیں انہیں ہر قسم کی دال سے پرہیز کرنا چاہیے اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی تھی۔ مجھے دال کا بہت شوق تھا۔

اتفاق سے کستوری بائی کچھ دن کے افاقے کے بعد پھر گر گئیں اور خون پھر آنے لگا۔ محض پانی کے علاج سے کام چلتا نظر نہیں آتا تھا۔ انہیں میری تدبیروں پر عقیدہ نہیں تھا مگر انہوں نے اس پر عمل کرنے میں کبھی عذر نہیں کیا اور بیرونی علاج کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ جب میری کوئی تدبیر نہیں چلی تو میں نے ان سے بڑی منت سے کہا کہ نمک اور دال کھانا چھوڑ دیجیے۔ میں نے انہیں بہت کچھ سمجھایا اور بڑی بڑی دلیلیں پیش کیں مگر وہ کسی طرح نہ مانیں۔ آخر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو ان چیزوں کی ممانعت کی جاتی تو آپ سے بھی نہ چھوٹ سکتیں۔ مجھے اس بات سے تکلیف ہوئی مگر اسی کے ساتھ یہ خوشی تھی کہ مجھے اپنی محبت کے اظہار کا موقع مل گیا۔ میں نے ان سے کہا ”آپ کا خیال غلط ہے۔ اگر ڈاکٹر مجھے مشورہ دیتا کہ ان چیزوں کو یا کسی اور چیز کو چھوڑ دو تو میں بے تامل چھوڑ دیتا۔ اچھا یوں سہی کہ میں بغیر طبی مشورے کے خود ہی نمک اور دال ایک سال کے لیے چھوڑتا ہوں چاہے آپ چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔“

ان کے دل پر بڑا دھچکا لگا اور وہ دکھ بھری آواز میں چلا اٹھیں ’خدا کے لیے میری خطا معاف کیجیے، میں آپ کے طبیعت سے واقف ہوں۔ اس لیے مجھے مناسب نہ تھا

کہ آپ کو یوں غصہ دلاتی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان چیزوں کو چھوڑ دوں گی مگر آپ اپنا عہد واپس لے لیجیے۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔''

''آپ کے لیے ان چیزوں کا ترک کرنا بہت مفید ہے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی صحت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ رہا میں، سو میں ایک ایسے عہد کو جو میں نے سمجھ بوجھ کر کیا ہے واپس نہیں لے سکتا اور اس میں میری بھلائی بھی ہے۔ کیونکہ ضبط نفس، خواہ کسی نیت سے کیا جائے انسان کے لیے ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ اس لیے آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ میرے لیے یہ عہد اخلاقی امتحان کا کام دے گا اور آپ کو بھی میرے سبب سہارا رہے گا۔''

وہ میری طرف سے مایوس ہوگئیں ی۔ انہوں نے کہا ''آپ بڑے ضدی ہیں کوئی سر ٹیک کر مر جائے مگر آپ نہ مانیں گے'' اور رو رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

میں اس واقعے کو ستیا گرہ کی ایک مثال سمجھتا ہوں اور یہ ان باتوں میں سے ہے جنہیں یاد کر کے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

اس کے بعد کستوری بائی کی طبیعت روز بروز سنبھلنے لگی۔ اب خدا جانے یہ دال اور مسالے کی ترک اور غذا اور تبدیلیوں اور کرشمہ تھا یا دوسری چیزوں میں زیادہ احتیاط کرنے کا اثر تھا یا اس بالیدگی کی برکت تھی جو مریضہ کی طبیعت کو اس عہد سے حاصل ہوئی مگر یہ حقیقت ہے کہ انہیں بہت جلد صحت ہونے لگی۔ خون بالکل بند ہوگیا اور میری شہرت عطائی کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی۔

مجھے بھی اس نئے ترک لذت سے فائدہ ہوا۔ میں نے جو چیزیں چھوڑی تھیں ان کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ ایک سال بات ہی بات میں گزر گیا اور مجھے اپنے حواس پر پہلے سے زیادہ قابو حاصل ہوگیا۔ اس تجربے سے ضبط نفس کا رجحان اور ب

ڑھ گیا اور میں نے ان چیزوں کو ہندوستان آنے کے بہت دن بعد تک استعمال نہیں کیا۔ اس عرصے میں صرف ایک بار 1914ء میں لندن کے قیام کے زمانے میں ان دونوں چیزوں کے استعمال کا اتفاق ہوا۔ یہ میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ یہ کون سا موقع تھا اور ہندوستان پہنچنے کے بعد میں نے ان دونوں کا استعمال کیوں شروع کر دیا؟

میں نے جنوبی افریقہ میں بے نمک اور بے دال کی غذا کا تجربہ اپنے بہت سے رفیقوں پر کیا اور اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ طبی نقطہ نظر سے ممکن ہے اس غذا کے متعلق اختلاف ہو مگر اخلاقی اعتبار سے مجھے پورا یقین ہے کہ ہر طرح کے ضبط نفس سے روح کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جس طرح ضبط نفس کرنے والے کی زندگی عیش پرست کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح ان دونوں کی غذا بھی مختلف ہونا چاہیے۔ ''برہمچاریہ'' کے طالب اکثر وہ عادتیں اختیار کر کے جو عیش پرستوں کے لیے موزوں ہیں، اپنا کام بگاڑ لیتے ہیں۔

............☆☆............

ضبط نفس کی کوشش

میں پچھلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ کستوری بائی کی بیماری کے سلسلے میں مجھے اپنی غذا میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اس کے بعد ''برہمچاریہ'' کی خاطر مزید تبدیلیاں ہوئیں۔

سب سے پہلے میں نے دودھ کا استعمال چھوڑا یہ نکتہ مجھے رائے چندر بھائی نے بتایا تھا کہ دودھ سے شہوانی جذبے کو تسکین ہوتی ہے۔ نباتاتی مشرب کی کتابیں پڑھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوئی لیکن جب تک میں نے ''برہمچاریہ'' کا عہد نہیں کیا تھا دودھ ترک کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مجھ پر بہت دن سے یہ بات روشن ہوگئی تھی کہ دودھ جسم کی پرورش کے لیے ضروری نہیں لیکن اس کا ترک کرنا سہل نہ تھا۔ اب مجھے ضبط نفس کی خاطر دودھ ترک کرنے کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں کچھ رسالے کلکتہ کے چھپے ہوئے میری نظر سے گزرے جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ گائے بھینس پالنے والے ان بے زبان جانوروں پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے مسٹر کیلن باخ سے اس معاملے کے متعلق گفتگو کی۔

اگرچہ میں نے مسٹر کیلن باخ کا حال ''جنوبی افریقہ کے ستیا گرہ کی تاریخ''میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اس کتاب میں بھی جا بجا ان کا نام لیا ہے۔ پھر بھی یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا تھوڑا سا ذکر کروں۔ ان سے میری ملاقات محض اتفاق سے ہوگئی۔ وہ خان صاحب کے دوست تھے۔ خان صاحب کو ان کے

دل کی گہرائی میں فکرِ آخرت کی جھلک نظر آئی۔ اس لیے انہوں نے ان کا تعارف مجھ سے کرا دیا۔

جب میں ان سے ملا تو ان کی عشرت پسندی اور پر تکلف زندگی دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی لیکن پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کرید کرید کر مذہب کے متعلق بہت سی باتیں پوچھیں۔ اسی ضمن میں گوتم بدھ کے ترکِ تعلق کا بھی ذکر آیا۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں میں بڑی گہری دوستی ہوگئی۔ یہاں تک کہ ہمارے خیالات بالکل ایک سے ہو گئے اور ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انہیں بھی اپنی زندگی میں وہی تبدیلیاں کرنی چاہیے جو میں نے کی تھیں۔

اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر بھی وہ مکان کے کرائے کے علاوہ اپنی ذات پر بارہ سو روپے خرچ کرتے تھے۔ اب انہوں نے اتنی سادگی اختیار کرلی کہ ان کا خرچ صرف ایک سو بیس روپیہ رہ گیا۔ میں جوہانسبرگ سے اپنا گھر بار تو اٹھا ہی چکا تھا۔ اس لیے جیل سے رہا ہو کر آیا تو ان ہی کے ساتھ رہنے لگا۔ ہم دونوں خاصی جفاکش کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مجھ سے ان سے دودھ کے بارے میں گفتگو ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا ”ہم آپ ہمیشہ دودھ کے مضر اثرات کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ آخر اسے چھوڑ ہی کیوں نہ دیں؟ یقیناً یہ ایسی ضروری چیز نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہ چلے۔ ان کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ میں نے بڑی گرمجوشی سے یہ تجویز قبول کی اور ہم دونوں نے اسی وقت دودھ ترک کردینے کا عہد کرلیا۔ یہ واقعہ 1912ء میں ٹالسٹائی فارم میں پیش آیا۔

مگر مجھے محض دودھ ترک کردینے سے تسکین نہیں ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی

دن کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ صرف پھل اور خشک میوے کھایا کروں گا اور وہ بھی ایسے تھے جو سب میں سستے ہوں۔ ہماری آرزو تھی کہ غریب سے غریب لوگ جیسی زندگی بسر کرتے ہیں ویسی ہم بھی کریں۔

اس غذا میں آسانی بھی بہت تھی۔ پکانے کا جھگڑا ہی نہیں رہا۔ کچھ مونگ پھلی، کیلے، کھجوریں، لیمو، زیتون کا تیل یہ ہماری معمولی غذا تھی۔

یہاں میں ''برہمچاریہ'' کے طالبوں کو ایک ضروری بات سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرے نزدیک غذا کا ''ہمچاریہ'' سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن اصل چیز دل ہے جو شخص جان بوجھ کر ناپاک خیالات دل میں رکھتا ہے اس کا تزکیہ نفس فاقے سے نہیں ہوسکتا۔ غذا کی تبدیلیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دل کی عیاشی کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسان سختی سے اپنے نفس کا احتساب کرلے اور خدا کے سامنے عاجزی سے سر جھکا دے۔ اگر اس کی توفیق شامل حال ہوئی تو نجات ممکن ہے مگر دل و دماغ میں اور جسم میں بڑا گہرا تعلق ہے اور لذت پرستوں کا دل ہمیشہ عیش و عشرت کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لذت کو کم کرنے کے لیے غذا کی احتیاط اور فاقہ ضروری ہے۔ لذت پرست دل حواس پر حکومت کرنے کی جگہ ان کا محکوم بن جاتا ہے۔ اس لیے جسم کو ہمیشہ پاک صاف متحرک غذا کی اور کبھی کبھی فاقے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں، جو غذا کی پابندیوں اور فاقے کو بالکل بیکار جانتے ہیں اور وہ بھی جو اسی کو سب کچھ سمجھے ہیں۔ مجھے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ضبط نفس کی لگن ہوتی ہے انہیں غذا کی پابندیوں اور فاقے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بغیر ان چیزوں کے دل سے شہوانی خیالات کسی طرح دور نہیں ہوتے۔

............☆☆............

فاقہ

جن دنوں میں نے دودھ اور دال کو ترک کر کے خشک وتر میوہ کھانے کا تجربہ شروع کیا اسی زمانے میں ضبط نفس کے لیے فاقے بھی کرنے لگا۔ اس میں بھی مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ شریک تھے میں اس سے پہلے بھی کبھی کبھی فاقہ کرتا تھا مگر محض صحت کے خیال سے یہ بات مجھے ایک دوست سے معلوم ہوئی کہ فاقہ ضبط نفس کے لیے بھی ضرورت ہے۔

چونکہ میں ویشنو خاندان میں پیدا ہوا تھا اور میری ماں کو طرح طرح کے کٹھن عہد کرنے کی عادت تھی اس لیے میں جب تک ہندوستان میں رہا، اکاوشی اور دوسرے تہواروں میں برت رکھتا تھا۔ مگر یہ محض والدین کی تقلید اور انہیں خوش کرنے کی کوشش تھی۔

اس زمانیمیں نہ مجھے فاقے کی خوبیاں معلوم تھیں اور نہ اس پر عقیدہ تھا۔ لیکن جن دوست کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں فاقے سے فائدہ پہنچتے دیکھا تو میں نے بھی اکاوشی کے دن برت رکھنا شروع کر دیا کہ اس سے ''برہمچاریہ'' کا عہد نبھانے میں مدد ملے گی۔ عموماً ہندو لوگ برت میں پھل اور دودھ کا استعمال جائزہ سمجھتے ہیں مگر ایسے برت 45 تو میں روز ہی رکھتا تھا۔ اس لیے اب میں پورا فاقہ کرنے لگا یعنی صرف پانی پیتا تھا کچھ کھاتا نہ تھا۔

جب میں نے یہ تجربہ شروع کیا تو اتفاق سے ہندوؤں کے ساون اور مسلمانوں کے رمضان کے ساتھ ہو گیا۔ گاندھی خاندان، ویشنو ساج اور شوساج دونوں کے

تہوار مناتا تھا۔ اور وشنو اور شوالے دونوں میں پوجا کرتا تھا۔ خاندان کے بعض افراد ساون کے پورے مہینے میں ''پرادوشہ'' رکھتے تھے۔ میں نے یہ طے کیا کہ میں بھی یہی کروں گا۔

یہ تجربے اس زمانے میں کیے گئے جب میں اور مسٹر کیلن باخ اور چند ستیا گرہی خاندان اپنے بچوں سمیت ٹالسٹائی فارم میں رہتے تھے۔ ان بچوں کے لیے ہم نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان میں چار پانچ مسلمان لڑکے بھی تھے۔ میں انہیں اس کا شوق دلاتا تھا۔ کہ اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں اور اس طرح میں ان کی ہر طرح مدد کرتا تھا۔ خصوصاً نماز کے لیے میری بڑی تاکید کی تھی۔ چند پارسی اور عیسائی لڑکے بھی تھے۔ انہیں بھی میں ان کے مذہبی رسوم کی پابندی پر راغب کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اس لیے میں نے رمضان میں مسلمان لڑکوں سے روزے رکھوائے۔ میں تو خود ''پرادوشہ'' کا ارادہ ہی کر چکا تھا۔ ہندو، پارسی، عیسائی لڑکوں کو بھی میں نے ساتھ دینے پر آمادہ کرلیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسے عمل میں جو ضبط نفس کی خاطر کیا جائے دوسرے کے ساتھ شرکت کرنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ فارم کے رہنے والوں میں سے بہتوں کو میری تجویز پسند آئی۔ ہندو اور پارٹی لڑکے ہر ذرا ذرا سی بات میں مسلمان لڑکوں کی تقلید نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ مسلمان لڑکے روزہ افطار کرنے کے لیے غروب آفتاب کے منتظر رہتے تھے مگر دوسرے کچھ پہلے سے کھا پی لیتے تھے تاکہ اپنے مسلمان دوستوں کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلا سکیں۔ سحری میں بھی اور لڑکے مسلمان لڑکوں کے ساتھ شریک نہیں ہوتے تھے اور ان کی طرح پانی ترک کرتے تھے۔

ان تجربوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کو روزے کی خوبیوں کا احساس ہو گیا اور ان میں رفتہ رفتہ برادرانہ خلوص اور محبت کی روح سرایت کر گئی۔

ہم سب لوگ جوٹالسٹائی کے فارم میں رہتے تھے۔ اس کی وجہ سچ پوچھیے تو یہ تھی کہ سب لوگوں کو میرے احساسات کی رعایت منظور تھی جس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مسلمان لڑکوں کو رمضان میں گوشت نہ ملنے سے یقیناً تکلیف ہوتی ہو گی مگر انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا وہ بڑے شوق سے دال ترکاری کھاتے تھے اور ہندو لڑکے انہیں اکثر مزے مزے کی چیزیں جو فارم کی سادہ زندگی کے مناسب حال ہوتی تھیں، پکا کر کھلایا کرتے تھے۔ میں نے بیچ میں یہ ذکر خاص کر کے چھیڑا ہے۔ کیونکہ ان واقعات کو جن کی یاد میرے لیے بڑی خوش گوار ہے کہیں اور بیان کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس ضمن میں میری یہ خصوصیت بھی ظاہر ہو گئی ہے۔ مجھے جو بات اچھی معلوم ہوتی ہے اس میں اپنے رفیقوں کو بھی شریک کر لیتا ہوں۔ ان لوگوں کو فاقے کی عادت نہ تھی مگر ''پرادوشہ'' اور رمضان کے روزوں کی بدولت انہیں یہ محسوس ہو گیا کہ فاقہ ضبط نفس کے لیے کسی قدر مفید ہے۔

اس طرح فارم میں خود بخود ضبط نفس کی فضاء پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ فارم کے اور رہنے والے بھی ہمارے ساتھ ادھورے اور پورے فاقے کرنے لگے جو ان کے لیے یقیناً سراسر مفید تھے۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کے ترک لذات سے ان کے دل پر کہاں تک اثر ہوا اور انہیں حواس پر قابو پانے میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ البتہ اپنی نسبت مجھے یقین ہے کہ اس سے بے حد جسمانی اور اخلاقی فائدہ پہنچا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ فاقہ اور اس قسم کی اور ریاضتوں اور اثر سب پر یکساں ہوتا ہے۔

فاقہ حیوانی جذبات کو دبانے میں صرف اسی صورت میں مفید ہے جب یہ ضبط نفس کی خاطر کیا جائے۔ میرے بعض دوستوں کا تو یہ تجربہ ہے کہ فاقے کے بعد حیرانی جذبات اور بھڑک اٹھے اور ذائقے کی قوت اور تیز ہوگئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر فاقے کے ساتھ ضبط نفس میں مدد دیتا ہے۔ یہ مضمون جگو دگیتا کے دوسرے باب کے مشہور اشلوک میں بہت خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔

جو شخص صرف ظاہری لذتوں کو ترک کرتا ہے۔

اس کے دل سے مخصوص چیزوں کا خیال دور ہو جاتا ہے۔

آرزو کی خلش نہیں جاتی تو یہ کھٹک بھی نہیں رہتی

غرض فاقہ اور اس قسم کی دوسری ریاضتیں محض ضبط نفس کا ذریعہ ہیں اور بجائے خود کافی نہیں۔ اگر جسمانی فاقے کے ساتھ ساتھ ضبط نفس کا فاقہ نہ ہو تو اس کا انجام ریاکاری اور ہلاکت ہے۔

............☆☆............

معلم کی حیثیت سے

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ میں ان ابواب میں ان باتوں کو بیان کر رہا ہوں جن کا ذکر'' جنوبی افریقہ کے ستیا گرہ کی تاریخ میں نہیں آیا یا آیا ہے تو محض سرسری طور پر اس سے پچھلے ابواب کا سلسلہ سمجھ میں آ جائے گا۔

جب ہمارے فارم کے رہنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تو اس کی ضرورت پڑی کہ ان کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ان میں ہندوستانی پارسی، عیسائی لڑکے تھے اور چند ہندو لڑکیاں تھیں۔ ان کے لیے خاص معلم رکھنا ممکن بھی نہ تھا اور میں نے اسے ضروری بھی نہیں سمجھا۔ مشکل یہ تھی کہ قابل ہندوستانی معلم بہت کم تھے اور ان میں سے کسی کو کم تنخواہ پر جوہانسبرگ سے اکیس میل دور جا کر رہنا منظور نہیں تھا۔ ادھر ہم لوگوں کے یہاں روپے کا توڑا تھا۔ میرے خیال میں باہر سے معلم بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں مروجہ طریقہ تعلیم کا قائل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ تجربے اور مشاہدے سے صحیح معلوم کروں۔ یہ مجھے یقین تھا کہ کامل نظام معاشرت میں بچوں کو سچی تعلیم والدین ہی سے مل سکتی ہے اور اس صورت میں بیرونی امداد جتنی کم لی جائے، اچھا ہے۔ ٹال کا فارم ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا جس میں میں بمنزلہ باپ کے تھا۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تجویز بھی نقائص سے خالی نہیں تھی۔ میرا اور ان سب لڑکے لڑکیوں کا بچپن سے ساتھ نہیں رہا تھا۔ ان کی تربیت جداگانہ حالات اور مختلف

ماحول میں ہوئی تھی اور ان کے مذہبی عقائد بھی مختلف تھے۔ سوال یہ تھا کہ ایسی صورت میں افسر خاندان بن کر ان بچوں کی تعلیم کا فرض کماحقہ کیونکر ادا کر سکتا ہوں۔

مگر میں تعلیم میں تہذیب نفس اور تعمیر سیرت کو سب مقدس سمجھتا تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ اخلاقی تربیت سب بچوں کو خواہ وہ کسی عمر اور کسی خاندان کے ہوں یکساں دی جا سکتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں دن رات ان بچوں کے ساتھ رہوں گا اور پدرانہ شفقت سے ان کی تربیت کی نگرانی کروں گا۔ میرے نزدیک تعمیر سیرت تعلیم کی بنیاد ہے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اگر بنیاد اچھی پڑ گئی تو اور سب باتیں یہ بچے خود بخود یا دوستوں کی مدد سے سیکھ لیں گے۔

پھر بھی مجھے یہ احساس تھا کہ اس کے علاوہ کتابی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے میں نے مسٹر کیلن باخ اور پراگ جی دیسائی کی مدد سے درس کا سلسلہ شروع کر دیا جسمانی تربیت کی طرف سے بھی میں غافل نہیں تھا۔ ان بچوں کی روزمرہ کے کام میں کافی ورزش ہو جاتی تھیں۔ ہمارے فارم میں نوکر تو تھے نہیں اس لیے باورچی سے لے کر مہتر تک کا کام بھی کافی تھا۔ مسٹر کیلن باخ کو باغبانی کا بہت شوق تھا اور انہوں نے ایک سرکاری ماڈل گارڈن میں اس کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ سوائے ان لوگوں کو جو باورچی خانے میں کام کرتے تھے اور سب چھوٹے بڑوں کے لیے کچھ دیر باغبانی کا کام کرنا لازمی تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بچے انجام دیتے تھے۔ وہی گڑھے کھودتے، لکڑی کاٹتے، بوجھ اٹھاتے۔ ان میں ان کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی۔ یہ کام انہیں دل سے پسند تھا اس لیے عموماً کسی اور ورزش یا کھیل کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض اور کبھی کبھی سب بیماری کے بہانے سے کبھی کبھی کام سے جی بھر چراتے تھے۔ بعض اوقات میں ان کی حرکتوں سے چشم پوشی کرتا تھا

مگر اکثر سختی سے پیش آتا تھا وہ اس سختی کو پسند نہیں کرتے ہوں گے مگر مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی مزاحمت کی ہو۔ جب ایسی ضرورت پیش آتی تو میں انہیں دلیلوں سے سمجھاتا کہ کام کو ٹالنا اچھا نہیں ۔وہ قائل ہو جاتے مگر تھوڑی دیر کے لیے دم بھر میں پھر کام چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کھیلنے لگتے ۔بہر حال کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا اور ان کے جسم ایسے بن گئے کہ دیکھنے کے قابل تھے ۔فارم میں بیماری کا نام تک نہ تھا۔ مگر اس میں سچ پوچھیے تو آب وہوا کی خوبی اور کھانے پینے کے اوقات کی پابندی کو بھی بہت دخل تھا۔

اسی سلسلے میں پیشے کی تعلیم کا بھی ذکر کر دوں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہر لڑکے کو کوئی نہ کوئی مفید دستکاری سکھائیں ۔اسی غرض سے مسٹر کیلن باخ ایک ٹریپسٹ خانقاہ میں جا کر جوتا بنانا سیکھ آئے ۔ میں نے ان سے یہ ہنر سیکھا اور جو لوگ سیکھنا چاہتے تھے انہیں سکھایا۔مسٹر کیلن باخ تھوڑی بہت بخاری بھی جانتے تھے ۔اور ہمارے ایک اور رفیق اس کے باہر تھے۔اس لیے ایک چھوٹی بخاری کی کلاس بھی کھول دی گئی۔ کھانا پکانا قریب قریب سب لڑکوں کو آتا تھا۔

یہ سب چیزیں ان کے لیے نئی تھیں انہیں سان گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن انہیں یہ سیکھنا پڑیں گی ۔کیونکہ جنوبی افریقہ میں بچوں کو صرف لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سکھایا جاتا تھا۔

ٹالسٹائے فارم میں ہم نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ معلم جو کام خود نہ کرتے ہوں لڑکوں سے نہ کرائیں ۔ جب کبھی لڑکوں کو کوئی کام دیا جاتا تھا تو ہمیشہ کوئی معلم ان کے ساتھ رہتا اور ان کا ہاتھ بٹاتا۔اس لیے انہیں جو کچھ سکھایا جاتا خوشی سے سیکھتے ۔ کتابی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔

ادبی تعلیم

پچھلے باب میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ ہم نے ٹالسٹائی فارم میں جسمانی تربیت کا اور اسی ضمن میں پیشے کی تعلیم کا کیا انتظام کیا تھا۔ اگرچہ میں اس انتظام سے پوری طرح مطمئن نہ تھا مگر پھر بھی کہا جا سکتا کہ اس میں کم وبیش کامیابی ہوئی۔

مگر ادبی تعلیم کا معاملہ اس سے مشکل تھا۔ نہ تو میرے پاس ضروری سامان تھا نہ مجھے زبانیں اچھی طرح آتی تھیں اور نہ اتنی فرصت تھی کہ ان کا حسب دلخواہ مطالعہ کرسکوں۔ دن بھر جسمانی مشقت کرنے کے بعد میں شام کو تھک کر چور ہو جاتا تھا اور مجھے آرام کی ضرورت ہوتی تھی۔ عین اس وقت لڑکے میرے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ پڑھانے کے لیے انسان کو تازہ دم ہونا چاہیے۔ یہاں اسی کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑتی تھی کہ آنکھیں کھلی رہیں نیند نہ آجائے۔ صبح کا وقت فارم کے اور گھر کے کام میں صرف ہوتا تھا اور سکول کی پڑھائی دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہوتی تھی اور کوئی مناسب وقت تھا ہی نہیں۔

اس تعلیم کے لیے تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ہندی، تامل، گجراتی، اردو، یہ سب زبانیں پڑھائی جاتی تھیں اور ہر لڑکے کو کل تعلیم اس کی مادری زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔ انگریزی تھوڑی سی تاریخ، جغرافیہ اور حساب بھی سب کے لیے لازمی تھا۔ گجرات ہندو لڑکوں کو کسی قدر سنسکرت سیکھنا پڑتی تھی۔

میں تامل اور اردو پڑھاتا تھا۔ تامل میں جتنی سیکھی سفر اور جیل میں سیکھی تھی۔ میری ساری کائنات پوپ کی مشہور کتاب ''معلم تامل'' تھی اور اردو رسم الخط میں نے ایک

سفر میں تھوڑا بہت سیکھا تھا اور زبان میں میری معلومات ان عربی فارسی الفاظ تک محدود تھی جو مسلمان دوستوں کی محبت میں سنے تھے۔ سنسکرت میں اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا جتنی ہائی سکول میں پڑھی تھی بلکہ گجراتی کا بھی یہی حال تھا۔

میری ساری پونجی یہ تھی اور اسی سے مجھے کام چلانا تھا۔ میرے رفیق مجھ سے بھی زیادہ بے مایہ تھے۔ لیکن مجھے اپنے ملک کی زبانوں سے محبت تھی اور اپنی معلمانہ صلاحیت پر اعتماد۔ پھر میرے شاگردوں کی جہالت اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی خطا پوشی میرے کام آئی۔

جو تامل لڑکے ہمارے سکول میں تھے اور ان کی سب کی پیدائش جنوبی افریقہ کی تھی۔ اس لیے وہ اپنی زبان بہت کم جانتے تھے اور رسم الخط سے تو بالکل واقف نہ تھے۔ اس لیے میں انہیں تامل رسم الخط اور صرف ونحو کی ابتدائی باتیں سکھاتا تھا۔ اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ میرے شاگرد یہ جانتے تھے کہ تامل بولنے میں میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور جب کبھی ایسے تامل لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے مجھ سے ملنے آتے تو لڑکے ترجمانی کرتے تھے مگر میرا کام بڑے مزے میں چلتا تھا کیونکہ میں نے ان سے کبھی اپنی جہالت چھپانے کی کوشش نہیں کی اور ہر چیز میں بھی جیسے تھا ویسا ہی میں اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اس لیے باوجود اس کے کہ میں تامل زبان میں بالکل کورا تھا وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور ادب سے پیش آتے رہے۔

مسلمان لڑکوں کو اردو پڑھانا اور اس سے زیادہ سہل تھا۔ وہ اردو رسم الخط جانتے تھے۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ انہیں پڑھنے کا وشوق دلاتا رہوں اور ان کا خط درست کر دیا کروں۔

ان میں سے اکثر لڑکے سکول میں داخل ہونے سے پہلے بالکل ان پڑھ تھے۔

مگر مجھے تجربے سے معلوم ہوا کہ انہیں بیٹھ کر پڑھانے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ صرف ان کی کاہلی کی عادت چھڑانا اور ان کے کام کی نگرانی رکھنا کافی ہے۔ میں اسی پر قناعت کرتا تھا۔ اس لیے مختلف عمر کے لڑکے ایک ہی درجے میں بیٹھ کر اپنا اپنا سبق پڑھتے تھے اور بغیر کسی دقت کے کام چلتا تھا۔

آج کل تعلیم میں درسی کتابوں پر اتنا زور دیا جاتا ہے مگر مجھے تو ان کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ جو تھوڑی بہت کتابیں موجود تھیں ان سے بھی میں نے بہت کام لیا۔ مجھے لڑکوں پر کتابوں کا انبار لادنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ طالب علم کے لیے بہترین درسی کتاب اس کا استاد ہے۔ میرے استادوں نے مجھے کتابوں سے جو کچھ پڑھایا اس میں سے مجھے بہت کم یاد ہے۔ ہر کتاب کے باہر جو بتائیں وہ آج تک دل پر نقش ہیں۔

بچے کانوں سے سن کر جتنا سیکھتے ہیں۔ اور جتنی آسانی سے سیکھتے ہیں، پڑھ کر نہیں سیکھ سکتے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان لڑکوں کو کوئی کتاب اول سے آخر تک پڑھائی ہو۔ مگر مختلف کتابوں کے مطالعے سے جو باتیں میرے دل میں بیٹھ گئی تھیں وہ میں انہیں اپنی زبان میں سمجھا دیتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں اب تک یاد ہوں گی۔ کتابوں کو پڑھ کر یاد رکھنا ان کے لیے مشکل تھا لیکن جو کچھ میں انہیں زبانی بتاتا تھا وہ آسانی سے ان کی ذہن نشین ہو جاتا تھا اور جب پوچھو فر فر سنا دیتے تھے۔ پڑھنا اس کے لیے بڑا کٹھن کام تھا۔ مگر میری گفتگو سننے میں انہیں لطف آتا تھا۔ بشرطیکہ میرا انداز بیان دلچسپ ہو اور وہ میری گفتگو کی تحریک سے جو سوالات کرتے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کہاں تک سمجھنے کی قوت ہے۔

............☆☆............

روحانی تربیت

ان بچوں کی روحانی تربیت کا مسئلہ ان کی جسمانی اور ذہنی تربیت سے کہیں زیادہ دشوار تھا۔ میں نے اس معاملے میں مذہبی کتابوں سے بہت کم مدد لی۔ میں اس کا ضرور قائل تھا کہ ہر طالب علم کو اپنے مذہب کے بنیادی اصول جاننا چاہیے اور اپنی مقدس کتابوں سے واقف ہونا چاہیے اور جہاں تک ممکن تھا میں نے اس تعلیم کا انتظام بھی کردیا تھا۔ مگر یہ تعلیم میرے نزدیک ذہنی تربیت میں داخل تھی۔ ٹالسٹائی فارم کے لڑکوں کی تعلیم کا بار اپنے سر لینے سے پہلے مجھے اس حقیقت کا احساس ہوگیا تھا کہ روحانی تربیت ایک جداگانہ چیز ہے۔ روح کی تربیت کے معنی ہیں انسان کی سیرت کی تعمیر اور اسے اس قابل بنا دینا کہ خدا کی معرفت اور اپنے نفس کی معرفت حاصل کرسکے۔ میرا خیال تھا کہ یہ روحانی تربیت تعلیم کا اہم عنصر ہے اور بغیر اس کے بیکار بلکہ مضر ہے۔

میں نے اکثر یہ بے بنیاد عقیدہ سنا ہے کہ معرفت نفس صرف زندگی کی چوتھی منزل یعنی ''سنیاس'' میں قدم رکھنے کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ اس بے بہا تجربے کی تلاش زندگی کے آخری دور پر اٹھا رکھتے ہیں انہیں معرفت نفس نصیب نہیں ہوتی بلکہ ان کا بڑھاپا بچپن کی بگڑی ہوئی تصویر بن جاتا ہے ان کا وجود زمین پر بار ہوجاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنی مفلسی کے زمانے یعنی 1911-12ء میں بھی یہی خیالات رکھتا تھا اگرچہ شاید میں اس وقت انہیں ان الفاظ میں ظاہر کرتا۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ روحانی تربیت کس طریقے سے کی جائے۔ میں بچوں کو الجھن اور مناجات یاد کراتا تھا اور انہیں اخلاق آموز کتابیں پڑھ کر سناتا۔ مگر اس سے میری تسکین نہیں ہوتی تھی۔ جب میں بچوں میں گھل مل گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ روحانی تربیت کتابوں سے نہیں ہوسکتی۔ جیسے جسمانی تربیت کے لیے جسم کی روزش اور ذہنی تربیت کے لیے ذہن کی ورزش ضروری ہے اسی طرح روحانی تربیت کے لیے روح کی ورزش ناگزیر ہے اور روح کی پرورش کا دارومدار معلم کی زندگی اور سیرت پر ہے۔ معلم کی بچوں کے سامنے اور ان کے پیچھے ہر وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کوئی نامناسب فعل اس سے سرزد نہ ہو۔

چاہے معلم شاگردوں سے کتنے ہی فاصلے پر ہو مگر اس کے طرز زندگی کا اثر ان کی روحانی نشوونما پر پڑتا ہے۔ اگر میں خود جھوٹ بولوں اور اپنے شاگردوں کو سچ بولنے کی تلقین کروں تو ظاہر ہے کوئی اثر نہ ہوگا۔ بزدل معلم کبھی اپنے شاگردوں کو بہادر نہیں بنا سکتا۔ نفس پرست استاد انہیں ہرگز ضبط نفس نہیں سکھا سکتا۔ اس لیے میں نے یہ سوچھا کہ مجھے ان لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے جو میری تربیت میں ہیں اپنی زندگی کو اسوہ حسنہ بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ گویا یہ بچے میرے استاد تھے اور میں ان کی خاطر نیکی اور عفت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ سچ پوچھیے تو میں ٹالسٹائی فارم میں ضبط نفس میں جو اہتمام کرتا تھا وہ زیادہ تر ان ہی کے سبب تھا۔

ان میں سے ایک وحشی سرکش جھوٹا اور جھگڑالو تھا۔ ایک بار اس نے بڑا فساد برپا کیا۔ میں آپے سے باہر ہوگیا۔ میں اپنے شاگردوں کو کبھی سزا نہیں دیتا تھا مگر اس مرتبہ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے خاطر میں نہ لایا۔ آخر میں نے رول اٹھایا اور اس کے بازو پر مارا۔ میں اس وقت سارے بدن سے

کانپ رہا تھا اور میرے خیال میں اسے بھی اس کا احساس تھا۔ وہ رونے لگا اور اس نے اپنے قصور کی معافی چاہی۔ اس کے رونے کا سبب چوٹ کی تکلیف نہیں تھی۔ وہ سترہ برس کا مضبوط لڑکا تھا۔ اگر چاہتا تو مجھ پر ہاتھ اٹھاتا مگر اس نے دیکھا کہ مجھے بالکل مجبور ہو کر ایسی سخت سزا دینی پڑی اور اس سے مجھے خود سخت اذیت ہوئی۔ اس نے اس کے دل پر اثر کیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے کبھی میری نافرمانی نہیں کی۔ مگر مجھے اس تشدد پر آج تک ندامت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس روز اس لڑکے کے سامنے اپنی روحانیت کا نہیں بلکہ اپنی بہیمیت کا اظہار کیا۔

میں جسمانی سزا کا ہمیشہ سے مخالف ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنے لڑکوں میں سے ایک کو صرف ایک بار مارا ہے۔ اس لیے میں آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا محرک غصہ اور سزا دینے کی خواہش تھی۔ اگر یہ محض میری بے بسی کا اظہار ہوتا تو میں اسے جائز سمجھتا لیکن میری نیت خالص نہیں تھی۔

اس واقعے سے مجھے عبرت ہوئی اور میں نے طالب علموں کی تادیب کا اس سے بہتر طریقہ اختیار کیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقہ اس موقع پر جس کا میں نے ذکر کیا ہے کہاں تک کامیاب ہوتا۔ وہ لڑکا اس واقعے کو بھول بھال گیا اور اس کی سبب کوئی خاص اصلاح نہیں ہوئی مگر میرے دل میں معلمی نے فرائض کا احساس بڑھ گیا۔

اس کے بعد بھی لڑکوں نے شرارتیں کیں لیکن میں نے کبھی حیوانی سزا سے کام نہیں لیا۔ غرض ان لڑکوں اور لڑکیوں کی روحانی تربیت کی کوشش میں مجھ پر روز بروز یہ حقیقت روشن ہوتی گئی کہ روح میں بڑی قوت ہے۔

..........☆☆..........

پھولوں میں کانٹے

ٹالسٹائے فارم کے قیام کے زمانے میں مسٹر کیلن باخ نے مجھے ایک مسئلے کی طرف توجہ دلائی جو اس سے پہلے کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فارم میں چند لڑکے بد اور سرکش تھے۔ ان میں سے بعض آوارہ بھی تھے۔ میرے تینوں لڑکے اور دوسرے بچے جن کی تربیت ان ہی کی طرح ہوئی تھی ان برے لڑکوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ مسٹر کیلن باخ کو یہ بات ناگوار تھی مگر انہیں جو کچھ فکر تھی میرے لڑکوں کی تھی۔

ایک دن انہوں نے صاف صاف مجھ سے کہہ دیا۔ ''مجھے یہ بات پسند نہیں کہ آپ اپنے بچوں کو برے لڑکوں سے ملنے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بری صحبت میں پڑ کر وہ بھی بگڑ جائیں گے۔''

مجھے یاد نہیں اس سوال پر مجھے کچھ غور کرنے کی ضرورت ہوئی یا نہیں۔ مگر اپنا جواب دیا ہے۔

''مجھے اپنے لڑکوں اور ان آوارہ لڑکوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے۔ میں دونوں کی تربیت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ لڑکے بھی میرے بلانے سے آئے ہیں۔ اگر میں انہیں کچھ دے کر رخصت کر دوں تو وہ فوراً جوہانسبرگ پہنچ کر اپنی پرانی حرکتیں شروع کر دیں گے۔ وہ خود اور ان کے والدین یہ سمجھتے ہوں گے ان کا یہاں رہنا مجھ پر بڑا احسان ہے اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ کم سے کم اتنا تو آپ بھی مانیں گے کہ انہیں یہاں بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ میرا اس معاملے میں جو فرض ہے وہ ظاہر

ہے۔ میں انہیں یہاں رکھنے پر مجبور ہوں اور میرے لڑکوں کو ان کی صحبت میں رہنا پڑے گا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے لڑکوں کے دل میں بھی سے یہ خیال پیدا کر دوں کہ وہ دوسروں سے برتر ہیں۔ یہ برتری کا زعم انہیں گمراہ کر دے گا۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ جل کر رہنا ان کے لیے بڑی اچھی تربیت ہے۔ وہ خود بخود نیکی اور بدی میں تمیز کرنے لگیں گے۔ ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ اگر واقعی ان میں نیکی کی صلاحیت ہے تو اس کا اثر ان کے ساتھیوں پر بھی پڑے گا؟ بہر حال میں تو انہیں یہی رکھوں گا۔ اگر اس میں کوئی خطرہ ہے تو ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

مسٹر کیلن باخ اس سے مطمئن نہیں ہوئے مگر چپ ہو گئے۔

میرے خیال میں نتیجہ برا نہیں ہوا۔ میرے بچوں کو اس تجربے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ اگر ان کے دل میں برتری کے احساس کا کچھ شائبہ تھا تو وہ دور ہو گیا اور انہیں ہر قسم کے لڑکوں میں مل جل کر رہنے کی عادت ہو گئی۔ وہ آگ میں تپ کر اور مضبوط ہو گئے۔

اس طرح کے متعدد تجربوں سے مجھ پر یہ بات ثابت ہو گئی اگر اچھے لڑکے برے لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں اور ان کی صحبت میں رہیں تو انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بشرطیکہ یہ تجربہ بہت احتیاط سے ان کے والدین اور ان کے سرپرستوں کی نگرانی میں کیا جائے۔

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ جو بچے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پاتے ہیں وہ ہر قسم کی ترغیبوں اور برے اثرات سے محفوظ رہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب مختلف قسم کی تربیت پائے ہوئے بچے ساتھ رکھے جائیں تو والدین اور معلموں کے لیے بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ انہیں ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے۔

فاقہ کفارے کی حیثیت سے

مجھے روز بروز یہ احساس ہوتا گیا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کس قدر مشکل چیز ہے میں نے دیکھا کہ اگر میں صحیح معنوں میں ان کا معلم اور سرپرست بننا چاہتا ہوں تو مجھے پر لازم ہے کہ ان کے دل میں جگہ کروں، ان کے دکھ سکھ میں شریک رہوں، ان کی مشکلوں کو حل کروں اور ان کے اٹھتے جوش اور آرزوؤں کو راہ پر لگاؤں۔

جس زمانے میں بعض ستیاگرہی جیل سے رہا ہوئے ہیں ٹالسٹائے فارم قریب قریب ویران تھا۔ چند لوگ جو رہ گئے تھے وہ فنیکس کے تھے اس لیے میں انہیں لے کرم فنیکس چلا گیا۔ یہاں مجھے بڑی سخت آزمائش کا سامنا ہوا۔

ان دنوں میں کبھی جوہانسبرگ میں رہتا تھا اور کبھی فنیکس میں۔ ایک بار مجھے جوہانسبرگ میں یہ اطلاع ملی کہ فنیکس آشرم کے دو شخص عفل شنیع کے مرتکب ہوئے۔ اگر میں یہ سنتا کہ یہ ستیاگرہ کی تحریک بیٹھ گئی تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا مگر اس خبر سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ میں اسی دن ریل سے فنیکس روانہ ہو گیا۔ مسٹر کیلن باخ با اصرار میرے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے میری حالت دیکھ لی تھی۔ انہیں کسی طرح گوارہ نہ ہوا کہ مجھے تنہا جانے دیں خصوصا اس لیے کہ اتفاق سے یہ خبر جس نے میرا دل ہلا دیا وہی لائے تھے۔

رستے میں میں نے یہ طے کر لیا کہ میرا کیا فرض ہے مجھے یہ احساس تھا کہ سرپرست یا معلم ایک حد تک ان لوگوں کی لغزشوں کا ذمہ دار ہے جو اس کی زیر نگرانی یا

زیر تربیت ہیں۔ اس لیے اس واقعہ کی ذمہ داری صریحا مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ میری بیوی نے مجھے پہلے سے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی سادہ دلی سے ان کی باتوں پر توجہ نہیں کی۔

میں نے سوچا کہ جن لوگوں سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے انہیں اپنے قصور اور میرے صدمہ کا پورا اندازہ اسی وقت ہوگا جب میں ان کے گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ اس لیے میں عہد کر لیا کہ سات دن فاقہ کروں گا اور اس کے بعد ساڑھے چار مہینے تک صرف ایک وقت کھانا کھاؤں گا۔ مسٹر کیلن باخ نے لاکھ کوشش کی کہ مجھے اس ارادہ سے باز رکھیں مگر ان کی ایک نہ چلی۔ آخر انہوں نے مان لیا کہ یہ کفارہ بجا ہے اور اس پر اصرار کرنے لگے کہ میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔ میں ان کی اس سچی محبت کو کیوں کر روکتا؟

اس فیصلے پر میرا دل ہلکا ہو گیا۔ اس خطا کا ارتکاب کرنے والوں کی طرف سے جو غصہ میرے دل میں تھا وہ دور ہو گیا اور مجھے ان کی حالت پر ترس آنے لگا۔ غرض جب میں فنیکس پہنچا تو میری طبیعت کو بہت کچھ سکون ہو گیا تھا۔ میں نے اس معاملے کی مزید تحقیقات کی اور جو تفصیلی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ معلوم کر لیں۔

میرے فاقے سے سب کو دکھ ہوا مگر آشرم کی فضا پاک صاف ہو گئی۔ ہر شخص کو محسوس ہو گیا کہ گناہ کس قدر ہولناک چیز ہے۔ مجھ میں اور بچوں میں جو رشتہ محبت تھا وہ اور استوار ہو گیا۔

کچھ دن کے بعد اسی واقعے کے سلسلے میں ایک اور شاخ پھوٹی۔ جس کے سبب سے مجھے چودہ دن کا فاقہ کرنا پڑا۔ اس کا اثر میری توقع سے بھی زیادہ ہوا۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جب کبھی شاگرد سے کوئی

لغزش ہوجائے تو استاد کا فرض ہے کہ فاقہ کرے۔ مگر میرے خیال میں بعض موقعوں پر اس انتہائی تدبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ البتہ اس کے لیے یہ شرط ہے کہ خلوص نیت اور روحانی صلاحیت موجود ہو۔ اگر استاد اور شاگرد میں سچی محبت نہیں ہے۔ اگر استاد کی لغزش سے روحانی اذیت نہیں پہنچی ہے، اگر شاگرد کے دل میں استاد کا احترام نہیں تو فاقہ بے جا ہے بلکہ اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔ غرض ایسی صورتوں میں خواہ فاقہ مناسب ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ استاد اپنے شاگردوں کی خطاؤں کا ذمہ دار ہے۔

پہلا کنارہ ہم لوگوں کے لیے دشوار نہ تھا۔ میں بدستور اپنا سارا کام کرتا رہا۔ حالانکہ فاقہ توڑنے کے بعد جتنے دن میں صرف ایک وقت کھانا کھاتا رہا۔ میری غذا پھلوں کے سوا کچھ نہ تھی۔ البتہ دوسرے فاقے کے آخری دن مجھ پر سخت گزرے مجھے اس وقت تک ''رام نام'' کی برکت کا پورا اندازہ نہ تھا اس لیے میں تکلیفیں سہنے میں کس قدر کچا تھا۔ اس کے علاوہ میں فاقے کے گروں سے خصوصا اس اصول سے ناواقف تھا کہ پانی خوب پینا چاہیے چاہے اس سے کتنی ہی متلی کیوں نہ ہو۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پہلا فاقہ آسانی سے گزرنے کی وجہ سے میں بے پرواہ سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلے فاقے میں میں روزانہ کوہنے کی ہدایت کے مطابق غسل کرتا تھا۔ چنانچہ پہلے فاقے میں میں نے دو تین دن کے بعد یہ معمول ترک کر دیا اور پانی بھی بہت کم پیا۔ کیونکہ اس سے منہ کا مزا میٹھا ہو جاتا تھا اور متلی ہونے لگتی تھی۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور آخر میں میری آواز بہت نحیف ہو گئی۔ اس پر بھی میں اپنے لکھنے کا کام اس طرح کرتا رہا کہ میں بولتا جاتا تھا اور کوئی دوسرا لکھتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ روز رامائن اور دوسری کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا اور ضروری معاملوں کے متعلق گفتگو کرنے اور مشورے دینے سے معذور نہ تھا۔

گوکھلے سے ملنے کے لیے سفر

جنوبی افریقہ کی اور بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں لیکن مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔

1914ء میں جب ستیا گرہ کی جدوجہد ختم ہوگئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آجاؤ۔ اس لیے میں کستور بائی اور کیلن باخ کو ساتھ لے کر انگلستان روانہ ہوگیا۔ ستیا گرہ کے زمانے میں میں نے تیسرے درجے میں سفر کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے اس سفر میں بھی میں نے میرے ہی درجے کا ٹکٹ لیا لیکن اس لائق کے جہازوں کا تیسرا درجہ ہندوستان کے ساحلی جہازوں (Coastal Boats) اور ریلوں کے تھرڈ کلاس سے کہیں بہتر تھا۔ ہندوستان کے جہازوں میں سونا تو الگ رہا بیٹھنے ہی کے لیے کافی جگہ نہیں ملتی اور صفائی کا تو نام بھی نہیں ہوتا۔ بہ خلاف اس کے لندن کے سفر میں تیسرے درجے میں کافی جگہ تھی اور صفائی کا معقول انتظام تھا۔ کمپنی نے ہمارے لیے خاص طور پر آرائش کا سامان مہیا کر دیا تھا اور چونکہ ہم لوگ سوائے میوے کے کچھ نہیں کھاتے تھے اس لیے اسٹیوارڈ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ ہمیں پھل اور اخروٹ وغیرہ دیا کرے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کو یہ چیزیں عموماً نہیں ملتی تھیں ان رعایتوں کی بدولت ہم نے جہاز پر اٹھارہ دن بڑے آرام سے گزارے۔

سفر کے دوران بعض ایسے واقعات پیش آئے جو قابل ذکر ہیں۔ مسٹر کیلن باخ کو دوربین کا بہت شوق تھا اور ان کے پاس دو ایک قیمتی دوربینیں تھیں۔ ہم دونوں

میں ان کے متعلق پر زور بحث رہتی تھی۔ میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ ایسی چیز رکھنا سادگی کے نصب العین کے خلاف ہے۔ ایک دن ہم اپنے کیبن کے روشن دان کے قریب کھڑے یہی بحث کرر ہے تھے کہ بات بڑھ گئی اور میں نے کہا ''ان دوربینوں کے سبب سے ہم دونوں میں روز نزاع رہتی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ انہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔''

لیکن باخ بولے ''ضرور پھینک دیجیے یہی کمبخت فساد کی جڑ ہیں۔''

میں نے کہا ''دیکھو پھر میں پھینکتا ہوں۔''

انہوں نے بے تامل جواب دیا ''میں سچ مچ کہتا ہوں پھینک دیجیے۔''

ان کا یہ کہنا تھا میں نے دوربین اٹھا کر سمندر کے حوالے کیں۔ یہ سات پونڈ میں خریدی گئی تھیں مگر ان کی اصل قدرو قیمت یہ تھی کہ مسٹر کیلن باخ ان پر جان دیتے تھے۔ مگر ان کے تلف ہونے کا انہیں مطلق رنج نہیں ہوا۔

میرے اور مسٹر کیلن رخ کے مابین جو محبت کے معاملے پیش آتے تھے یہ ان کی ایک ادنی سی مثال ہے۔ ہم دونوں ہر روز اس مکتب میں نئے سبق سیکھتے تھے۔ کیونکہ دونوں حق کی راہ پر چلنے کی کوشش کرر ہے تھے۔ اس سفر میں غصہ، خود غرض، نفرت وغیرہ خود بخود رخصت ہو جاتی ہے۔ ورنہ حق کی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔

جو شخص جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے وہ چاہے کتنا ہی نیک نیت اور سچا ہو حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتا۔ تلاش حق کی سعی بھی مشکور ہوتی ہے۔ کہ محبت اور نفرت، رنج و راحت کی دوئی سے چھٹکارا مل جائے۔

میرے فاقے کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ کہ مجھے یہ سفر کرنا پڑا۔ میری قوت ابھی اچھی طرح عود نہیں کر پائی تھی۔ میں جہاز کے عرشے پر ٹہلا کرتا تھا کہ تھوڑی سی

ورزش ہو جائے اور جو کچھ کھاتا ہوں اسے ہضم کر لوں۔ مگر یہ ورزش بھی میرے لیے زیادہ تھی اور اس سے میری پنڈلیوں میں درد ہونے لگتا تھا۔ لندن پہنچتے پہنچتے میری حالت اور ابتر ہو گئی۔ وہاں ڈاکٹر جیوراج مہتا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے اپنے فاقے کا حال اور اس کے بعد کی کیفیت بیان کی۔ انہوں نے کہا۔ ''اگر آپ کچھ دن کامل آرام نہیں کریں گے تو اندیشہ ہے کہ آپ کے پیر ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جائیں گے۔''

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص طویل فاقہ کر چکا ہو اسے کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے اور کھانے کی حرص کو روکنا چاہیے۔ فاقہ توڑنے میں فاقہ کرنے سے بھی زیادہ احتیاط اور ضبط نفس کی ضرورت ہے۔

مدیرا میں ہم نے سنا کہ کسی دن بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ بحیرہ انگلستان میں داخل ہوئے تو خبر ملی کہ لڑائی سچ مچ شروع ہو گئی۔ وہاں ہمارے جہاز کو کچھ دیر ٹھہرا پڑا۔ جہاد کو تحت بحری بم کے جال میں سے جو سارے بحیرے میں پھیلا ہوا تھا، نکال کر لے جانا سہل نہ تھا۔ ساتھمپٹن پہنچتے پہنچتے ہمیں دو دن لگ گئے۔ لڑائی کا اعلان 4 اگست کو ہوا تھا۔ ہم 6 اگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

............☆☆............

جنگ عظیم میں میرا حصہ

انگلستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ گوکھلے، جو علاج کے لیے پیرس گئے تھے، آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک لوٹیں گے۔ میں بھی ان سے ملنے ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا مگر ان کی واپسی کا کچھ ٹھیک معلوم نہیں تھا۔

مجھے یہ فکر تھی کہ اتنے دن تک کیا کروں؟ جنگ کے سلسلے میں میرا کیا فرض ہے؟ سہراب جی اداجانیا جو ستیا گرہ میں شریک رہے تھے اور میرے ساتھ جیل گئے تھے اس زمانے میں لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ بڑے پکے ستیا گرہی تھے۔ اس لیے لوگوں نے انہیں قانون پڑھنے بھیجا تھا کہ جب لوٹ کر آئیں تو میری جگہ کام کریں۔ ان کے ساتھ اور ان ہی کے توسط سے میں ڈاکٹر جیوراج جی مہتا اور دوسرے حضرات سے جو لندن میں تعلیم پا رہے تھے ملا اور میں نے ان سے اس معاملے میں مشورہ لیا۔ ان کی رائے سے ایک جلسہ ان سب ہندوستانیوں کا جو برطانیہ عظمی اور آئرستان میں مقیم تھے، منعقد کیا گیا میں نے اس جلسے کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے۔

میری رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہیے جس طرح انگریز طالب علموں نے اپنی خدمات فوج کے لیے پیش کی ہیں ہندوستانیوں کو بھی کرنا چاہیے۔ اس پر بہت سے اعتراض کیے گئے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہم غلام ہیں وہ آقا ہیں۔ جب آقا پر برا وقت پڑے تو غلام کیوں ساتھ دے؟ اسے تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہیے۔ اس وقت اس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں فرق ہے مگر میری نظر میں ہندوستانیوں کی حالت اتنی بری نہیں تھی کہ غلامی کہی جائے۔ ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ قصور جو کچھ ہے وہ انگریز حکام کا انفرادی حیثیت سے ہے۔ برطانوی نظام حکومت کا قصور نہیں ہے۔ اگر ہم انگریزوں کی مدد اور ان کے اتحادِ عمل سے اپنی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ضرورت کے وقت ان کے کام آئیں۔ ان کی حکومت میں خرابیاں ضرور ہیں مگر اتنی ہیں کہ نا قابل برداشت ہوں۔ اب مجھے برطانوی نظام پر اعتماد نہیں رہا اس لیے میں حکومت کے ساتھ اتحادِ عمل نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ حضرات اسی زمانے سے نظام حکومت اور حکام دونوں سے بدظن تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ ان کا ساتھ کیونکر دے سکتے تھے۔

جو لوگ میرے رائے کے مخالف تھے ان کا قول تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات پر زور دینے کا یہی وقت ہے۔

میں کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے بلکہ شرافت اور دوراندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے اختتام تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ غرض میں اپنی رائے پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضا کاروں میں لکھوا دے۔ مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی اور تقریباً ہر صوبے اور مذہب کے نمائندے رضا کار بن گئے۔

میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا جس میں ان سب واقعات کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر ہماری خدمات کا قبول کیا جانا اس شرط پر منحصر ہو کر پہلے ہم ایمبولینس 46 کا کام

سیکھیں تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔

لارڈ کریو نے کچھ تامل کے بعد ہماری خدمات قبول کر لیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا کہ ہم ایسے نازک وقت میں سلطنت کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

رضا کاروں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام مشہور و معروف ڈاکٹر کنٹیلی کی نگرانی میں سیکھنا شروع کر دیا۔ صرف چھ ہفتے کی تعلیم تھی۔ مگر اس میں فرسٹ ایڈ کا پورا کورس آ جاتا تھا۔

ہماری جماعت میں اسی (80) آدمی تھے۔ چھ ہفتے کے بعد ہمارا امتحان ہوا جس میں ایک شخص کے سوا سب کے سب کامیاب ہوئے۔ اب حکومت نے ہمیں فوجی قواعد وغیرہ سکھانے کا انتظام کیا۔ کرنل بیکر ہمارے نگران مقرر ہوئے۔

لندن کی حالت اس زمانے میں دیکھنے کے لائق تھی۔ شہر میں ذرا بھی انتشار نہ تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے میں مصروف تھے۔ جتنے مضبوط جوان تھے وہ تو فوجی قواعد سیکھ ہی رہے تھے مگر ضعیف اور بیمار لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی بیکار نہ تھیں۔ انہوں نے سپاہیوں کی وردیاں اور زخمیوں کی پٹیاں تیار کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔

ایک خواتین کے کلب نے جو نسیم کہلاتا ہے فوجی وردیاں بہت بڑی تعداد میں سلوانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مسز سروجنی نائڈو اس کلب کی ممبر تھیں اور بڑے خلوص اور جوش سے کام کر رہی تھیں۔ اسی زمانے میں مجھے ان سے پہلے مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے میرے سامنے بونتے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا اور کہا کہ انہیں سلوا کر لاؤ۔ میں نے بڑی خوشی سے یہ خدمت قبول کی اور فرسٹ ایڈ کی تعلیم کے زمانے میں دوستوں کی مدد سے جتنے کپڑے سل سکے سلوا کر انہیں دیئے۔

روحانی کشمکش

جیسے ہی یہ خبر جنوبی افریقہ پہنچی کہ میں نے چند اور ہندوستانیوں نے اپنی خدمات جنگ کے لیے پیش کی ہیں میرے پاس دو تار آئے ان میں سے ایک مسٹر پولک کا تھا انہوں نے پوچھا تھا کہ کیا آپ کا یہ فعل ''اہمسا'' کے عقیدے کے منافی نہیں ہے؟

مجھے پہلے سے خیال تھا کہ یہ اعتراض ہو گا کیونکہ میں نے اپنی کتاب ''ہند سوراج'' میں جنگ کے مسئلے پر بحث کی تھی اور جنوبی افریقہ میں بارہا اپنے دوستوں سے اس کے متعلق گفتگو کر چکا تھا۔ ہم سب کا خیال تھا کہ جنگ اخلاقاً ناجائز ہے۔ جب میں نے ان لوگوں پر جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا مقدمہ نہیں چلایا تو میرے دوستوں کو یہ توقع کیونکر ہو سکتی تھی کہ میں جنگ میں شریک ہو جاؤں گا۔ خصوصی ایسی حالت میں کہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے۔ میرے دوستوں کو معلوم تھا کہ میں جنگ بوئر میں شریک رہ چکا ہوں مگر وہ سمجھتے تھے کہ اس کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جن وجوہ سے میں جنگ بوئر میں شامل ہوا تھا ان ہی کی بناء پر میں نے اس بار بھی فیصلہ کیا۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ جنگ میں شریک ہونا ''اہمسا'' کے منافی ہے مگر انسان کو ہر موقع پر اپنا صحیح فرض نہیں سوجھتا۔ حق کے طالب کو اکثر اندھیرے میں ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔

''اہمسا'' ایک عالمگیر اصول ہے جس میں تشدد کسی صورت میں جائز نہیں۔ ہم بے بس خاک کے پتلے ہر طرف ''اہمسا'' کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں یہ قول

کہ جاندار جانداروں ہی کو کھا کر جیتے ہی گہری حقیقت پر مبنی ہے۔ انسان جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے ''اہمسا'' کے بغیر ایک لحظ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، ہر وقت اس کے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی جان چاہے وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو ضرور تلف ہوتی ہے۔ اس لیے ''اہمسا'' کا طالب اگر اتنا کر سکے کہ اپنے ہر فعل میں خدا ترسی کو مدنظر رکھے جہاں تک ممکن ہو چھوٹے سے چھوٹے جاندار کی جان لینے سے پرہیز کرے بلکہ اسے دوسروں کے ہاتھ سے بچائے، غرض ہمیشہ ''اہمسا'' کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے عقیدے پکا ہے۔ اس کے دل میں روز بروز ضبط نفس اور خدا ترسی بڑھتی جائے گی۔ مگر ظاہری ''اہمسا'' سے کامل نجات کبھی نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ ''اہمسا'' کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سب جاندار کامل روحانی اتحاد رکھتے ہیں اور اس کی خطا کا اثر سب پر پڑتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص ''اہمسا'' سے پالک نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ انسانی سماج کا رکن ہے وہ اس ''اہمسا'' میں شریک ہونے پر مجبور ہے جس پر سماج کی زندگی کا دارومدار ہے۔ جب دو قوموں میں لڑائی ہو تو ''اہمسا'' کے طالب کا فرض ہے کہ وہ لڑائی کو روکے۔ مگر جو شخص یہ فرض ادا نہیں کر سکتا۔ جو لڑائی کو روکنے کی قوت نہیں رکھتا۔ جس میں لڑائی روکنے کی قابلیت نہیں ہے۔ وہ لڑائی میں شریک ہو کر بھی دل و جان سے یہ کوشش کر سکتا ہے۔ کہ اپنی قوم کو بلکہ ساری دنیا کو لڑائی سے نجات دے۔

مجھے یہ امید تھی کہ میں برطانوی سلطنت کے ذریعہ سے اپنی اور اپنی قوم کی حیثیت بڑھا سکوں گا۔ میں سوچتا تھا کہ جب تک میں انگلستان میں ہوں برطانوی بیڑے کی حفاظت سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اس مسلح قوت سے فائدہ اٹھانا گویا اس

تشدد میں شریک ہونا ہے جو اس کے ہاتھ سے عمل میں آسکتا ہے۔ اس لیے اگر میں سلطنت برطانیہ سے تعلق قائم رکھنا اور اس کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہوں تو مجھے ان تین طریقوں سے میں ایک اختیار کرنا چاہیے یا تو میں کھلم کھلا لڑائی کی مخالفت کروں اور ستیا گرہ کے اصول کے مطابق سلطنت برطانیہ سے اس وقت تک ترک موالات کروں جب تک وہ اپنی فوجی پالیسی نہ بدل دے، اس کے قابل اعتراض قوانین کی خلاف ورزی کر کے جیل چلا جاؤں، یا لڑائی میں سلطنت کا ساتھ دے کر لڑائی کو روکنے کی قابلیت اور قوت حاصل کروں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تک مجھ میں یہ قابلیت اور قوت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے سوائے لڑائی میں شامل ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

میرے نزدیک ''اہنسا'' کے نقطہ نظر سے سپاہیوں میں جو لڑتے ہیں اور ان لوگوں میں جو فوج کے ساتھ رہ کر دوسری خدمات انجام دیتے ہیں کوئی فرق نہیں جو شخص ڈاکوؤں کے جتھے کے ساتھ شریک ہو کر بار برداری میں مدد دیتا ہے یا جب وہ لڑنے جاتے ہیں تو ان کے گھروں پر پہرہ دیتا ہے یا جب وہ زخمی ہوتے ہیں تو ان کی مرہم پٹی کرتا ہے تو وہ بھی ان ڈاکوؤں کی طرح ڈکیتی کا مجرم ہے اسی طرح وہ لوگ بھی جو لڑائی میں محض زخمیوں کی خدمت کرتے ہیں لڑائی کے جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔

پولک کا خط پہنچنے سے پہلے میں یہ سب باتیں سوچ چکا تھا۔ جب یہ تار آیا تو میں نے کئی دوستوں سے اس مسئلے پر گفتگو کی اور آخر میں یہی طے کیا کہ میرا فرض ہے کہ اپنی خدمات جنگ کے لیے پیش کروں۔ آج بھی مجھے ان دلیلوں میں کوئی کمزوری نظر نہیں آتی اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ اس زمانے میں میری رائے سلطنت

برطانیہ کے متعلق اچھی تھی مجھے اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہے۔

مگر میں اس وقت بھی اپنے دوستوں کو اس کا قائل نہ کر سکا کہ میرا طرزِ عمل صحیح ہے۔ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے اور اس میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے خیالات کو جہاں تک ممکن ہے وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے جو ''اہمسا'' پر عقیدہ رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حق کے طالب کو کوئی کام رسمی خیالات سے متاثر ہو کر نا نہیں چاہیے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا فرض ہے کہ اپنی بات کی پچ نہ کرے اور جب اسے اپنی غلطی محسوس ہو تو بے تامل سب کے سامنے اس کا اعتراف کرلے اور اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

............☆☆............

چھوٹی ستیا گرہ

گو میں اپنا فرض سمجھ کر لڑائی میں شریک ہوا تھا مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں اس میں ذاتی طور پر حصہ نہ لے سکا بلکہ مجھے اس نازک موقعے پر ایک چھوٹی سی ستیا گرہ کرنا پڑی۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب ہم لوگ امتحان پاس کر چکے اور ہمارے نام رضا کاروں میں درج ہو گئے تو ایک افسر ہماری تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ ہم صرف قواعد وغیرہ میں اس کے ماتحت رہیں گے اور سب معاملات کی نگرانی میرے سپرد ہو گی اور کمانیر کو جو کچھ کور سے کہنا ہو گا میرے توسط سے کہے گا۔ مگر اس نے پہلے ہی دن ہمارے اس خیال خام کو دور کر دیا۔

مسٹر سہراب جی اداجانیا بڑے ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ''اس شخص سے خبر دار رہیے گا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم پر حکومت جتانا چاہتا ہے ہم سے اس کی تابعداری ہرگز نہ ہو گی۔ ہم اسے اپنا معلم ضرور سمجھتے ہیں مگر یہ کل کے چھوکرے تک جنہیں اس نے ہمارے سکھانے کے لیے رکھا ہے ہمارے افسر بنتے ہیں۔''

یہ نوجوان جنہوں کا اس نے ذکر کیا آکسفورڈ کے طالب علم تھے جو ہمیں قواعد سکھانے آئے تھے۔ انہیں ہمارے کمانیر نے سیکشن افسر مقرر کیا تھا۔

میں نے بھی کمانیر کے محکمانہ انداز کو محسوس کیا تھا۔ مگر نے سہراب جی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر بھلا وہ کب مانتے تھے۔

انھوں نے مسکرا کر کہا کہ ''آپ تو ہر شخص پر اعتبار کر لیتے ہیں یہ لوگ باتیں بنا کر آپ کو دھوکا دیتے رہیں گے اور جب آپ خدا خدا کر کے ان کی چالوں کو سمجھیں گے تو ستیا گرہ پر کمر باندھ لیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ بھی برباد ہوں گے اور ہم کو بھی برباد کریں گے۔''

میں نے جواب دیا ''آپ لوگ میرا ساتھ دے کر سوائے بربادی کے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ ستیا گرہی تو دھوکا کھانے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے۔ کمانیر ہمیں شوق سے دھوکا دے۔ میں آپ سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن خود دھوکا کھاتا ہے۔''

سہراب جی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے ''اچھا تو پھر آپ دھوکا کھاتے رہیے کسی دن ستیا گرہ میں آپ کا خاتمہ ہو جائے گا اور آپ کے ساتھ ہم جیسے غریبوں کی بھی جان جائے گی۔''

یہاں مجھے مس ایمیلی باب ہاؤس آنجہانی کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انھوں نے مجھے ترک موالات کے متعلق لکھے تھے ''کوئی تعجب نہیں کہ ایک دن آپ کو حق کے لیے سولی پر چڑھنا پڑے۔ خدا آپ کو راہ راست پر رکھے اور آپ کا حامی اور مددگار رہے۔''

مجھ سے اور سہراب جی سے یہ باتیں کمانیر کے تقرر کے بعد ہی ہوئی تھیں۔ چند روز میں ہمارے اور اس کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ میرے جسم میں چودہ دن کے فاقے کے بعد ابھی اچھی طرح طاقت نہیں آنے پائی تھی کہ میں قواعد میں شریک ہونے لگا۔ جس کے لیے مجھے اکثر گھر سے دو میل پیدل جانا پڑتا تھا۔ اس سے میری پسلی میں ورم ہو گیا اور میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اسی حالت میں مجھے ہفتے

کے آخر میں کیمپ میں جانا پڑتا تھا اور لوگ تو وہیں رہ جاتے تھے۔ لیکن میں گھر لوٹ آتا تھا۔ اسی کیمپ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ستیا گرہ کی ضرورت پڑی۔

کمانیر کا حکم حد سے بڑھنے لگا۔ اس نے ہم سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل معاملات میں چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی افسر ہوں اور اس زعم میں اس نے بے جا سختی شروع کر دی۔ سہراب جی میرے پاس دوڑے ہوئے آئے انہیں اس سخت گیری کی برداشت نہ تھی۔ انہوں نے کہا ہمارے پاس جو حکم آئے وہ آپ کے توسط سے آنا چاہیے ابھی تو ہم ٹریننگ کیمپ ہی میں ہیں جب ہمیں ابھی سے ایسے مہمل حکم دیئے جاتے ہیں تو آگے چل کر نہ جانے کیا ہو جو چھوکرے ہمیں قواعد سکھانے آئے ہیں ان کو ہم پر ہر بات میں ترجیح دی جاتی ہے۔ کمانیر سے دو دو باتیں ہو جانا چاہیں اس طرح سے ہرگز کام نہیں چلے گا۔ ہندوستانی طالب علم وغیرہ جو ہماری کور میں ہیں ایسے مہمل احکام کی پابندی نہیں کر سکتے ہم یہ کام اپنی خودداری قائم رکھنے کے لیے کر رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ رہی سہی عزت بھی کھو دیں۔''

میں نے کمانیر کو ان شکایتوں کی طرف توجہ دلائی اس نے لکھا کہ یہ شکایتیں باضابطہ تحریر کے ذریعے سے پیش ہونا چاہئیں۔ آپ شکایت کرنے والوں کو ہدایت کر دیجیے کہ وہ ایک درخواست لکھ کر اپنے نئے سیکشن افسر و کو دے دی۔ وہ معلموں کے توسط سے میرے پاس بھیج دیں گے۔

میں نے جواب دیا۔ کہ مجھے افسر کا دعویٰ نہیں۔ فوجی ضابطے کے لحاظ سے میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ والنٹیر کور کے صدر کی حیثیت سے مجھے غیر سرکاری طور پر اس کی نمائندگی کا حق دیا جائے۔ اسی کے ساتھ میں نے کل شکایتیں تفصیل سے لکھ دیں۔ میں نے کور کی طرف سے اس بات پر ناراضگی کا

اظہار کیا کہ نئے سیکشن افسر بغیر اس کی رائے کے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور یہ درخواست کی کہ افسر معزول کر دیئے جائیں اور نئے افسر کور کے انتخاب اور کمانیر کی منظوری سے مقرر رہوں۔

کمانیر کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اس نے لکھا کور کو سیکشن افسروں کے انتخاب کا حق دینا فوجی ضابطے کے خلاف ہے اور جو افسر مقرر ہو چکے ہیں۔ ان کے معزول کرنے سے بڑی بدرعی ہوگی۔

اس پر ہم لوگوں نے ایک کمیٹی کی جس میں یہ طے ہوا کہ ہمیں کیمپ سے واپس آ جانا چاہیے۔ میں نے سب کو جتا دیا کہ اس ستیا گرہ کا نتیجہ بہت خطرناک ہوگا۔ مگر اکثر ممبروں کی یہی رائے ہوئی کہ جب تک موجودہ سیکشن افسر معزول نہ کیے جائیں اور کور کو اپنے افسر خود منتخب کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے ہم لوگوں کو نہ قواعد میں شریک ہونا چاہیے اور نہ کیمپ میں جانا چاہیے۔

جب یہ فیصلہ ہوا تو میں نے کمانیر کو خط لکھا کہ مجھے آپ کے جواب سے جس میں آپ نے میری تجویز کی مخالفت کی ہے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ مجھے افسری کا شوق نہیں ہے۔ بلکہ میں خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جنگ بوئر کے زمانے میں میں نے جنوبی افریقہ کی ہندوستانی ایمبولینس کور میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا تھا۔ مگر کور کے کمانیر کرنل گیلوے ہر کام میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔ تاکہ کور کا منشاء معلوم ہو جائے۔ اس لیے ان کے اور ہماری کور کے تعلقات میں کبھی کشیدگی پیدا نہیں ہوئی اس خط کے ساتھ میں نے کمیٹی کے ریزولوشن کی ایک نقل بھی بھیج دی۔

کمانیر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس کے خیال میں یہ کمیٹی اور یہ تجویز بالکل بے

ضابطہ تھی۔

اس پر میں نے وزیر ہند کو ان سب واقعات کی اطلاع دی اور ریزولوشن کی نقل بھیجی۔ انہوں نے جواب دیا کہ جنوبی افریقہ کا معاملہ اور تھا یہاں قواعد کی رو سے سیکشن افسروں کا تقرر کمانیر کے اختیار میں ہے۔ مگر آپ اطمینان رکھیے کہ آئندہ جب کبھی ان افسروں کے تقرر کا موقعہ آئے گا تو کمانیر آپ کی تجویز کا لحاظ رکھے گا۔

اس کے بعد مجھ سے اور ان سے عرصے تک خط و کتاب ہوتی رہی۔ مگر میں اس افسوس ناک قصے کو طول نہیں دینا چاہتا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھے اس معاملے میں وہی تجربہ ہوا جو ہمیں ہندوستان میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ کمانیر نے کچھ ڈرا دھمکا کر اور کچھ حکمت عملی سے کام لے کر ہماری کور میں پھوٹ ڈال دی۔ ریزولوشن کی تائید کرنے والوں میں سے کچھ لوگ کمانیر کی باتوں میں آ کر قول سے پھر گئے۔

اسی زمانے میں نیٹلے کے ہسپتال میں یکا یک بہت سے زخمی آ گئے اور ہماری کور ان کی خدمت کے لیے مقرر ہوئی۔ کچھ لوگوں کو کمانیر نے سمجھا بجھا کر وہاں بھیج دیا۔ مگر اکثر نے صاف انکار کر دیا۔ میں نقل و حرکت سے معذور تھا مگر مجھ میں اور کور کے لوگوں میں نامہ و پیام جاری تھا۔ ان دنوں مسٹر رابرٹس نائب وزیر ہند اکثر مجھے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اپنے دوستوں کو راضی کر کے نیٹلے بھیج دو۔ انہوں نے یہ صورت تجویز کی کہ یہ لوگ اپنی علیحدہ کور بنا لیں۔ نیٹلے میں یہ لوگ وہیں کے کمانیر کے ماتحت ہوں گے۔ اس میں ان کی بھی سبکی نہیں۔ حکومت بھی خوش ہو گی اور بہت سے زخمیوں کی خدمت بھی ہو جائے گی۔ یہ تجویز مجھے اور میرے رفیقوں کو پسند آئی اور وہ سب نیٹلے چلے گئے۔ صرف میں دل پر پتھر رکھے اپنے بستر پر پڑا رہا۔

............☆☆............

گوکھلے کی رواداری

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے درد (ذات الجب) میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گوکھلے لندن واپس آ گئے۔ ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ لیکن باخ کو جرمنی کا جغرافیہ ازبر تھا اور انہوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی بہت سفر کیا تھا۔ اس لیے وہ ہمیں نقشہ میں وہ مقامات دکھایا کرتے تھے جو لڑائی کے سلسلے میں اہمیت رکھتے تھے۔

جب میرے مرض نے شدت پکڑی تو یہ بھی روزمرہ کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ میرے غذائیاتی تجربے اس زمانے میں بھی جاری تھے۔ میری غذا مونگ پھلی، کچے اور پکے کیلے میٹھے لیمو، زیتون کے تیل، ولیتی بینگن اور انگور وغیرہ پر مشتمل تھی۔ دودھ، اناج اور دال کو میں بالکل ترک کر دیا تھا۔

ڈاکٹر جیوجی مہتا میرے معالج تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اناج اور دودھ استعمال کرو مگر میں کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات کہیں گوکھلے نے سن پائی۔ وہ میرے میوہ خوری کے اصول کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ جو کچھ ڈاکٹر تجویز کرے وہ استعمال کرو۔

گوکھلے کی بات ٹالنا میرے لیے سہل نہ تھا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانے تو میں نے ان سے غور کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے کی مہلت مانگی۔ جب میں اور کیلن باخ رات کو گھر لوٹے تو ہم دونوں میں اس مسئلے پر بحث ہوئی۔ وہ اس تجربے میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔

وہ خود اسے پسند کرتے تھے۔ مگر مجھے انہوں نے یہی رائے دی کہ اگر یہ تجربہ آپ کی صحت کے لیے مضر ہے اسے ترک کر دینا چاہیے۔ اب مجھے خود اپنے ضمیر سے مشورہ کر کے فیصلہ کرنا تھا۔

میں رات بھر جاگ کر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ تجربے کے ترک کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں غذا کے متعلق اپنے اصول بدل دوں حالانکہ مجھے ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی اصل میں سوال یہ تھا کہ مجھے گوکھلے کے محبت بھرے اصرار سے کہاں تک متاثر ہونا چاہیے اور اپنی صحت کی خاطر اپنے تجربے میں تبدیلی کرنا چاہیے۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے تجربے کا جو پہلو خالص مذہبی ہے اس پر مجھے بہر حال قائم رہنا چاہیے۔ البتہ جہاں دوسری مصلحتیں شامل ہیں وہاں ڈاکٹر کی رائے پر عمل کر سکتا ہوں۔ دودھ میں نے زیادہ تر مذہبی جذبات کی بناء پر ترک کیا تھا۔ یہ عہد کرتے وقت میری آنکھوں میں اس ظلم کی تصویر پھر رہی تھی جو کلکتے کے گوالے ایک ایک قطرہ دودھ نچوڑنے کے لیے گائے بھینسوں پر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا یہ خیال تھا کہ جس طرح گوشت انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے۔ اسی طرح دودھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے صبح کو میں یہ طے کر کے اٹھا کہ دودھ ترک کرنے کے عہد پر قائم رہوں گا۔ اس فیصلے سے میری طبیعت کو یکسوئی ہوگئی۔ میں گوکھلے کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مگر مجھے یہ امید تھی کہ وہ میرے فیصلے کی وقعت کریں گے۔

شام کو میں اور کیلن باخ گوکھلے سے ملنے نیشنل لبرل کلب گئے۔ ''مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا۔'' کہو تم نے کیا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر کی رائے پر عمل کرو گے؟''

میں نے استقلال کے انداز سے مگر نرم لہجے میں کہا۔ ''میں اور سب باتیں ماننے کو تیار ہوں مگر ایک چیز کے متعلق اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ واللہ آپ اس بارے

میں مجھ سے اصرار نہ کیجیے۔ میں گوشت، دودھ اور وہ کوئی چیز جو دودھ سے بنتی ہے استعمال نہیں کروں گا۔ مگر ان چیزوں کو ترک کرنے سے میری جان بھی جاتی ہے تو مجھے منظور ہے۔''

گوکھلے نے کہا۔ ''کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں میں اس معاملے میں بالکل مجبور ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میرے اس فیصلے سے رنج ہوگا مگر امید ہے کہ آپ درگزر کریں گے۔''

گوکھلے کو کسی قدر ملال ضرور رہا۔ مگر انہوں نے انتہائی محبت سے کہا۔ ''مجھے تمہارا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مذہب کی بات ہے؟ مگر اب میں تم سے اصرار نہیں کروں گا۔'' پھر ڈاکٹر جیوراج مہتا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

''مہربانی کر کے اب انہیں نہ ستایئے۔ انہوں نے اپنے اوپر جو قیود عائد کر لی ہیں ان کا لحاظ رکھ کر غذا تجویز کر دیجیے۔''

ڈاکٹر صاحب میرے فیصلے سے بہت جز بز ہوئے۔ مگر بے چارے مجبور تھے کیا کرتے انہوں نے پتلی مونگ پھلی کی دل تجویز کی اور کہا کہ اس میں ہینگ ڈال لیا کرو۔ اس پر میں راضی ہو گیا۔ دو تین دن میں نے اسے استعمال کیا۔ مگر میرا درد بڑھ گیا۔ اس لیے میں نے پھر اپنی پرانی غذا شروع کر دی۔

ڈاکٹر صاحب خارجی تدابیر سے کام لیتے رہے جن سے درد میں کچھ تخفیف ہو جاتی تھی مگر میں نے جو قیود لگا رکھی تھیں ان کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

اس عرصے میں گوکھلے وطن چلے گئے۔ لندن کے اکتوبر کے کہر سے ان کی طبیعت اکتا گئی تھی۔

............☆☆............

پسلی کے ورم کا علاج

پسلی کا ورم کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا اس لیے مجھے کسی قدر اندیشہ پیدا ہو گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ داخلی تدبیروں سے فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ غذا میں تبدیلی اور اس کے ساتھ خارجی علاج ہونا چاہیے۔

میں نے نباتاتی مشرب کے مشہور معروف حامی ڈاکٹر ہیلنسن سے رجوع کیا جو محض غذا کی تبدیلی سے علاج کیا کرتے تھے۔ ان کے علاج سے میں بالکل اچھا ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں دودھ کے ترک کا عہد کر چکا ہوں۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا اور کہا ''آپ کو دودھ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دن تک آپ کسی قسم کی چکنائی استعمال نہ کریں۔'' انہوں نے میرے لیے جو غذا تجویز کی وہ روکھی روٹی، کچے چقندر، مولی، پیاز وغیرہ مختلف قسم کے ساگ اور تازہ پھل خصوصاً نارنگی پر مشتمل تھی۔ ترکاریوں کو پکانے کی اجازت نہیں تھی لیکن اگر چبانے میں دقت ہو تو پیس کر کھا سکتا تھا۔

میں نے تین دن تک یہ غذا استعمال کی لیکن کچی ترکاریاں مجھے موافق نہیں آئیں۔ میرا جسم اتنا کمزور تھا کہ یہ تجربہ جیسا چاہیے تھا نہیں کر سکا۔ کچی ترکاریاں کھاتے میں ڈرتا تھا۔

ڈاکٹر ہیلنسن نے یہ بھی کہا کہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں ہر وقت کھلی رکھو۔ نیم گرم پانی میں نہایا کرو۔ جسم کے جس حصے میں ورم ہے وہاں تیل کی مالش کیا کرو اور پندرہ منٹ سے لے کر تیس منٹ تک کھلی ہوا میں ٹہلا کرو۔ مجھے یہ سب تجویزیں

پسند آئیں۔

میرے کمرے میں فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں تھیں اگر پانی برستے وقت یہ پوری کھلی رہیں تو کمرے میں بوچھار آتی تھی۔ ان کے اوپر جو روشندان تھے وہ کھل نہیں سکتے تھے۔ اس لیے میں نے روشندانوں کے شیشے تڑوا دیے تاکہ تازہ ہوا آسکے اور کھڑکیاں اتنی کھول دیں کہ بوچھار نہ آئے۔

ان تدبیروں سے میری طبیعت کس قدر سنبھل گئی مگر پوری صحت نہیں ہوئی۔

لیڈی سیسیلیا رابرٹس کبھی کبھی مجھے دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ دودھ کا استعمال شروع کر دو۔ مگر میں جب کسی طرح نہ مانا تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ دودھ کا کوئی بدل تلاش کریں۔ کسی نے انہیں ''مالٹڈ ملک'' 47 بتا دیا اور ناواقفیت کی بناء پر کہہ دیا کہ اس میں دودھ بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک کیمیاوی مرکب ہے جس میں دودھ کی کل خاصیتیں موجود ہیں۔ لیڈی سیسیلیا میرے مذہبی جذبات کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس لیے مجھے ان کی بات پر پورا اعتبار تھا۔ میں نے اس سفوف کو پانی میں گھول کر پیا تو اس میں بالکل دودھ کا مزا تھا۔ اب مجھے شیشی کا لیبل پڑھنے کا خیال آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ دودھ ہی کا مرکب ہے۔ اس لیے میں نے پھر کبھی نہیں پیا۔

میں نے لیڈی سیسیلیا کو اس کی خبر کی اور کہلا بھیجا کہ جو ہوا سو ہوا۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجیے۔ وہ بے چاری معذرت کرنے دوڑی آئیں اور کہنے لگیں کہ میرے دوست نے لیبل نہیں پڑھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ بالکل تشویش نہ کیجیے۔ مجھے اس کا مطلق ملال نہیں بلکہ آپ سے ندامت ہے کہ آپ اتنی زحمت اٹھا کر یہ شیشی لائیں اور میں اسے کام میں نہیں لا سکتا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ناواقفیت

کی بناء پر دودھ استعمال کر لینے میں میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ۔

لیڈی سیسیلیا رابرٹس کی ہمدردی اور محبت کے بہت سے واقعات ہیں جن کی یاد میرے دل کو عزیز ہے مگر میں مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں ۔ مجھے اور بہت سے دوست یاد آرہے ہیں جنہوں نے مصیبت اور مایوسی میں میرے دستگیری کی جو دل نورایمان سے منور ہے ۔اسے ان کے پردے میں رحمت ایزدی کا جلوہ نظر آتا ہے جن کی بدولت رنج والم کی تلخی میں حلاوت پیدا ہو جاتی ہے ۔

ڈاکٹر ایلنسن مجھے دوسری بار دیکھنے آئے تو انہوں نے پرہیز کی سختیاں کم کر دیں ۔انہوں نے کہا کہ تم مونگ پھلی اور زیتون کا تیل استعمال کر سکتے ہو اور پکی پا جی چاہے تو پکے ہوئے ساگ ترکاری چاول کے ساتھ کھا سکتے ہو۔ یہ تبدیلیاں خوشگوار تھیں مگر ان سے بھی مرض کا ازالہ نہیں ہوا۔ ابھی تیمارداری میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی ۔اور زیادہ تر وقت بستر پر لیٹے لیٹے گزارنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر مہتا کبھی کبھی میری عیادت کو آتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آپ اب بھی میری بات مان لیجے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو اچھا کر دوں گا۔

اس اثناء میں ایک دن مسر رابرٹس مجھے دیکھنے آئے اور انہوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ ''آپ وطن چلے جائیں۔'' اس حال میں نٹیلے جانا ناممکن ہے ادھر سردی چمکنے کے دن آرہے ہیں۔ میری تو یہی صلاح ہے کہ آپ ہندوستان چلے جایئے ۔ پوری صحت آپ کو وہیں جا کر ہو سکتی ہے ۔ اگر اس وقت تک لڑائی جاری رہی تو وہاں بھی آپ کو سلطنت کی مدد کے بہت سے موقعے ملیں گے اور اب بھی آپ نے جو کچھ کیا ہے اسے میں کم نہیں سمجھتا۔

میں نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

وطن کو واپسی

مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئے تھے۔ لندن میں وہ میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور ہم دونوں ایک ہی جہاز میں روانہ ہونے والے تھے مگر جرمن نسل کے لوگوں کی نگرانی اس قدر سختی سے کی جا رہی تھی کہ انہیں پاسپورٹ (پروانہ راہداری) ملنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ میں نے اس معاملہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ مسٹر رابرٹس انہیں پاسپورٹ دلائے جانے کے حامی تھے اور انہوں نے اس کے متعلق وائسرائے کو تار دیا مگر لارڈ ہارڈنگ نے صاف جواب دے دیا ''مجھے افسوس ہے حکومت ہند ایسے خطرے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں۔'' ہم سب لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب کوشش کرنا بیکار ہے۔

مجھ پر کیلن باخ کی جدائی بہت شاق گزری اور انہیں مجھ سے بھی زیادہ صدمہ ہوا۔ اگر وہ ہندوستان آتے تو آج میرے ساتھ کسان اور جولاہے کی سیدھی سادی زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوتے۔ وہ آج کل جنوبی افریقہ میں پہلے کی طرح ماہر تعمیرات کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا کام خوب چل رہا ہے۔

ہم تیسرے درجے کا ٹکٹ لینا چاہتے تھے مگر پی اینڈ او کے جہازوں میں تیسرا درجہ تھا ہی نہیں۔ اس لیے مجبوراً دوسرے درجے میں سفر کرنا پڑا۔

ہم جنوبی افریقہ سے جو خشک میوہ لائے تھے وہ ہم نے ساتھ رکھ لیا کیونکہ جہاز پر تازے پھل تو ملتے تھے مگر خشک میوہ نہیں ملتا تھا۔

ڈاکٹر جیوراج مہتا نے میری پسلیوں پر ''میڈس پلاسٹر'' کی پٹی باندھ دی تھی اور

یہ تاکید کردی تھی کہ بحرِ قلزم پہنچنے سے پہلے اس نہ کھولنا۔ ڈون تک تو میں نے یہ تکلیف سہی مگر اس کے بعد برداشت نہ ہو سکی۔ بڑی مشکل سے میں نے پٹی چھڑائی اور اچھی طرح نہانا دھونا شروع کیا۔

زیادہ تر میں تازے پھل اور خوش میوہ خصوصات اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ کھاتا تھا۔ میری طبیعت روز بروز سنبھلتی جاتی تھی اور نہر سویز پہنچتے پہنچتے تقریباً پوری صحت ہو گئی۔ اب کمزوری کے سوا اور کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس لیے میں رفتہ رفتہ ورزش بڑھاتا گیا۔ میرے خیال میں اس افاقہ کا سبب زیادہ تر منطقہ معتدلہ کی صحت بخش ہوا تھی۔ خدا جانے پرانے تجربے کی بناء پر جو خیال جم گیا تھا اس کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی کہ مجھے جہاز کے انگریز اور ہندوستانی مسافروں میں اس سے بھی زیادہ منفصل نظر آیا جو میں نے جنوبی افریقہ سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری چند انگریزوں سے بات چیت ہوئی مگر محض سرسری اور رسمی۔ جس بے تکلفی سے جنوبی افریقہ کے جہازوں پر گفتگو ہوتی تھی اس کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ تھا کہ انگریز کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ احساس رہتا ہے کہ میں حاکم قوم کا فرد ہوں اور ہندوستانی کے دل میں یہ کھٹک رہتی ہے کہ میں محکوم قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔

میری طبیعت اس فضا میں الجھتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح جلدی گھر پہنچوں۔ عدن میں آ کر تھوڑا بہت وطن کا لطف آنے لگا۔ عدن والوں سے ہماری اچھی طرح راہ و رسم تھی۔ کیونکہ ڈربن میں مسٹر کیقباد کاوس جی ڈنشا اور ان کی بیوی سے ہمارا میل جول رہ چکا تھا۔

چند روز میں ہم بمبئی پہنچ گئے۔ دس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ

کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔

گو کھلے باوجود اپنی صحت کی خرابی کے مجھ سے ملنے بمبئی آئے تھے۔ ان کی تحریک سے یہاں میرا استقبال کیا گیا۔ میں دل میں یہ امید لیے ہوئے آیا تھا کہ ان کا دامن تھام لوں گا تو میرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

وکالت کے زمانے کی چند قابل ذکر باتیں

ہندوستان آنے کے بعد مجھ پر جو کچھ گزری اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی افریقہ کے چند تجربے جنہیں میں نے خاص کر کے چھوڑ دیا تھا بیان کر دوں۔

میرے بعض وکیل دوستوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ اپنی وکالت کے زمانے کی قابل ذکر باتیں لکھوں۔ ان کی تعداد اتنی ہے کہ اگر میں لکھنے آؤ تو ایک مستقل کتاب بن جائے اور میں کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں۔ اس لیے میں چند ایسے واقعات کے ذکر پر اکتفاء کرتا ہوں جو تلاش حق سے متعلق ہیں۔

غالباً میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں نے اپنے پیشے میں کبھی جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا اور میری وکالت زیادہ تر قومی معاملات کے لیے وقف تھی۔ جس کا معاوضہ میں صرف اتنا لیتا تھا کہ جو کچھ مجھے اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا ہے وہ نکل آئے اور کبھی کبھی اسے بھی چھوڑ دیتا تھا۔ میرے خیال میں تو میری وکالت کرنا پڑا ہے وہ نکل آئے اور کبھی کبھی اسے بھی چھوڑ دیتا تھا۔ میرے خیال میں تو میری وکالت کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ کچھ اور لکھو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں ان موقعوں کا کچھ تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں جہاں میں نے حق کی راہ میں استقلال دکھایا ہے تو وکیلوں کے لیے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

بچپن میں میں نے سنا تھا کہ وکالت میں بغیر جھوٹ بولے کام نہیں چل سکتا۔ مگر میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے کچھ جھوٹ بول کر دولت یا عزت کمانا تو

تھا ہی نہیں ۔

جنوبی افریقہ میں میرے لیے امتحان کے بہت سے موقعے آئے اکثر مجھے یہ علم ہوتا تھا کہ فریق مخالف کے وکیلوں نے گواہوں کو سکھایا پڑھایا ہے اور اگر میں بھی اپنے موکل یا اس کے گواہوں کو جھوٹ بولنے دوں تو مقدمہ جیت جاؤں گا مگر میں نے اسے کبھی جائز نہیں رکھا۔صرف ایک بار ایک مقدمہ جیتنے کے بعد مجھے یہ شبہ ہوا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں اپنے دل میں ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ اگر میرا موکل حق پر نہ ہو تو میں مقدمہ ہار جاؤں۔فیس مقرر کرتے وقت میں نے کبھی یہ شرط نہیں کی کہ اگر مقدمے میں کامیابی ہوئی تو زیادہ لوں گا۔میرے موکل چاہے ہاریں یا جیتیں میں اپنی مقررہ فیس سے کم یا زیادہ نہیں لیتا تھا۔

میں ہر نئے موکل کو پہلے ہی جتا دیتا تھا کہ مجھ سے جھوٹے مقدمے میں پیروی کرنے کی یا گواہوں کو سکھانے کی توقع نہ رکھو۔جب اس بات کی شہرت ہوگئی تو میرے پاس جھوٹے مقدمے ہی آنا بند ہو گئے ۔بعض موکل یہ کرتے تھے کہ سچے مقدمے میرے پاس لاتے تھے اور جھوٹے مقدمے دوسروں کے پاس لے جاتے تھے۔

اس موقع پر میرے لیے بڑی سخت آزمائش کا تھا۔ایک موکل جس سے مجھے بہت سا کام ملا کرتا تھا۔میرے پاس ایک مقدمہ لایا جو بہت دن سے چل رہا تھا۔یہ بہی کھاتے کا معاملہ تھا اور اس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ عدالت نے چند قابل محاسبوں کو پنچ مقرر کیا۔انھوں نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ کیا۔لیکن ان کے حساب میں ایک غلطی رہ گئی یعنی ایک رقم جو خرچ کے خانے میں لکھی جانا چاہیے تھی آمدنی کے خانے میں لکھ دی گئی۔رقم تو چھوٹی سی تھی مگر یہ غلطی بڑی فاش تھی۔فریق

مخالف نے محاسبوں کے فیصلے کی اپیل دوسری وجوہ کی بناء پر کی تھی۔ اس غلطی کا اسے علم نہ تھا۔ اس مقدمے کی اصل پیروی ایک دوسرے وکیل کر رہے تھے میں ان کا مددگار تھا۔ جب انہیں اس غلطی کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس کا ظاہر کرتے پھریں۔ وہ اس خیال کے آدمی تھے کہ وکیل کو کسی ایسی بات کا اعتراف نہ کرنا چاہیے جو اس کے موکل کے خلاف پڑتی ہو۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہ غلطی ظاہر کر دینی چاہیے۔

وکیل صاحب کہنے لگے "اس صورت میں بڑا اندیشہ ہے کہیں عدالت پنچوں کے فیصلے کو منسوخ نہ کر دے۔ کوئی وکیل جس کا دماغ صحیح ہے اپنے موکل کے مقدمے کو ایسے خطرے میں نہ ڈالے گا۔ مجھ سے تو یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر پھر نئے سرے سے کارروائی شروع ہوئی تو نہ جانے ہمارے موکل کو کتنی زیر باری ہو اور مقدمے کا کیا نتیجہ ہو؟"

یہ باتیں موکل کی موجودگی میں ہو رہی تھیں۔

میں نے کہا "میرے خیال میں تو ہمیں اور ہمارے موکل کو یہ خطرہ برداشت کرنا چاہیے۔ یہ کونسی یقینی بات ہے کہ اگر ہم اس غلطی کو ظاہر نہ کریں تو عدالت پنچوں کے فیصلے کو بحال رکھے گی اور فرض کیجیے کہ ہمارے موکل کو نقصان بھی پہنچے تو کیا ہرج ہے؟

'

وکیل صاحب بولے "مگر آخر اس کی ضرورت کیا ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس غلطی کو ظاہر کر کے مقدمہ کمزور کر دیں؟"

میں نے عرض کیا آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عدالت کی نظر اس غلطی پر نہ پڑے گی یا فریق کو اس کا پتہ نہ چلے گا؟"

انہوں نے اس قیل وقال کو ختم کرنے کے لیے کہا ''تو پھر آپ ہی جا کر مقدمے میں بحث کیجیے۔ میں آپ کی شرط ہرگز منظور نہیں کرسکتا۔''

میں نے عاجزی سے کہا ''اگر موکل کی خواہش ہو تو میں بحث کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اسی شرط پر کہ غلطی کا اظہار کر دیا جائے۔ ورنہ مجھ سے اس مقدمے سے کوئی سروکار نہیں۔''

یہ کہہ کر میں نے موکل کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر شش و پنج میں رہا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ یہ مقدمہ میرا سمجھا ہوا ہے۔ اسے مجھ پر پورا اعتبار تھا اور میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ آخر اس نے کہا۔ ''اچھی بات ہے، آپ بحث کیجیے اور غلطی کا اظہار کر دیجیے۔ اگر تقدیر میں ہارنا لکھا ہے تو یہی سہی۔ سچ کا ساتھ ہے۔''

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وکیل صاحب نے مجھے پھر سمجھایا اور میری ضد پر افسوس کیا۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے مجھے مبارکباد بھی دی۔

عدالت میں جو کچھ گزری اس کا حال آئندہ باب میں ہوگا۔

............☆☆............

چالبازی؟

مجھے پورا یقین تھا کہ میری رائے صحیح ہے۔ البتہ اس کا بڑا کھٹکا تھا کہ مقدمے کی پیروی جیسی چاہیے مجھ سے نہ ہو سکے گی۔ عدالت عالیہ کے سامنے ایسے پیچیدہ مقدمے میں بحث کرتے میرا ڈرتا تھا۔ جب میں ججوں کے سامنے گیا تو خوف سے کانپ رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے حساب کی غلطی کا ذکر کیا ایوجج بول اٹھے۔ ''کیوں مسٹر گاندھی کیا یہ چالبازی نہیں ہے؟''

یہ سن کر مجھے ایک آگ لگ گئی۔ ایسے بے بنیاد الزام کو برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب جج پہلے ہی سے بدظن ہے تو ایسے پیچیدہ مقدمے میں کامیابی کی کیا امید ہوسکتی ہے مگر میں نے ضبط سے کام لے کر کہا۔

''مجھے تعجب ہے کہ حضور والا نے پوری بات سنے بغیر مجھ پر چالبازی کا الزام لگا دیا۔''

جج نے کہا ''الزام کیسا میں نے تو ایک سوال پوچھا ہے۔''

''میرے نزدیک تو یہ سوال الزام سے کم نہیں۔ میں حضور والا سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی تقریر پوری کر لینے دیجیے اس کے بعد اگر میرا قصور ثابت ہو تو مجھے ملامت کیجیے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قطع کلام کیا۔ آج جو کہہ رہے تھے کہیے۔''

میرے پاس صفائی کا پورا ثبوت تھا۔ اچھا ہوا کہ جج نے بحث چھیڑ دی۔ اس کی وجہ سے عدالت شروع ہی سے میری تقریر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے اس موقع

سے فائدہ اٹھا کر معاملے کو بہت تفصیل سے سمجھایا۔ سب ججوں نے میری بات کو غور سے سنا اور انہیں یقین آ گیا کہ پنچوں سے نادانستہ غلطی ہو گئی۔ اس لیے انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ فیصلے کو سرے سے منسوخ کر کے پنچوں کی ساری محنت پر پانی پھیر دیں۔

فریق مخالف کے وکیل یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ غلطی کے ظاہر ہو جانے کے بعد زیادہ بحث کی ضرورت نہ رہے گی مگر ججوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ غلطی محض اتفاقی ہے اور آسانی سے صحیح کی جا سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ان کی تقریر پر توجہ نہ کی۔ وکیل نے بہت زور لگایا کہ فیصلے کو غلط ٹھہرائیں مگر جس جج نے ابتداء میں شبہے کا اظہار کیا تھا وہ اب کھلم کھلا میری طرفداری کرنے لگا۔

اس نے پوچھا۔ ''اگر مسٹر گاندھی خود غلطی کا اعتراف نہ کر لیتے تو آپ کیا کرتے؟ آپ کی نظر اس غلطی پر کیوں نہیں پڑی؟''

وکیل نے جواب دیا ''ہم نے اپنی طرف سے جو حاسب مقرر کیا تھا اس سے بڑھ کر ایماندار اور قابل آدمی ہمیں نہیں مل سکتا تھا۔ جب وہ اس غلطی کو نہ پکڑ سکا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟''

جج نے کہا ''عدالت کے نزدیک آپ اپنے مقدمے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر آپ سوائے اس غلطی کے جو بڑے سے بڑے محاسب سے بھی ممکن ہے اور کوئی پہلو اپنے موافق نہیں نکال سکتے تو کیا عدالت کے لیے یہ مناسب ہے کہ ایک ذرا سی غلطی کے لیے فریقین کو مزید مقدمہ بازی کی زیر باری برداشت کرنے دے؟ جب اس غلطی کی تصحیح آسانی سے ہو سکتی ہے تو دوبارہ تحقیقات کا حکم کیوں دیا جائے؟''

غرض عدالت نے وکیل کا اعتراض تسلیم نہیں کیا اور یا تو خود غلطی کی تصحیح کر کے

پنچوں کا فیصلہ برقرار رکھا یا انہیں ہدایت کی کہ اسے درست کر دیں۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ کیا صورت ہوئی۔

مجھے اس سے بے حد مسرت ہوئی میرا موکل اور اس کے دوسرے وکیل بھب ہت خوش ہوئے میرا یہ عقیدہ اور پختہ ہو گیا کہ دیانتداری کے ساتھ وکالت کرنا ناممکن نہیں ہے۔

مگر یہ یاد رہے کہ وکالت کے پیشے میں سچائی برتنے سے بھی اس کی بنیادی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں۔

............☆☆............

موکل رفیق بن گئے

نٹال اور ٹرنسوال کی وکالت میں یہ فرق تھا کہ نٹال میں وکیل اور بیرسٹر مقدمے کو ترتیب بھی دے سکتے تھے اور پیروی بھی کرسکیت تھے۔ مگر ٹرانسوال میں بمبئی کی طرح یہ دونوں پیشے الگ کر دیئے گئے تھے۔ مقدمہ کی تربیت کا کام اٹارنی کرتے تھے اور پیروی ایڈووکیٹ۔ بیرسٹر کو اختیار تھا کہ چاہے اٹرنی کا پیشہ اختیار کرے چاہے ایڈووکیٹ کا۔ میں نٹال کی مجلس وکلاء میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا مگر ٹرانسوال آ کر میں نے اٹارنی کا کام شروع کیا۔ کیونکہ ایڈووکیٹ کی حیثیت سے مجھے ہندوستانیوں سے براہ راست ملنے کا موقع نہ ملتا اور جنوبی افریقہ کے یورپی اٹرنی مجھے مقدمے بھی نہ دیتے۔

مگر ٹرانسوال میں بھی اٹارنی مجسٹریٹوں کی عدالت میں پیروی کرنے کے مجاز تھی۔ ایک بار جوہانسبرگ میں ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکا دیا۔ جرح میں وہ بالکل اکھڑ گیا۔ اس لئے میں نے بغیر کسی بحث کے مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ میرے موکل کے خلاف فیصلہ کر دیا جائے۔ فریق مخالف کا وکیل حیرت میں رہ گیا اور مجسٹریٹ بہت خوش ہوا۔ میں نے اپنے موکل کو بہت ملامت کی کہ تم جھوٹا مقدمہ میرے پاس کیوں لائے۔ اس نے اپنے خطا کا اقرار کیا اور میرے خیال میں وہ مجھ سے اس بات پر ناراض نہیں ہوا کہ میں نے اس کے خلاف فیصلہ کرا دیا۔ بہر حال میرے اس طرز عمل سے میری وکالت کو نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ میرے کام میں بڑی آسانی ہوگئی۔ ہم

پیشہ لوگوں میں میری ساکھ قائم ہوگئی اور باوجود نسل کے تعصب کے ان میں سے بعض میرے دوست بن گئے۔

میرا یہ بھی معمول تھا کہ اپنی جہالت کو اپنے موکلوں یا اپنے ہم چشموں سے کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ جب کبھی کوئی مقدمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا موکل کو یہ مشورہ دیتا تھا کہ کسی دوسرے وکیل کے پاس جائے اگر وہ مجھ ہی کو وکیل کرنے پر مصر ہوتا تھا تو میں اس کی اجازت سے کسی بڑے وکیل کو شریک کر لیتا تھا۔ اس طرزِ عمل کی بدولت میرے موکلوں کو مجھ سے بڑی محبت ہوگئی اور وہ مجھ پر بے حد اعتبار کرنے لگے۔ جب کسی بڑے وکیل سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ خوشی سے اس کی فیس ادا کرتے تھے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جنوبی افریقہ میں وکالت کرنے میں میرا اصل مقصد قومی خدمت کرنا تھا اس کے لیے بھی لوگوں کی نظر میں اپنا اعتبار قائم کرنا بہت ضروری تھا۔ ہندوستانیوں کی کریم النفسی کی انتہا ہے کہ میں جو کام فیس لے کر کرتا تھا اسے بھی وہ قومی خدمت سمجھتے تھے اور جب میں نے انہیں یہ رائے دی کہ اپنے حقوق کی خاطر جیل جاؤ تو وہ زیادہ تر میری محبت میں اور میرے پر اعتبار کی وجہ سے خوشی سے راضی ہو گئے۔

اس سطروں کو لکھتے وقت میرا دل ایسے بہت سے واقعات کی یاد کے مزے لے رہا ہے۔ میرے سینکڑوں موکل قومی خدمت میں میرے دست و بازو بن گئے اور ان کی بدولت وہ کانٹے جو میرے راہ میں تھے پھول ہو گئے۔

............☆☆............

میں نے ایک موکل کو کیونکر بچایا

اس کتاب کے پڑھنے والے پارسی رستم جی کے نام سے واقف ہو گئے ہوں گے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو میرے موکل بھی تھے اور رفیق بھی۔ بلکہ رفیق پہلے تھے اور موکل بعد میں بنے۔ انہیں مجھ پر اتنا اعتبار ہو گیا کہ خانگی معاملات میں بھی میرے مشورے پر عمل کرنے لگے یہاں تک کہ دوا علاج میں بھی مجھ سے مدد لینے لگے۔ گو ہم دونوں کی طرز زندگی میں بہت فرق تھا مگر وہ بے تامل میری عطائی تدبیروں پر عمل کرتے تھے۔

ایک بار بے چارے بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ عموماً وہ اپنے معاملات کا ذکر مجھ سے کر دیتے تھے مگر ایک بات انہوں نے چھپا رکھی تھی۔ وہ بمبئی اور کلکتہ سے بہت سا مال منگواتے تھے اور اکثر چنگی سے بچا کر نکال لاتے تھے۔ چنگی کے بہت سے افسران کے دوست تھے۔ اس لیے کسی کو ان پر شبہ نہیں ہوتا تھا۔

مگر بقول گجراتی شاعر آکھو کے "کاچو پارو کھادو آن تیوون چھے چوری نو دھن" یعنی پارہ کی طرح چوری بھی نہیں دیتی۔ ایک دن رستم جی پھنس گئے وہ دوڑے ہوئے میرے پاس آئے اور رو کر کہنے لگے۔ "بھائی میں نے تمہیں بڑا دھوکا دیا۔ آج میری چوری پکڑی گئی۔ میں مال چنگی سے بچا کر لایا کرتا تھا۔ اب بید کھل گیا۔ مجھے جیل جانا پڑے گا۔ ہائے میں تباہ ہو گیا۔ میرے بھائی مجھے بچایئے۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ مگر ان بیوپار کے ہتھکنڈوں کا کیا ذکر کرتا۔ کاش! میں نے آپ سے کہہ دیا ہوتا۔"

میں نے انہیں دلاسا دیا اور کہا ''آپ کا بچنا یا نہ بچنا خدا کے ہاتھ ہے رہا۔ میرا اصول آپ جانتے ہیں میں آپ کو بچانے کی کوشش اسی صورت میں کر سکتا ہوں کہ آپ حکام کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر لیں۔''

یہ سن کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''مگر میں نے آپ کے سامنے تو اقرار کر لیا، کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

میں نے نرمی سے جواب دیا'' آپ نے سرکار کی چوری کی ہے میری نہیں کی۔ پھر میرے سامنے اقرار کرنے سے کیا فائدہ؟''

رستم جی بولے: ''آپ جو کچھ کہیں گے وہی کروں گا۔ مگر میرے پرانے وکیل مسٹر...... سے بھی تو پوچھ لیجئے۔ وہ بھی تو اپنے دوست ہیں۔''

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ عرصے سے جاری تھا مگر جو مال پکڑا گیا وہ تھوڑا سا ہی ہے۔ ہم دونوں وکیل کے پاس گئے۔ انہوں نے کاغذات کو دیکھ کر کہا ''مقدمہ جیوری کے سامنے پیش ہو گا اور نٹال کی جیوری سے یہ توقع نہیں کہ کسی ہندوستانی کو بری کر دے مگر پھر بھی اپنی سی کوشش کرنی چاہیے۔''

میں ان وکیل صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ پارسی رستم جی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر میں اس مقدمے کو مسٹر گاندھی کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے معاملات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جب ضرورت ہو گی۔ یہ آپ سے مشورہ لے لیں گے۔''

وہاں سے اٹھ کر ہم دونوں رستم جی کی دوکان پر پہنچے۔ اب میں نے انہیں اپنی رائے بتائی۔ ''میرے خیال میں مقدمے کو عدالت تک نہیں جانے دینا چاہیے۔

مقدمہ چلانا یا نہ چلانا چنگی کے افسر کے اختیار میں ہے اور وہ اٹارنی جنرل سے رائے لے گا۔ میں ان دونوں کے پاس چلتا ہوں۔ میرے رائے میں وہ کچھ جرمانہ کریں آپ دیجیے۔ غالباً وہ اس پر راضی ہو جائیں گے۔ اگر نہ ہوئے تو آپ جیل جانے کو تیار رہے۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جیل جانے میں اس قدر شرم اور ذلت نہیں جتنی جرم کے ارتکاب میں ہے۔ شرم کی جو بات تھی وہ تو ہو چکی۔ اب جیل جانے کو آپ ایک طرح کا کفارہ سمجھیے۔ مگر اصلی کفارہ یہ ہے کہ آپ آئندہ کے لیے اس حرکت سے توبہ کیجیے۔''

پارسی رستم جی کو یہ باتیں ناگوار ہوئی ہوں گی۔ وہ بڑے بہادر آدمی تھے مگر اس وقت ان کی ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ ان کی عزت، آبرو خطرے میں تھی۔ وہ دل میں کہتے ہوں گے۔ ''یہ عمارت جو میں نے بڑی محنت سے کھڑی کی ہے مسمار ہو کر بیٹھ گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔''

انہوں نے کہا۔ ''میں نے تو سب کچھ آپ پر ہی چھوڑ دیا ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیے، کیجیے۔''

میں نے اپنی ساری شیوا زبانی اس معاملے میں صرف کر دی۔ چنگی کے افسر کے پاس جا کر میں نے اس سے سارا واقعہ صاف صاف بیان کر دیا۔ میں نے کہا کہ آپ سارے بہی کھاتے دیکھ لیجیے اور جو جرمانہ مناسب سمجھیے لے لیجیے۔ رستم جی کی حالت رحم کے قابل ہے۔ بیچارے اپنے قصور پر بے حد نادم ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے یہ بوڑھا پارسی بہت پسند ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نے ایسی حماقت کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا فرض اس معاملے میں کیا ہے۔ میں اٹارنی جنرل سے رائے لینے پر مجبور ہوں۔ آپ ان کو سمجھانے کی کوشش کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ معاملے کو عدالت تک نہ جانے دیں تو بڑا احسان ہو گا۔''

ان سے یہ وعدہ لے کر میں اٹارنی جنرل سے ملا۔ انہیں میری صاف گوئی پسند آئی اور یہ یقین ہو گیا کہ میں نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

مجھے یاد نہیں کہ یہی معاملہ تھا یا کوئی اور تھا۔ جس میں انہوں نے میری صاف گوئی اور اصرار سے مجبور ہو کر کہا تھا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ آپ کبھی اپنی بات منوائے بغیر نہیں رہتے۔''

رستم جی والے مقدمے میں سمجھوتا ہو گیا۔ انہوں نے جتنے محصول کی چوری کا اقرار کیا تھا اس کا دوچند جرمانہ انہیں ادا کرنا پڑا۔

رستم جی نے سارا واقعہ لکھ کر ایک چوکھٹے میں لگایا اور اپنے دفتر میں لٹکا دیا کہ ان کے وارثوں اور دوسرے تاجروں کو عبرت ہو۔

رستم جی کے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان کی اس عارضی ندامت سے دھوکا نہ کھائیے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے۔ ''آپ کو دھوکا دے کر میں جاؤں گا۔ کہاں؟''

............☆☆............

حصہ پنجم

پہلا تجربہ

ہم وطن پہنچے تو فنیکس والے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میرا قصد ان سے پہلے پہنچنے کا تھا مگر جب میں انگلستان میں لڑائی کے بکھیڑے میں پڑ گیا اور میری واپسی کا کچھ ٹھیک نہ رہا تو مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں ان لوگوں کے قیام کا کیا انتظام ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے یہ سب رہیں اور وہی پرانی زندگی بسر کریں۔ میری نظر میں کوئی ایسا آشرم نہیں تھا جہاں یہ رہ سکیں۔ اس لیے میں نے انہیں تار دے دیا کہ مسٹر اینڈریوز سے مل کر ان کی رائے پر عمل کریں۔

چنانچہ پہلے یہ لوگ کانگڑی کے گروکل میں گئے۔ جہاں سوامی شردھانند نے انہیں اپنے بچوں کی طرح رکھا۔ اس کے بعد شانتی نکیتن کے آشرم میں ٹگور اور ان کے رفیقوں کے سایہ عاطفت میں رہے۔ دونوں جگہ رہ کر انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا وہ میرے لیے اور ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

میں اینڈریوز سے کہا کرتا تھا کہ آپ کی تثلیث مہاکوی ٹگور پرنسپل سوشل رودرا اور شردھانند جی پر مشتمل ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہمیشہ ان تینوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی باتیں اب تک میرے دل پر نقش ہیں اور ان کی یاد بہت خوشگوار ہے۔

شانتی نکیتن میں اینڈریور نے فنیکس والوں کو سوشل رودرا کے سپرد کر دیا۔ پرنسپل رودرا کا کوئی آشرم نہیں تھا ایک گھر تھا جو انہوں نے فنیکس کے خاندان کو دے دیا۔

شانتی نکیتن والے ان سے اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے دل سے فنیکس کی یاد جاتی رہی۔ مجھے بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ فنیکس والے شانتی نکیتن میں ہیں، مجھے یہ بے تابی تھی کہ گوکھلے کی زیارت کرنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے ان سے جا ملوں۔ بمبئی میں میرے استقبال میں اس قدر اہتمام ہوا کہ مجھے چھوٹی سی ستیہ گرہ کرنا پڑی۔

مسٹر جہانگیر پیٹٹ کے گھر پر جو پارٹی مجھے دی گئی اس میں میری ہمت نہ پڑی کہ گجراتی میں تقریر کروں۔ اس عالیشان محل میں میرا جیسا شخص، جس کی زندگی کا اکثر حصہ پابند مزدوروں کی صحبت میں گزرا تھا بالکل گنوار معلوم ہوتا تھا۔ میں ان دنوں کا ٹھیاواری انگرکھا پہنتا تھا اور پگڑی اور دھوتی باندھتا تھا۔ اس وضع میں میں آج کل کے مقابلے میں زیادہ مہذب نظر آتا تھا لیکن مسٹر پیٹٹ کے محل کی شان وشوکت میں کیسے کھپ سکتا تھا۔ بہر حال میں نے سر فیروز شاہ مہتا کا سہارا لے کر کسی طرح کام چلایا۔

اس کے بعد گجراتیوں کے جلسے میں جانا پڑا۔ یہ جلسہ آتا تل ترویدی آنجہانی کے اہتمام میں کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا پروگرام پہلے سے معلوم کر لیا تھا۔ مسٹر جناح جو گجراتی ہیں وہاں موجود تھے۔ مگر یہ یاد نہیں کہ وہ جلسے کے صدر تھے یا اس کے ترجمان، انہوں نے انگریزی میں ایک اعلیٰ درجے کی چھوٹی سی تقریر کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اکثر تقریریں انگریزی میں ہوئیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے گجراتی میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا کہ میں گجراتی اور ہندوستانی کو انگریزی پر ترجیح دیتا ہوں اور عاجزی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتا ہوں کہ گجراتیوں کے مجمعے میں تقریریں انگریزی میں کی گئیں۔ یہ بات میں نے ڈرتے

ڈرتے ڈرتے کہی تھی۔ کہ کہیں ایک نئے آدمی کا جو مدت تک جلاوطن رہنے کے بعد گھر لوٹا ہے۔ عام رواج پر اعتراض کرنا خلاف تہذیب نہ سمجھا جائے۔ مگر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ لوگوں نے میرے اعتراض کو چپ چاپ سن لیا۔

اس سے میری ہمت بندھ گئی اور میرے دل میں یہ امید پیدا ہوگئی کہ مجھے اپنے انوکھے خیالات اپنے ہموطنوں کے سامنے پیش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

چند دن بمبئی ٹھہر کر، میں ان پہلے تجربوں کے نشے میں سرشار، گھوکھلے سے ملنے پونا روانہ ہوگیا۔

............☆☆............

گوکھلے کے ساتھ پونا میں

جیسے ہی میں بمبئی میں داخل ہوا گوکھلے کا پیغام پہنچا کہ گورنر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ پونا آنے سے پہلے ان سے مل لو چنانچہ میں بڑا کسی لینسی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا۔

''میں آپ سے ایک بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ جب کبھی کوئی ایسی تجویز سوچیں جس کا تعلق گورنمنٹ سے ہو تو مجھ سے ضرور مل لیا کیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ میں ستیا گرہی ہوں۔ میرا تو یہ اصول ہی ہے کہ اپنے مخالفوں کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان میں جو باتیں مجھے معقول نظر آئیں مان لوں۔ جنوبی افریقہ میں میں نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور یہاں بھی کروں گا۔''

لارڈ ولنگڈن نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ''آپ کا جب جی چاہے میرے پاس چلے آیا کیجئے۔ آپ دیکھ لیں گے کہ میری گورنمنٹ جان بوجھ کر برائی نہیں کرنا چاہتی۔'' میں نے اس کی جواب میں عرض کیا۔ ''اسی عقیدے کی بدولت میری ہمت بندھی ہوئی ہے۔'' اس کے بعد میں پونا گیا۔ ان مبارک دنوں کے بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں۔ مگر ان سب کو یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ گوکھلے اور انجمن خدام ہند کے ممبرون نے مجھے محبت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گوکھلے نے کل ممبروں کو مجھ سے ملانے کے لیے بلایا تھا میں نے ان سے ہر قسم کے موضوع پر آزادی سے گفتگو کی۔

گوکھلے دل سے چاہتے تھے کہ میں انجمن کا ممبر بن جاؤں اور میری بھی یہی آرزو تھی مگر ممبروں کا یہ خیال تھا کہ میرے اور ان کے نصب العین اور طریق کار میں بہت فرق ہے۔ اس لیے میرا انجمن میں شامل ہونا مناسب نہیں۔

گوکھلے کو میرے متعلق تھا کہ میں اپنے اصول کا سختی سے پابند ہوں مگر ان لوگوں سے جن کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہو، رواداری برت سکتا ہوں۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''مشکل یہ ہے کہ انجمن کے ممبروں کو ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا کہ تمہاری طبیعت میں سازگاری کی کتنی صلاحیت ہے۔ یہ لوگ اپنے اصول کے پکے ہیں اور اپنی رائے میں آزاد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ تمہیں ممبر بنانے پر راضی ہو جائیں گے لیکن اگر نہ بھی ہو تو تم یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ ان کے دل میں تمہاری وقعت اور محبت نہیں۔ انہیں زیادہ تامل اسی لیے ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے کی وجہ سے تمہارا احترام ان کی نظر میں کم ہو جائے۔ مگر چاہے تم باضابطہ ممبر بنائے جاؤ یا نہ بنائے جاؤ میں تو تمہیں ممبر سمجھوں گا۔''

میں نے ان سے کہا کہ میرا ارادہ ہے خواہ میں انجمن میں داخل کیا جاؤں یا نہ کیا جاؤں دونوں صورتوں میں اپنا ایک الگ آشرم گجرات کے کسی حصے میں قائم کروں کیونکہ میں گجراتی ہوں اور مجھے اسی میں آسانی ہے کہ گجرات کی خدمت کے ذریعے سے ہندوستان کی خدمت کروں۔

گوکھلے کو یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے کہا ''تم آشرم ضرور قائم کرو۔ انجمن کے ممبروں سے تم سے کوئی سمجھوتہ ہو یا نہ ہو، میں تمہارے آشرم کو اپنا آشرم سمجھوں گا اور اس کا کل خرچ دوں گا۔''

میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ

چندہ جمع کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہوں اور مجھے یہ اطمینان رہے کہ سب کچھ مجھ ہی کو نہیں کرنا ہے بلکہ ایک رہنما موجود ہے جو مشکلوں میں میری مدد کرے گا۔ گوکھلے کے اس وعدے سے میرے دل سے بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

انہوں نے ڈاکٹر دیو آنجہانی کو بلا کر حکم دیا کہ انجمن کے کھاتے میں ان کا حساب کھول دیا جائے اور انہیں آشرم کے اور قومی کاموں کے لیے جتنے روپے کی ضرور ہو دے دیا جائے۔''

اب میں نے شانتی نکیتن جانے کی تیاری کی۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے گوکھلے نے اپنے خاص دوستوں کی چائے کی دعوت کی۔ میرے خیال سے انہوں نے میری پسند کی چیز یعنی خشک اور تر میوہ منگوایا۔ یہ پارٹی ان کے کمرے سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوئی مگر ان میں وہاں تک جانے کی طاقت نہیں تھی پھر بھی میرے محبت انہیں وہاں تک کھینچ لائی۔ آنے کو تو وہ آ گئے مگر اتنی تکان ہوئی کہ انہیں غش آ گیا اور لوگ انہیں اٹھا کر لے گئے۔ یہ غشی کے دورے انہیں اکثر ہوا کرتے تھے۔ اس لیے جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ پارٹی میں دیر نہ کی جائے۔

یہ پارٹی چند دوستوں کا مجمع تھا جو انجمن کے مہمان خانے کے سامنے زیر آسمان بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے اور بیچ بیچ میں مونگ پھلی، کھجوریں اور موسمی پھل کھاتے جاتے تھے۔

مگر یہ غشی کا دورہ میری زندگی میں ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔

............☆☆............

کیا یہ دھمکی تھی؟

پونا سے میں راجکوٹ اور پور بندر گیا جہاں مجھے اپنی بھاوج اور دوسرے عزیزوں سے ملنا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ستیا گرہ کے زمانے میں میں نے اپنی وضع "پابند مزدوروں" کی سی بنالی تھی اور انگلستان میں بھی گھر کے اندر یہی کپڑے پہنتا تھا۔ بمبئی میں جہاز سے اترنے سے پہلے میں نے کاٹھیاواری لباس پہن لیا تھا۔ یعنی کرتا، انگرکھا، دھوتی، پگڑی اور گلے میں آڑا دوپٹہ۔ یہ سب چیزیں سودیشی تھیں مگر چونکہ مجھے بمبئی سے تیسرے درجے میں سفر کرنا تھا اس لیے میں نے انگرکھے اور دوپٹے کو خیرباد کہا اور پگڑی کی جگہ ایک آٹھ، دس آنے کی کشمیری ٹوپی سر پر رکھ لی۔ اس وضع میں جو شخص مجھے دیکھتا وہ غریب آدمی سمجھتا۔ اس زمانے میں طاعون پھیلا ہوا تھا اور ویرام گام یا وڈھوان میں تیسرے درجے کے مسافروں کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا تھا مجھے خفیف سی حرارت تھی۔ انسپکٹر نے یہ دیکھ کر میرا نام لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ تم راجکوٹ کے میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو جانا۔

شاید کسی شخص نے یہ اطلاع دے دی تھی کہ میں وڈھوان اسٹیشن سے گزروں گا کیونکہ موتی لال درزی جو وہاں کے مشورہ قومی کارکن تھے مجھ سے ملنے اسٹیشن پہنچے انہوں نے ویرام گام کے حالات سنائے کہ وہاں ریل کے مسافروں کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ میری طبیعت بخار کے سبب سے باتیں کرنے کو نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے گفتگو کو مختصر کرنے کے خیال سے پوچھا۔ "تم لوگ جیل جانے کو تیار ہو؟" میں سمجھتا تھا کہ موتی لال ان جلد باز نوجوانوں میں سے ہیں جو

بے سمجھے بوجھے جو جی میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں مگر یہ بات نہیں تھی انہوں نے استقلال کے لہجے میں جواب دیا۔

''بیشک ہم تیار ہیں بشرطیکہ آپ ہماری رہنمائی کریں۔ ہم کاٹھیاواڑیوں کا آپ پر جتنا حق ہے کسی کا نہیں اس وقت ہم آپ کو روکنا نہیں چاہتے۔ مگر آپ یہ وعدہ کر لیجیے کہ واپسی میں یہاں ضرور ٹھہریں گے۔ آپ ہمارے یہاں کے نوجوانوں کا جوش اور ان کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور آپ جو حکم دیں گے اس کی فوراً تعمیل ہوگی۔''

موتی لال نے میرے دل میں جگہ کر لی۔ ان کے ساتھی نے ان کی تعریف میں کہا۔ ''میرے دوست ہیں تو درزی مگر اپنے فن میں اس قدر ماہر ہیں کہ ایک گھنٹہ روز کام کر کے پندرہ روپیہ مہینہ کما لیتے ہیں جو ان کے خرچ کے لیے کافی ہے اور باقی وقت قومی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ ہم پڑھے لکھے لوگ انہیں اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ ان کا خلوص اور ایثار دیکھ کر ہمیں اپنے اوپر شرم آتی ہے۔''

آگے چل کر میرا موتی لال سے بہت سابقہ رہا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اس تعریف میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا۔ انہوں نے یہ معلوم کر لیا کہ ہمارے نئے آشرم میں ہر مہینے چند روز کے لیے آتے تھے۔ ہم لوگوں کے کپڑے سیتے تھے اور ہمیں درزی کا کام سکھاتے تھے۔

وہ ہمیشہ ویرام گام کے حالات سنایا کرتے تھے اور مسافروں کی تکلیفوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ صدمہ ان سے کسی طرح برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار پڑے اور عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وڈھوان کی قومی زندگی کو ان کی وفات سے بڑا نقصان پہنچا۔

غرض میں راجکوٹ پہنچ گیا اور دوسرے دن صبح کو میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہوا۔ وہاں لوگ مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور انہیں انسپکٹر پر بڑا غصہ آیا ان کی یہ خفگی بے جا تھی کیونکہ انسپکٹر نے تو اپنا فرض ادا کیا تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتا تھا اور اگر جانتا بھی ہوتا تو اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ میڈیکل افسر نے بڑے اصرار سے مجھے دوبارہ اس کے پاس جانے سے روکا اور ایک دوسرے انسپکٹر کو میرے گھر پر بھیج دیا۔

ایسے موقعوں پر تیسرے درجے کے مسافروں کا طبی معائنہ حفظان صحت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اگر بڑے آدمی تیسرے درجے میں سفر کریں تو انہیں خودبخود ان تمام ضابطوں کی پابندی کرنا چاہئے جو غریبوں کے لیے مقرر ہیں اور سرکاری ملازموں کو غریب اور امیر میں فرق نہیں کرنا چاہئے۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ سرکاری ملازم تیسرے درجے کے مسافروں کو اپنا ہم جنس نہیں بلکہ بھیڑ، بکری سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ حقارت سے گفتگو کرتے ہیں۔ اور انہیں یہ برداشت نہیں کہ کوئی ان کی بات کا جواب دے یا ان سے بحث کرے۔ بیچارے مسافر نوکروں کی طرح کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ بے تکلف انہیں مارتے پیٹتے ہیں۔ ان سے ڈرا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں۔ اور انہیں ٹکٹ تک رلا رلا کر دیتے ہیں۔ چاہے ان کی گاڑی کیوں نہ چھوٹ جائے۔ یہ سب باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں۔ ان کی اصلاح کی صرف یہی صورت ہے کہ چند تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگ غریبوں کی وضع اختیار کرکے تیسرے درجے میں سفر کیا کریں۔ اگر ان کے ساتھ غریبوں کے مقابلے میں کوئی رعایت کی جائے تو قبول نہ کریں اور جس تکلیف بدسلوکی، بے انصافی کا دور کرنا ممکن ہو اسے چپ چاپ سہنے کے بجائے اس کے خلاف احتجاج کریں۔

میں کاٹھیاوار میں جہاں کہیں گیا میں نے یہی شکایت سنی کہ ویرام گام میں چنگی والے مسافروں کو بہت دق کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ لارڈ ولنگڈن کی فرمائش سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس مسئلے کے متعلق جتنا مواد مل سکا میں نے جمع کیا اور اس کو غور سے پڑھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں بجا ہیں تو میں میں نے حکومت بمبئی س خط و کتاب شروع کی۔ میں لارڈ ولنگڈن کے پرائیویٹ سیکرٹری سے ملا اور خود ہزا کسلینسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ موصوف نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اس معاملے میں اپنی مجبوری ظاہر کر کے دہلی کے حکام کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا۔ ''اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم کب کے اس چوکی کو اٹھا چکے ہوتے آپ حکومت ہند سے درخواست کیجئے۔''

میں نے حکومت ہند کو لکھا لیکن سوائے خط کی رسید کے کوئی جواب نہیں ملا۔ بہت دنوں بعد جب مجھے لارڈ چیمفورڈ سے ملنے کا اتفاق ہوا تب جا کر شنوائی ہوئی۔ میں نے ان سے سارے واقعات بیان کیے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ انہیں اس معاملے کی خبر تک نہیں کی گئی تھی۔ انہوں نے میری گفتگو بہت غور سے سنی۔ فوراً ٹیلی فون کر کے ویرام گام کے کاغذات منگوائے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر چنگی کا محکمہ کوئی معقول وجوہ پیش نہ کر سکا۔ تو اس چنگی کو منسوخ کر دیں گے۔ چند روز کے بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ویرام گام کی چنگی کی چوکی اٹھا دی گئی۔

اس واقعے کو میں نے ہندوستان میں ستیا گرہ کا آغاز سمجھا۔ کیونکہ جب میں گورنر بمبئی کے سیکرٹری سے ملا تھا تو انہوں نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا کہ میں نے اپنی بگیسرا 48 کی تقریر میں ستیا گرہ کا ذکر کیا۔

انہوں نے پوچھا تھا ''کیا یہ دھمکی نہیں ہے؟ کیا آپ کے خیال میں ایک

با اقتدار حکومت ان دھمکیوں سے دب جائے گی؟"

میں نے اس کے جواب میں کہا تھا۔ یہ دھمکی نہیں ہے یہ عوام کو سیاسی تعلیم دینے کا ایک طریقہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ ملک کے سامنے وہ تمام جائز تدبیریں پیش کر دوں جن سے رعایا اپنی شکایاتوں کو دور کرا سکتی ہے جو قوم اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے اسے آزادی کے کل طریقے ملعوم ہونا چاہئیں۔ عموماً ایسی صورتوں میں مجبور ہو کر تشدد سے کام لینا پڑتا ہے مگر ستیا گرہ ایسا حربہ ہے جسے تشدد سے کوئی سروکار نہیں۔ میں لوگوں کو یہ بتانا اپنا دھرم سمجھتا ہوں کہ اس حربے کو کیسے اور کس حد تک استعمال کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ برطانوی حکومت بڑا اختیار رکھتی ہے مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ستیا گرہ میں بہت بڑی قوت ہے۔

اس پر مدبر سیکرٹری نے شبہ کے انداز میں سر ہلا کر کہا تھا۔ "خیر، یہ بھی دیکھ لیں گے۔"

............☆☆............

شانتی نکیتن

راجکوٹ سے میں شانتی نکیتن گیا وہاں کے استاد اور طالب علم مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ میرے استقبال میں جو سامان کیا گیا۔ وہ آرائش، سادگی اور خلوص کا خوشنما مجموعہ تھا۔ یہاں مجھے اپنی عمر میں پہلی بار کاکا صاحب کلیلکر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ کلیلکر کالقب کاکا صاحب کیوں ہے، آگے چل کر معلوم ہوا کہ میرے دوست کیشو راوجی دیشپانڈے نے جو انگلستان میں میرے ساتھ تھے بڑودے میں گنگا ناتھ ودیالا کے نام سے ایک سکول قائم کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ سب استاد، شاگرد ایک خاندان کے لوگوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اس لیے انہوں نے استادوں کے لقب رشتوں کے نام پر رکھے تھے۔ کلیلکر اس سکول میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس لیے یہ کاکا صاحب (چچا جان) کہلانے لگے۔ پھڈ کے کالقب ''ماما'' (ماموں جان) اور ہری شرما کا ''انا'' (بھائی جان) تھا۔ اور استاد بھی اسی طرح کے ناموں سے پکارے جاتے تھے مثلاً انند انند جو کاکا صاحب کے دوست تھے ''سوامی'' اور پٹوردھن جو ''ماما'' کے دوست تھے ''آپا'' کہلاتے تھے۔ یہ سب لوگ آگے چل کر یکے بعد دیگرے میرے رفیق بن گئے۔ خود دیشپانڈے جی ''صاحب'' کہے جاتے تھے۔ جب یہ سکول ٹوٹ گیا تو خاندان کے لوگ منتشر ہو گئے۔ مگر انہوں نے اپنے لقب اور آپس کے روحانی رشتے بدستور قائم رکھے۔

کاکا صاحب مختلف تعلیمی اداروں کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے سفر کر رہے تھے۔ جس زمانے میں میں شانتی نکیتن گیا۔ اتفاق سے وہیں موجود تھے اور ان کے ساتھ ان کی برادری کے اور شخص چنتامن شاستری بھی تھے۔ یہ دونوں وہاں سنسکرت پڑھاتے تھے۔

فنیکس والے شانتی نکیتن میں ایک علیحدہ مکان میں رکھے گئے تھے۔ ان کے سرکردہ گمن لال گاندھی یہاں بھی سختی کے ساتھ فنیکس آشرم کے ضابطوں کی پابندی کراتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی محبت، قابلیت اور مستعدی کا سکہ سارے شانتی نکیتن پر بٹھا دیا ہے۔

وہاں اینڈریوز بھی تھے اور پیرسن بھی۔ بنگالی استادوں میں سے ہمارا زیادہ میل جول جگد انند بابو، نیپال بابو، سنتوش بابو، کھتی موہن بابو، ناگن بابو، شارد ابا جو اور کالی بابو سے تھا۔

میں حسب معمول بہت جلد یہاں کے استادوں اور طالب علموں میں گھل مل گیا اور میں نے ان سے اپنا کام آپ کرنے کے مسئلے پر بحث چھیڑ دی۔ میں نے استادوں سے کہا کہ اگر آپ اور آپ کے شاگرد اپنا کھانا تنخواہ دار باورچیوں سے نہ پکوائیں بلکہ خود پکائیں تو آپ لڑکوں کی جسمانی اور اخلاقی صحت کے نقطہ نظر سے باورچی خانے کی نگرانی کر سکیں گے اور لڑکوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی تربیت ملے گی۔ ان میں سے دو ایک نے شبہہ کے انداز میں سر ہلایا۔ بعض نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ لڑکوں نے بڑے جوش وخروش سے اس کی تائید کی کیونکہ ان کو تو نئی باتوں کا شوق ہوتا ہی ہے۔ غرض ہم نے یہ تجربہ شروع کر دیا۔ میں نے مہا کوی ٹگور سے درخواست کی کہ آپ بھی اس معاملے میں رائے دیجیے تو انہوں نے فرمایا اگر

استاد راضی ہوں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ لڑکوں سے انہیں نے کہا۔ ''یہی چیز سوراج کی کنجی ہے۔''

پیرسن نے اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی محنت کی۔ انہیں اس میں بے حد جوش اور انہماک تھا۔ استادوں اور شاگردوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بنائے گئے اور ان میں سارا کام تقسیم کر دیا گیا۔ کچھ لوگ ترکاری چھیلتے تھے۔ کچھ غلہ بینتے اور پھٹکتے تھے۔ ناگن بابو اور ان کے ساتھیوں نے باورچی خانے وغیرہ کی صفائی کا ذمہ لیا۔ انہیں ہاتھ میں پھاوڑا لیے کام کرتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔

لیکن سوا سو لڑکوں اور ان کے استادوں کو جسمانی محنت کا عادی بنانا سہل نہ تھا۔ روز جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ بعض لوگ تھوڑے ہی دن میں تھک گئے۔ مگر پیرسن ہمت ہارنے والے اسامی نہ تھے۔ جب دیکھیے کشادہ روی سے کوئی نہ کوئی کام کرتے نظر آتے تھے۔ بڑے برتنوں کا مانجنا انہوں نے اپنے ذمے رکھا تھا۔ جب برتن مانجے جاتے تو چند طالب علم بیٹھ کر ستار بجاتے کہ مانجنے والوں کو یہ کٹھن کام کھلنے نہ پائے۔ غرض سب اپنے اپنے کام میں منہمک رہتے تھے اور شانتی نکیتن شہد کی مکھیوں کا چھتا بن گیا تھا۔

ایسے کاموں کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو اس میں نئی نئی شاخیں نکل آتی ہیں۔ فنیکس والے بھی اپنا کھانا خود پکاتے تھے مگر ان کی غذا بالکل سادہ تھی۔ مصالحہ نام کو بھی نہیں پڑتا تھا۔ چاول، دال، ترکاری، گیہوں کا آٹا سب چیزیں ملا جلا کر بھاپ کے چولہے میں پکائی جاتی تھیں۔ شانتی نکیتن کے بعض لڑکوں نے بھی بنگالی غذا میں اصلاح کرنے کے لیے اس قسم کا کھانا پکانا شروع کیا۔ وہ ایک استاد اور چند لڑکے مل کر یہ تجربہ کرتے تھے۔

یہ کارخانہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ مگر میرے خیال میں اس تھوڑے عرصے میں شانتی نکیتن کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی پہنچا۔ استادوں کو جو تجربے ہوئے وہ بیکار نہیں کہے جا سکتے۔

میرا ارادہ تھا کہ ابھی کچھ دن شانتی نکیتن میں ٹھہروں مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پونا سے تار آیا کہ گوکھلے کا انتقال ہو گیا۔ سارے شانتی نکیتن پر اداسی چھا گئی سب لوگ میرے میرے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ آشرم کے مندر میں ماتمی جلسہ کیا گیا۔ بڑا دلدوز منظر تھا۔ میں اسی دن اپنی بیوی اور مگن لال کو ساتھ لے کر پونا چلا گیا اور لوگ شانتی نکیتن میں رہے۔

اینڈریوز مجھے پہنچانے بروڈان تک آئے۔ انہوں نے اثنائے گفتگو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے خیال میں کبھی ہندوستان میں بھی ستیا گرہ کا وقت آئے گا؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا جواب مشکل ہے۔ ایک سال تک میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' گوکھلے نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ ایک سال تک ہندوستان میں تجربہ حاصل کرنے کے لیے سفر کروں گا اور اس عرصے میں قومی معاملات پر کوئی رائے ظاہر نہیں کروں گا بلکہ میں ایک سال گزرنے کے بعد بھی اپنی رائے کے اظہار میں جلدی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے خیال میں ابھی پانچ برس ستیا گرہ کا امکان نہیں۔''

اسی سلسلے میں یہ بھی کہہ دوں کہ گوکھلے میری کتاب ''ہند سوراج'' کے بعض خیالات پر ہنسا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے۔ ''ایک سال ہندوستان میں رہنے کے بعد تمہارے خیالات خود بخود راہ پر آ جائیں گے۔''

............☆☆............

تیسرے درجے کے مسافروں کی مصیبت

بروڈان میں ہمیں اس مصیبت کا سامنا ہوا جو تیسرے درجے کے مسافروں کو ٹکٹ لینے تک میں بھگتنا پڑتی ہے جب میں نے ٹکٹ مانگا تو جواب ملا۔ ''تیسرے درجے کے ٹکٹ گاڑی آنے سے اتنے پہلے نہیں ملتے۔'' میں اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اول تو اسے ڈھونڈھنے ہی میں بڑی مشکل ہوئی۔ خدا خدا کر کے ملا تو اس نے بھی وہی جواب دیا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلتے ہیں میں وہاں پہنچا مگر مسافروں کی وہ ریل پیل تھی کہ ٹکٹ لینا سہل نہ تھا ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا معاملہ تھا۔ ہٹے کٹے لوگ جنہیں دوسروں کا مطلق خیال نہ تھا مجھے دھکیل کر ٹکٹ لے لیتے تھے۔ پہلے گروہ میں جتنے لوگ تھے ان کے بعد مجھے ٹکٹ ملا۔

اب گاڑی آئی۔ اس میں گھس پیٹھ کر بیٹھنا ٹکٹ لینے سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ اندر کے اور باہر کے مسافروں میں خوب گالی گلوچ، دھکم دھکا ہو رہی تھی۔ ہم کئی بار دوڑتے ہوئے اس سرے سے اس سرے تک گئے مگر سب کو ہی جواب ملا۔ ''یہاں بالکل جگہ نہیں ہے'' میں نے گارڈ سے کہا۔ ''اس نے جواب دیا جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ ورنہ دوسری گاڑی سے چلے جانا۔''

میں نے ادب سے کہا مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ مگر اسے میری بات سننے کی فرصت نہ تھی۔ میری ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے مگن لال سے کہا۔ جہاں ہو سکے بیٹھ جاؤ اور میں اپنی بیوی کو لے کر ڈیوڑھے درجے میں بیٹھ گیا۔ گارڈ نہیں ہمیں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اسنسول کے اسٹیشن پر وہ زائد کرایہ وصول کرنے پہنچا۔ میں نے اس سے

کہا۔

''آپ کا فرض تھا کہ ہمیں جگہ دیتے۔ ہمیں کہیں جگہ نہیں ملی۔ اس لیے اس درجے میں بیٹھ گئے۔ اگر آپ ہمیں تیسرے درجے میں بٹھا سکیں تو ہم خوشی سے چلنے کو تیار ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بس زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں تیسرے درجے میں جگہ نہیں دے سکتا۔ کرایہ دینا ہے تو دو ورنہ گاڑی سے اتر جاؤ۔''

مجھے کسی نہ کسی طرح پونا پہنچنا تھا۔ اس لیے میں گارڈ سے لڑنے کے لیے تیار نہیں تھا میں نے چپ چاپ پونا تک کا زائد کرایہ دے دیا مگر یہ بے انصافی مجھے بہت ناگوار ہوئی۔

صبح کو ہم مغل سرائے پہنچے۔ مگن لال گھس پیٹھ کر تیسرے درج میں بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی اسی میں چلا گیا۔ میں نے ٹکٹ ایگزامنر سے اس بات کا سرٹیفکیٹ مانگا کہ میں مغل سرائے سے تیرے درج میں بیٹھا ہوں۔ اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں میں نے ریل کے اعلیٰ افسر کو درخواست دی۔ وہاں سے جواب ملا۔ ''ہم بغیر سرٹیفکیٹ کے زائد کرایہ واپس نہیں دیا کرتے مگر آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ تاہم بروڈان سے مغل سرائے تک کا زائد کرایہ واپس نہیں ہوسکتا۔''

اس کے بعد مجھے تیسرے درجے کے سفر کے ایسے ایسے تجربے ہوئے کہ اگر لکھنے پر آؤں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے مگر یہاں میں جا بجا سرسری طور پر ایک آدھ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ جسمانی کمزوری کے سبب سے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کی تکلیفوں کا بڑا سبب ریل کے ملازموں کی بے جا سختی ہے مگر خود مسافروں کی بدتمیزی، غلاظت، خود غرضی اور

جہالت بھی کچھ کم قابل الزام نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اکثر انہیں اپنی برائیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں یہی کرنا چاہئے۔ اس کی اصلی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ ان کی اصلاح کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔

غرض ہم تھکے ماندے کلیان پہنچے۔ میں نے اور مگن لال نے اسٹیشن کے بمبے سے پانی لے کر اشنان کیا۔ میں اپنی بیوی کے نہانے کا بندوبست کر رہا تھا کہ ''انجمن خدام ہند'' کے رکن کول جی نے ہمیں دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ ان خاتون کو دوسرے درجے کے غسل خانے میں نہا لینے دیجئے۔ میں جانتا تھا کہ میری بیوی کو اس غسل خانے کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ مگر میں نے اس اس وقت اس بے عنوانی سے چشم پوشی کی۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ بات حق کے طالب کے لے مناسب نہیں ہے۔ میری بیوی کو یہ خواہش نہیں تھی۔ کہ اس غسل خانے میں نہائیں۔ مگر میرے دل میں بیوی کی محبت حق کی محبت پر غالب آ گئی۔ اپانشد میں لکھا ہے کہ حق کا رخ زیبا ''مایا'' کے سنہرے نقاب میں پوشیدہ ہے۔

............☆☆............

محبت کی کشمکش

پونا پہنچ کر ''شرادھ'' کی رسم سے فراغت کرنے کے بعد یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انجمن کا مستقبل کیا ہوگا اور مجھے اس میں شریک ہونا چاہئے یا نہیں۔ میرے لیے یہ مسئلہ بہت نازک تھا۔ جب تک گوکھلے زندہ تھے مجھے انجمن کا رکن بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میری رہنمائی کے لیے ان کی ذات کافی تھی۔ ہندوستانی سیاست کے تلاطم خیز سمندر میں سفر کرنے کے لیے مجھے ایک ناخدا کی ضرورت تھی اور گوکھلے کا دامن تھام لینے سے یہ مشکل حل ہوگئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں بے کس و تنہا رہ گیا اور اب میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انجمن کا رکن بن جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ گوکھلے کی روح اس بات سے خوش ہوگی۔ اس لیے میں نے بے تامل داخلے کی کوشش شروع کردی۔

اس موقع پر انجمن کے اکثر ممبر پونا میں موجود تھے۔ میں نے ان سے مل کر اس مسئلے کو چھیڑا اور ان کے دل میں میری طرف سے جو شبے تھے انہیں دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان میں اختلاف رائے ہے۔ ایک فریق میرے داخلے کے موافق تھا اور دوسرا بہت سختی سے مخالفت کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دونوں کو مجھ سے مساوی محبت ہے مگر وہ انجمن کے مفاد کو مقدم سمجھتے تھے۔

اس لیے ہمارے مشوروں میں کبھی تلخ کلامی کی نوبت نہیں آتی تھی بلکہ محض اصولی بحث ہوا کرتی تھی۔ وہ لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ بہت سے اہم معاملات میں میری اور ان کی رائے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے میری ممبر ہونے سے انجمن کے بنیادی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا خوف ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ اسے کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ بڑی طویل طویل بحث کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ یہ طے پایا کہ اس مسئلے پر پھر کبھی غور کیا جائے گا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد میں عجب کشمکش میں پڑ گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اگر میرا انتخاب کثرت رائے سے ہو تو مجھے ممبری قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟ کیا یہ گوکھلے سے بیوفائی نہ ہوگی؟ آخر مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جب میرے متعلق ممبروں میں اس قدر شدید اختلاف رائے ہے تو میرے لیے یہی مناسب ہے کہ داخلے کی درخواست واپس لے لوں اور فریق مخالف کو اس ناگوار صورت حال سے نجات دوں مجھے انجمن اور گوکھلے سے جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی نظر آیا۔ یہ بات دفعتاً میرے ذہن میں آئی اور میں نے فوراً شاستری جی کو لکھا کہ انجمن کا ملتوی شدہ جلسہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے۔ انہوں نے میرے اس فیصلے کی بہت تعریف کی۔ اس کے سبب ان کی مشکل آسان ہوگئی اور ان میں اور مجھ میں دوستی اور رابطہ اور استوار ہو گیا۔ سچ پوچھیے تو اس درخواست کے واپس لینے سے میں انجمن کا ممبر بن گیا۔

تجربے سے ثابت ہو گیا کہ میرا انجمن کا باضابطہ ممبر نہ بننا بہت اچھا ہوا اور جو لوگ میرے داخلے مخالف تھے ان کی رائے بالکل صحیح تھی۔ میرے اور ان کے خیالات میں جو اصولی اختلاف تھا وہ اب پوری طرح نمایاں ہو گیا ہے۔ مگر اس اختلاف کو تسلیم کر لینے سے ہماری باہمی دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم میں برادرانہ تعلقات بدستور قائم ہیں اور میں اکثر جا کر پونا میں انجمن کے مستقر کی زیارت کرتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میں انجمن کا باضابطہ ممبر نہیں بنا۔ مگر روحانی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا رکن سمجھتا ہوں۔ یہ باطنی رشتہ ظاہری رشتے سے بدرجہا زیادہ قابل قدر ہے۔ ظاہری رشتہ بغیر باطنی اتحاد کے جسد بے روح کی مانند ہے۔

کمبھ کا میلا

میں ڈاکٹر مہتا سے ملنے رنگون جا رہا تھا۔ راہ میں کلکتے میں بابو بھوپندر ناتھ باسو کے گھر ٹھہرا۔ یہاں مجھے بنگالیوں کی مہمان نوازی کا پورا اندازہ ہوا۔ ان دنوں میں سوائے میوے کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ اس لیے کلکتے میں جتنے خشک اور تر میوے مل سکتے تھے سب میری خاطر مہیا کیے گئے۔ گھر کی عورتیں رات رات بھر جاگ کر میوہ چھیلتی تھیں۔ بڑے اہتمام سے سارے میوے ہندوستانی طریقے سے چھیل کر اور تراش کر میرے سامنے رکھے جاتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے لیے جن میں میرا لڑکا رام داس بھی تھا، طرح طرح کے مزیدار کھانے پکتے تھے۔ میرے دل پر اس خاندان کی محبت اور مہمان نوازی کا بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ دو تین مہمانوں کی خاطر مدارت میں سارا گھر مصروف رہے۔ مگر ان تکلفات سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

رنگون جاتے وقت میں نے عرشے پر سفر کیا۔ باسو بابو کے یہاں تو ہم لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ حد سے زیادہ خاطر ہوتی ہے مگر جہاز پر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ بے توجہی کا یہ حال تھا کہ ہم لوگ روزمرہ کی ضروریات سے بھی محروم تھے۔ غسل خانہ اس قدر میلا تھا کہ قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور پاخانوں میں تو غلاظت کے انبار لگے تھے۔ وہاں جاتے ہوئے گویا موت کے دلدل میں سے گزرنا پڑتا تھا۔

اس کا برداشت کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ میں نے چیف افسر سے شکایت کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اس مکروہ منظر میں جو کچھ کمی تھی وہ مسافروں کی بد

تمیزی کرنے پوری کر دی۔ یہ لوگ جہاں بیٹھتے تھے۔ وہیں تھوک دیتے اور بے تکلف بچا کھچا کھانا اور پان کا اگال پھینک دیا کرتے۔ شور اس قدر مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ہر شخص کوشش کرتی کہ بہت سی جگہ پر قبضہ کرے۔ ان کے احباب نے ان سے بھی زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ وہ دن اسی عذاب میں گزرے۔

رنگون پہنچ کر میں نے کمپنی کے ایجنٹ کو خط لکھا۔ اس کا اور ڈاکٹر مہتا کی کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ واپسی میں اتنی ناقابل برداشت تکلیف نہیں ہوئی۔

رنگون میں بھی میرے میزبان کو میری غذا کی پابندیوں کے سبب بڑی زحمت اٹھانا پڑی۔ میں ڈاکٹر مہتا کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا اس لیے میں نے انہیں زیادہ تکلف نہیں کرنے دیا۔ پھر بھی چونکہ میں نے اپنے کھانے کے لیے میووں کی قسمیں محدود نہیں کی تھیں۔ خود میرے ذائقے اور میرے نظر کو ہوس تھی کہ طرح طرح کی چیزیں ہوں کھانے کے اوقات مقرر نہیں تھے میں چاہتا تھا کہ شام کا کھانا اندھیرا ہونے سے پہلے کھالیا کروں۔ مگر عمومارات کے آٹھ نو بج جاتے تھے۔

اس سال یعنی 1915ء میں ہردوار میں کمبھ کا میلا تھا جو بارہ سال کے بعد ہوا کرتا ہے۔ مجھے میلا دیکھنے کا شوق نہیں تھا مگر گرد کل میں مہاتما منشی رام جی کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ انجمن خدام ہند نے میلے کے انتظام کے لیے رضا کاروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا تھا۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزداس اس دستے کے سردار تھے اور ڈاکٹر دیو آنجہانی اس کے طبی افسر تھے۔ مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ ان کی مدد کے لیے فنیکس والوں کو بھیجوں اور مگن لال گاندھی انہیں لے وہاں پہنچ چکے تھے۔ رنگون سے لوٹ کر میں بھی ان سے آملا۔

کلکتہ سے ہردوار تک ریل کے سفر میں بے حد تکلیف ہوئی۔ بعض جگہ ڈبوں

میں روشنی تک نہ تھی۔ سہارنپور سے ہم لوگ مال گاڑیوں میں اور مویشی کے ڈبوں میں بھر دیئے گئے۔ ان میں چھت نہیں تھی۔ دوپہر کو ایک تو سورج کی گرمی دوسرے لوہے کے فرش کی تپش نے ہمیں بھون ڈالا۔ لوگوں کا یہ حال تھا کہ اس مصیبت کے سفر میں پیاس سے تڑپتے تھے۔ لیکن اگر کسی اسٹیشن پر ''مسلمان'' پانی ملتا تھا تو نہیں پیتے تھے اور ''ہندو'' پانی کے انتظار میں رہتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ یہی ہندو جب بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کی تجویز سے بے تکلف بے پوچھے گچھے شراب یا گائے کے گوشت کی یخنی چڑھا جاتے ہیں اور مسلمان یا عیسائی کمپونڈر کے ہاتھ کا پانی پی لیتے ہیں۔

شانتی نکیتن کے قیام سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں ہندوستان میں زیادہ تر خاکروب کا کام کرنا پڑے گا۔ ہردوار میں رضاکاروں کے قیام کے لیے ایک دھرم شالے میں خیمے نصب کر دیئے گئے تھے اور ڈاکٹر دیو نے رفع حاجت کے لیے کچھ گڑھے کھدوا دیئے تھے۔ ان کی صفائی تنخواہ دار بھنگی ہوتے تھے۔ یہ کام ہم فنیکس والوں کے کرنے کا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم غلاظت پر راکھ ڈال دیا کریں گے اور خود صفائی کی نگرانی کریں گے۔ ڈاکٹر دیو نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ یہ بات کہی تو میں نے تھی مگر اسے پورا مگن لال گاندھی نے کیا۔ میرا کام تو زیادہ تر یہی تھا کہ خیمے میں بیٹھا ''درشن'' دیا کروں اور ان جاتریوں سے جو سینکڑوں کی تعداد میں میرے پاس آتے تھے مذہبی بحثیں کیا کروں۔ یہ ''درشن'' کے بھوکے ''گھاٹ'' تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی پہنچ جاتے تھے۔ غرض ہردوار میں مجھے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں جو ناچیز خدمات میں نے انجام دیں ہیں ان کا اثر سارے ہندوستان میں کس قدر گہرا ہے۔

مگر میری یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی کو اس پر رشک آئے۔ میری جان پر دو طرفہ عذاب تھا جہاں مجھے کوئی پہنچانتا نہیں تھا مثلاً ریل کے سفر میں وہاں مجھے اپنے کروڑوں بھائیوں کی طرح سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں اور جہاں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو میری شہرت سن چکے تھے وہاں ''درشن'' کی مصیبت تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے کون سی حالت زیادہ قابل افسوس تھی۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ درشن والوں کی اندھی محبت پر مجھے بارہا غصہ آیا ہے اور اکثر اس سے دلی صدمہ پہنچا ہے مگر سفر میں باوجود سخت تکلیفوں کے کبھی طیش نہیں آیا بلکہ روح کو اور تقویت ہوئی۔

ان دنوں میرے جسم میں طاقت تھی اور میں دور دور تک چکر لگایا کرتا تھا۔ یہ بہت اچھا تو کہ لوگ عام طور پر مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ اس لیے سڑکوں پر اتنی ہلچل نہیں ہوتی تھی۔ کہ گزرنا مشکل ہو جائے۔ اس طرح چل پھر کر میں نے جاتریوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ مجھے ان میں بے حسی، ریکاری اور بدتمیزی زیادہ نظر آئی اور دینداری بہت کم ''سادھو'' ٹڈی دل کی طرح چھائے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عیش و عشرت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔

یہاں میں نے ایک گائے دیکھی جس کے پانچ پیر تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی مگر واقفت کار لوگوں نے مجھے اس کا بھید بتا دیا۔ یہ بےچاری سنگدل انسانوں کی حرص و طمع کا شکار تھی۔ یہ پانچواں پیر اصل میں ایک زندہ بچھڑے کے جسم سے کاٹ کر اس غریب کے کندھے پر کھال چیر کر لگا دیا گیا تھا۔ اس دوہرے ظلم سے جاہلوں کو ٹھگنے کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا تھا۔ یہ پاپی جانتے تھے کہ ہندو پانچ پیر کی گائے دیکھنے کیشوق میں دوڑ آئیں گے اور اس زندہ معجزے پر حسب حیثیت چڑھاوا چڑھائے گا۔

اب میلے کا دن قریب آ گیا۔ میں ہردوار جاترا کی نیت سے نہیں گیا تھا۔ میرا یہ اصول نہیں کہ خدا کو زیارہ گاہوں میں ڈھونڈھتا پھروں لیکن یہ سترہ لاکھ آدمی جو وہاں جمع تھے۔ سب کے سب ریا کار محض تماشے کے شائق نہیں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو ثواب حاصل کرنے اور گناہوں سے پاک ہونے کی خاطر آئے ہیں اس کا اندازہ بہت مشکل ہے کہ اس طرح کی عقیدت سے کس حد تک روحانی فیض ہوتا ہے۔

میں رات بھر اسی ادھیڑ بن میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں سوچتا تھا کہ اس ریکاری کی فضا میں بعض بچے دیندار بھی ہیں۔ یہ تو خدا کی عدالت میں بے گناہ ٹھہریں گے۔ اگر ہردوار کی جاترہ بجائے خود گناہ ہے تو مجھے چاہئے کہ کھلم کھلا اس کی مخالفت روں اور کبنتھ کے دن ہردوار سے چلا جاؤں۔ اگر ایسا نہیں ہے تب بھی مجھے اس پاپ کے کنارے میں جو یہاں پھیلا ہوا کہ کسی قسم کی ریاضت کر کے تزکیہ نفس کر ڈالنا چاہیے۔ میرے دل میں یہ خیال آنا قدرتی بات تھی۔ میری زندگی کی بنیاد ہی ضبط نفس اور ریاضت پر ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ میں نے کلکتہ اور رنگون میں اپنے میزبانوں کو بے حد زحمت دی تھی۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو پھل وغیرہ میں کھاتا ہوں اس کی قسمیں محدود کر دوں اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے ہی کھا لیا کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو آئندہ بھی میرے میزبانوں کو اسی طرح زحمت ہوا کرے گی اور میں بجائے ان کی خدمت کرنے کے ان سے خدمت لیا کروں گا۔ اس لیے میں نے عہد کر لیا کہ جب تک ہندوستان میں ہوں کبھی چوبیس گھنٹے کے اندر پانچ چیزوں سے زیادہ نہیں کھاؤں گا اور اندھیرا ہو جانے کے بعد کچھ نہ کھایا کروں گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس میں بڑی مشکلیں پیش

آ ئیں گی۔ مگر میں چاہتا تھا کہ یہ عہد ایسا ہو جس میں نفس لئیم کو بہانے ڈھونڈ ھنے کی گنجائش نہ رہے۔ میں نے اس پر غور کیا کہ اگر بیماری کے زمانے میں دوا پانچ چیزوں میں سے ایک شمار کی ہمارے اور ڈاکٹر جو خاص غذا تجویز کرے اسے بھی گن کیا جائے تو کیسے کام چلے گا۔ مگر آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو کھانے پینے کی کل تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

ان دونوں باتوں کا عہد کیے آج تیرہ سال ہو گئے۔ میرے لیے یہ بڑا سخت امتحان تھا مگر اس کی بدولت میری زندگی میں چند سال بڑھ گئے اور میں بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہا۔

............☆☆............

لکشمن جھولا

گر دکل جا کر مہاتما منشی رام جلیسے پلیتن کو دیکھنے سے طبیعت کو بڑا سکون ہوا۔ کہاں ہر دوار کا شوروغل اور کہاں گر دکل کی خاموشی! مجھے فوراً یہ خوش گوار فرق محسوس ہوا۔

مہاتما مجھ سے بڑی محنت سے پیش آئے۔ برہمچاریوں نے دل کھول کر خاطر مدارت کی۔ یہاں مجھے پہلی بار اچاریہ رامد یو جی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ان کی شخصیت میں بڑی قوت ہے۔ ہم دونوں میں بہت سے معاملات میں اختلاف رائے تھے۔ مگر بہت جلد آپس میں دوستی ہو گئی۔

مجھ سے اچارہ رامد یو جی اور گر دکل کے دوسرے پروفیسروں سے بڑی بحث ہوا کرتی تھی کہ گر دکل میں دستکاری کی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں۔ جب جانے کا وقت آیا تو مجھے یہاں سے رخصت ہونے کا بہت قلق ہوا۔

میں نے ''لکشمن جھولے'' 49 کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہ ہرش کیش کے قریب ہے۔ بہت سے دوستوں نے اصرار کیا کہ ہر دوار سے رخصت ہونے سے پہلے اس پل کو ضرور دیکھ کر لو۔ میں اس جاتر اپر پیدل جانا چاہتا تھا اس لیے بیچ میں ایک منزل کر کے دوسرے دن وہاں پہنچا۔

ہرش کیش میں بہت سے ستیاسی مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے ایک مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ فنیکس والوں کی جماعت وہاں موجود تھی انہیں دیکھ کر سوامی جی نے بہت سے سوالات کیے۔

میری ان سے کئی بار مذہب کے متعلق باتیں ہوئیں۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میرا مذہبی احساس بہت گہرا ہے۔ میں گنگا سے نہا کر ننگے سر صرف ایک دھوتی باندھے واپس آ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ میرے سر پر چوٹی اور گلے میں جنیو نہیں ہے تو انہیں بہت رنج ہوا اور وہ کہنے لگے۔

''مجھے بڑا دکھ ہے کہ تم ایسے پکے ہندو ہو کر نہ چوٹی رکھتے ہو نہ جنیو باندھتے ہو۔ یہی دونوں ہندو دھرم کی ظاہری علامتیں ہیں اور کسی ہندو کو ان سے خالی نہ ہونا چاہیے۔''

میں نے ان دونوں چیزوں کو ایک وجہ سے چھوڑا تھا۔ مناسب ہے کہ یہ قصہ بیان کر دوں۔ جب میں دس برس کا چھوکرا تھا تو برہمنوں کے لڑکوں کو گلے میں جنیو ڈالے اور ان میں بندھ کنجیاں کھنکھناتے دیکھ کر مجھے بڑا رشک آتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔ اس زمانے میں کاٹھیاوار کے ویش خاندانوں میں جنیو پہننے کا رواج عام نہ تھا مگر یہ تحریک نئی نئی اٹھی تھی کہ ہر برہمن، چھتری اور ویش کے لیے اس کا پہننا لازمی کر دیا جائے۔ چنانچہ گاندھی خاندان کے کئی شخص گلے میں جنیو ڈالتے تھے۔ کچھ دن بعد جو برہمن ہم دو تین لڑکوں کو رام رکشا سکھایا کرتا تھا، اس نے ہمیں جنیو پہنائے اور اگر چہ مجھے کنجیوں سے کوئی کام نہیں پڑتا تھا مگر میں نے خواہ مخواہ ایک گچھا لے کر اپنے جنیو میں باندھ ہی لیا۔ آگے چل کر یہ دھاگا ٹوٹ گیا۔ یاد نہیں کہ مجھے اس کا کچھ زیادہ افسوس ہوا یا نہیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ میں نے دوبارہ جنیو نہیں پہنا۔

جب میں بڑا ہو گیا تو ہندوستان میں اور جنوبی افریقہ میں بارہا یہ کوشش کی گئی کہ میں اس مقدس رشتے کو گلے میں ڈال لوں مگر میں نے قبول نہ کیا۔ میں دل میں کہتا

تھا کہ اگر شودر لوگ اسے نہیں پہن سکتے تو دوسری ذاتوں کو اس کے پہننے کا کیا حق ہے ؟ اور یوں بھی ایک فضول رسم کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا تھا مگر یہ کہتا تھا کہ آخر مجھے اس کے پہننے کی ضرورت کیا ہے؟

وشنو ہونے کی حیثیت سے میں گلے میں کنٹھی پہنتا تھا اور سر پر چوٹی رکھتا تھا کیونکہ میرے بزرگ اسے ضروری سمجھتے تھے۔ انگلستان جاتے وقت میں نے چوٹی کٹوا دی کہ کہیں ایسا نہ ہو لوگ مجھے ننگے سر دیکھ کر میرا مذاق اڑائیں اور انگریز مجھے وحشی سمجھیں۔ اس زمانے میں اس سے ڈرتا تھا۔ میری اس بزدلی کی انتہا یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں میں نے چھگن لال کو جو مذہبی فرض سمجھ کر چوٹی رکھتے تھے اور اس پر مجبور کیا کہ اسے کٹوا دیں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ یہ ان کی قومی خدمت کی راہ میں حائل ہو گی اس لیے میں نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ انہیں صدمہ ہو گا۔

غرض میں نے یہ سارا حال سوامی جی سے صاف صاف بیان کر دیا اور کہا کہ ”میں جنیؤ نہیں پہنوں گا۔“ کیونکہ جب کروڑوں آدمی اس کے بغیر ہندو رہ سکتے ہیں تو مجھے اس کی کون سی ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ یہ مقدس رشتہ روحانی تجدید اور اصلاح کی علامت ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ پہننے والا برتر اور پاکیزہ تر زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں آج کل ہندوستان کی اور ہندو دھرم کی جو حالت ہے اس کے لحاظ سے ہندوؤں کو اس معنی خیز علامت کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ یہ حق اس وقت حاصل ہو گا جب ہندو دھرم چھوت چھات کے عقیدے سے پاک ہو جائے۔ اس میں ادنی اور اعلیٰ کا فرق نہ رہے اور دوسری برائیاں اور ریاکاریاں جو اس میں داخل ہو گئی ہیں دور ہو جائیں۔ اس لیے میری طبیعت جنیؤ پہننے سے کراہت کرتی ہے۔ مگر آپ چوٹی کے متعلق جو فرماتے ہیں میں

اس پر غور کروں گا۔ میں نے پہلے چوٹی رکھی تھی۔ مگر جھوٹی شرم کے سبب سے کٹوا دی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے پھر سے رکھ لینی چاہیے۔ میں اپنے رفیقوں سے اس بارے میں مشورہ کروں گا۔''

سوامی جی کو میری رائے جنیو کے بارے میں پسند نہیں آئی۔ میں نے جو دلیلیں اس کے ترک کرنے کی بتائیں سوامی جی کے نزدیک ان ہی سے اس کے پہننے کی تائید ہوتی تھی۔ مگر میں آج تک اسی خیال پر قائم ہوں جو میں نے ہرش کیش میں ظاہر کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب تک دنیا میں مختلف مذہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی ظاہری علامت کی ضرورت ہے جو اسے دوسرے مذہبوں سے ممتاز کرے لیکن جب لوگ اس کی پرستش کرنے لگیں اور اس کے ذریعے سے اپنے مذہب کی فوقیت جتائیں تو اس کا ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ میرے نزدیک آج کل جنیو سے ہندو دھرم کی روحانی ترقی نہیں ہو سکتی اس لیے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

البتہ چوٹی میں نے بزدلی سے کٹوائی تھی اس لیے دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اسے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

مگر میں تو لکشمن جھولے کا ذکر کر رہا تھا۔ ہرش کیش اور لکشمن جھولے کے آس پاس کے قدرتی مناظر نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے بزرگ حسن فطرت کا کیسا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور کتنے عاقبت اندیش تھے کہ انہوں نے فطرت کے خوشنما مظاہر کو مذہبی حیثیت بخشی اور میرا دل ان بزرگوں کی عقیدت سے معمور ہو گیا۔

لیکن لوگوں نے ان حسین مناظر کی جو گت بنا رکھی ہے انہیں دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ ہردوار کی طرح ہرش کیش میں بھی لوگوں نے سڑکوں پر اور گنگا کے خوشنما

کناروں پر گندگی پھیلا رکھی تھی۔ لوگوں کا عام شاہراہوں پر اور دریا کے کنارے رفع حاجت کرتے دیکھنا میرے لیے بڑا دل خراش منظر تھا۔

خود لکشمن جھولے کو جا کر دیکھا تو لوہے کا معمولی آوازایں پل تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ پہلے یہاں رسیوں کا خوب صورت پل بندھا ہوا تھا۔ ایک مخیّر مارواڑی کے جی میں یہ سما گئی کہ رسیوں کے پل کو توڑ کر لوہے کا پل بنانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے بہت کچھ خرچ کر کے یہ پل بنوا دیا اور اس کی کنجیاں حکومت کے حوالے کر دیں۔ میں نے رسیوں کا پل تو دیکھا نہیں اس لیے اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لوہے کا پل یہاں بالکل بے تکا معلوم ہوتا ہے اور اس نے اس خوش نما منظر کی خوب صورتی کو غارت کر دیا ہے اور جاتریوں کے پل کی کنجیاں حکومت کو دے دینا مجھے اس وقت بھی جب میں سرکار کا وفادار تھا بہت برا معلوم ہوا۔

پل کو عبور کر کے سورگا شرم پہنچا۔ یہ ایک چھوٹی سی بدنما بستی ہے۔ جس میں لوہے کی چادروں کے چند سائبان بنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ سادھوؤں (طالبانِ معرفت) کی کٹیاں ہیں۔ اس وقت تو یہ خالی نظر آتی تھیں۔ بڑی عمارت میں چند لوگ تھے جنہیں دیکھ کر میرے دل پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔

مگر ہردوار کے تجربے میرے لیے بڑے قیمتی ثابت ہوئے۔ ان سے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی مدد ملی کہ مجھے کہاں رہنا چاہیے۔

☆☆

آشرم کی بناء

یہ میرا اڑیہ دون کا دوسرا سفر تھا۔

ستیا گرہ آشرم 25 مئی 1915ء کو قائم ہوا۔ شردھانند جی چاہتے تھے۔ کہ میں ہردوار میں سکونت اختیار کرلوں۔ کلکتہ کے بعض احباب نے میرے لیے دویاناتھ دھام تجویز کیا تھا اور دوستوں کا اصرار تھا کہ راجکوٹ میں رہو۔ مگر احمد آباد سے گزرتے وقت وہاں کے لوگ پیچھے پڑ گئے کہ یہیں بس جاؤں اور انہوں نے ہم لوگوں کے لیے ایک مکان اور آشرم کے کل مصارف دینے کا وعدہ لیا۔

میں احمد آباد ہی کو ترجیح دیتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ گجرات میرا وطن ہے یہاں رہ کر گجراتی زبان کے ذریعہ میں ملک کی بڑی خدمت کرسکتا ہوں۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ احمد آباد پارچہ بافی کا قدیم مرکز ہے یہاں چرخہ کا کام بہت اچھا چلے گا اور گجرات کا صدر مقام ہونے کے سبب یہاں مالی امداد بھی دوسری جگہ سے زیادہ ملے گی۔

احمد آباد کے دوستوں سے منجملہ اور باتوں کے اچھوتوں کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا اچھوت ملے گا جو ہر لحاظ سے بھلا آدمی ہو تو میں سے فوراً آشرم میں داخل کرلوں گا۔

ایک ویشنو دوست نے خود پسندی کے انداز میں کہا ''ایسے اچھوت آپ کو مل چکے۔''

آخر میں میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آشرم احمد آباد میں قائم کروں۔ مکان کے

معاملے میں احمد آباد کے ایک بیرسٹر جیون لال جی ڈیسائی سے بڑی مدد ملی۔ انہیں نے ہمیں کوچرب میں اپنا بنگلہ کرائے پر دے دیا۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آشرم کا نام کیا ہو۔ میں نے اپنے دوستوں سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ کئی نام تجویز کیے گئے جن میں ''سیوا شرم'' (دار الخدمت) ار چودن (دار الریاضت) بھی تھے۔ مجھے ''سیوا شرم'' پسند آیا لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ خدمت کا طریقہ کیا ہو گا۔ چودن کے لفظ میں دعوت اوراوں کی جھلک تھی۔ ہمیں ریاضت دل سے پسند تھی مگر مرتاض ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہم حق کے پرستار ہیں اور ہمارا کام حق کی تلاش اور حق کی پیروی ہے۔ ہماری پیش نظر یہ ہے کہ ستیا گرہ کی تحریک کو جو جنوبی افریقہ میں آزمائی جا چکی ہے ہندوستان میں چلا کر دیکھیں۔ اس لیے ہمیں اپنے آشرم کا نام ستیا گرہ آشرم رکھنا چاہیے۔ جس سے ہمارے مقصد اور طرز عمل دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ میرے دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اس لیے یہی نام رکھا گیا۔

اب آشرم کے لیے ایک دستور العمل کی ضرورت تھی۔ اس کا مسودہ تیار ہوا اور دوستوں کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیجا گیا۔ جتنی لوگوں نے رائے دیں اور ان میں سے مجھے گر گروداس بز جی کی رائے اب تک یاد ہے۔ انہوں ے سب قواعد ضوابط کو پسند کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ آشرم والوں سے علاوہ اور باتوں کے کسر نفس کا عہد لیا جائے کیونکہ آج کل کے نوجوانوں میں اس کی بڑی کمی ہے۔ مجھے بھی اس کمی کا احساس تھا لیکن میرا خیال تھا کہ کسر نفس کا عہد کر لیا جائے تو وہ کسر نفس نہیں رہتا۔ کسر نفس ترک خودی کا نام ہے اور ترک خودی دراصل موکشا (نجات) ہے۔ یہ کوئی عمل نہیں ہے بلکہ وہ مقدر ہے جس کے لیے اور اعمال کیے جاتے ہیں۔ اگر خدمت یا

نجات کا طالب کسرِ نفس سے محروم ہے تو اس کی طلب جھوٹی ہے۔بغیر کسرِ نفس کی خدمت خود غرضی بن جاتی ہے۔

ان دنوں ہمارے جماعت میں تیرہ تاملی تھے۔پانچ نوجوان تاملی جنوبی افریقہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور باقی آٹھ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ کر شامل ہو گئے تھے۔سب ملا کر ہم پچیس نفوس تھے جن میں چند عورتیں بھی تھیں۔

یہ تھی آشرم کی ابتداء۔ہم سب اکٹھا کھانا کھاتے تھے۔اور عزیزوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔

مشکل نیست کہ آساں نہ شودی

ابھی آشرم کو قائم ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ میں ایک بڑا سخت امتحان پیش آیا۔ میرے پاس امرت لال ٹھکر کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا ''اچھوتوں کا ایک غریب اور دیانت دار خاندان آپ کے آشرم میں آنا چاہتا ہے۔ کیا آپ اسے آشرم میں داخل کرنے کو تیار ہیں؟''

مجھے ذرا تردد ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اچھوتوں کا خاندان کا خاندان ٹھکر باپا جیسے شخص کی سفارش لے کر آشرم میں داخل ہونے کے لیے آئے گا۔ میں نے اپنے رفیقوں کو یہ خط پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے اس تجویز کو دل سے پسند کیا۔

میں نے امرت لال جی کو لکھا کہ ہم ان لوگوں کو داخل کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ انہیں آشرم کے ضابطوں کی پابندی میں کوئی عذر نہ ہو۔

یہ خاندان تین نفوس پر مشتمل تھا۔ دوادا بھائی ان کی بیوی دانی بین اور ان کی بچی لکشمی جوان دنوں گھٹنیوں چلتی تھی۔ دوادا بھائی بمبئی میں معلم تھے۔ ان تینوں نے ضابطوں کی پابندی منظور کر لی اور یہ آشرم میں داخل کر لیے گئے۔

ان کے داخلے سے آشرم کے سرپرستوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ پہلی مشکل پیش آئی کہ بنگلے کا کنواں مالک کی نگرانی میں تھا۔ ان کے نوکر نے ہمیں پانی بھرنے سے روکا۔ ہمارے ڈول کے چھینٹوں سے اسے اپنے چرس کے ناپاک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے وہ ہمیں گالیاں دیتا تھا۔ اور دوادا بھائی کو دق کرتا تھا۔ میں نے سب

لوگوں سے کہا کہ گالیاں سنو۔ سب کچھ سہو مگر پانی ضرور بھرو۔ اس شخص نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ چپ چاپ سن لیتے ہیں تو اسے شرم آئی اور اس نے ہمیں ستانا چھوڑ دیا۔

مگر ہمیں جو مالی امداد ملتی تھی بند ہوگئی۔ جس دوست نے کہا تھا کہ اچھوتوں میں کوئی شخص آشرم میں داخل ہونے کے قابل نہیں مل سکتا اسے کیا معلوم تھا کہ ایسے لوگ نکل آئیں گے۔

ادھر امداد بند ہوئی اور ادھر یہ افواہیں سننے میں آئیں کہ ہم لوگ ذات باہر کر دیئے جائیں گے۔ میں نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم احمد آباد چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جائیں گے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے۔

یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن مگن لال گاندھی نے مجھے اطلاع دی ''ہمارا سرمایہ ختم ہوگیا اگلے مہینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

میں نے اطمینان سے جواب دیا ''تو ہم اچھوتوں کے محلے میں اٹھ چلیں گے۔''

اس معاملہ میں یہ میرا پہلا امتحان نہیں تھا جب کبھی ایسا موقعہ آیا خدا نے عین وقت پر میری مدد کی۔ میری اور مگن لال کی گفتگو کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز صبح کو ایک بچے نے آ کر کہا کہ ایک سیٹھ موٹر میں بیٹھ کر آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو لینے کے لیے گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ ''میں آشرم کی مدد کروں تو آپ قبول کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی خوشی سے، سچ پوچھیے تو میں آج کل بالکل خالی ہاتھ ہوں۔''

سیٹھ بولے۔ ''میں کل اسی وقت یہاں آؤں۔ کیا آپ یہاں ہوں گے؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔'' سیٹھ چلے گئے۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت موٹر ہمارے گھر کے سامنے رکی۔ بچوں نے مجھے آکر خبر کر دی۔ سیٹھ اندر نہیں آئے بلکہ انہوں نے مجھے باہر بلا لیا۔ انہوں نے تیرہ ہزار روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں دیئے اور رخصت ہو گئے۔

یہ مدد بالکل خلاف توقع تھی اور اس کے ملنے کا طریقہ بھی نیا تھا۔ یہ سیٹھ اس سے پہلے کبھی آشرم میں نہیں آئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ان سے صرف ایک بار ملا تھا۔ انہوں نے کچھ نہ دیکھا بھالا نہ پوچھا گچھا۔ بس روپیہ دیا اور چلے دیئے۔ ایسا تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس مدد کے مل جانے سے ہم نے اچھوتوں کے محلّہ میں اٹھ جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب ہمیں ایک سال کے لیے اطمینان ہو گیا۔

مگر اچھوتوں کے آنے سے خود آشرم کے اندر خلفشار برپا تھا۔ گو جنوبی افریقہ میں اچھوت میرے گھر آکر رہا کرتے تھے اور میرے ساتھ کھاتے پیتے تھے مگر میری بیوی کو اور دوسری عورتوں کو اچھوتوں کا آشرم میں رکھا جانا پسند نہیں آیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ لوگ دانی بین کے ساتھ مخالفت یا کم سے کم بے رخی کا برتاؤ کرتی ہیں۔ مالی مشکلات سے مجھے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی مگر گھر کے اندر یہ حالت دیکھنا مجھ پر بہت شاق تھا۔ دانی بین ایک معمولی عورت تھی۔ دوادا بھائی کی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی مگر سمجھ اچھی تھی۔ مجھے ان کا صبر بہت پسند آیا۔ کبھی کبھی انہیں غصہ آجاتا تھا مگر عموماً تحمل سے کام لیتے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں حقارت اور دل آزادی کا برتاؤ ہو تو چپ چاپ سہہ لینا چاہیے۔ انہوں نے اسے مان لیا اور اپنی بیوی کو بھی اس پر آمادہ کر لیا۔

اس خاندان کا داخلہ آشرم والوں کے لیے بڑا مفید سبق تھا۔ ہم نے شروع ہی

سے اس بات کا اعلان کر دیا کہ آشرم میں چھوت چھات کا جھگڑا نہیں رہے گا۔ اس لیے ہمارے سرپرستوں کو کوئی غلط فہمی نہیں رہی اور ہمیں اس معاملے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی آشرم کی مدد زیادہ تر راسخ الاعتقاد ہندوؤں نے کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھوت کے عقیدے کی بنیادیں تک ہل گئی ہیں۔ اس کے اور بھی بہت سے ثبوت ہیں مگر یہی کیا کم ہے کہ پکے ہندوؤں کو ایک ایسے آشرم کی مدد کرنے میں جہاں ہم لوگ اچھوتوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں ذرا بھی باک نہیں۔

اس اور بہت سی باتیں ہیں جو تلاش حق کی داستان سے تعلق رکھتی ہیں مگر افسوس ہے کہ میں انہیں نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔ آئندہ ابواب میں بھی یہی کوتاہ قلمی نظر آئے گی۔ مجھے بہت سی اہم تفصیلات ترک کرنا پڑیں گی کیونکہ اس ڈرامے کے اکثر اشخاص ابھی زندہ ہیں اور ایسے معاملوں میں جو ان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں بغیر اجازت کے ان کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور ان سے اجازت لینا یا وہ حصے جن میں ان کا ذکر ہے ان کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیجنا بڑا بکھیڑا ہے۔ پھر یہ طریقہ اس آپ بیتی کے لیے مناسب بھی نہیں۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ بقیہ داستان میں جو میرے خیال میں طالبان حق کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے بہت کچھ کتر بیونت کرنا پڑے گی۔ پھر بھی انشاء اللہ میں ترک موالات کے زمانے تک کے خاص خاص واقعات بیان کروں گا۔

............☆☆............

''پابند مزدوری'' کی موقوفی

ہم تھوڑی دیر کے لیے آشرم سے جسے ابتدا ہی میں اندرونی اور بیرونی طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا رخصت ہوتے ہیں اور ایک معاملے کا ذکر کرتے ہیں جس کی طرف مجھے توجہ کرنا پڑی۔

''پابند مزدور'' وہ کہلاتے تھے جو ہندوستان سے ترک وطن کرکے پانچ سال کی مزدوری کے معاہدے پر جنوبی افریقہ جاتے تھے۔ 1914ء کے اسمٹس، گاندھی معاہدے کی رو سے نٹال میں داخل ہونے والے ''پابند مزدوروں'' کو تین پونڈ کا ٹیکس معاف کردیا تھا لیکن ہندوستان سے مزدوروں کے جانے کے مسئلہ پر ابھی غور کرنا باقی تھا۔

مارچ 1916ء میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے مرکزی مجلس وضع قوانین میں پابند مزدوری کو منسوخ کرنے کی تحریک پیش کی۔ اس تحریک کو قبول کرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے وعدہ کیا ہے کہ یہ طریقہ کچھ عرصہ کے بعد موقوف کردیا جائے گا۔ مگر میرا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو ایسے غیر معین وعدے سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ فوری منسوخی کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ یہ محض ہمارے ملک کی غفلت تھی کہ وہ اس جبر کو برداشت کرتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر اب بھی سارے ملک میں اس کے خلاف احتجاج کا شور بلند ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ میں نے چند لیڈروں سے ملاقات کی۔ اخبارات میں مضمون لکھے اور یہ اندازہ کرلیا کہ عام رائے سختی کے ساتھ اس کی فوری منسوخی کی حمایت میں ہے۔ اب

یہ سوال تھا کہ کیا یہ ایسی چیز ہے جس کے لیے ستیا گرہ کی جائے۔ مجھے ستیا گرہ کے ضروری ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا طریقہ کیا ہو۔

اس اثناء میں وائسرائے نے صاف صاف کہہ دیا کہ ''کچھ عرصہ کے بعد منسوخی'' کے معنی ہیں۔

''اتنے دن کے بعد کہ آجروں کو کوئی دوسرا انتظام کرنے کی مہلت مل جائے۔''

فروری 1917ء میں پنڈت مالوی جی نے پابند مزدوری کی فوری منسوخی کے لیے ایک مسودہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ لارڈ چمسفورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ وقت آ گیا کہ میں سارے ہندوستان میں احتجاج کا شور برپا کرانے کے لیے دورہ کروں۔

مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے وائسرائے سے مل لوں۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جو فوراً منظور ہو گئی۔ مسٹر میفی (جواب سر جان سیفی کہلاتے ہیں) ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ مجھے ان سے اکثر ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لارڈ چمسفورڈ سے جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان تھی۔ انہوں نے کوئی صریح بات تو نہیں کہی مگر یہ کہا کہ میں مدد کروں گا۔

میں نے اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ مسٹر جہانگیر پٹیٹ نے امپیریل شٹرنشپ ایسوسی ایشن (انجمن شہریان سلطنت برطانیہ) کی طرف سے جلسہ کرانے کا وعدہ کیا۔ پہلے انجمن کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا کہ جلسہ عام میں پیش کرنے کے لیے ریزولوشن ترتیب دے۔ اجلاس میں ڈاکٹر اسٹینلے ریڈ، للو بھائی ساملداس (جواب سر ہو گئے ہیں) ہنترنجن جی اور سٹر پٹیٹ موجود تھے۔ بحث اس بات پر تھی کہ حکومت کو منسوخی کے لیے کتنا وقت دیا جائے۔ تین تجویزیں پیش تھی۔ ایک میں ''جلد سے

جلد'' دوسری میں '' 31 جولائی تک'' اور تیسری میں ''فوری'' منسوخی کا مطالبہ تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی تاریخ مقرر کر دی جائے تا کہ اگر حکومت اس وقت تک ہماری درخواست پوری نہ کرے تو ہم اپنے آئندہ طرز عمل کے متعلق فیصلہ کرسکیں۔ للو بھائی ''فوری منسوخی'' کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک اکتیس جولائی تک کی مہلت زیادہ تھی۔ میں نے کہا کہ لوگ فوری کا مفہوم نہیں سمجھیں گے اگر ہم ان سے کچھ عملی کام کرانا چاہتے ہیں تو تاریخ کی صراحت کر دینا چاہیے۔ فوری کی تاویل ہر فریق اپنے طور پر کرسکتا ہے مگر 31 جولائی میں کسی طرح کے شبے کی گنجائش نہیں۔ اگر اس وقت تک کوئی کارروائی نہ ہوئی تو ہم اور تدبیریں اختیار کرسکیں گے۔ ڈاکٹر ریڈی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور آخر میں للو بھائی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ ہم نے یہی طے کیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ 31 جولائی تک منسوخی کا اعلان کر دے۔ جلسہ عام میں اس مضمون کا ریزولوشن پاس ہو گیا اور سارے ہندوستان میں اس کی تائید میں جلسے کیے گئے۔

مسز جے جی پیٹٹ نے انتہائی سرگرمی اور مستعدی سے کام لے کر خواتین کا ایک وفد ترتیب دیا اور اسے وائسرائے کی خدمت لے گئیں۔ بمبئی سے جو خواتین گئی تھیں ان میں سے مجھے لیڈی ٹاٹا اور دلشاد بیگم صاحبہ کے نام یاد ہیں۔ یہ وفد بہت کامیاب رہا۔ وائسرائے نے ہمت افزا جواب دیا۔

میں نے کراچی، کلکتہ اور بہت سے اور شہروں کا دورہ کیا۔ ہر مقام پر شاندار جلسے ہوئے اور بے انتہا جوش کا اظہار کیا گیا۔ مجھے اس تحریک کو شروع کرتے وقت اتنی کامیابی کی توقع نہ تھی۔

ان دنوں میں تنہا سفر کرتا تھا اس لیے مجھے بڑے دلچسپ تجربے ہوا کرتے تھے۔

خفیہ پولیس والے ہمیشہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔مگر میری بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔اس لیے نہ وہ مجھے ستاتے تھے اور نہ میں ان سے تعرض کرتا تھا۔خوش قسمتی سے ان وقت تک میرے نام کے ساتھ ''مہاتما'' کا دم چھلا نہیں لگا تھا۔اگر چہ بعض مقامات پر جہاں لوگ مجھ سے واقف تھے اس لقب کے نعرے لگائے جاتے تھے۔

ایک بار خفیہ پولیس والوں نے مجھے کئی اسٹیشنوں پر آکر پریشان کیا۔میرا نام پوچھتے اور ٹکٹ کا نمبر لکھتے تھے۔ظاہر ہے کہ میں بڑی خوشی سے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔میرے ہم سفر مجھے یہ سمجھتے تھے۔کہ یہ کوئی سادھو یا فقیر ہے۔انہیں یہ دیکھ کر کہ خفیہ پولیس والے مجھے ہر اسٹیشن پر دق کرتے ہیں، غصہ آگیا اور انہوں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔انہوں نے کہا ''اس غریب سادھو کو ناحق کیوں ستاتے ہو۔'' اور مجھ سے کہنے لگے۔''تم ہرگز ان بدمعاشوں کو ٹکٹ نہ دکھاؤ۔''

میں نے نرمی سے کہا ''ٹکٹ دکھانے میں میرا کیا حرج ہے؟ یہ بیچارے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں'' مسافروں کو اس سے اطمینان نہیں ہوا۔انہوں نے مجھ سے اور زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ کیسا اندھیر ہے کہ لوگ بے گناہوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔

مجھے خفیہ پولیس والوں کے سبب کوئی تکلیف نہیں تھی۔البتہ تیسرے درجے کے سفر میں بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔سب سے زیادہ تلخ تجربہ مجھے لاہور سے دہلی تک کے سفر میں ہوا۔میں کراچی سے کلکتہ جا رہا تھا اور لاہور میں گاڑی بدلنا تھی۔ دہلی کی گاڑی میں مجھے کسی طرح جگہ نہیں ملتی تھی۔جن ڈبوں کے دروازے بند تھے ان میں لوگ کھڑکیوں سے چڑھ جاتے تھے۔مجھے جلسے کی تاریخ پر کلکتہ پہنچنا تھا۔اور اس گاڑی سے نہ جاؤں تو وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔میں جگہ ملنے سے قریب قریب

مایوس ہو گیا تھا۔ لوگ مجھے کہیں دھنسنے نہیں دیتے تھے۔ ایک قلی نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھ سے کہا ''مجھے بارہ آنہ دو تو میں جگہ دلوا دوں۔'' میں نے کہا ''اچھا، اگر مجھے بٹھا دو تو میں بارہ آنے دے دوں گا'' تو نوجوان قلی گاڑی گاڑی پھر کر مسافروں کی خوشامد کرنے لگا مگر وہاں کون سنتا تھا۔ گاڑی چھوٹنے والی تھی کہ ایک ڈبے کے مسافروں نے کہا جگہ تو یہاں بالکل نہیں مگر تم سے ہو سکے تو اسے اندر دھکیل دو۔ کھڑے چلا جائے گا، قلی نے مجھ سے پوچھا میں فوراً راضی ہو گیا اور اس نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے دھکیل دیا۔ اس طرح قلی نے مجھے جگہ دلوائی اور اپنے بارہ آنے کھرے کر لیے۔

یہ رات میرے لیے بڑی مصیبت کی رات تھی۔ دوسرے مسافروں نے گھس پیٹھ کر بیٹھنے کی جگہ نکال لی۔ میں دو گھنٹے تک اوپر کی بنچ کی زنجیر تھامے کھڑا رہا۔ اس پر بھی چند مسافر مجھے چین لینے دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے ''بیٹھ کیوں نہیں جاتا؟'' میں نے عذر کیا کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ مگر انہیں اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ اوپر کی بنچ پر مزے میں پیر پھیلائے لیٹے تھے مگر میرا کھڑا رہنا بھی انہیں ناگوار تھا۔ وہ مجھے برابر ڈانٹتے رہے اور میں نرمی سے جواب دیتا رہا۔ آخر وہ بھی نرم پڑ گئے۔ چند لوگوں نے میرا نام پوچھا۔ جب میں نے نام بتایا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے معذرت کی اور سمٹ سمٹا کر میرے لیے بیٹھنے کی جگہ نکالی۔ اس طرح مجھے صبر کا پھل ملا۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا اور مجھے چکر آ رہے تھے۔ خدا نے عین وقت پر میری مدد کی۔

غرض کسی نہ کسی طرح میں دہلی اور وہاں سے کلکتہ پہنچا۔ وہاں میں مہاراجہ قاسم بازار کا مہمان تھا جو جلسے کی صدارت کرنے والے تھے۔ کراچی کی طرح یہاں بھی

بے حد جوش کا اظہار کیا گیا۔ جلسے میں کئی انگریز بھی شریک تھے۔

31 جولائی سے پہلے حکوت نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان سے پابند مزدوروں کا بھیجنا بند کیا جاتا ہے۔

1984ء میں میں نے پابند مزدوری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے پہلی درخواست لکھی تھی اور مجھے اسی زمانے میں پوری امید تھی یہ طلسم جسے سرو۔ و ہنٹر ''نیم غلامی'' کہتے تھے کسی نہ کسی دن ٹوٹ کر رہے گا۔

اس تحریک میں جو 1894ء میں شروع ہوئی تھی بہت سے لوگوں نے مدد دی لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ ستیا گرہ کا امکان نہ ہوتا تو اس طلسم کا خاتمہ اتنی جلدی ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔

جو لوگ اس تحریک کی مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں وہ میری کتاب ''جنوبی افریقہ کی ستیا گرہ کی تاریخ'' کا مطالعہ کریں۔

............☆☆............

نیل کا دھبا

چمپاران جنگ کا ملک ہے۔ جس طرح وہاں آم کے باغوں کی کثرت ہے۔ اسی طرح 1917ء تک نیل کی کاشت پھیلی ہوئی تھی۔ چمپارن کے کاشتکار اس کے پابند تھے کہ اپنی زمین کے بیس حصوں میں سے تین میں زمیندار کے لیے نیل کی کاشت کریں۔ یہ نظام ''تن کھتیا'' کہلاتا تھا۔ ''کتھ'' ایک ایکڑ کے بیسویں حصے کو کہتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو مجھے اس وقت تک یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چمپارن کہاں ہے بلکہ میں نے اس کا نام تک نہیں سنا تھا مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ نیل کے کھیت کیسے ہوتے ہیں۔ میں نے نیل کے بورے ضرور دیکھے تھے مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ چمپارن میں ہزاروں کاشتکاروں پر ظلم کر کے تیار کیے گئے ہیں۔

راجمار شکل ایک کاشتکار تھے جنہوں نے خود اس شکنجے کی اذیت سہی تھی اور ان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اپنے ہزاروں بھائیوں کے داموں سے، جو ان کی طرح تکلیفیں اٹھا رہے ہیں، یہ نیل کا دھبا چھڑائیں۔

میں 1916ء کی کانگریس میں لکھنؤ گیا تھا وہاں راجکمار شکل نے مجھے آن پکڑا اور مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ چمپارن چلو۔ انہوں نے کہا ''وکیل بابو آپ کو ہمارے دکھ درد کا سارا حال بتائیں گے۔'' یہ وکیل بابو برجکشور پرشاد جی تھے جو بہار میں قومی کاموں کے روح رواں ہیں اور جن کی رفاقت کا فخر مجھے چمپارن میں ہوا۔ راجکمار شکل انہیں میرے خیمے میں لے آئے۔ وہ سیاہ الپکے کی اچکن اور پتلون پہنے

تھے پہلی ملاقات میں مجھ پر بابو صاحب کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی وکیل ہیں جو بھولے بھالے کاشتکاروں کو پھانس کر اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے چمپارن کے حالات سنائے اور میں نے حسب معمول یہ جواب دیا۔ ''میں جب تک سارے حالات خود نہ دیکھ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کانگریس میں ریزولوشن ضرور پیش کیجیے مگر مجھے تو مہربانی کر کے ابھی چھوڑ ہی دیجیے۔'' ظاہر ہے کہ راجکمار شکل کانگریس سے بھی مدد چاہتے تھے۔ بابو رجکشور پرشاد نے اہل چمپارن سے ہمدردی کا ریزولوشن پیش کیا وہ اتفاق رائے سے پاس کیا گیا۔

راجکمار شکل کو اس سے خوشی ہوئی مگر ان کا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں خود چمپارن جاؤں اور کسانوں کی مصیبت دیکھوں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اپنے دورے کے سلسلے میں دو ایک دن چمپارن میں بھی آ کر ٹھہروں گا۔ انہوں نے کہا۔ ایک ہی دن کافی ہے آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے کہ کیا حال ہے۔

لکھنؤ سے میں کانپور گیا۔ راجکمار شکل میرے ساتھ ساتھ وہاں بھی پہنچے۔ انہوں نے بڑے اصرار سے کہا۔ ''چمپارن یہاں سے نزدیک ہے۔ مہربانی کر کے ایک دن کے لیے چلے چلئے۔''

میں نے کہا ''اس وقت تو معاف کیجیے مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور آؤں گا۔'' وہاں سے میں آشرم آیا۔ دھن کے پکے راجکمار وہاں بھی پہنچے۔ انہوں نے کہا ''مہربانی کر کے آپ کوئی تاریخ مقرر کر دیجیے۔'' میں نے جواب دیا ''مجھے فلاں تاریخ کو کلکتہ جانا ہے۔ آپ وہاں مجھ سے ملئے گا اور مجھے ساتھ لے چلئے گا۔'' مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کہاں جانا ہے، کیا دیکھنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

میں کلکتہ میں چپن بابو کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ راجکمار پہلے سے براج رہے ہیں غرض اس بے پڑھے لکھے، بھولے بھالے مگر دھن کے پکے کسان نے مجھے گرفتار کر ہی لیا۔

1917ء کے شروع میں ہم کلکتے سے چمپارن روانہ ہوئے ہم دونوں کی وضع ایک سی تھی، دونوں دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کونسی گاڑی میں جانا ہے۔ انہوں نے مجھے لے جا کر ایک گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھا لیا اور صبح کو ہم دونوں پٹنہ پہنچ گئے۔ مجھے پٹنہ جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میرا کوئی دوست یا ملاقاتی وہاں نہیں تھا جس کے یہاں جا کر ٹھہر سکتا۔ میں سمجھتا تھا کہ راجکمار شکل معمولی کسان ہیں تو کیا ہوا پٹنہ میں کچھ لوگوں سے ان کی جان پہچان ضرور ہو گی۔ راہ میں مجھے ان کی طبیعت کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہوا اور پٹنہ پہنچ کر جو کچھ غلط فہمی تھی دور ہو گئی۔ بے چارے بالکل سادہ لوح تھے۔ جن وکیلوں کو وہ اپنا دوست سمجھتے تھے وہ ان غریبوں سے نوکروں کا سا برتاؤں کرتے تھے۔ کہاں وکیل صاحب اور کسان موکل کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔

راجکمار مجھے راجندر بابو کے گھر لے گئے وہ پوری یا کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے۔ گھر میں دو نوکر تھے جنہوں نے ہماری بات تک نہیں پوچھی۔ میرے پاس تھوڑا بہت کھانے کا سامان موجود تھا۔ مجھے کھجوروں کی ضرورت تھی جو میرے دوست نے بازار سے لا دیں۔

بہار میں چھوت چھات کا بڑا زور تھا۔ راجندر بابو کے نوکر اس کے روادار نہیں تھے کہ جس وقت وہ کنویں کے پاس موجود ہوں میں پانی بھروں۔ انہیں میری ذات معلوم نہیں تھی اس لیے احتیاط کرتے تھے کہ کہیں میرے ڈول کے چھینٹے ان کے جسم

کو ناپاک نہ کر دیں۔ مجھے قضائے حاجت کی ضرورت ہوئی۔ راجکمار نے مجھے اندر کا پاخانہ بتایا مگر ایک نوکر نے فوراً باہر کے پاخانے کی طرف اشارہ کیا۔ میں ان باتوں کا عادی تھا اس لیے مجھے نہ تعجب ہوا اور نہ برا معلوم ہوا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں اپنا فرض ادا کر رہے تھے اور راجندر بابو کی منشاء کے مطابق عمل کر رہے تھے۔

ان دلچسپ تجربوں سے جہاں مجھے راجکمار شکل کی سادہ لوحی کا اندازہ ہوا وہاں میرے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی مگر یہ میں نے سمجھ لیا کہ ان کی رہنمائی سے کام نہیں چلے گا اب مجھے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔

............☆☆............

بہاریوں کی شرافت اور نیک دلی

میری مولانا مظہر الحق سے اس زمانے کی ملاقات تھی جب وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد 1915ء میں جس سال وہ مسلم لیگ کے صدر تھے، بمبئی کی کانگریس میں انہوں نے اس ملاقات کی تجدید کی اور مجھے دعوت دی کہ جب پٹنہ آؤ تو میرے گھر ٹھہرنا۔ اس وقت مجھے وہ دعوت یاد آئی اور میں نے انہیں ایک رقعہ بھیجا جس میں یہ بھی لکھ دیا کہ میں چمپارن جانے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ وہ فوراً اپنی موٹر کار میں پہنچے اور بڑا اصرار کرنے لگے کہ میرے یہاں چل کر ٹھہرو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ مجھے سب سے پہلے گاڑی میں جو چمپارن جاتی ہو بٹھا دیں کیونکہ میرے جیسے اجنبی کو ریل کے ٹائم ٹیبل سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ انہوں نے راجکمار شکل سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز کی کہ پہلے مظفر پور جاؤ۔ شام کو انہوں نے مجھے مظفر پور کی گاڑی سے روانہ کر دیا۔

پرنسپل کرپلانی اس زمانے میں مظفر پور میں تھے۔ میں جب حیدر آباد (سندھ) گیا تھا اس وقت سے ان سے ملاقات تھی۔ ڈاکٹر چھونت رام نے مجھ سے ان کی ایثار اور ان کی سادگی کی تعریف کی تھی اور اپنے آشرم کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے مصارف کا انتظام پروفیسر کرپلانی ہی نے کیا ہے۔ وہ پہلے مظفر پور کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے مگر میرے پہنچنے سے کچھ دن پہلے اس عہدے سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ میں نے انہیں تار کے ذریعے سے اپنے آنے کی اطلاع

دے دی تھی اور باوجود یہ کہ گاڑی آدھی رات کو پہنچی وہ طالب علموں کی فوج کی فوج ساتھ لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کا خود کوئی مکان نہیں تھا بلکہ وہ پروفیسر تلکانی کے یہاں رہتے تھے اس لیے مجھے بھی اصل میں ان ہی کا مہمان ہونا پڑا۔ اس زمانے میں ایک گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کا میرے جیسے شخص کو اپنے یہاں ٹھہرانا غیر معمولی معمولی بات تھی۔

پروفیسر کرپلانی نے مجھے بہار کی خصوصا ترہٹ کی کمشنری کی حالت زار بتائی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کام کس قدر مشکل ہے ان کا بہار کے لوگوں سے بہت میل جول تھا۔ انہوں نے ان لوگوں پر میرے آنے کی غرض ظاہر کی۔ صبح کو چند وکیل مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے رام نرمی پرشاد جی کا نام مجھے اب تک یاد ہے کیونکہ ان کے جوش اور خلوص کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے کہا۔ ’’آپ جو کام کرنے کے لیے آئے ہیں وہ یہاں (یعنی پروفیسر تلکانی کے گھر) رہ کر نہیں کر سکتے۔ آپ ہم لوگوں میں کسی کے یہاں اٹھ چلئے۔ گیا بابو یہاں کے مشہور وکیل ہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ ان کے یہاں قیام کیجیے۔ سچ پوچھئے تو ہم گورنمنٹ سے ڈرتے ہیں مگر ہم سے جو کچھ مدد ہو سکے گی کریں گے۔ راجکمار شکل نے آپ سے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں سے اکثر صحیح ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے لیڈر بابو برج کشور اور بابو راجندر پرشاد یہاں موجود نہیں۔ میں نے ان دونوں کو تار دے دیئے ہیں مجھے امید ہے کہ وہ جلد یہاں پہنچ جائیں گے اور ان سے آپ کو یقیناً ہر طرح کی معلومات بہم پہنچیں گی اور بہت کچھ مدد ملے گی۔ اچھا تو اب گیا بابو کے یہاں تشریف لے چلئے۔

یہ ایسی درخواست تھی جسے میں رد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے تھوڑا سا تامل تھا کہ

کہیں گیا بابو کو میری وجہ سے نقصان نہ پہنچ جائے مگر انہوں نے مجھے اطمینان دلایا اور میں ان کے یہاں اٹھ گیا۔ وہ اور ان کے خاندان والے میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔

اس عرصے میں برجلشور بابو دربھنگا سے اور راجندر بابو پوری سے آ گئے۔ اب کی بار برجلشور بابو مجھے اور ہی رنگ میں نظر آئے یہ وہ بابو برجلشور پرشاد نہیں تھے جو مجھے لکھنؤ میں ملے تھے۔ ان کی منکسر مزاجی، سادگی، نیکی اور حسن عقیدت نے جو بہاریوں کے حصے کی چیزیں ہیں، میرے دل کی روحانی مسرت سے مالا مال کر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ بہار کے وکیل ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

تھوڑے ہی دن میں میرے اور اس حلقہ احباب کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ بابو برجلشور نے مجھے سارے واقعات سمجھائے۔ ان کے پاس غریب کسانوں کے مقدمے رہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی دو مقدموں کی کارروائی جاری تھی۔ جب وہ ان مقدموں میں کامیاب ہوتے تو اپنے دل میں یہ سمجھتے کہ میں غریبوں کی مدد کر رہا ہوں حالانکہ وہ ان بے چاروں سے فیس برابر وصول کرتے تھے۔ وکیلوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر ہم فیس نہ لیں تو ہمارا خرچ نہیں چلے گا اور ہم غریبوں کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ بنگال اور بہار کے وکیلوں کی فیس کی شرح سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا ''ہم نے فلاں شخص سے اپنے مقدمے میں رائے لی تھی، اسے دس ہزار روپے دیئے۔'' ہزاروں سے کم کی بات چیت نہ تھی۔

میں نے ان لوگوں کو دوستانہ ملامت کی۔ یہ جھڑکیاں انہیں ناگوار نہیں ہوئیں۔

میں نے کہا ''ان سب واقعات کو سننے کے بعد میری یہ رائے ہے کہ ہمیں مقدمے بازی نہیں کرنی چاہیے اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب کسانوں پر یہ ظلم ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں خوف بیٹھا ہوا ہے تو عدالتیں بیکار ہیں۔ ان کی مدد کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کے دل سے خوف دور کر دیا جائے۔ جب تک بہار میں تنکتھیا کا خاتمہ نہ ہو جائے ہمیں چین نہیں لینا چاہیے۔ میرا قصد یہاں دو دن ٹھہرنے کا تھا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں اس کام میں دو سال لگ جائیں۔ میں تیار ہوں کہ جب تک ضرورت ہو یہاں ٹھہروں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے مگر آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے دیکھا کہ برجکشور بابو بڑی سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ انہوں نے سنجیدگی سے کہا ''ہم سے جہاں تک بنے گا مدد کریں گے مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی۔''

یہ باتیں آدمی رات تک ہوتی رہیں۔

میں نے کہا ''مجھے آپ کی قانونی معلومات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے صرف محرر اور ترجمان چاہئیں۔ ممکن ہے کہ جیل خانے جانے کی نوبت آئے۔ خوشی تو مجھے جب ہوگی کہ آپ اس میں بھی میرا ساتھ دیں مگر میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ آپ کا یہی ایثار کیا کم ہے۔ کہ آپ محرری کا کام کریں اور غیر معین مدت کے لیے اپنے پیشے کو ترک کر دیں۔ مجھے یہاں کی ہندی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اور کیتھی یا اردو کے کاغذات تو پڑھ ہی نہیں سکتا۔ آپ کو ان کا ترجمہ میرے لیے کرنا ہوگا ہم میں اتنی استطاعت نہیں کہ اس کا معاوضہ دیں۔ یہ سارا کام خدمت اور ایثار کی نیت سے مفت ہونا چاہیے۔''

برجلشور بابو میرا مطلب سمجھ گئے انہوں نے باری باری سے مجھ سے اور اپنے رفیقوں سے جرح شروع کی۔ مجھ سے انہوں نے اس قسم کے سوالات کیے۔ آپ کو کتنے دن تک ہماری خدمات کی ضرورت ہے اور کتنے آدمی چاہئیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگ باری باری سے کام کریں؟'' وکیلوں سے انہوں نے پوچھا۔ ''آپ لوگوں میں سے کون کون کام کرنے کے لیے تیار ہیں اور کتنے دن کر سکتے ہیں؟''

اس ساری بحث کے بعد ان لوگوں نے مجھ سے کہا۔ ''ہم میں سے فلاں فلاں شخص آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب تک ضرورت ہو حاضر رہیں گے۔ جیل جانے پر آمادہ ہونا ہمارے لیے بالکل نئی چیز ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہم میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے۔''

............☆☆............

''اہمسا'' کا نظارہ

میرا مقصد یہ تھا کہ چمپارن کے کسانوں کی حالت کا مطالعہ کروں اور یہ معلوم کروں کہ انہیں نیل کی کوٹھی والوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں۔ اس کے لیے ہزاروں کاشتکاروں سے ملنے کی ضرورت تھی مگر یہ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے میں نے کوٹھی والوں کے خیالات سے واقف ہونا اور اس وقت کے کمشنر سے ملنا ضروری سمجھا چنانچہ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے سیکرٹری اور ترہٹ کمشنر سے ملاقات کی درخواست کی جسے دونوں نے منظور کرلیا۔

انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں کوٹھی والوں اور ان کے کاشتکاروں کے باہمی معاملات میں دخل ہونے کا کوئی حق نہیں۔ پھر بھی اگر تم کچھ شکایتیں پیش کرنا چاہتے ہو تو تحریر کے ذریعے سے پیش کرو۔ میں نے نرمی سے جواب دیا کہ میں اپنے آپ کو باہر کا آدمی نہیں سمجھتا اور جب کسان خود چاہتے ہیں کہ میں ان کے حالات کی تحقیقات کروں تو مجھے ان کا پورا حق ہے۔

کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے مجھے بہت دھمکایا اور کہا تم فوراً ترہٹ سے چلے جاؤ۔

میں نے اپنے رفیقوں سے یہ سب واقعات بیان کیے۔ میں نے کہا کہ غالباً گورنمنٹ مجھے آگے جانے سے روک دے گی اور ممکن ہے کہ مجھے خلاف توقع ابھی سے جیل جانا پڑے جب مجھے گرفتار ہی ہونا ہے تو مناسب یہ ہے کہ میری گرفتاری موتیہاری میں بلکہ اگر ممکن ہو تو بیتیاں میں ہو۔ اس لیے مجھے جلد سے جلد ان میں

سے کسی مقام پر پہنچ جانا چاہیے۔

چمپارن ترہٹ کی قسم کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام موتیہاری ہے۔ راجکمار شکل کا گھر بیٹیا کے قریب تھا اور اس کی نواح میں نیل کے کاشتکاروں کی حالت اور مقامات سے بھی بدتر تھی۔ راجکمار شکل چاہتے تھے کہ میں ان لوگوں سے ملوں اور مجھے بھی اس کی بہت خواہش تھی۔

چنانچہ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ موتیہاری روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم بابو گورکھ پرشاد کے مہمان ہوئے اور ان کا گھر سرائے بن گیا۔ اس میں اتنے آدمیوں کی گنجائش بڑی مشکل سے نکلی۔ اسی دن ہم نے یہ سنا کہ موتیہاری سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں کسی کاشتکار سے بدسلوکی کی گئی ہے۔ یہ طے ہوا کہ میں دوسرے دن صبح کو بابو دھرنی دھر پرشاد کے ساتھ جا کر اس کاشتکار سے ملوں، چنانچہ ہم دونوں ہاتھی پر بیٹھ کر چلے۔ چمپارن میں ہاتھیوں کی وہی کثرت ہے جو گجرات میں بیل گاڑیوں کی۔ ابھی ہم آدھی دور بھی نہیں گئے تھے کہ ایک شخص سپرنٹنڈنٹ کا آدمی لایا تھا۔ اس نے مجھے مجسٹریٹ کا حکم دکھایا کہ چمپارن سے فوراً چلے جاؤ اور مجھے میری قیام گاہ پر پہنچا دیا۔ اس نے مجھ سے اطلاعیابی کے تصدیق چاہی میں نے لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا اور جب تک میری تحقیقات ختم نہ ہو جائے گی میں چمپارن سے نہیں جاؤں گا۔ اس پر میرے پاس سمن پہنچا کہ کل تمہیں عدالت میں خلاف ورزی کی جواب دہی کرنا ہو گی۔

میں نے رات بھر جاگ کر خطوط لکھے اور برجکشور بابو کو ضروری ہدایتیں دیں۔ اس حکم اور سمن کے آنے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی اور لوگوں نے مجھ سے کہا کہ موتیہاری میں اس روز ایسے منظر دیکھنے میں آئے جو پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ گورکھ بابو

کے مکان پر اور عدالت میں لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے اپنا کام رات ہی کو ختم کر لیا تھا۔ ورنہ یہ مجمع کچھ نہ کرنے دیتا۔ میرے رفیقوں نے اس موقعے پر بڑا کام کیا۔ انہوں نے اس مجمع کو جو میرے پیچھے پیچھے سب کہیں پہنچتا تھا قابو میں رکھا اور اس کی تنظیم اور ترتیب کرتے رہے۔

یہاں کے حکام یعنی کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کی مجھ سے ایک طرح کی دوستی ہوگئی۔ میں قانوناً ان کے احکام کی اطاعت سے انکار کرنے کا مجاز تھا مگر میں نے خوشی سے اطاعت کر دی اور ان لوگوں کے ساتھ انتہائی تہذیب کا برتاؤ کیا۔ ان پر یہ ثابت ہوگیا کہ مجھے ان سے ذاتی مخالفت نہیں بلکہ میں صرف ان کے احکام کے خلاف سول نافرمانی کر رہا ہوں۔ اس سے انہیں بہت اطمینان ہوگیا اور انہوں نے مجھ پر سختی کرنے کی بجائے مجمع کی تنظیم میں میرا اور میرے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا۔ مگر یہ اس بات کا چشم دید ثبوت تھا کہ اس وقت ان کا رعب اٹھ گیا ہے۔ لوگوں نے کچھ دیر کے لیے سزا کا خوف دل سے نکال کر اپنے نئے دوست کی محبت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

یہ یاد رہے کہ چمپارن میں کوئی شخص مجھے نہیں جانتا تھا۔ کسانوں نے میرا نام تک نہیں سنا تھا۔ چمپارن گنگا کے شمالی کنارے سے دور ہمالیہ کے دامن میں نیپال کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس وقت تک یہاں کے لوگ ہندوستان کے بقیہ حصوں کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ کانگریس کا نام ان کے کانوں تک ضرور پہنچا تھا مگر ہمیں شریک ہونا تو درکنار وہ اس کا ذکر کرتے ڈرتے تھے۔ مگر اب کانگریس کا ہاتھ ان کے دیس تک پہنچ گیا تھا۔ اور اس کے ممبر وہاں جا پہنچے تھے اگرچہ اس معاملے میں کانگریس کا نام نہ تھا مگر کام اسی کا تھا۔

میں نے اپنے دوستوں کے مشورے سے یہ طے کیا تھا کہ ہم جو کچھ کریں اپنی

طرف سے کریں کانگریس کا نام نہ آئے۔ ہمیں نام سے غرض نہ تھی، بلکہ کام سے تھی۔ جوہر سے زیادہ واسطہ تھا عرض سے نہ تھا۔ ان کے ذہن میں کانگریس کا مفہوم تھا۔ وکیلوں کی کج بحثیاں، قانون داؤ پیچ سے قانون کو بچھاڑنا، بم کے گولے، انار کسٹوں کے جرائم، حکمت عملی اور ریاکاری۔ ہم ان کے دل سے اس خیال کو دور کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کانگریس کو بیچ میں نہ لائیں اور کسانوں سے اس کا ذکر تک نہ کریں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ان لوگوں میں کانگریس کی اصلی روح پیدا ہو جائے تو یہی بہت کافی ہے۔

اس لیے ہمارے آنے سے پہلے کانگریس کی طرف سے، خفیہ یا اعلانیہ طور پر، کوئی سفیر لوگوں کو تیار کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا۔ بے چارے راجکمار شکل ہزاروں کسانوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس نواح میں اب تک کسی طرح کا سیاسی کام نہیں کیا گیا تھا۔ بے چارے کسانوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چمپارن کے باہر بھی دنیا آباد ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گویا میں ان کا برسوں کا دوست تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہو کہ ان کسانوں کے سابقہ میں مجھے خدا کا نور، اہنسا اور حق کا جلوہ نظر آ گیا۔

جب میں دل میں سوچتا ہوں کہ مجھے کس استحقاق کی بناء پر یہ دولت نصیب ہوئی تو سوائے اس محبت کے جو مجھے کے جو مجھے اپنے ہم جنسوں سے ہے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی اور یہ محبت خود ''اہنسا'' کے عقیدے کا نتیجہ ہے جو میرے دل پر اس طرح نقش ہے کہ مٹ نہیں سکتا۔

وہ دن میری زندگی میں یاد رہے گا۔ میرے لیے اور چمپارن کے کسانوں کے لیے وہ دن عید سے کم نہیں تھا۔

قانون کے مطابق میرے مقدمے کی تحقیقات درپیش تھی مگر سچ پوچھیے تو حکومت کا امتحان ہو رہا تھا۔ کمشنر نے جو جال میرے لیے پھیلایا تھا اس میں خود حکومت پھنس گئی۔

............☆☆............

مقدمہ واپس لے لیا گیا

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل، مجسٹریٹ اور دوسرے عہدیدار بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ سرکاری وکیل مجسٹریٹ پر زور ڈال رہا تھا کہ مقدمے کی پیشی بڑھا دی جائے مگر میں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں میں خود اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے چمپارن سے چلے جانے کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس کے بعد میں نے حسب ذیل بیان پڑھ کر سنایا۔

''میں عدالت کی اجازت سے بہت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس کی حکم کی، جو دفعہ 144 تعزیرات ہند کے مطابق جاری کیا گیا تھا ظاہری خلاف ورزی کیوں کی۔ میری ناقص رائے میں بات صرف اتنی ہے کہ میرے اور مقامی حکام کے نقطہ نظر میں فرق ہے۔ میں اس علاقے میں انسانی اور قومی خدمت کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ یہاں آ کر کسانوں کی مدد کروں جن کے ساتھ نیل کی کوٹھی والے ناانصافی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ میں بغیر واقعات کی تحقیقات کیے کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ چاہتا ہوں کہ اگر ہو سکتے تو حکام اور کوٹھی والوں کی مدد سے صورتحال کا مطالعہ کروں۔ میری کوئی اور غرض نہیں ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ میرے آنے سے نقص امن یا کشت و خون کا اندیشہ ہے۔ مجھے یہ دعوی ہے کہ میں ان معاملات میں کافی تجربہ رکھتا ہوں۔ مگر حکام کا خیال کچھ اور ہے مجھے خوب معلوم ہے کہ ان کے فرائض بہت نازک ہیں

اورانہیں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو اطلاع ملے اس کی بناء پر کارروائی کریں۔ایک پابند قانون

شہری کی حیثیت سے میری طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے حکم کی تعمیل کروں۔ لیکن اگر ایسا کرتا تو ان کسانوں سے بے وفائی ہوتی جن کے بلانے سے میں آیا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ ان کی خدمت کے لیے میرا یہاں رہنا ضروری ہے اس لیے مجھے اپنے فعل نے چمپارن سے جانا گوارا نہیں ہوا۔فرائض کی اس کشمکش میں میرے لیے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ اپنے اخراج کی ذمہ داری حکام پر ڈالوں۔میں اس بات کو پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ میری جیسی حیثیت کے آدمی کو بہت سمجھ بوجھ کر کوئی مثال قائم کرنی چاہیے مجھے کامل یقین ہے کہ اس پیچیدہ دستور اساسی کے ماتحت جو آج کل ہندوستان میں رائج ہے میری ایسی صورت جو درپیش ہے۔ہر خوددار اور محتاط آدمی کے لیے یہی مناسب ہے کہ میری طرح سول نافرمانی کرے اور چپ چاپ اس کی سزا بھگتے۔

میں یہ بیان اس غرض سے نہیں دے رہا ہوں کہ مجھے جو سزا دی جانے والی ہے اس میں تخفیف ہو جائے بلکہ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ میں نے مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی سوءادب کی بناء پر نہیں کی بلکہ فطرت انسانی کے بلند و برتر قانون یعنی ضمیر کے حکم کی تعمیل میں کی ہے‘‘۔

اس کے بعد پیشی بڑھانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔لیکن چونکہ مجسٹریٹ اور سرکاری وکیل میری اس تقریر کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مقدمہ ملتوی کر دیا گیا۔میں نے وائسرائے پٹنہ کے احباب، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے لیڈروں کو تار کے ذریعے سارے واقعات کی اطلاع دے دی تھی۔

دوسری پیشی سے پہلے مجسٹریٹ کی تحریر پہنچی کہ لیفٹیننٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دیا ہے اور کلکٹر نے لکھا کہ آپ جو تحقیقات کرنا چاہتے ہیں شوق سے کیجیے۔ اگر آپ کو حکام سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی تو وہ خوشی سے دیں گے۔

میں مسٹر ہیکاک' کلکٹر سے ملا۔ وہ بڑے اچھے اور انصاف پسند آدمی معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ آپ کو جن کاغذات کی ضرورت ہو بے تکلف طلب کیجیے اور جب جی چاہے مجھ سے ملیے۔

اس طرح سے ہندوستان نے سول نافرمانی کا پہلا عملی سبق سیکھا۔اس مسئلے پر مقامی حلقوں میں اور اخباروں میں خوب بحثیں ہوئیں اور خلاف توقع میری تحقیقات کی بڑی اشاعت ہوئی۔میری تحقیقات کے لیے حکومت کا غیر جانبدار رہنا ضروری تھا مگر اخبارون کے نامہ نگاروں کی تائید اور ان کے افتتاحی مقالوں سے مجھے کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ سچ پوچھیے تو صورت حال اس قدر نازک تھی کہ زیادہ سخت تنقید یا مبالغہ آمیز اطلاعات سے میرے مقصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔اس لیے میں نے بڑے بڑے اخباروں کے اڈیٹروں کو لکھا کہ آپ نامہ نگار بھیجنے کی زحمت نہ کیجیے۔جس چیز کی اشاعت کی ضرورت ہوگی میں آپ کو خود لکھ بھیجوں گا۔اور واقعات کی اطلاع برابر دیتا رہوں گا۔

میں جانتا تھا کہ حکومت کا ہمدردانہ رویہ چمپارن کے کوٹھی والوں کو سخت ناگوار ہے اور حکام بھی چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں مگر دل میں خوش نہیں ہیں۔اس لیے اگر بے سروپا یا غلط فہمی پیدا کرنے والی اطلاعات شائع ہوں گی تو یہ لوگ اور زیادہ جھلائیں گے اور اپنا غصہ مجھ پر اتارنے کے بجائے غریب' خوف زدہ کسانوں پر اتاریں گے جس کی وجہ سے مجھے صحیح حالات معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔

اس احتیاط کے باوجود کوٹھی والے میرے خلاف زہر اگلنے سے باز نہ رہے۔ اخباروں میں میرے اور میرے رفیقوں کے متعلق طرح طرح کی جھوٹی خبریں شائع ہوتی رہیں مگر اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی بات میں سچائی کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ حریفوں کی تلواریں کند ہوگئیں۔

کوٹھی والوں نے برجلشور بابو کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا لیکن وہ اس معاملے میں جتنا اہتمام کرتے تھے اتنی ہی بابو صاحب کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھتی جاتی تھی۔

ایسی نازک حالت میں مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ دوسرے صوبوں کے لیڈروں کو چمپارن بلاؤں۔ پنڈت مالوی جی نے کہلا بھیجا تھا کہ تمہیں جب میری ضرورت ہو مجھے بلا بھیجو مگر میں نے انہیں زحمت نہیں دی۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ غیر سیاسی معاملات کو خواہ ان کی غرض سیاسی ہی کیوں نہ ہو سیاست کا رنگ دینا مضر ہے اور سیاست سے بچائے رکھنا مفید ہے۔ چمپارن کے معرکے سے یہ ثابت ہوگیا کہ لوگوں کی بے غرض خدمت سے خواہ وہ کسی شعبے میں کی جائے ملک کو ایک نہ ایک دن سیاسی فائدہ بھی ضرور پہنچتا ہے۔

☆☆☆

کام کے طریقے

اگر میں اس تفصیلات کے تفصیلی حالات بیان کروں تو گویا مجھے چمپارن کے کسانوں کے اتنے دن کی پوری تاریخ لکھنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ چمپارن کی تحقیقات اہمسا اور حق کی تلاش کی ایک دلیرانہ سعی تھی اور میں ان ہفتہ وار مضامین میں صرف ان ہی باتوں کا ذکر کروں گا جو اس نقطہ نظر سے اہمت رکھتی ہیں۔ جن حضرت کو تفصیلی حالات معلوم کرنا ہوں وہ بابو راجندر پرشاد کی چمپارن کی ستیا گرہ کی تاریخ پڑھیں یہ کتاب ہندی میں ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ۵۰ بھی چھپ رہا ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد میں اصل واقعے کی طرف رجوع کرتا ہوں مجھے یہ دقت تھی کہ تحقیقات کہاں کی جائے۔ گورکھ بابو کے گھر میں یہ بکھیڑا ہوتا تو اس بیچارے کو گھر خالی کرنا پڑتا۔ دوسرے مکان کی تلاش تھی مگر ابھی تک موتیہاری کے لوگ ہمیں اپنا مکان کرایے پر دینے سے ڈرتے تھے تاہم برجکشور بابو نے تالیف قلوب سے کام لے کر ہمیں ایک مکان دلوا دیا جس کے احاطے میں ایک کشادہ میدان بھی تھا۔

اس کام کے لیے کچھ نہ کچھ روپے کی ضرورت تھی۔ اب تک کسی اس قسم کے کام کے لیے چندہ نہیں ہوا تھا۔ برجکشور بابو خود اور ان کے دوست زیادہ تر وکیل تھے جو ضرورت کے وقت یا تو خود چندہ دیتے تھے یا اپنے احباب سے دلواتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہم خود دے سکتے ہیں تو دوسروں سے کس منہ سے مانگیں۔ یہ میں

نے بالکل طے کرلیا تھا کہ جب ہم خود دے سکتے ہیں تو دوسروں سے کس منہ سے مانگیں۔ یہ میں نے طے کرلیا تھا کہ چمپارن کے کسانوں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ ایسا کرتا تو لوگوں کو شبہہ کرنے کا موقع ملتا۔ ملک میں عام چندہ کرنا بھی مجھے منظور نہیں تھا کیونکہ اس سے تحقیقات میں سیاسی رنگ آ جانے کا اندیشہ تھا۔ بمبئی کے چند دوستوں نے پندرہ ہزار روپیہ دینا چاہا مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ برجکشور بابو کی مدد سے بہار کے دوسرے مقامات میں آسودہ حال لوگوں سے چندہ جمع کروں اور اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنے رنگوں کے دوست ڈاکٹر جے پی مہتا کو تکلیف دوں۔ انہوں نے میرے لکھنے پر بڑی خوشی سے وعدہ کرلیا کہ مجھے جتنے روپے کی ضرورت ہوگی بھیجیں گے۔ غرض ادھر سے ہمیں پورا اطمینان ہو گیا۔ ہمیں کوئی بہت بڑی رقم درکار نہیں تھی کیونکہ چمپارن والوں کی غربت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم بہت کفایت سے کام لیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے سب ملا کر تین ہزار روپے سے زیادہ خرچ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے جو چندہ جمع ہوا تھا اس میں سے دو چار سو روپے بچ رہے۔

شروع شروع میں میرے رفیق جس ٹھاٹ سے رہتے تھے اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔ ہر وکیل کے ساتھ ایک خدمت گار اور ایک باورچی تھا۔ ہر ایک کا باورچی خانہ الگ تھا اور یہ لوگ بارہ بجے رات کو کھانا کھاتے تھے۔ یہ اپنے مصارف خود برداشت کرتے تھے پھر بھی مجھے ان کے لاابالی پن سے تکلیف ہوتی تھی۔ میں ان کا مضحکہ اڑاتا تھا مگر ہمارے آپس میں اس قدر گہرے تعلقات ہو گئے تھے کہ وہ کبھی برا نہیں مانتے تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ نوکر رخصت کردیے جائیں سب کا کھانا ایک جگہ پکے اور کھانے کے اوقات کی پابندی کی جائے۔ سب لوگ نباتاتی نہیں تھے مگر

چونکہ دو جگہ کھانا پکنے میں زیادہ حرج تھا اس لیے سب نے نباتاتی غذا پر بسر کرنا منظور کیا تھا۔ کھانے میں سادگی بھی اختیار کی گئی۔

اس انتظام کی بدولت خرچ بہت کم ہو گیا اور بہت سا وقت جو فضول ضائع ہوتا تھا بچ گیا۔ ان دونوں چیزوں میں کفایت ہمارے لیے بہت ضروری تھی۔ کسانوں کے گروہ کے گروہ بیان دینے ک لیے آتے تھے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی لاتے تھے۔ سارے احاطے اور بازار میں تل رکھنے کی گنجائش نہین تھی۔ میرے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ مجھے درشن کی مصیبت سے بچائیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا مقررہ اوقات پر میری نمائش درشن کے لیے ہوتی تھی۔ پانچ سات رضا کار بیانات لکھتے پھر بھی کچھ لوگ رہ جاتے اور انہیں بغیر بیان لکھائے واپس جانا پڑتا۔ ان میں سے سب بیان ضروری نہیں تھے۔ اکثر لوگ ان ہی باتوں کو دھراتے جوان سے پہلے کہہ چکے ہوتے تھے مگر کسانوں کو بغیر اپنی اپنی بپتا سنائے چین نہیں آتا تھا اور مجھے ان کے اس جذبے سے ہمدردی تھی۔

بیان لکھنے والوں کو مقررہ قواعد کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ ہر کسان نے خوب جرح کی جاتی تھی۔ اور جو لوگ جرح میں ٹوٹ جاتے تھے ان کی شہادت رد ہو جاتی تھی۔ اس میں بہت وقت صرف ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے یہ فائدہ ہوا کہ جتنے بیانات لکھے گئے ان میں سے اکثر پوری طور پر قابل اعتماد نہ تھے۔

ان بیانات کے لکھتے وقت ایک خفیہ پولیس کا عہدہ دار موجود ہوتا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے نہ رہنے دیتے مگر ہم نے شروع سے یہ طے کر لیا تھا کہ خفیہ پولیس والوں کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آئیں گے اور حتی الامکان انہیں ہر طرح کی معلومات فراہم کرنے میں مدد دیں گے۔ اس سے

ہمارا کوئی حرج نہیں ہوا بلکہ خفیہ پولیس کے عہدہ داروں کے سامنے بیان ہونے سے کسانوں کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے دل میں خفیہ پولیس والوں کا رعب کم ہو گیا اور دوسری طرف ان عہدہ داروں کی موجودگی کے سبب انہیں اپنے بیان میں مبالغہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ جانتے تھے کہ خفیہ پولیس والے انہیں پھانسنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لیے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔

مجھے کوٹھی والوں کو اشتعال دلانا منظور نہیں تھا۔ بلکہ میں نرمی اور ملاطفت سے انہیں پرچانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ التزام کر لیا کہ جن لوگوں کی سختی کی زیادہ شکایت کی جاتی ان سے خط و کتابت کرتا اور ان کے گھر جا کر ان سے ملتا۔ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے کارکنوں سے بھی ملاقات کی انہیں کسانوں کی شکایتیں سنائیں اور ان کے جواب سنے۔ ان میں سے بعض مجھ سے نفرت کرتے تھے بعض بے توجہی برتتے تھے اور دو چار ایسے بھی تھے جو میرے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے۔

☆☆☆

میرے ساتھی

برج کشور بابو اور راجندر بابو جیسے دو آدمی مشکل سے ملیں گے۔ ان کے خلوص اور انہماک کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کوئی کام ان کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ ان کے چیلے یا رفیق شمبھو بابو، انوگرہ بابو، دھرنی بابو، رام نومی بابو اور دوسرے وکیل ہر وقت ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وندھیا بابو اور رجنکدھری بابو بھی کبھی کبھی آ کر ہماری مدد کرتے تھے یہ سب بہاری تھے ان کا کام زیادہ تر کسانوں کے بیانات لکھنا تھا۔

پروفیسر کرپلانی بھلا ہمارا ساتھ دیے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ ہونے کو تو وہ سندھی تھے مگر اصل میں بہاریوں سے زیادہ بہاری تھے۔ میں نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو ان کی طرح دل و جان سے اپنے مجازی وطن کے ہو رہیں۔ کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کسی دوسرے صوبے کے ہیں۔ یہ میرے میر صاحب تھے ان دنوں انہوں نے اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی تھی کہ مجھے ''درشن'' کے طالبوں سے بچائیں۔ وہ کبھی اپنی خلقی ظرافت سے اور کبھی پیالہ کی دھمکیوں سے کام لے کر غنیم کو پسپا کر دیتے تھے۔ رات کو وہ معلم بن جاتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو اپنی تاریخی تحقیقات سے منظور کیا کرتے تھے۔ اگر اتفاق سے کوئی کچھ لا آ جائے تو ان کی باتیں سن کر بھیڑ سے شیر بن جاتا تھا۔

مولانا مظہر الحق نے اپنا نام امیدوار رضا کاروں کی فہرست میں لکھوا دیا تھا کہ جب مجھے ضرورت ہو ان سے مدد لوں اور مہینے میں دو ایک بار ضرور میرے پاس ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی اس زمانے کی شان و شوکت اور آج کل کی سادگی میں زمین

و آسمان کا فرق ہے وہ ہم سے اس خلوص سے ملتے تھے کہ ہم انہیں اپنا رفیق سمجھتے تھے حالانکہ کوئی اجنبی ان کے ٹھاٹھ دیکھتا تو اسے یہ یقین نہ آتا۔

بہار سے زیادہ واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جب تک یہاں کے دیہات میں تعلیم نہ ہو کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ کسانوں کی جہالت بہت افسوسناک تھی۔ ان کے بچے یا تو بیکار مارے مارے پھرتے تھے یا نیل کے کھیتوں میں صبح سے شام تک دو تین پیسے روز پر کام کرتے تھے۔ ان دنوں مزدوری کی شرح مردوں کے لیے ڈھائی آنے عورتوں کے لیے ڈیڑھ آنے اور بچوں کے لیے تین پیسے سے زیادہ نہ تھی جو شخص چار آنے روز کما لے وہ بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔

اپنے رفیقوں کے مشورے سے میں یہ طے کیا کہ چھ گاؤں میں ابتدائی مدارس کھولے جائیں۔ گاؤں والوں کے ساتھ ایک شرط یہ تھی کہ تم مدرس کے کھانے اور رہنے کا کوئی انتظام کر دو باقی مصارف ہمارے سر پر رہیں گے۔ گاؤں والوں کے پاس نقد روپیہ تو تھا نہیں مگر وہ کھانے کی چیزیں فراہم کر سکتے تھے۔ انہوں نے غلہ اور دوسری اجناس دینے کا وعدہ کیا۔

اب یہ سوال تھا کہ مدرس کہاں سے آئیں؟ مقامی لوگوں میں ایسے مدرس ملنا مشکل تھا جو بلا معاوضہ یا کم معاوضہ پر کام کریں۔ ایسے لوگوں کو میں رکھنا نہیں چاہتا تھا میری نظر میں علمی قابلیت کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی اخلاقی صفات کی تھی۔

اس لیے میں نے رضا کاروں مدرسوں کے لیے عام اپیل کی۔ اس کا فوراً اثر ہوا۔ گنگا دھر راؤ جی دیشپانڈے نے بابا صاحب سومن اور پنڈارک کو بھیج دیا۔ بمبئی سے مسز اونتکا بائی گوکھلے اور پونا سے انندی بائی آ گئیں۔ آشرم سے میں نے چھوٹا

لال سریندر ناتھ اور اس کے بیٹے دیوداس کو بلا لیا۔ اسی زمانے میں بہاروڈیسائی اور زہری پارکھ اپنی بیویوں کو لے کر ہم سے آملے۔ کستورا بائی کو بھی میں نے اس کام میں شریک کر لیا۔ کام کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔ اونتکا بائی اور آنندی بائی اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھیں۔ مگر مسز درگا ڈیسائی اور مسز منی بین پارکھ صرف تھوڑی بہت گجراتی جانتی تھیں۔ کستورا بائی اس سے محروم تھیں۔ سوال یہ تھا کہ یہ خواتین بچوں کو ہندی کے ذریعے تعلیم کیوں کر دیں گی۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ آپ بچوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانے کی زیادہ فکر نہ کیجیے بلکہ انہیں صفائی اور شائستگی سکھائیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ گجراتی، ہندی اور مرہٹی حروف میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا آپ سمجھتی ہیں اور مکتب میں حروف تہجی اور ہندسے سکھانے میں آپ کو زیادہ دقت نہیں ہو گی۔ ان خواتین کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جماعتیں سب سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔ اس تجربے کی بدولت انہیں اپنے کام میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور ان کی ہمت بڑھ گئی۔ اونتکا بائی کا مدرسہ دوسرے مدرسوں کے لیے نمونہ بن گیا۔ انہیں اپنے کام میں بے حد انہماک تھا۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت کا پورا استعمال کیا۔ ان خواتین کے ذریعے ہم نے گاؤں کی عورتوں کی بھی تھوڑی بہت اصلاح کی۔

مگر میں صرف تعلیم پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں بے حد گندے تھے۔ گلیاں غلاظت سے بھری ہوئی تھیں۔ کنوؤں کے گرد کیچڑ اور سڑی گلی چیزوں کی دلدل تھے۔ اور مکانوں کے صحن گھوڑے سے بدتر تھے۔ بالغوں کو صفائی کی تعلیم دینا بہت ضروری تھا یہ سب کے سب جلدی امراض میں مبتلا تھے۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ صفائی پر انتہائی زور دیا جائے اور ان کی زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جائے۔

اس کام کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑی۔ ہم نے انجمن خدام ہند سے درخواست کی کہ ڈاکٹر دیو آنجہانی کو ہماری مدد کے لیے بھیجے۔ وہ میرے بڑے دوست تھے اور میری درخواست پر چھ مہینے کے لیے چلے آئے۔ سب پڑھانے والوں اور پڑھانے والیوں کو ان کی ماتحتی میں کام کرنے کی ہدایت کردی گئی۔

میں نے ان سب کو تاکید کردی کہ نیل کے کاشتکاروں کی شکایتوں اور سیاسی معاملات سے مطلق سروکار نہ رکھیں۔ جو شخص شکایت کرے اس میرے پاس بھیج دیں۔ کوئی اپنے دائرہ عمل سے باہر قدم نہ رکھے میرے دوستوں نے نہایت وفاداری سے ان ہدایتوں کی تعمیل کی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی ذرا سی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو۔

☆☆☆

دیہات کی اصلاح

جہاں تک ہو سکا ہم نے ہر مدرسے کو ایک معلم اور ایک معلّمہ کی نگرانی میں رکھا۔ دوسرے رضا کار دواؤں کی تقسیم اور حفظان صحت کے انتظام کے لیے تعینات کیے گئے۔ عورتوں کی امداد کے لیے عورتیں مقرر ہوئیں۔

طبی امداد کا طریقہ بالکل سہل اور کشادہ تھا۔ رضا کاروں کے پاس صرف کونین، ارنڈی کا تیل اور گندھک کا مرہم رہتا تھا۔ اگر مریض کی زبان میلی نظر آئے یا وہ قبض کی شکایت کرے تو اسے انڈی کا تیل پلا دیا جاتا تھا، اگر بخار ہو تو ارنڈی کے تیل کے ہلکے مسہل کے بعد کونین دی جاتی تھی۔ اور خارش یا پھنسیاں ہوں تو انہیں اچھی طرح دھو کر گندھک کا مرہم لگا دیا جاتا تھا۔ کسی مریض کو دوا گھر پر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کبھی مرض میں کوئی پیچیدگی نظر آتی تھی ڈاکٹر دیو بلائے جاتے تھے۔ یوں بھی وہ ہفتے میں چند بار مرکز کے معائنے کے لیے جایا کرتے تھے۔

بہت سے لوگ اس سدھے سادھے علاج سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہ طریقہ بظاہر انوکھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن بات یہ تھی کہ یہی دو چار بیماریاں قبض، بخار، خارش عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان کا علاج آسانی سے بغیر ڈاکٹر کے ہو سکتا تھا۔ مریضوں کو بھی اسی میں سہولت تھی۔

حفظان صحت کا معاملہ ذرا مشکل تھا۔ گاؤں کے لگ خود ہاتھ پیر ہلانے پر تیار نہ تھے مزدوروں تک کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنا پاخانہ خود اٹھائیں اور اپنے گھر میں جھاڑو دیں۔ مگر ڈاکٹر دیو ہمت ہارنے والے آدمی نہ تھے انہوں نے اور رضا کاروں نے

اپنی ساری محنت ایک گاؤں کی صفائی پر صرف کر دی تا کہ وہ دوسروں کے لیے معیار بن سکیں۔ پہلے انہوں نے خود سڑکوں اور گھروں میں جھاڑو دی کنوؤں کو صاف کیا اور قریب کے گڑھوں کو مٹی سے بھرا اس کے بعد نرمی اور محبت سے گاؤں والوں کو رضا کار بننے پر آمادہ کیا۔ بعض گاؤں میں انہوں نے لوگوں کو غیرت دلا کر ان سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ایک دو جگہ کے لوگوں میں اتنا جوش پیدا ہو گیا کہ انہوں نے میری موٹر کے جانے کے لیے سڑک بھی تیار کر دی۔ ان خوشگوار تجربوں کے ساتھ لوگوں کے بے پروائی کے تلخ تجربے بھی ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ بعض گاؤں میں لوگوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم اس کام کو پسند نہیں کرتے۔

مناسب ہو گا کہ یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں جسے میں اپنی تقریروں میں اکثر بیان کر چکا ہوں۔ بھٹی ہوروا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس میں ہمارا ایک مدرسہ تھا۔ وہاں جاتے ہوئے میں ایک مزرعہ سے گزرا جہاں چند عورتیں بہت میلے کپڑے پہنے نظر آئیں میں نے مسز گاندھی سے کہا کہ ان سے پوچھیے کہ یہ اپنے کپڑے کیوں نہیں دھوتیں۔ انہوں نے ان عورتوں سے گفتگو شروع کی۔ ان میں سے ایک انہیں اپنی جھونپڑی میں لے گئی اور کہنے لگی ”دیکھ لو نہ کوئی صندوق ہے نہ الماری جس میں اپنے کپڑے رکھوں۔ جو ساڑھی پہنے ہوں اس کے سوا میرے پاس کوئی کپڑا نہیں۔ مہاتما جی سے کہو کہ مجھے ایک ساڑی اور لے دیں پھر میں روز نہا کر کپڑے بدلا کروں گی“۔

ایسی جھونپڑیاں ہندوستان کے بہت سے گاؤں میں پائی جاتی ہیں۔ نہ جانے کتنے غریب ایسے ہیں جن کے گھر ایک چٹائی تک نہیں اور جن کے پاس سوائے اس چیتھڑے کے جس سے وہ ستر پوشی کرتے ہیں اور کوئی کپڑا نہیں۔

میں ایک اور تجربہ بھی لکھوں گا۔ چمپارن میں تپا اور بانس بہت کثرت سے ہیں ۔ بھٹی باروہ میں مدرسے کے لے ان ہی چیزوں کا ایک جھونپڑا بنا دیا گیا تھا۔ ایک رات کسی شخص نے ممکن ہے کہ نیل کی کوٹھی والوں کا آدمی ہو اس میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ پھر تپا اور بانس کا جھونپڑا بنایا جائے ۔اس مدد سے ان کی نگرانی سومن جی اور مسز گاندھی کے سپرد تھی۔ سومن جی نے یہ طے کیا کہ پکا مکان بنانا چاہیے وہ خود اس مستعدی سے کام کرنے لگے کہ بہت سے لوگ ان کے ساتھ شریک ہو گئے چند ہی روز میں اینٹوں کا مکان تیار ہو گیا اب آگ لگنے کا خوف نہیں رہا۔

غرض رضا کاروں کے سکولوں حفظان صحت کے کام اور طبی امداد کی بدولت لوگ انہیں عزت کی نظر سے دیکھنے لگے اور ان پر بھروسا کرنے لگے۔ ان کے اثر سے کسانوں کی زندگی میں بہت اصلاح ہوگئی۔

مگر مجھے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اس تعمیری کام کو مستقل بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہ رضا کار عارضی طور پر آئے تھے ان کے جانے کے بعد نہ باہر کے لوگ آئے اور نہ بہار کے مستقل اعزازی کارکن مل سکے مجھے خود چمپارن کا کام ختم کرنے کے بعد دوسری جگہ جہاں میری ضرورت تھی چلا جانا پڑا۔ پھر بھی اس چند مہینے کے کام نے چمپارن والوں کی زندگی میں اتنی تبدیلی کر دی تھی کہ اس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں آج تک نظر آتا ہے۔

☆☆☆

گورنر کی نیک دلی

ایک طرف تو یہ اصلاحی کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف کسانوں کے بیانات لکھے جا رہے تھے۔ ان بیانات کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ کوٹھی والوں نے جب یہ رنگ دیکھا تو ان کا غصہ اور بھڑکا اور انہوں نے میری تحقیقات کو روکنے میں کوئی کوشش نہیں اٹھا رکھی۔

ایک دن میرے پاس بہار کے گورنر کی طرف سے اس مضمون کا خط آیا "آپ کی تحقیقات کو بہت طول ہو گیا ہے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اسے جلد ختم کر دیں اور بہار سے رخصت ہو جائیں"۔ خط بہت نرم اور مہذب الفاظ میں لکھا گیا تھا لیکن اس کا مطلب بالکل صاف تھا۔

میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ ایسی تحقیقات میں طویل ہونا لازمی ہے۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس کے ذریعے کسانوں کی شکایتیں دور نہ ہو جائیں میں بہار سے نہیں جاؤں گا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات روک دی جائیں تو اس کی تدبیر بہت سہل ہے یا تو وہ کسانوں کی شکایتوں کو فوراً تسلیم کر لے اور چارہ جوئی کرے یا کم سے کم ان کے بیانات کو قابل توجہ سمجھ کر فوراً ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔

لیفٹیننٹ گورنر سر ایڈورڈ گیٹ نے مجھے بلا کر مجھ سے گفتگو شروع کی اور کہا "کہ میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی اسی کا ممبر بنا دوں گا"۔ میں نے کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے نام دریافت کیے اور اپنے رفیقوں

سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے کہا کہ ''میں تین شرطوں پر کمیٹی کی شرکت قبول کرتا ہوں۔ایک یہ کہ مجھے دوران تحقیقات اپنے رفیقوں سے مشورہ کرنے کی اجازت ہو دوسرے گورنمنٹ یہ تسلیم کرلے کہ کمیٹی کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ میں کسانوں کا پیروکار بھی رہوں۔تیسرے اگر میں تحقیقت کے نتیجے سے مطمئن نہ ہوں تو مجھے یہ اختیار رہو کہ میں رعایا کو ان کے آئندہ طرزعمل کے متعلق مشورہ دوں''۔

سر ایڈورڈ گیٹ نے ان شرطوں کو معقول سمجھ کر قبول کرلیا اور تحقیقات کا اعلانکر دیا۔سر فرینک سلائی آنجہانی کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی کہ جو رقمیں کوٹھی والوں نے کمیٹی کے نزدیک ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ ان سے واپس لایا جائے اور تنکتھیا کا طریقہ منسوخ کردیا جائے۔

کمیٹی میں اتفاق رائے پیدا کرنے میں اس کی تجویز کے مطابق مسودہ قانون پاس کرانے میں سر ایڈورڈ گیٹ کی کوشش کو بہت کچھ دخل ہے۔اگر وہ انتہائی استقلال اور موقع شناسی سے کام نہ لیتے تو نہ کمیٹی کی رپورٹ متفقہ ہوتی اور نہ قانون مزارعین پاس ہوتا۔کوٹھی والوں کا بہار میں بے انتہا اثر تھا باوجود اس کے کہ رپورٹ ان کے خلاف تھی انہوں نے مسودہ قانون کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔لیکن سر ایڈورڈ گیٹ آخر تک ثابت قدم رہے اور انہوں نے کمیٹی کی تجاویز پر پوری طرح عمل کیا۔

اس طرح ''تنکتھیا'' کا طریقہ جو سو سال سے جاری تھا منسوخ ہوگیا اور کوٹھی والوں کے راج کا خاتمہ ہوگیا۔رعایا کو جو ہمیشہ سے پامال ہوتی آئی تھی تھوڑے بہتے حقوق مل گئے اور لوگوں کے دل سے یہ خیال خام دور ہوگیا کہ نیل کا دھبا کبھی نہیں

مٹ سکتا۔

میں چاہتا تھا کہ چند سال تک چمپارن میں تعمیری کام جاری رکھوں اور مدرسے کھولوں اور دیہات کی زیادہ گہری اصلاح کروں اس کے لیے زمین بھی تیار ہو چکی تھی لیکن جیسا پہلے کئی بار ہو چکا تھا کہ مشیت ایزدی سے میرا یہ ارادہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے میرے لیے دوسرا نام تجویز کر رکھا تھا۔

☆☆☆

مزدوروں سے سابقہ

ابھی میں تحقیقاتی کمیٹی کا کام ختم نہیں کر پایا تھا۔ کہ موہن لال جی پانڈے اور شنکر لال جی پارکھ کا خط پہنچا کہ کھیدا ضلع میں فصل ماری گئی اور لگان کا تقاضا ہے اور کسان اس کے ادا کرنے سے معذور ہیں۔ آپ بتایئے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ مجھ میں نہ اتنی قابلیت اور ہمت تھی اور نہ میرا جی چاہتا تھا کہ بغیر موقع کا معائنہ کیے ہوئے کسی قسم کا مشورہ دوں۔

ادھر احمد آباد سے انسویا بائی نے وہاں کے مزدوروں کی حالت دیکھی ان لوگوں کو مزدوری بہت کم ملتی تھی۔ بیچارے دن بھر سے ہاتھ پیر مار رہے تھے کہ کچھ اضافہ ہو جائے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ اگر ہو سکے تو ان کی مدد کروں۔ مگر اس چھوٹے سے کام کو بھی میں دور بیٹھ کر چلانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے موقع ملتے ہی میں احمد آباد روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ امید تھی کہ ان دونوں قصوں کو میں جلدی سے نبٹا کر چمپارن لوٹ آؤں گا اور یہاں کے تعمیری کام کی نگرانی کروں گا۔

مگر احمد آباد اور کھیدا میں مجھے بہت دن لگ گئے اور میں چمپارن نہ جا سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا وہاں کے سارے مدرسے ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔ میرے اور مرے رفیقوں کے شیخ چلی کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

ہماری تجویز یہ تھی کہ چمپارن میں تعلیم اور حفظان صحت کے علاوہ گئو رکھشا کا انتظام بھی کر لیں۔ میں نے اپنے سفر کے سلسلے میں یہ دیکھا تھا کہ گئو رکھشا اور

ہندی کا پرچار مارواڑیوں کا حصہ ہو گیا ہے۔بتیا میں مجھے ایک مارواڑی دوست کے دھرم شالے میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔وہاں کے مارواڑیوں نے مجھے اپنا گئو شالہ دکھایا۔ میں گئو رکھشا کے متعلق ایک خاص رائے رکھتا تھا۔اور اب تک اس پر قائم ہوں۔میرے نزدیک ایک ایک میں مویشی کی افزائش نسل، بیلوں سے رحمدلی کا برتاؤ اعلیٰ درجے کے ڈیری فارم قائم کرنا وغیرہ شامل تھا۔مارواڑی بھائیوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا تھا مگر چونکہ میرا مستقل قیام بتیا میں نہ ہو سکا اس لیے یہ تجویز رہ گئی۔

بتیا کا گئو شالہ اب تک قائم ہے مگر اس نے اعلیٰ درجے کے ڈیری فارم کی حیثیت نہیں اختیار کی ہے۔چمپارن میں ابھی تک بیلوں سے حد سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔نام کے ہندو ابھی تک ان بے زبان جانوروں کو بے دردی سے مارتے ہیں۔اور اپنے دھرم کو بدنام کرتے ہیں۔

مجھے آج تک افسوس ہے کہ میری یہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔جب کبھی میں چمپارن جاتا ہوں اور بہاری اور مارواڑی بھائیوں کی دوستانہ شکایتیں سنتا ہوں تو ان منصوبوں کا خیال کر کے آہ سرد بھرتا ہوں اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

تعلیمی کام کسی نہ کسی صورت میں بہت سے مقامات پر اب بھی جاری ہے مگر گئو رکھشا کا کام اچھی طرح جمنے نہیں پاتا تھا اس لیے میں اس حسب دلخواہ ترقی نہیں ہوئی۔

کھیدا کے کسانوں کا مسئلہ ہنوز زیر بحث تھا کہ میں نے احمد آباد کے مزدوروں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

یہ میرے لیے بڑا نازک موقع تھا۔مزدوروں کی شکایتیں واجبی تھیں۔اس جنگ

میں کارخانوں کے مالکوں کے سپہ سالار امبالال جی سارابھائی تھے۔ ان کی سگی بہن انسویابائی مزدوروں کی طرف سے ان کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ میرے اور مالکوں کے دوستانہ تعلقات تھے اس لیے یہ لڑائی اور بھی دشوار ہوگئی تھی۔ میں نے ان سے کئی بار گفتگو کی تھی اور انہیں سمجھایا کہ اس معاملے کو پنچوں کے سپرد کر دیجیے۔ مگر انہوں نے کہا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا کہ مزدوروں کو ہڑتال کا مشورہ دوں۔ مگر اس سے قبل میں نے مزدوروں اور ان کے لیڈروں سے اچھی طرح میل جول پیدا کر لیا تھا اور انہیں سمجھا دیا تھا کہ ہڑتال کے کامیاب ہونے کی چار شرطیں ہیں۔

۱۔ کبھی بھول کر تشدد سے کام نہ لے۔

۲۔ جو لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ کر کام پر جانا چاہیں انہیں نہ ستاؤ۔

۳۔ خیرات کا پیسہ ہرگز نہ لو۔

۴۔ چاہے ہڑتال کتنے ہی دن چلے استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور کسی جائز طریقے سے روٹی کما کر کھاؤ

ہڑتال کے لیڈروں نے ان شرطوں کی اہمیت تسلیم کی اور انہیں قبول کیا مزدوروں کے عام جلسے میں یہ عہد کیا کہ جب تک ان کے مطالبات پورے نہ ہوں گے یہ معاملہ پنچوں کے سپرد نہ کیا جائے گا ہرگز کام پر نہ جائے۔

اسی ہڑتال کے سلسلے میں مجھ سے ولبھ بھائی پٹیل اور شنکر لال جی بینکر سے ملاقات ہوئی۔ انسویابائی سے میں پہلے سے اچھی طرح واقف تھا۔

ہم لوگ روز سابرمتی کے کنارے ایک درخت کے سایے میں ہڑتالیوں کے جلسے کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے اور انہیں ان کا عہد یاد دلا کر امن و امان اور خودداری قائم رکھنے کی تاکید کرتا تھا۔ روزانہ ان کا پر امن

جلوس شہر کی سڑکوں پر نکلتا۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے ہوتے تھے جن پر یہ الفاظ لکھتے تھے۔ ''ایک ٹیک (عہد پر قائم رہو)''۔

یہ ہڑتال اکیس دن تک جاری رہی۔ اس کے دوران میں وقتاً فوقتاً مالکوں سے ملتا رہتا تھا اور ان سے انصاف کی درخواست کرتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے ''ہم کو بھی تو اپنا عہد پورا کرنا ہے ہمارے اور مزدوروں کے تعلقات ایسے ہیں جیسے باپ بیٹوں کے ہوتے ہیں۔ ہم اس معاملے میں باہر والوں کی مداخلت کیسے گوارا کریں باپ بیٹوں کے بیچ میں پنچ کا کیا کام''۔

☆☆☆

آشرم کی ایک جھلک

قبل اس کے کہ میں ہڑتال کے اور حالات بیان کروں کچھ تھوڑا سا ذکر آشرم کا کر دینا ضروری ہے۔ ۔ چمپارن کے قیام کے زمانے میں آشرم کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ جب موقع ملتا تھا دو ایک دن کے لیے وہاں ہو آتا تھا۔

ان دنوں آشرم احمد آباد کے قریب کوچرب نام گاؤں میں تھا۔ اس گاؤں مُں طاعون پھوٹا اور مجھے چھوٹے بچوں کی طرف سے بہت اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آشرم کے اندر لاکھ صفائی ٓہی مگر آس پاس کی گندگی کے اثرا سے بچنا ناممکن تھا۔ اس زمانے میں ہم اس قابل نہ تھے کہ کوچرب کے لوگوں سے حفظان صحت کے اصول کی پابندی کرائیں یا ان کی کوئی اور خدمت کر سکیں۔

ہم یہ چاہتے تھے کہ آشرم گاؤں اور شہر کے درمیان ایسی جگہ ہو کہ دونوں سے علیحدہ بھی رہے اور آمد ورفت میں زیادہ دشواری نہ ہو ہم نے یہ طے رلیا تھا کہ کسی نہ کسی دن اپنی ذاتی زمین خرید لیں گے اور اس پر اپنی بستی بنائیں گے۔

طاعون کو میں اپنے قافلے کے لیے بانگ درا سمجھتا تھا احمد آباد کے ایک تاجر سیٹھ پنجا بھائی ہیرا چند کو آشرم سے خاص تعلق تھا اور انہوں نے بارہا خلوص اور بے غرضی سے ہماری مدد کی تھی۔ وہ احمد آباد سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ آشرم کے لیے ایسی زمین جو ہر لحاظ سے مناسب ہو تلاش کروں۔ میں ان کو ساتھ کوچرب کے شمال اور جنوب میں زمین تلاش پھرتا رہا۔ آخر میں میری یہ رائے ہوئی کہ تین چار میل شمال کی طرف ہٹ کر کوئی قطعہ منتخب کیا جائے۔ انہوں نے وہ جگہ تجویز کی

جہاں آج آشرم قائم ہے یہ مقام مجھے اس لیے پسند آیا کہ سابرمتی کے سنٹرل جیل کے قریب تھا۔ستیا گرہیوں کے لیے جن کا کام ہی جیل جانا ہے' اس سے اچھی جگہ کون سی ہوسکتی تھی۔پھر یں یہ بھی جانتا تھا کہ جوعلاقہ جیل کے لیے منتخب کیا جاتا ہے وہ عموماً صاف ستھرا ہی ہوتا ہے۔

آٹھ روز کے اندر زمین خرید لی گئی یہاں کسی عمارت یا درخت کا نام تک نہ تھا۔ لیکن دو بڑی خوبیاں تھیں دریا کا کنارہ اور تنہائی۔

ہم نے یہ طے کیا کہ جب تک مستقل عمارت بنے خیموں میں رہیں گے اور باورچی خانے کے لیے ٹین کا سائبان ڈال لیں گے۔

آشرم والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوا تھا۔اب ہم لوگ عورت مرد بچے ملا کر چالیس سے زیادہ تھے اور سب ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ یہ ساری تجویز میری تھی مگر اسے عمل میں لانا حسب معمول مگن لال کا کام تھا۔

مستقل عمارت بننے سے پہلے ہمیں بڑی دقتیں اٹھانا پڑیں برسات قریب تھی اور کھانے کا سامان چار میل جا کر شہر سے لانا پڑتا تھا۔زمین بنجر پڑی تھی اس لیے وہا سانپوں کی بڑی کثرت تھی اور چھوٹے بچوں کے ساتھ رہنا بڑے خطرے کا کام تھا۔ ہم سانپوں کو مارتے نہیں تھے۔مگر ان کا ڈر ہم سب کو لگا رہتا تھا اور اب تک وہی حال ہے۔

زہریلے کیڑوں کو نہ مارنا ہمارا اصول تھا اور فینکس ٹالسٹائے فارم اور سابرمتی میں اس کی پابندی ہوتی رہی۔تینوں جگہ ہمیں بنجر زمین پر بستی بسانا پڑی۔مگر آج تک ہمارے یہاں کوئی سانپ کے کاٹنے سے نہیں مرا میری چشم عقیدت کو اس میں اس رحمٰن رحیم کی کارسازی نظر آتی ہے۔ممکن ہے کوئی عقل کل یہ کہے کہ خدا کو کیا پڑی

ہے کہ کسی کو بچائے اور اسے اتنی فرصت کہاں کہ انسانوں کے معاملات میں دخل دیتا پھرے۔مگراس موشگافی کی کوئی ضرورت نہیں۔یہ میرا برسوں کا تجربہ ہے اوراس کا جواثر میرے دل پر ہے اس کے ظاہر کرنے کے لیے مرے پاس اورکوئی الفاظ نہیں انسان کی زبان جب خدا کی کارسازیوں کو بیان کرتی ہے تو اسی ناقص طریقے سے کرتی ہے میں خوب جانتا ہوں کہ یہ چیزیں فہم اور بیان سے باہر ہیں۔لیکن جب انسان ان کے ذکر کی جرات کرے تو اسے ان ہی بے معنی آوازوں سے جنہیں نطق کہتے ہیں کام لینا پڑتا ہے۔اگر یہ میری ضعیف الاعتقادی ہے کہ میں پچیس سال تک سانپوں کونہ مارنے کے باوجودان کے شر سے محفوظ رہنا محض اتفاق نہیں بلکہ تائید غیبی سمجھتا ہوں تو یہی سہی یہ ضعیف الاعتقادی میری جان کے ساتھ ہے

جن دنوں مزدوروں نے ہڑتال کی تھی اسی زمانے میں آشرم میں بنائی کے کام کے لیے ایک سائبان کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ابھی آشرم والوں کا شغل زیادہ تر کپڑا بننا تھا۔کتائی کا کام ہنوز جاری نہیں ہوسکا تھا۔

☆☆☆

اپاس

پہلے دو ہفتوں میں مزدوروں نے بڑی بہادری اور ضبط نفس سے کام لیا اور روزانہ بڑے عظیم الشان جلسے کرتے رہے۔ میں ان جلسوں میں انہیں ان کا عہد یاد دلاتا تھا اور وہ بلند آواز سے کہا کرتے تھے کہ ہمارا قول جان کے ساتھ ہے۔

مگر آخر میں ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ جس طرح جسمانی کمزوری کی علامت یہ ہے کہ آدمی بات بات پر جھلانے لگتا ہے اسی طرح ہڑتال کی کمزوری اس کے ظاہر ہونے لگی کہ ہڑتالیوں کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ جو کام پر جایا کرتے تھے روز بروز زیادہ تہدید آمیز ہوتا گیا اور مجھے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ لوگ فساد نہ کر بیٹھیں۔ جلسوں کی حاضری بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ جو لوگ آتے بھی تھے ان کے چہروں پر مایوسی اور بے دلی برستی تھی آخر ایک دن یہ اطلاع آئی کہ ہڑتالی کندھا ڈالے دیتے ہی۔ میں بہت گھبرایا۔ اس تردد میں پڑ گیا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ میں ایک بڑی ہڑتال کا تجربہ تھا مگر یہاں بالکل نئی صورت تھی۔ مزدوروں نے میرے کہنے سے عہد کیا تھا اور اسے میری موجودگی میں بار بار دہرایا تھا۔ مجھے س عہد کو توڑنے کا خیال بھی گوارا نہ تھا۔ اب خدا جانے اس کی تہہ میں میرا غرور تھا یا مزدوروں کی محبت یا حق کی لگن۔

ایک صبح کو مزدوروں کے جلسے میں یکایک مجھے اس تاریکی میں روشنی کی جھلک نظر آئی۔ خود بخود میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے "جب تک ہم ہمت سے کام لے کر اس ہڑتال کا کوئی تصفیہ نہ کر لیں یا کارخانوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق نہ کر

لیں اس وقت تک میں اپاس کروں گا''۔

مزدور سناٹے میں آ گئے۔ آنسو ان کے رخساروں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ہڑتالیوں کے مجمعے سے آواز آئی ''آپ نہیں ہم اپاس کریں گے۔ غضب خدا کا ہم آپ کو اپنی خاطر اپاس کرنے دیں! ہماری خطا معاف کر دیجیے۔ اب ہم اپنے عہد سے ہرگز نہ ہٹیں گے''۔

میں نے کہا ''تمھیں اپاس کرنے کی ضرورت نہیں تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے عہد پر قائم رہو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس روپیہ ختم ہو گیا ہے اور ہمیں خیرات کے پیسے ہڑتال پر چلانا منظور نہیں۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ کسی قسم کی مزدوری کر کے پیٹ پالو۔ پھر ہڑتال چاہے جب تک چلے کوئی پرواہ نہیں اب رہا میرا اپاس یہ تو تبھی ٹوٹے گا جب ہڑتال کا تصفیہ ہو''۔

اس عرصے میں دلبھ بھائی کوشش کر رہے تھے کہ میونسپلٹی میں ہڑتالیوں کے لیے کام نکالیں مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مگن لال گاندھی نے یہ بات سمجھائی کہ ہمیں آشرم میں بنائی کی مدرسے کی بنیادیں قائم کرنے کے لے ریت کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ ریت اٹھانے کے کام میں کھپ سکتے ہیں۔ ہڑتالیوں نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ آگے آگے آنسویا ہیں سر پر ایک ٹوکری رکھ کر چلیں اور ان کے پیچھے پیچھے مزدوروں کا تانتا لگ گیا۔ یہ لوگ ندی کنارے سے ریت کے ٹوکرے بھر بھر کے لانے لگے۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ مزدوروں میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اروانہیں مزدوری بانٹنے والے تھک گئے۔

میرے اپاس میں ایک بڑی خرابی تھی میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے اور کارخانے کے مالکوں سے بڑے گہرے تعلقات تھے اور ان کے فیصلے پر میری فاقہ

کشی کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ میں جانتا ھتا کہ ستیا گرھی کی حیثیت سے میرے لیے ان کی مخالفت میں اپاس کرنا جائز نہیں بلکہ مجھے چاہیے کہ انہیں صرف مزدوروں کی ہڑتال سے متاثر ہونے دوں۔ اس لیے میں نے یہ اپاس مالکوں کے کسی قصور کی بنا پر نہیں کیا تھا۔ بلکہ مزدوروں کی غلطی کی مکافات میں کیا تھا جس میں میں بھی اپنے اپ کو شریک سمجھتا تھا۔ مالکوں کو سمجھانے بجھانے کا تو مجھے حق تھا مگر ان کی مخالفت سے اپاس کرنا گویا ان پر بے حد دباؤ ڈالنا تھا غرض اس اپاس کو مالکوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھی میں یہ جانتا تھا کہ اس کا اثر ان پر پڑے گا۔ مگر میں بالکل مجبو رتھا۔ میرا صریحی فرض تھا کہ میں اپاس کروں۔

میں نے مالکوں کو اطمینان دلانے کے لیے ان سے کہا ''آپ لوگوں کو میری خاطر اپنا طرز عمل بدلنے کی ضرورت نہیں'' مگر انہوں نے میرے یہ الفاظ سرد مہری سے سنے بلکہ مجھ پر چھپے طعنوں کی بوچھار کر دی۔ سچ پوچھیے تو انہیں اس کا حق بھی تھا۔

مالکوں کی ضد کے ذمہ دار اصل میں سیٹھ امالال تھے۔ ان کے استقلال اور خلوص کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ ایسے شخص کا مقابلہ کرنے میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ اسی لیے مجھے اس کا اور قلق تھا کہ میرے اپاس سے مخالفوں کے گروہ پر جس کے وہ سردار تھے دباؤ پڑ رہا تھا۔ ان کی بیوی سارلا دیوی مجھ سے بہنوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ میرے اس فعل سے انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

پہلے دن انسو یا بین اور چند دوستوں نے جن میں بعض مزدور بھی شامل تھے میرے اپاس کیا مگر میں نے سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے انہیں اس کے جاری رکھنے

سے روکا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو گئی کارخانوں کے مالک پسیجے یا ور تصفیے کی صورتیں تلاش کرنے لگے۔ انسویا بین کا گھر ان کے مشوروں کا مرکز بن گیا۔ انند شنکر جی دھروا نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کی گفتگو شروع کی اور آخر میں وہی سرپنچ مقرر کیے گئے۔ میرے اپاس کو تین ہی دن گزرے تھے کہ ہڑتال کا خاتمہ ہو گیا ل۔ مالکوں نے اس کی خوشی میں مزدوروں کو مٹھائی بانٹی اور اکیس دن کی ہڑتال کے بعد اس جھگڑے کا تصفیہ ہو گیا۔

تصفیے کی خوشی منانے کے لیے جو جلسہ ہوا اس میں کارخانوں کے مالک اور کمشنر صاحب بھی شریک تھے۔ صاب نے اس موقع پر مزدوروں کو نصیحت کی کہ "تمہیں ہمیشہ مسٹر گاندھی کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے" اس کے بعد ہی مجھ سے اور ان حضرت سے مقابلہ پڑ گیا۔ مگر اس عرصے میں صورت حال تبدیل ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ صاحب بھی بدل گئے تھے۔ اب وہ کھیدا کے پٹی داروں کو سمجھانے لگے کہ خبردار گاندھی کی باتوں میں نہ آنا۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کروں گا جو مضحک بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ اس کا تعلق شیرینی کی قسم سے ہے۔ مالکوں نے بہت سی مٹھائی منگوائی تھی مگر اسے ہزاروں مزدوروں میں بانٹنا کچھ سہل نہ تھا۔ آخر یہ قرار پایا کہ مٹھائی کھلے میدان میں اسی درخت کے نیچے بانٹی جائے جس کے تلے مزدوروں نے ہڑتال کا عہد کیا تھا کیونکہ کسی اور جگہ سب کو جمع کرنا مشکل تھا۔

مجھے یقین تھا کہ جن لوگوں نے اکیس دن تک انتہائی مضبوط سے کام لیا ہے وہ مٹھائی کی تقسیم کے وقت ترتیب سے کھڑے رہیں گے اور آپس میں دھکم دھکا نہیں

کریں گے مگر جب امتحان کا وقت آیا تو طوفان بدتمیزی برپا ہوا کہ تقسیم کرنا ناممکن ہو گیا۔ ہر دو منٹ کے بعد ان کی صفوں میں ابتری پڑ جاتی تھی۔ مزدوروں کے لیڈروں نے کوشش کی کہ ترتیب قائم رکھیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس ریل پیل دھکم دھکا میں بہت سی مٹھائی گر کر پیروں سے کچلی گئی۔ آخر تقسیم موقوف کرنا پڑی اور بقیہ مٹھائی بڑی مشکلوں سے مرزاپور میں سیٹھ امبالال کے بنگلے پر پہنچائی گئی۔ دوسرے دن اس بنگلے میں بڑی آسانی سے مٹھائی بٹ گئی

اس واقعے کا مضحکہ پہلو تو ظاہر ہے مگر اس کے افسوسناک پہلو کے متعلق دو ایک لفظ کہنے کی ضرورت ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ کہیں احمد آباد کے فقیروں نے یہ بات سن پائی تھی کہ ''ایک ٹیک'' درخت تلے مٹھائی تقسیم ہو گی اور ان کے گروہ کے گروہ وہاں آ پہنچے تھے۔ یہی لوگ بے صبری سے جھپٹے پڑتے تھے جس کی وجہ سے یہ ابتری پیدا ہوئی۔

ہمارا ملک افلاس کی چکی میں اس طرح پس رہا ہے کہ ہر سال فقیروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور ان بے چاروں کو فاقوں کے مارے خودداری اور انسانیت کا احساس تک باقی نہیں رہتا اور ہمارے مخیّر حضرات بجائے اس کے کہ ان کے لیے کام مہیا کریں اور انہیں اپنے قوت بازو سے روٹی کمانے پر مجبور کریں۔ انہیں بھیک دے کر ٹال دیتے ہیں۔

☆☆☆

کھیدا کی ستیا گرہ

تقدیر نے مجھے دم لینے کی مہلت بھی نہیں دی۔ احمد آباد کے مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی مجھے کھیدا کی ستیا گرہ میں شریک ہونا پڑا

کھیدا ضلع میں فصل کے برباد ہو جانے سے قحط کی سی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اور وہاں کے پٹی دارلگان کی وصولی کے لیے ملتوی کرانے کے مسئلے پر غور کررہے تھے۔ قبل اس کے کہ میں کاشتکاروں کو کوئی مشورہ دوں امرت لال جی ٹکر واقعات کی تحقیق کرنے کے بعد کمشنر سے مل کر گفتگو کر چکے تھے۔ موہن لال جی انڈیا اور شنکر لال جی پارکھ بھی اس تحریک میں شریک تھے اور انہوں نے دلبھ بھائی پٹیل اور سر گوکلد اس کا ہندو اس پارکھ آنجہانی کے توسط سے بمبئی کی مجلس وضع قوانین میں یہ مسئلہ اٹھایا۔ گورنر کے پاس بھی اس سلسلے میں کئی وفد جا چکے تھے۔ میں ان دنوں گجرات سبھا کا صدر تھا۔ سبھا کی طرف سے حکومت کو درخواست بھیجی جارہی تھی اور تار دیے جارہے تھے۔ کمشنر کے اہانت آمیز برتاؤ اور ان کی دھمکیوں کو سبھا صبر سے برداشت کررہی تھی۔ اس موقعے پر حکام کا طرز عمل اس قدر مہمل تھا اور اوچھا تھا کہ آج اس کا ذکر کیا جائے تو لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔ کاشتکاروں کا مطالبہ بالکل صاف تھا اور اس قدر معقول کہ اس کے قبول کرنے میں مشکل سے عذر ہو سکتا تھا۔

مال گزاری کے قواعد کی رو سے جب فصل روپے میں چار آنے یا اس سے کم ہو تو کاشتکار رواں سال کا لگان ملتوی کرانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ سرکاری اطلاع یہ تھی کہ فصل چار آنے سے زیادہ ہے اور کاشتکاروں کا دعویٰ تھا کہ چار آنے سے کم ہے۔

مگر حکومت ان کی فریاد کی شنوائی نہیں کرتی تھی۔ اور اس کے خیال میں کاشتکاروں کا یہ مطالبہ کہ اس کا فیصلہ پنچائیت کے ذریعے کیا جائے بغاوت سے کم نہ تھا۔ آخر جب ساری درخواستیں اور التجائیں بیکار ہو گئیں تو میں نے اپنے دوستوں سے صلاح کرنے کے بعد پٹی داروں کو یہ مشورہ دیا کہ ستیا گرہ شروع کر دیں۔

کھیدا کے رضا کاروں کے علاوہ اس معرکے میں میرے ساتھ دلبھ بھائی پٹیل‘ لال جی مینکر‘ انسویا بین‘ اندو لال جی یاجنگ‘ مہادیو دیسائی اور کچھ حضرات اور بھی شریک تھے۔ دلبھ بھائی پٹیل کو اس کام کی خاطر اپنی وکالت جو بڑے زور و شور سے چل رہی تھی ملتوی کرنا پڑی اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں پھر کبھی اس کے دوبارہ شروع کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

ہ نے اپنا صدر مقام ندیاد کے آناتھ آشرام کو قرار دیا کیونکہ اور کوئی مکان نہیں مل سکا۔ جس میں اتنے آدمیوں کی گنجائش ہو۔

ستیا گرہیوں نے حسب ذیل حلف نامے پر دستخط کیے

”اس علم کی بنا پر کہ ہمارے علاقے کی فصلیں روپے میں چار آنے سے کم ہیں ہم نے حکومت سے درخواست کی کہ لگان کی وصولی آئندہ سال تک ملتوی کر دی جائے۔ مگر حکومت نے ہماری التجا نہیں سنی۔ اس لیے ہم لوگ اس حلف کے ذریعے سے عہد کرتے ہیں کہ ہم اس سال حکومت کو پورا لگان یا اس کا جتنا حصہ باقی ہے نہ خود ادا کریں گے اور نہ اپنی رضامندی سے ادا ہونے دیں گے۔ حکومت جو قانونی کارروائی کرے ہم اس میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے اور اپنی عدم ادائیگی کے نتائج خوشی سے برداشت کریں گے۔ چاہے ہماری زمینیں ضبط ہو جائیں مگر ہم اپنی مرضی سے لگان ادا کر کے اپنے دعوے کو جھوٹے نہیں ہونے دیں گے اور اپنی عزت

میں بٹہ نہیں لگنے دیں گے۔ البتہ اگر حکومت سارے ضلع میں لگان کی دوسری قسط کی وصولی ملتوی کر دے تو ہم مین سے جتنے ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے ادا نہ کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ کہیں ان کی دیکھا دیکھی ان کے غریب بھائی اپنے مویشی بیچ کر یا روپیہ قرض لے کر لگان نہ دے دیں اور اپنے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اسی صورت میں ہمارے نزدیک مقدرت والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے غریب بھائیوں کی خاطر لگان ادا کرنے سے انکار کر دیں''۔

یہاں اس لڑائی کا حال بیان کرنے کے لیے دو باب سے زیادہ گنجائش نہیں۔ اس لیے بہ سی باتیں جن کی یاد مجھے پیاری ہے چھوڑنا پڑیں گی جو لوگ اس اہم معرکے کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنا چاہیں وہ کھیدا کی ستیا گرہ کی مفصل اور مستند پڑھیں جو شنکرلال جی پارکھ ساکن کٹھلاں ضلع کھیدا نے لکھی ہے۔

☆☆☆

''پیاز کا چور''

چمپارن ہندوستان کے دورافتادہ حصے میں واقع تھا اور ہم نے وہاں کے معرکے کی مفصل کیفیت اخباروں میں چھپنے نہیں دی تھی۔ اس لیے وہاں باہر کے لوگ نہیں آتے تھے مگر کھیدا کی حالت دوسری تھی۔ یہاں کے واقعات کی روز کی خبریں اخباروں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

گجراتیوں کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا اور انہیں اس سے بے حد دلچسپی تھی۔ لوگ اس کام کے لیے اپنا دھن دولت دینے کو تیار تھے ہم ان کے کہتے تھے کہ ستیا گرہ صرف روپے سے نہیں چل سکتی۔ اس میں روپے کی ضرورت اور چیزوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ باوجود میرے سمجھانے کے بمبئی کے سوداگروں نے ضرورت سے زیادہ روپیہ بھیج دیا چنانچہ جب ستیا گرہ ختم ہوئی تو ہمارے پاس کچھ رقم بچ رہی۔

ستیا گرھی رضاکاروں نے اس معرکے میں سادگی کے نئے سبق سیکھے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے بالکل سادہ زندگی اختیار کر لی مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ انہوں نے بہت سے تکلفات ترک کر دیے۔

پٹی دار کاشتکاروں کے لیے بھی یہ لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اسلیے ہمیں گاؤں گاؤں پھر کر انہیں اس کے اصول سمجھانے پڑے۔

اصل کام یہ تھا کہ کسانوں کے دل میں سے خوف دور کر دیا جائے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی جائے ہ سرکاری ملازم ان کے آقا نہیں بلکہ خادم ہیں کیونکہ

ان کو محصول ادا کرنے والوں کے روپے سے تنخواہ ملتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ مشکل ان کے دل میں اس فرض کا احساس پیدا کرنا تھا کہ نڈر ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں حفظ ماتقدم کا بھی خیال رکھنا چاہیے جہاں ان کے دل سے عہدہ داروں کا خوف دور ہوا وہ ان کی بدتمیزیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے اور ان کو روکنا ہمارے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ مگر ہم جانتے تھے کہ انہوں نے ذرا سی بدتمیزی کی تو ستیا گرہ کی ساری خوبی جاتی رہے گی جس طرح سنکھیا کے ایک قطرے سے سارا دودھ زہریلا ہو جاتا ہے۔

ہم نے انہیں یہ اصول سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر آگے چل کر معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ سبق میری توقع سے کم سیکھا۔ مجھے تجربے سے معولم ہوا کہ حسن اخلاق ستیہ گرہ کی جان ہے۔ یہاں حسن اخلاق سے مراد محض ظاہری شیریں کلامی نہیں بلکہ باطنی شیریں مزاجی اور اپنے مخالفوں کی دلی خیر خواہی ہے۔ سچے ستیا گرھی کے ہر فعل میں ان صفتوں کا رنگ جھلکتا ہے۔

ابتدا میں باوجود اس کے کہ لوگوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا حکومت کی طرف سے کوئی سختی نہیں ہوئی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان لوگوں کے قدم کو کسی طرح لغزش نہیں ہوتی تو تشدد شروع کر دیا۔ قرق اسینوں نے لوگوں کے مویشی بیچ ڈالے اور جو چیز ہاتھ آئی قرق کر لی جرمانے کے نوٹس جاری کیے گئے اور کہیں کہیں تیار فصلوں کی قرقی بھی ہوئی۔ اس سے کسان گھبرا گئے۔ بعض نے لگان ادا کر دیا اور بعض نے یہ کوشش کی کہ ان کی منقولہ جائیداد بیچ کر مطالبہ وصول کر لیا جائے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو آخر تک لڑنے کے لیے تیار رہے۔

اسی اثناء میں شنکر لال جی پارکھ کے ایک اسامی نے لگان ادا کر دیا۔ اس سے

بڑی بے چینی پھیل گئی۔ شنکر لال جی نے فوراً اس کی تلافی میں وہ زمین جس کا لگان ادا کیا گیا تھا مصافت خیر کے لیے وقف کردی۔ اس طرح انہوں نے اپنی عزت رکھ لی اور دوسروں کے لیے عمدہ مثال قائم کردی۔

سچدلوں کے دل مضبوط کرنے کے لیے میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ موہن لال جی پانڈیا کی سرکردگی میں ایک پیاز کے کھیت سے جس کی فصل بے انصافی سے قرق کرلی گئی ہے پیاز کاٹ لائیں میں نے لوگوں سے کہا کہ میرے نزدیک یہ فعل سول نافرمانی میں داخل نہیں ہے اور فرض کیجیے کہ ہو بھی تو بھی کوئی حرج نہیں پیاز کی فصلوں کی قرقی چاہے قانوناً درست ہو مگر اخلاقاً ناجائز ہے اور لوٹ سے کم نہیں۔ اس لیے لوگوں کا فرض ہے کہ قرقی کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور فصل کاٹ لائیں۔ یہ لوگوں کو اس کی تعلیم دینے کا بڑا اچھا موقع تھا کہ ستیا گرہ میں اپنی خواہش سے قید یا جرمانے کی سزا کیوں کر حاصل کی جاتی ہے۔ موہن لال جی کی یہ دلی آرزو تھی۔ انہیں یہ پسند تھا کہ یہ معرکہ یونہی ختم ہو جائے اور کوئی شخص ستیا گرہ کی راہ میں قید کی مصیبت نہ جھیل سکے۔ اس لیے وہ بڑی خوشی سے پیاز کی فصل کاٹنے پر راضی ہو گئے اور ساتھ آٹھ منچلے بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔

حکومت انہیں گرفتار کرنے پر مجبور تھی۔ ان کی گرفتاری سے لوگوں کا جوش اور بڑھ گیا۔ جب جیل خانے کی جھجک جاری رہی تو حکومت کی سختی لوگوں کی ہمتیں بڑھا دیتی ہ۔ مقدمے کی پیشی کے دن ہزاروں آدمیوں نے کچہری کو گھیر لیا پانڈیا اور ان کے ساتھی مجرم قرار دیے گئے۔ اور انہیں تھوڑے دن کی قید ہوگئی۔ میرے خیال میں یہ سزا بیجا تھی کیونکہ تعزیرات ہند میں چوری کی جو تعریف کی گئی ہے۔ وہ ان کے اس افعال پر عائد نہیں ہوتی تھی مگر ہم لوگ عدالتوں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ اس

لیے ہم نے اپیل دائر نہیں کیا۔

''مجرموں'' کے ساتھ ایک بہت بڑا جلوس جیل خانے کے دروازے تک گیا اور اس دن سے موہن لال جی پانڈیا کو لوگ ڈنگلی چور (پیاز کا چور) کے معزز لقب سے پکارنے لگے۔

اس ستیہ گرہ کا انجام میں دوسرے باب میں بیان کروں گا۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
www.
All rights reserved.
©2002-2006

کھیڈا کی ستیہ گرہ کا انجام

یہ ستیا گرہ خلاف توقع بہت جلد ختم ہوگئی۔ لوگوں میں مقابلے کا دم نہیں تھا۔ اور میں اس خیال سے کہ کہیں یہ غریب بالکل تباہ نہ کردیے جائیں لڑائی کو جاری رکھنے سے ہچکچاتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اسے ختم کرنے کی کوئی ایسی معقول صورت نکل آئے جو ایک ستیا گرہی کے لیے قابل قبول ہو۔ بالکل خلاف توقع ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ ندیاو تعلقے کے ستیا گہی کے لیے قابل قبول ہو۔ کے معاملت دار نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ اگر خوشحال پٹی دارلگان ادا کردیں تو غریب لوگوں سے وصولی ملتوی کردی جائے گی۔ میں نے اس مضمون کی تحریر مانگی۔ اس نے بھیج دی لیکن چونکہ معاملت دار صرف اپنے تعلقے کا ذمہ دار تھا اس لیے میں نے کلکٹر سے پوچھا کہ کیا آپ سارے ضلعے کے متعلق یہی وعدہ کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اس التوا کے حکام پہلے ہی جاری ہوچکے ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو کسانوں کا عہد پورا ہوگیا۔ یہ احکام ان کی خواہش کے مطابق تھے۔ اس لیے ہم ان کی تعمیل پر راضی ہوگئے۔

مگر اس تصفیے کے عمل درآمد میں وہ شفقت اور ملاطفت نہ تھی جو ستیا گرہ کے خاتمے پر ہونا چاہے۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ کلکٹر نے ایسا انداز اختیار کیا کہ گویا کوئی تصفیہ ہوا ہی نہیں۔ غریبوں کے التواء کا وعدہ کیا گیا مگر اس پر عمل بہت کم ہوا۔ یہ طے کرنا کہ کون کون غریب ہیں اصل میں خود کسانوں کا حق تھا مگر وہ اس سے کام نہ لے سکے۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں سے اپنے اس حق سے فائدہ

اٹھانے کی طاقت ہی نہ تھی۔ لوگوں نے ستیا گرہ کی فتح کی خوشیاں منائیں مگر میرے دل میں ذرا بھی جوش نہ تھا۔ کیونکہ یہ فتح محض برائے نام تھی۔ ستیا گرہ کی تحریک کامیاب تب کہلا سکتی تھی جب اس کے خاتمے کے وقت ستیا گرہیوں کی ہمت اور قوت پہلے سے بڑھ گئی ہو۔

مگر اس معرکے کے بالواسطہ اثرات بہت گہرے تھے اور اس وقت جو پودا لگایا گیا تھا وہ آج پھل دے رہا تھا۔ کھیدا کی ستیا گرہ سے گجرات کے کسانوں کی بیداری اور ان کی سیاسی تعلیم شروع ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی ہوم رول کی تحریک کا تھوڑا بہت اثر کسانوں پر ہوا تھا مگر کھیدا کی مہم کی بدولت تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں کی واقعی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کے دکھ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ انہیں اپنا حقیقی دائرہ عمل معلوم ہو گیا اور ان میں ایثار اور قربانی کی صلاحیت بڑھ گئی اور پھر یہ کیا کم ہے کہ دلبھ بھائی کو اس معرکے سے معلوم ہو گیا کہ انہیں خدا نے کس کام کے لیے بنایا ہے۔ اس نعمت کی قدر ہمیں پانچ سال سیلاب زدگان کی امداد کی مہم میں اور اس سال بردولی کی ستیا گرہ میں ہوئی۔ گجرات کی قومی زندگی میں نیا زور اور نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ پٹی دار کسانوں کو اپنی قوت کا پورا اندازہ ہو گیا۔ لوگوں کے دل پر یہ بات نقش ہو گئی کہ ان کی نجات خود ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور ان کے ایثار اور قربانی پر منحصر ہے کھیدا کے معرکے کے ستیا گرہ نے گجرات میں جڑ پکڑ لی۔

اس لیے اگرچہ مجھے ستیا گرہ کے خاتمے پر کچھ زیادہ خوشی نہ تھی لیکن کھیدا ک کسان کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ہماری کوشش کے لحاظ سے بہت ہے اور اب ہمیں ایسی تدابیر ہاتھ آ

گئی ہیں کہ جس کے ذریعے ہم حکومت کو دادرسی پر مجبور کر سکتے ہیں۔

پھر بھی کھیدا کے کسانوں نے ستیا گرہ کے اصلی بھید کو نہیں سمجھا تھا۔ آئندہ ابواب میں معلوم ہو گا کہ اس کی انہیں کیا سزا ملی۔

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اتحاد کی گرما گرمی

جس زمانے میں کھیدا کا معرکہ شروع ہوا۔ یورپ کی مہلک جنگ جاری تھی۔ اب اس میں بڑا نازک موقع آن پڑا اور وائسرائے نے ہر خیال کے لیڈروں کو دہلی میں ''وار کانفرنس'' میں شریک ہونے کے لے بلایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میرے اور لارڈ چیمفورڈ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کانفرنس کی شرکت کے لیے اصرار کیا۔

میں نے یہ دعوت قبول کر لی اور دہلی پہنچ گیا۔ مگر کئی وجوہ سے مجھے کانفرنس میں تامل تھا۔ جن میں ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں علی برادران شامل نہیں کیے گئے تھے۔ یہ دونوں ان دنوں جیل میں تھے۔ میری ان سے صرف دو ایک بار کی ملاقات تھی۔ مگر میں نے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر شخص انکی خدمات اور ان کی ہمت کی تعریف کرتا تھا۔ حکیم صاحب سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر پرنسپل رورا اور دین بندھو اینڈریوز نے بھی ان کی بہت تعریف کی تھی۔ شعیب قریشی صاحب اور خواجہ صاحب سے میں کلکتہ کی مسلم لیگ میں مل چکا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے بھی میری ملاقات ہو سکتی تھی۔ مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک نفس اور وطن پرست لوگ ہیں ان سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں۔ اس لیے میں ہر جگہ ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ تاکہ ان سے اچھی طرح ربط ضبط ہو جائے۔

مجھے جنوبی افریقہ میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل

ایک دوسرے سے صاف نہیں ہیں۔ میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ مجھے یہ معلوم ہو کہ انگلستان کے وزیر اعظم تک نے تسلیم کرلیا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ خلافت کے بارے میں صحیح ہے اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کو عہد کی پابندی سے مجبور کرنے میں مسلمانوں کا ساتھ دوں۔ یہ عہد اس قدر صاف لفظوں میں تھا کہ مجھے اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کیا۔

دوستوں اور نکتہ چینیوں نے خلافت کے بارے میں میرے رویہ پر بہت اعتراضات کیے ہیں مگر اسکے باوجود مجھے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا مطلق افسوس نہیں اگر ایسا موقع پھر آجائے تو میں پھر وہی طرز عمل اختیار کروں گا۔

غرض جب میں دہلی گیا تو میں نے پوری طرح ارادہ کرلیا کہ مسلمانوں کے مطالبات وائسرائے کے سامنے پیش کروں گا اس وقت تک خلافت کے مسئلے کی وہ صورت نہیں تھی جو آگے چل کر ہوگئی۔

دہلی پہنچ کر ایک بات اور پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے مجھے ''وار کانفرنس'' کی شرکت میں تامل ہوا۔ وین بندھو اینڈ ریوز نے مجھے شبہے میں ڈال دیا کہ کانفرنس میں میری شرکت اخلاقاً جائز ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا انگلستان کے اخباروں میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ برطانیہ نے اطالیہ سے خفیہ معاہدہ کرلیا ہے اگر یہ صحیح ہے تو آپ میرے لیے اینڈ ریوز کا قول کافی تھا۔ میں نے لارڈ چیمفورڈ کو ایک خط لکھا جس میں اپنے شبہات بیان کردیے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ آپ مجھ سے مل کر گفتگو کرلیجیے۔ ان سے اور ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر میفے سے طول وطویل بحث کے بعد میں کانفرنس میں شریک ہونے پر راضی ہوگیا۔

وائسرائے کی دلیلوں کا خلاصہ یہ تھا ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے وائسرائے کو برطانوی مجلس وزراء کے سب فیصلوں کی خبر ہوتی ہے؟ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا اور میں کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ برطانوی حکومت معصوم ہے۔لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ برطانوی سلطنت مجموعی حیثیت سے دنیا کے لیے مفید ہے اور ہندوستان کو اس کے ساتھ سے مجموعی حیثیت سے فائدہ پہنچا ہے تو کیا آپ کے خیال میں ہر ہندوستانی کا یہ فرض نہیں ہے کہ ایسی ضرورت کے وقت اس کی مدد کرے؟ میں نے بھی انگلستان کے اخباروں میں خفیہ معاہدے کی بحث دیکھی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان اخباروں کی قیاس آرائیوں کے سوا مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی ہے اور انہیں میں مطلق قابل اعتبار نہیں سمجھتا کیونکہ یہ اکثر بے سروپا خبریں گھڑ دیا کرتے ہیں۔کیا آپ ان اخباری چہ مگوئیوں کی بناء پر ایسے نازک وقت میں سلطنت کی مدد سے منہ موڑیں گے؟ لڑائی ختم کیجیے یا ہو جانے دیجیے۔پھر آپ دل کھول کر اخلاقی بحثیں چھیڑیے گا اور جو اعتراض کرنا ہو کر لیجیے گا آج اس کا موقع نہیں''۔

یہ استدلال نیا نہیں تھا۔مگر یہ ایسے موقع اور ایسے انداز میں پیش کیا گیا کہ مجھے نیا معلوم ہوا اور میں نے کانفرنس کی شرکت قبول کر لی۔مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق یہ طے ہوا کہ میں وائسرائے کو ایک خط لکھوں۔

☆☆☆

رنگروٹوں کی بھرتی

غرض کہ میں کانفرنس میں شریک ہوا۔ وائسرائے کا بہت اصرار تھا کہ تم رنگروٹوں کی بھرتی کے ریزولوشن کی تائید کرو۔ میں نے ہندی میں تقریر کرنے کی اجازت چاہی۔ وائسرائے نے اسے منظور کرلیا۔ مگر اس شرط پر کہ جو کچھ ہندی میں کہو اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کر دو۔ مجھے کوئی طویل تقریر نہیں کرنی تھی۔ میں نے صرف ایک جملہ کہا جس کا مضمون یہ تھا ''میں اپنی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اس ریزولوشن کی تائید کرتا ہوں''۔

بہت سے لوگوں نے مجھے ہندی میں تقریر کرنے پر مبارکباد دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ایسے جلسے میں ہندوستانی زبان سننے میں آئی۔ جب میں نے یہ مبارکبادیں سنیں اور مجھے معلوم ہوا کہ وائسرائے کے مشورے کے جلسوں میں مجھ سے پہلے کسی نے ہندوستانی میں تقریر نہیں کی تو مجھے اپنی قوم کی حالت پر بڑا صدمہ ہوا۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے میرا دل مرجھا کر رہ گیا ہو۔ غضب خدا کا ہندوستان کے اندر جلسہ ہو ہندوستان کے معاملات پیش ہوں اور ہندوستانی زبان میں تقریر کرنا ممنوع ہو۔ اور میری طرح کوئی اپنی زبان میں تقریر کر گزرے تو مبارکباد کے قابل سمجھا جائے! اسی قسم کے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ ہماری پستی کس حد تک پہنچ چکی ہے۔

یہ ایک جملہ جو میں نے کانفرنس میں کہا میرے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کانفرنس اور اس ریزولوشن کا خیال میرے دل پر چھا گیا۔ دہلی کے قیام کے دوران مجھے ایک فرض انجام دینا تھا یعنی وائسرائے کو خط لکھنا تھا۔ یہ کوئی سہل کام نہ تھا۔ میں

حکومت اور ملک دونوں کی اغراض کو مدنظر رکھ کر اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس خط میں ظاہر کر دوں کہ میں کانفرنس میں کیوں شریک ہوا اور صاف صاف بتا دوں کی ملک کو حکومت سے کیا توقعات ہیں۔

میں ں ے اس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لوکمانیہ تلک علی برادران جیسے لیڈر کانفرنس میں شریک نہیں کیے گئے اور بہت تفصیل سے لکھا کہ جنگ نے جو صورتحال پیدا کر دی ہے اس کے سبب ہندوستانی کم از کم اس قدر سیاسی حقوق چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے مخصوص مطالبات یہ ہیں۔

وائسرائے کانفرنس کے بعد ہی شملہ چلے گئے تھے۔ اس لیے میں نے یہ خط وہیں بھیجا اس کے مضمون کو بہت اہم سمجھتا ہوں اور جواب جلدی چاہتا تھا اس لیے اسے ڈاک سے نہیں بھیج سکتا تھا۔ مگر باوجود عجلت کے کسی ایسے ویسے شخص کے ہاتھ بھیجنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی پاک نفس آدمی خود جا کر وائسرائے گل لاج میں یہ خط پہنچا دے۔ پرنسپل رورا اور آئیڈ ریوز نے کیمرج مشن کے نیک دل پادری مسٹر آئر لینڈ کو تجویز کیا۔ انہوں نے کہا "اگر آپ مجھے یہ خط دکھا دیں اور میں اس کے مضمون کو اچھا سمجھوں تو میں اس کے لے جانے کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے خط دکھانے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں کوئی رنج کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے وہ خط پڑھا اس کا مضمون پسند کیا اور اسے پہنچانے پر تیار ہو گئے۔ میں نے دوسرے درجے کا کرایہ دینا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ میں ڈیوڑے درجے پر سفر کرنے کا عادی ہوں چنانچہ باوجود اس کے کہ رات کا سفر تھا میں ڈیوڑھے ہی درجے میں گئے۔ ان کی سادگی اور صاف گوئی کی وجہ سے مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ ایسے پاک نفس آدمی کے ہاتھ خط بھیجنے کی برکت سے نتیجہ حسب دلخواہ نکلا۔ اس سے

مجھے بڑا اطمینان ہوا اور میرا راستہ صاف ہو گیا''۔

میرا دوسرا فرض یہ تھا کہ رنگروٹ بھرتی کروں۔ اس کی یہی صورت تھی کہ میں کھیڑا سے ابتدا کروں اور سب سے پہلے اپنے رفیقوں کو بھرتی ہونے کی دعوت دوں۔ چنانچہ ندیاد پہنچتے ہی میں نے دلبھ بھائی اور دوسرے دوستوں سے مشورے کے لیے جمع کیا۔ ان میں سے بعض نے اس تجویز کو ناپسند کیا۔ جنھوں نے پسند کیا انہیں بھی اس کی کامیابی میں بہت شبہ تھا۔ جن لوگوں کو میں دعوت دینا چاہتا تھا انہیں سرکار سے بالکل محبت نہ تھی۔ سرکاری ملازموں کا جو تلخ تجربہ انہیں ہوا تھا اس کی یاد ابھی تازہ تھی۔

پھر بھی دوستوں کی یہ رائے ہوئی کہ کام شروع کر دینا چاہیے۔ پہلا قدم اٹھاتے ہی میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ میری امیدوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ستیا گرہ کے زمانے میں تو لوگ بیل گاڑی بے کرائے کے دے دیا کرتے تھے اور جہاں ایک رضا کار کی ضرورت ہوتی تھی وہاں دو موجود ہوتے تھے مگر اب رضا کار تو ایک طرف گاڑی تک کرائے پر نہ ملتی تھی۔ مگر ہم لوگ ہمت ہارنے والے آسامی نہ تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پیدل سفر کریں تاکہ گاڑی کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ ہمیں روز بیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب لوگ گاڑی نہیں دیتے تھے تو ان سے یہ توقع رکھنا فضول تھا کہ ہمیں کھانا کھلائیں گے اور ہمارے لیے مناسب بھی نہ تھا کہ ان پر اس کا بار ڈالیں۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ ہر رضا کار اپنے اپنے تھیلے میں اپنا کھانا لے کر چلے۔ بستر کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ گرمی کے دن تھے۔

ہم ہر جگہ جلسے کرتے جاتے تھے۔ جلوں میں مجمع تو خاصا ہو گیا تھا مگر رنگروٹ ایک دو سے زیادہ نہیں بنتے تھے۔ لوگ ہم سے اس قسم کے سوال کیا کرتے تھے

’’آپ اہنسا کے قائل ہو کر ہمیں ہتھیار اٹھانے کی صلاح کیسے دیتے ہیں؟‘‘ ’’گورنمنٹ نے ہندوستان کے لیے کیا کیا ہے جو ہم اس کا ساتھ دیں؟

پھر بھی ہماری کوششوں کا اثر ہونے لگا۔ لوگوں نے خاصی تعداد میں نام لکھوائے اور ہمیں یہ امید ہوگئی کہ پہلی کھیپ بھیجنے کے بعد بھرتی کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ میں نے کمشنر سے اس بارے میں مشورہ شروع کر دیا کہ رنگروٹ کہاں رکھے جائیں۔

ہر قسم کے کمشنر دہلی کی وار کانفرنس کے نمونے پر مشورے کے جلسے کر رہے تھے۔ چنانچہ گجرات میں بھی ایک جلسہ ہوا اور مجھے اور میرے رفیقوں کو دعوت دی گئی۔ ہم لوگ شریک ہوئے تو مجھے یہاں دہلی کے جلسے سے بھی زیادہ یہ بات محسوس ہوئی کہ ایسی جگہ میرے جیسے شخص کے لیے گنجائش نہیں۔ اس غلامی اور چاپلوسی کی فضا میں میرا دل الجھتا تھا۔ میں نے یہاں کسی قدر طویل تقریر کی مجھے جو کچھ کہنا تھا اس میں حکام کو خوش کرنے والی کوئی بات نہ تھی بلکہ دو چار جملے ایسے تھے جس سے انہیں تکلیف ہوئی۔

میں لوگوں کو رنگروٹ بننے کی ترغیب دلانے کے لیے چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر شائع کرتا تھا۔ ان میں میں نے منجملہ اور دلیلوں کے اس دلیل پر کام کیا تھا کہ ’’برطانوی حکومت نے ہندوستان پر جو مظالم کیے ہیں ان میں سے وہ قانون جس کی رو سے قوم کی قوم ہتھیاروں سے محروم کر دی گئی تاریخ کی نظر میں سب سے بڑا ظلم سمجھا جائیگا۔ اگر ہم قانون اسلحہ کو منسوخ کرنا چاہتے ہیں اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے اچھا موقع اور کیا ہو گا۔ اگر متوسط طبقہ اس آڑے وقت میں حکومت کا ساتھ دے تو حکومت کے دل سے بے اعتمادی دور ہو جائے گی۔ اور ہتھیاروں کی بندش اٹھا دی جائے گی‘‘۔

یہ بات کمشنر کو ناگوار ہوئی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ باوجود اس کے کہ ہمارے آپ کے خیالات میں اختلاف ہے۔ آپ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ میں نے جہاں تک ہو سکا نرم اور مہذب الفاظ میں اپنے نقطہ نظر کی حمایت کی۔

میں نے وائسرائے کے نام جو خط لکھا تھا اس کا مضمون یہ ہے۔

''آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنے ۲۶ اپریل کے خط میں وہ وجود عرض کی تھیں جن کی بناء پر مجھے کانفرنس میں شرکت میں تامل تھا۔ مگر آپ سے ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل کر لینے کے بعد میں اس میں شریک ہونے پر راضی ہو گیا جس کا بڑا سبب وہ خلوص تھا جو مجھے آپ کی ذات سے ہے۔ مجھے کانفرنس کی شرکت میں سب سے قوی اعتراض یہ تھا کہ لوکمانیہ تلک مسز بسینٹ اور علی برادران جیسے با اثر لیڈر اس میں شریک نہیں ہوئے۔ میرا اب تک یہی خیال ہے کہ یہ بہت بڑی غلطی تھی اور میری ناقص رائے میں اس غلطی کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ حکومت ان لیڈروں کو صوبہ وار کانفرنس میں جواب ہونے والی ہیں مدعو کرے اور ان کے مشورے سے فائدہ اٹھائے۔ میری مودبانہ گزارش ہے کہ کسی حکومت کو یہ جرات نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے لیڈروں کو جو اتنی بڑی جماعتوں کے نمائندے ہیں ناقابل توجہ سمجھے۔ خواہ ان کے خیالات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ اسی کے ساتھ میں بڑی خوشی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں کانفرنس کی کمیٹیوں میں مختلف خیال کے لوگوں کو آزادی اظہار رائے کی اجازت دی گئی۔ خود میں نے اپنی رائے کا اظہار اس کمیٹی میں کیا جس کی ممبری کا مجھے فخر تھا اور کانفرنس میں خاص کر کے نہیں کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے لیے کانفرنس کی خدمت کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ جو ریزولوشن پیش ہوں

ان کی تائید کروں۔ چنانچہ میں نے بغیر کسی شرط کے تائید کی۔ میں اپنے قول کو عمل کی صورت دینے کے لیے تیار ہوں اور اس خط کے ساتھ اپنی درخواست بھیج رہا ہوں۔ اس کے منظور ہوتے ہی کام شروع کر دوں گا''۔

''میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں اس نازک وقت میں اپنے وعدے کے مطابق سلطنت برطانیہ کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے جس کے زیر سایہ عنقریب نو آبادی کا درجہ حاصل کرنے کی ہمیں آرزو ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم سلطنت کا ساتھ اسی توقع کی بناء پر دے رہے ہیں کہ اس کے ذریعے ہم اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ جو اپنا فرض ادا کرتا ہاس کا حق خود بخود قائم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ہندوستان والے یہ سمجھتے ہیں کہ جن اصطلاحات کی طرف آپ کی تقریر میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کانگریس لیگ سکیم کے عام اصولوں پر مبنی ہوں گی تو کچھ بے جا نہیں سمجھتے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی خیال سے کانفرنس کے بہت سے ممبروں نے حکومت کی پوری پوری امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے''۔

''اگر میرے ہموطن میرے کہنے پر چلتے تو میں کانگریس کے تمام ریزولوشن واپس کرا لیتا اور جنگ کیدوران میں ''ہوم رول'' یا ''ذمہ دار حکومت'' کا نام بھی نہ آنے دیا۔ میں مادر ہند کے سارے صحیح الجسم نوجوانوں کو ایسے نازک وقت میں سلطنت کی خدمت کے لیے حاضر کر دیتا اور مجھے یقین ہے کہ اس قربانی کی بدولت ہندوستان سلطنت کا محبوب ترین رفیق بن جاتا۔ اور نسل و قوم کے امتیازات خود بخود مٹ جاتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اس گرم جوشی سے حکومت کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور ملک پر اب اسی طبقے کا اثر ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ سے آنے کے بعد کسانوں سے بہت سابقہ رہا ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا

ہوں کہ وہ ہوم رول کی تحریک سے متاثر ہو چکے ہیں۔ میں کانگریس کے پچھلے اجلاس میں موجود تھا۔اور میں نے اس کی ریزولوشن کی تائید کی تھی کہ ہندوستان کو اس معیاد کے اندر جو پارلیمنٹ تجویز کرے کامل ذمہ دارانہ حکومت دے دی جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہیکہ یہ اقدام خطرے سے خالی نہیں ہے مگر جب تک ہندوستان کو جلد سے جلد ہوم روم حاصل ہونے کی امید نہ دلائے جائے' ان کا مطمئن ہونا ممکن نہیں۔آپ یقین کیجیے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس مقصد کے لیے بڑی بڑی قربانی کرنے کو تیار ہیں اور یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سلطنت کی جاں نثاری ہمارا فرض ہے۔جس کے سایہ عاطفت میں ہمیں نوآبادی کا درجہ حاصل کرنے کی آرزو اور امید ہے۔ ہمارا مقصد جلد تر حاصل ہونے کی یہی صورت ہے کہ ہم دل و جان سے سلطنت کی خدمت میں مصروف ہو جائیں اور اسے دشمنوں ک نرغے سے بچائیں۔ ہماری قوم اس بدیہی حقیقت کو نہ سمجھے تو خودکشی کی مرتکب ہوگی اگر ہم اس نازک وقت میں سلطنت کے آڑے آئیں تو ہوم رول ہمیں خود بخود مل جائے گا''۔

غرض اس کا تو مجھے یقین ہے کہ ہمیں جتنے آدمی مل سکیں سلطنت کی حفاظت کے لیے حاضر کر دینا چاہئیں مگر مالی امداد کے بارے میں مجھے تامل ہے۔کسانوں سے ملنے جلنے اور ان کی حالت دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان پہلے ہی اپنی مقدرت سے زیادہ رقم سلطنت کے خزانے کی نذر کر چکا ہے۔یہ صرف میری رائے نہیں بلکہ میرے اکثر ہم وطنوں کا یہی خیال ہے۔

میں اور میرے بہت سے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ اس کانفرنس نے ہمیں سلطنت کے مشترکہ مفاد کے لیے اپنی جانیں نثار کرنے کی دعوت دے کر' نوآبادیوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا ہے۔مگر ہماری حالت ان سے مختلف ہے۔ ہم ابھی تک

شرکائے سلطنت کے زمرے سے باہر ہیں۔ ہماری جاں نثاری آئندہ ترقی پر مبنی ہے میں نے صاف صاف عرض کر دیاہ کہ یہ امید کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو اپ سے اور اپنے ملک سے بے وفائی ہو جاتی۔ میں اس معاملے میں سودا نہیں کرنا چاہتا مگر یہ سمجھ لیجیے کہ امیدیں پوری نہ ہوں تو اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ایک اور بات فرض کر دینا ضروری ہے کہ آپ نے ہم سے اپیل کی ہے کہ اندرونی جھگڑے مٹا دو۔ اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم حکام کے ظلم چپ چاپ سہیں تو اس کا مقابلہ کروں گا۔ آپ کو اپیل کرنا ہے تو حکام سے کیجیے کہ کسی تنفس سی بدسلوکی نہ کریں ہر معاملے میں رائے عامہ سے مشورہ کریں اور اس کا احترام ہر وقت مدنظر رکھیں۔

چمپارن میں میں نے اس ظلم کا انسداد کر کے' جو پشت ہا پشت سے ہوتا چلا آیا تھا یہ دیکھا دیا کہ ایک نہ ایک دن برطانوی انصاف کا بول بالا ہو کر رہتا ہے۔ کھیدا میں جو لوگ حکومت کو کوستے تھے' انہیں آج یہ محسوس ہو گیا ہے کہ جب حق ان کی طرف ہو اور وہ اس کی خاطر قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو حکومت ان کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اس طرح میں نے جو کام چمپارن اور کھیدا میں کیاہ اسے میری نمایاں اور مخصوص خدمات جنگ میں شمار کرنا چاہیے یہی جدوجہد میری جان ہے۔ مجھ سے یہ فرمائش کرنا کہ اسے روک دو گویا مجھے خودکشی کی دعوت دینا ہے۔ اگر میں ہر شخص کو بہیمی قوت کی جگہ' روحانی قوت یعنی محبت کی قوت سے کام لینے پر آمادہ کر سکوں تو آپ کو دکھا دوں کہ ساری دنیا مل کر بھی ہندوستان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اس لے میں دن رات ریاضت میں مصروف رہتا ہوں۔ کہ اپنی ذات کو قربانی کے ابدی قانون کا نمونہ بنا کر اہل نظر کے سامنے پیش کروں جب کبھی میں کوئی اور مشغلہ اختیار کرتا ہوں تو اسی نیت سے کرتا ہوں کہ اس قانون کی فضیلت ظاہر ہو جائے۔

میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزراء کے کہیے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل ان کے درد سے بے چین ہے اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے اس درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہے۔ سلطنت کی حفاظت کی یہی صورت ہے کہ اسلامی ممالک کے حقوق کی دل و جان سے حمایت کی جائے۔ مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام مدنظر رکھا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ ہوم رول کا جلد سے جلد منصفانہ تصفیہ کر دیا جائے۔ میری یہ گزارش اس لیے ہے کہ مجھے انگریز قوم سے محبت ہے اور میں ہر ہندوستانی کو انگریزوں کا وفادار بنانا چاہتا ہوں۔

☆☆☆

قریب مرگ

رنگروٹوں کی بھرتی میں میں نے اتنی محنت کی کہ میری صحت نے جواب دے دیا۔ ان دنوں میری غذا مونگ پھلی کا تیل اور لیمو تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ذرا سی غفلت میں تیل کا استعمال اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ اور صحت کو ضرر پہنچ جاتا ہے پھر بھی کبھی مجھ سے بے اعتدالی ہو ہی گئی۔ اس کے اثر سے مجھے خفیف سی پیچش ہو گئی۔ میں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ شام کو جیسا میں اکثر کیا کرتا تھا۔ آشرم چلا گیا۔ اس زمانے میں حتی الامکان دوا کا استعمال نہیں کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک وقت کھانا نہ کھاؤں تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی اور واقعی دوسرے دن صبح کا ناشتہ ناغہ کر دینے سے بہت مجھے بہت سکون ہو گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ پوری صحت تب ہی ہو گی جب میں کئی وقت کا فاقہ کروں یا اگر بہت خواہش ہو تو پھلوں کے افشردے پر قناعت کروں۔

ایک روز کوئی تہوار تھا۔ میں نے کستوار بائی سے کہہ دیا تھا کہ میں دن کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مگر انہوں نے ترغیب دلائی اور راور لالچ میں آ گیا۔ چونکہ میں یہ عہد کر چکا تھا کہ دودھ یا دودھ کی کوئی چیز استعمال نہیں کروں گا۔ اس لیے انہوں نے خاص میرے لیے گیہوں کا میٹھا دلیہ پکایا تھا اور اس میں گھی کی جگہ تیل ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیالہ بھر مونگ کی دال بھی میرے سامنے رکھ دی۔ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت مرغوب تھیں اس لیے میں نے بڑے شوق سے کھائیں۔ میں سمجھتا تھا کہ بس اتنا کھاؤں گا کہ نقصان کا اندیشہ نہ ہو' کستورا بائی بھی خوش ہو جائے اور

مجھے ذائقے کی لذت مل جائے مگر شیطان تاک میں بیٹھا تھا۔تھوڑا سا کھانے کی جگہ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔موت کے فرشتے کے لیے یہ دعوت کافی تھی۔ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے سخت پیچش ہوگئی۔

اسی دن شام کو مجھے ندیا د واپس جانا تھا۔بڑی مصیبت سے میں سابرمتی کے اسٹیشن تک پہنچا جس کا فاصلہ آشرم سے سوا میل سے زیادہ نہیں ہے۔احمد آباد سے دلبھ بھائی ساتھ ہو لیے۔انہیں میرے چہرے سے معلوم ہوگیا کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔مگر میں نے ان پر یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ مجھے کس قیامت کی تکلیف ہے۔

دس بجے رات کو ہم ندیاد پہنچے۔ہندو آشرم جہاں ہم لوگ مقیم تھے اسٹیشن سے صرف آدھ میل ہے مگر یہ فاصلہ اس وقت دس میل سے کم نہ تھا۔کسی نہ کسی طرح میں آشرم پہنچ گیا۔مگر درد کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔پاخانہ کرنے میں کسی قدر درد تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی شرم آئی مگر مجبوری تھی۔پھول چند جی نے فوراً کموڈ مہیا کیا۔ سب لوگ تردد کی حالت میں میرے گرد جمع ہوگئے وہ بڑی محنت سے میری خدمت کررہے تھے لیکن میرے درد کو دور کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔اور میری ضد نے انہیں اور بے دست وپا کردیا تھا۔میں نے طبی امداد سے قطعی انکار کیا۔مجھے اپنی حماقت کی سزا بھگتنا قبول تھا مگر دوا کرنا قبول نہ تھی۔اس لیے وہ بیچارے حسرت سے دیکھتے تھے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔مجھے چوبیس گھنٹے میں تیس چالیس دست آئے۔ میں نے غذا بالکل ترک کردی یہاں تک کہ ابتدا میں پھلوں کے افشردے سے بھی پرہیز کیا۔بھوک نام کو نہ تھی۔میں سمجھا کرتا تھا کہ میری کاٹی لوہے کی ہے مگر اب دیکھا کہ میرا جسم مٹی کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے۔اس میں مرض کے مقابلے کی قوت

بالکل نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر کانوگالے نے آکر مجھے بہت سمجھایا کہ دوا پی لو مگر میں نے کسی طرح منظور نہیں کیا۔ پھر انہوں نے کہا اچھا میں انجکشن دیتا ہوں؟ میں اس پر راضی نہیں ہوا۔ اس زمانے میں انجکشن کے متعلق میری معلومات اس قدر غلط تھیں کہ میں سمجھتا تھا کہ ہر انجکشن میں سیرم؟ ہوتا ہے آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ جو انجکشن ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا تھا وہ نباتاتی مادے کا تھا۔ مگر اس وقت یہ علم بے کار تھا۔ دست برابر جاری رہے اور میں بالکل پست ہو گیا۔ اس تکان سے مجھے بخار ہو آیا اور سرسامی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میرے دوست اور گھبرائے اور انہوں نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ مگر وہ ایسے مریض کا کیا علاج کرتے جو ان کی بات سنتا ہی نہیں تھا؟

سکیٹھا مبالال اپنی نیک دل بیوی کے ساتھ ندیاد پہنچے۔ انہوں نے میرے دوستوں سے مشورہ کیا اور مجھے نہایت احتیاط سے اپنے مرزاپور (احمد آباد) والے بنگلے میں لے گئے۔ اس بیماری میں جس محبت اور بے نفسی سے میری خدمت کی گئی شاید ہی کبھی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ مگر ایک خفیف سی حرارت ہر وقت رہتی تھی اور میرے جسم کو روز بروز تحلیل کر رہی تھی۔ مگر مجھے یہ خیال ہو گیا کہ میری بیماری طول پکڑے گی اور میں جانبر نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے سکیٹھا مبالال کے یہاں میری خبر گیری انتہائی محبت اور توجہ سے ہوتی تھی مگر میری طبیعت الجھنے لگی اور میں نے بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ مجھے آشرم پہنچا دو۔ میرے اصرار سے وہ بیچارے مجبور ہو گئے۔

میں آشرم میں بستر علالت پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ کہ ولبھ بھائی پٹیل یہ خبر لائے کہ جرمنی کو کامل شکست ہو گئی اور کمشنر نے کہلا بھیجا ہے کہ اب رنگروٹوں کی ضرورت نہیں۔ یہ سن کر مجھے بڑی تسکین ہوئی کہ اب اس معاملے میں دردسری نہیں کرنا ہو گی۔

اب میں پانی کا علاج کر رہا تھا۔ اس سے کسی قدر فائدہ تھا مگر جسم کو از سر نو بنانا کوئی سہل کام نہ تھا۔ میرے طبی مشیر بہت تھے اور انہوں نے طرح طرح کے مشورے دیے مگر میں کسی غذا یا دوا کے استعمال پر راضی نہ ہوا۔ ان میں دو تین نے کہا کہ آپ دودھ کے ترک کا عہد کر چکے ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ یخنی پیا کیجیے اور اس کے جواز میں آیوروید کی سند پیش کی۔ ایک نے انڈے کے استعمال پر اصرار کیا مگر میرے پاس سب کے لیے ایک ہی جواب تھا ''مجھے معاف کیجیے''۔

میں غذا کے بارے میں شاستر کی سند کا قائل نہیں تھا۔ یہ مسئلہ میری زندگی کا اہم جز تھا اور میری زندگی کے اصول بیرونی سند کے پابند نہیں تھے۔ اگر میرا جینا ان اصولوں کے ترک کرنے پر موقوف تھا تو مجھے ایسا جینا منظور نہیں تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے بارے میں اس اصول کو توڑ دوں جس کی پابندی پر میں بار ہا اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کو مجبور کر چکا تھا!

میری عمر میں یہ پہلی طویل بیماری تھی۔ اس میں مجھے اپنے اصولوں کے امتحان کا بہت اچھا موقع ملا۔ ایک رات میں بالکل مایوس ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ موت آ پہنچی ہے۔ میں نے انسویا بین کو بلا بھیجا۔ وہ بیچاری فوراً دوڑی آئیں۔ ولبھ بھائی ڈاکٹر کانوزگا کو لے کر پہنچے انہوں نے میری نبض دیکھی اور کہا ''آپ کی نبض اچھی خاصی چل رہی تھی۔ کسی قسم کا خطرہ مطلق نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ انتہائی کمزوری سے اعصاب نے جواب دے دیا ہے''۔ مگر مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ ساری رات جاگتے گزری۔

صبح ہوگئی اور موت نہیں آئی پھر بھی میرے دل سے یہ خیال کسی طرح نہیں نکلتا تھا کہ خاتمہ نزدیک ہے اور میں سوائے سونے کے اوقات میں ہر وقت آشرم والوں

سے گیتا پڑھوا کر سنتا تھا۔ میں نے خود پڑھ نہیں سکتا تھا۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جہاں ذرا بات کی دماغ ہل جاتا تھا۔ زندگی کی خواہش مطلق نہ رہی تھی کیونکہ محض جینے کی خاطر جینا مجھے کبھی گوارا نہ تھا۔ اس بے بسی اور معذوری کی حالت میں نفس شماری کرنا اور اپنے دوستوں اور رفیقوں سے خدمت لینا اور اپنے جسم کو تحلیل ہوتے دیکھنا میرے لیے سوہان روح تھا۔

ایک دن اسی طرح موت کے انتظار میں پڑا تھا کہ ڈاکٹر نلوا کی ایک عجیب و غریب آدمی کو ساتھ لے کر آئے۔ یہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے یہ کوئی مشہور آدمی نہ تھے مگر ان کی صورت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ بھی میری طرح خبطی ہیں۔ وہ اپنا علاج آزمانے کے لیے آئے تھے انہوں نے گرانٹ میڈیکل کالج میں اپنی تعلیم قریب قریب مکمل کر لی تھی مگر سند نہیں لی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ برھمو سماج کے رکن تھے کیلکر جی کہلاتے تھے ان کے منوج میں بے حد خود آرائی اور ضد تھی۔ یہ برف کے علاج کا کلمہ پڑھتے تھے اور مجھے اپنا تختۂ مشق بنانا چاہتے تھے۔ ہم نے ان کا نام برف کا ڈاکٹر رکھ دیا۔ انہیں یقین ہے کہ انہوں نے بہت سی ایسی باتیں معلوم کی ہیں جن کی با قاعدہ ڈاکٹروں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اپنی اور میری بدقسمتی سے وہ مجھے اپنے طریقہ علاج کا معتقد نہ کر سکے۔ میں ان کے اصولوں کو ایک خاص حد تک تسلیم کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں انہوں نے بعض نتیجے نکالنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔

بہر حال ان کی دریافت کیے ہوئے اصول صحیح ہوں یا غلط میں ان پر راضی ہو گیا کہ وہ میرے جسم کو تختۂ مشق بنائیں۔ مجھے خارجی علاج میں کوئی تامل نہ تھا۔ ان کا علاج یہ تھا کہ سارے جسم پر برف رکھ دی جائے۔ ان کو میرے علاج میں جس

کامیابی کا دعویٰ ہے کی تو میں تصدیق کر سکتا ہوں۔ مگر میں اس میں شک نہیں کرتا کہ ان کے علاج سے میرے دل میں نئے سرے سے امید اور قوت پیدا ہوگئی اور اس کا اثر لامحالہ میرے جسم پر بھی ہوا۔ مجھے بھوک لگنے لگی اور دس پانچ منٹ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اب انہوں نے میری غذا کی اصلاح پر توجہ کی۔ انہوں نے کہا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ کچے انڈوں کا استعمال کریں تو آپ کی طاقت بہت جلد عود کر آئے گی۔ انڈا دودھ کی طرح بے ضرر چیز ہے اسے ہرگز گوشت نہیں کہہ سکتے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ سب انڈوں میں بچے نہیں ہوتے؟ بازار میں خالی انڈے بھی ملتے ہیں''۔ مجھے خالی انڈوں کا استعمال بھی گوارا نہ تھا پھر بھی مجھے اتنا افاقہ ہوگیا کہ میں ملکی مسائل کی طرف توجہ کرنے لگا''۔

☆☆☆

رولٹ بل اور میری کشمکش

میرے دوستوں اور ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر تم تبدیلی آب و ہوا کے لیے ماتھران چلے جاؤ تو تمہاری طاقت بہت جلد عود آئے گی چنانچہ میں وہاں گیا لیکن ماتھران کا پانی بہت شور تھا اس لیے وہاں کے قیام میں مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ پیچش کے سبب سے بواسیر کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اور قضائے حاجت کے وقت بہت شدید درد ہوتا تھا۔ اس لیے میں غذا کے خیال سے لرزتا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی مجھے ماتھران سے بھاگنا پڑا۔ اب شنکر لال بینکر میری صحت کے محافظ بن گئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر دلال کو دکھاؤ۔ چنانچہ ڈاکٹر دلال کو بلائے گئے مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ ہر معاملے کا فیصلہ فوراً کر دیتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ جب آپ دودھ استعمال نہ کریں آپ کے بدن میں طاقت نہیں آسکتی اور اگر اسی کے ساتھ آپ فولاد اور سنکھیا کے انجکشن بھی لیں تو پھر میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو پرسے مضبوط اور توانا بنا دوں گا۔

میں نے کہا "آپ انجکشن شوق سے دیجیے' مگر دودھ کا معاملہ اور ہے اس کے متعلق میں عہد کر چکا ہوں' ڈاکٹر نے پوچھا "آخر معلوم تو ہو آپ کا عہد کیا ہے؟"

میں نے انہیں اپنے عہد کی تاریخ سنائی اور جب یہ معلوم ہوا کہ گائے بھینسوں کے تھن جلائے جاتے ہیں مجھے دودھ سے نفرت ہوگئی۔ علاوہ اس کے میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ دودھ انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے اس لیے میں نے اس کے ترک کا عہد کر لیا۔ کستوربائی جو میری پٹی کے پاس کھڑی یہ باتیں سن رہی تھیں بول پڑیں

"تو پھر آپ کو بکری کا دودھ پینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟"

ڈاکٹر بھی ان کے ہمنوا ہو گئے انہوں نے کہا "آپ بکری کا دودھ پئیں تب بھی کام چل جائے گا"میں لالچ میں آ گیا۔ستیا گرہ شروع کرنے کے شوق نے میرے د میں زندگی کی دبی ہوئی آرزو کو ابھار دیا تھا۔اس لیے میں نے اپنے عہد کی لفظی پابندی پر اکتفا کی اس کے اصل منشا کے گلے پر چھری پھیر دی۔یہ سچ ہے کہ عہد کرتے وقت میرے دل میں صرف گائے اور بھینس کے دودھ کا خیال تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم سب جانوروں کے دودھ پر حاوی تھا۔اس کے علاوہ جب میرا یہ عقیدہ تھا کہ دودھ انسان کی قدرتی غذا نہیں تو پھر میرے لیے کسی قسم کے دودھ کا استعمال جائز نہ تھا۔ان سب باتوں کے علم کے باوجود بکری کا دودھ پینے پر راضی ہو گیا۔زندگی کی خواہش حق کی محبت پر غالب آ گئی اور طالب حق نے ستیا گرہ کی لڑائی چھیڑنے کے شوق میں اپنے پاک نصب العین کا دامن مصلحت کے چھینٹوں سے ناپاک کر دیا یہ بات اب تک میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے اور گناہ کی خجالت مجھے چین نہیں لینے دیتی میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہوں کہ بکری کا دودھ چھوڑ دوں۔لیکن ہنوز دنیا داری کی آخری زنجیر یعنی خدمت کا شوق مجھے پابند کیے ہوئے ہے۔مجھے اپنے غذائیاتی تجربے اس لیے عزیز ہیں کہ میں انہیں اہمسا کی منزل کے مرحلے سمجھتا ہوں۔لیکن بکری کا دودھ پینے میں مجھے اہمسا کے ترک کرنے کا خیال سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی ترک حق یعنی نقص عہد کے خیال سے ہوتی ہ۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے حق کی معرفت اہمسا کی معرفت سے زیادہ حاصل ہے اور میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر تو نے حق کا دامن چھوڑ دیا تو اہمسا کے معمہ کا حل کبھی نہ ہو گا۔حق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جو عہد کرے اسے لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے پورا

کرے۔ موجودہ صورت میں میں نے اپنے عہد کی لفظی پابندی تو کی مگر اس کے معنی کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ سب جاننے کے باوجود مجھے راہ عمل صاف نظر نہیں آئی یا شاید یہ بات ہے کہ مجھ میں سیدھے راستے پر چلنے کی ہمت نہیں۔ سچ پوچھیے تو ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ شک جب ہی ہوتا ہے کہ ایمان نہ ہو یا ایمان میں استواری نہ ہو۔ میں دن رات دعا مانگتا ہوں ''اے میرے داتا مجھے ایمان عطا کر''۔

غرض میں نے بکری کے دودھ کا استعمال شروع کر دیا۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ڈاکٹر دلال نے مجھ پر آپریشن کیا اور وہ کامیاب ہوا۔ جوں جوں میرے بدن میں طاقت آتی گئی میرے دل میں زندگی کی خواہش بڑھتی گئی خاص کر اس لیے کہ خدا کو مجھ سے ایک کام لینا تھا۔

ابھی مجھے اچھی طرح صحت نہیں ہو پائی تھی کہ اخبار دیکھتے دیکھتے میری نظر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر پڑ گئی۔ اس کی تجویز دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ شنکر لال بینکر اور عمر سبحانی نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کو اس معاملے میں فوری کارروائی کرنا چاہیے۔ مگر میں ایک مہینے کے بعد اس قابل ہوا کہ احمد آباد جا سکوں۔

دلبھ بھائی قریب قریب روزانہ مجھے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میں نے ان سے اپنے اندیشے کا ذکر کیا ار کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ وہ کہنے لگے ''ہم ایسی صورت میں کیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے جواب دیا اگر چند آدمی مل جائیں جو مقاومت کے حلف نامے پر دستخط کر دیں اور اس پر بھی یہ قانون پاس ہو جائے تو ہم فوراً ستیہ گرہ شروع کر سکتے ہیں۔ اگر میری حالت یہ نہ ہوتی تو میں تن تنہا مقابلے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ اور رفتہ رفتہ اور لوگ بھی میرا ساتھ دیتے مگر اس بے بسی کی حالت میں اس مہم کا بیڑا نہیں اٹھا سکتا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ میرے دوستوں کو جمع ہو کر مشورہ کرنے کی

دعوت دی گئی۔ میرے خیال میں رولٹ کمیٹی کی تجاویز اس شہادتوں کی بنا پر جو اس کے ساتھ شائع ہوئی تھیں ہرگز جائز نہیں قرار دی جا سکتی تھیں اور کوئی قوم جس میں ذرا سی خودداری بھی ہو انہیں کسی طرح قبول نہیں کر سکتی تھی۔

خدا خدا کر کے مجوزہ جلسہ آشرم میں منعقد ہوا۔ اس میں بیس آدمی سے زیادہ نہیں بلائے گئے تھے۔ ان میں سے ولبھ بھائی کے علاوہ مسز سروجنی نائڈو، مسٹر ہارنیمین، سیٹھ عمر سبحانی شنکر لال بینکر وار انسویا بین کے نام یاد رہ گئے ہیں اس جلسے میں ستیا گرہ کا حلف نامہ مرتب کیا گیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے سب حاضرین نے اس پر دستخط کیے۔ میں اس زمانے میں کوئی اخبار نہیں نکالتا تھا مگر کبھی کبھی روزنامہ اخباروں میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہتا تھا۔ یہی صورت میں نے اس موقعے پر اختیار کی۔ شنکر لال بینکر نے بڑے زور و شور سے یہ تحریک اٹھائی اور مجھے پہلی بار ان کی بے نظیر قوت عمل اور قوت تنظیم کا اندازہ ہو گیا۔

مجھے ملک کی کسی انجمن سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ ستیا گرہ کے نئے حربے سے کام لینے پر تیار ہو گی۔ اس لیے میری تحریک پر ایک خاص انجمن ستیا گرہ سبھا کے نام سے قائم کی گئی۔ اس کے ممتاز ارکین سب بمبئی کے تھے اس لیے وہی اس کا صدر مقام قرار پایا۔ تھوڑے دن میں کھیڑا کی لڑائی کا سارا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ ہزارہا آدمی حلف نامے پر دستخط کر رہے تھے۔ بلیٹن نکالے جا رہے تھے جدھر دیکھیے جلسے ہو رہے تھے۔ میں ستیا گرہ سبھا کا صدر بنایا گیا مجھے بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ مجھ میں اور سبھا کے تعلیم یافتہ ممبروں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکتا۔ میرا اس پر زور دینا کہ سبھا کی کارروائی گجراتی میں ہو اور اسی قسم کی اور انوکھی باتیں، ان کے لیے بڑی زحمت کا باعث تھیں۔ مگر اس کا مجھے اعتراف ہے کہ ان میں سے اکثر نے میرے مزاق کو

برداشت کرنے میں بڑی فراخدلی دکھائی پھر بھی ابتدا سے کچھ ایسا نظر آتا تھا کہ یہ سبھا زیادہ دن چلنے والی نہیں۔ مجھ پر یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ اس کے بعض ممبروں کو میرا حق اور اہمسا پر زور دینا ناگوار ہے۔ پھر بھی شروع میں ہماری تحریک زور شور سے چلی اور روز بروز قوت پکڑتی گئی۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

وہ شاندار منظر!

ادھر تو رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف شورش بڑھ رہی تھی اور ادھر حکومت کو ضد تھی کہ کمیٹی کی تجاویز پر عمل کر کے رہے گی۔ چنانچہ اس نے رولٹ بل چھپ کر شائع کر دیا۔ میں عمر بھر ایک بار ہندوستان کی مجلس وضع قوانین میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں اور یہ وہی موقع تھا جب رولٹ بل پر بحث ہو رہی تھی۔ شاستری جی نے ایک پر جوش تقریر میں حکومت کو آگاہ کر دیا کہ سمجھ بوجھ کر قدم اٹھائے۔ ان کی خطابت کا دریا موجیں مار رہا تھا اور وائسرائے ان کے چہرے پر نظر جمائے محویت کے عالم میں ان کی تقریر سن رہے تھے۔ ان کے الفاظ میں اس قدر سچائی اور اس قدر جوش تھا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے یہ گمان ہو گیا کہ وائسرائے کے دل پر بھی ان کا اثر پڑا ہو گا۔

لیکن جاتے تو وہ جو سوتا ہو۔ جو جان بوجھ کر سوتا بن جائے اسے کون جگا سکتا ہے۔

حکومت کی بعینہ یہی حالت تھی۔ اسے تو بس یہی فکر تھی کہ قانونی ضابطے کی رسم پوری ہو جائے اسے جو فیصلہ کرنا تھا پہلے ہی کر چکی تھی۔ شاستری جی کے متنبہ کرنے کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ایسی صورت میں میری فریاد گویا نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ میں نے چند وائسرائے کو منت سماجت سے سمجھایا، ان کے نام نج کے خط لکھے، ضابطے کی درخواستیں بھیجیں مگر یہ ساری کوششیں بے کار گئیں۔

یہ مسودہ ابھی تک قانون کی حیثیت سے گزٹ میں شائع نہیں ہوا تھا کہ میرے پاس مدارس والوں کی طرف سے دعوت آئی۔ میں بہت کمزور تھا اور سفر بہت دور دراز کا تھا مگر میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے جو کچھ ہو جانا ضرور چاہیے۔ ان دنوں میں اتنی بلند آواز میں گفتگو نہیں کر سکتا تھا کہ سارا جلسہ سن سکے۔ یہ معذوری ایک حد تک ابھی باقی تھی اگر میں کھڑے ہو کر تقریر کروں تو تھوڑی دیر میں سارے بدن سے کانپنے لگتا ہوں اور شدت سے اختلاج شروع ہو جاتا ہے۔

جنوبی ہند والوں کی صحبت میں بہت جلد گھل مل جاتا ہوں۔ تامل اور تیلگو بھائیوں پر میں خاص طور پر اپنا حق سمجھتا ہوں کیونکہ جنوبی افریقہ میں میں نے برسوں ان کے ساتھ مل کر کام کیا تھا اور ان نیک لوگوں ن بھی ہمیشہ اس حق کو نباہا ہے۔ میرے پاس جو دعوت نامہ آیا تھا اس پر کستوری رنگ آئنگر آنجہانی کے دستخط تھے۔ مگر راہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس دعوت کے محرک در پردہ راجا گوپال چاری ہیں۔ اصل میں میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

راجا گوپال چاری ان دنوں نئے نئے سلم سے مدارس میں آئے تھے۔ ان کے دوستوں نے جن میں کستوری رنگ آئنگر آنجہانی بھی تھے انہیں مجبور کیا تھا کہ مدارس میں وہ کر وکالت کریں۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ یہاں انہیں فوری کام کا موقع زیادہ ملے گا۔ ہم لوگ مدارس میں ان ہی کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بات مجھے دو دن کے بعد معلوم ہوئی کہ ہم ان کے مہمان ہیں۔ وہ مکان کستوری رنگ آئنگر جی کا تھا۔ اس لیے میں سمجھتا تھا کہ وہی ہمارے میزبان ہیں مگر مہادیو ڈیسائی نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ انہوں نے راجا گوپال چاری سے جو اپنے خلقی حجاب کے سبب دور دور رہتے تھے۔ بہت جلد دوسری کر لی اور مجھ سے بھی کہا کہ دیکھیے ان سے ضرور تعلقات

بڑھائیے۔

میں نے یہی کیا۔ ہم روزانہ لڑائی کے منصوبوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت تک مجھے سوائے جلسے کرنے کے اور کوئی پروگرام نہیں سوجھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر رولٹ بل تمام مدراج سے گزر کر قانون بن جائے تو مجھے سول نافرمانی کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی نافرمانی کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ حکومت اس کا موقع دے میں سوچتا تھا کہ اگر ایسا موقع نہ ملے تو ہمارے لیے دوسرے قوانین کی سول نافرمانی کرنا جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ یہ مسئلہ اور اسی قسم کے اور مسائل ہمارے موضوع بحث رہا کرتے تھے۔

آئنگر جی نے لیڈروں کی ایک چھوٹی سی کانفرنس اس معاملے میں سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے منعقد کی۔ منجملہ اور لوگوں کے دجیا ررا گھوچاری جی نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھے یہ رائے دی کہ ستیا گرہ کے فن کا ایک مفصل دستورالعمل مرتب کرو جو تمام جزئیات پر حاوی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ خبر آئی کہ رولٹ بل قانون کی حیثیت سے شائع کر دیا گیا ہے۔ اس رات کو میں نے اس مسئلے پر غور کرتے کرتے سو گیا۔ پچھلے پہر میری آنکھ معمولی وقت سے ذرا پہلے کھل گئی۔ ابھی میں خواب بیداری کی سرحد پر تھا کہ یکایک اس مسئلے کا حل میری سمجھ میں آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں نے خواب دیکھا ہو۔ میں نے یہ سارا قصہ راجا گوپال چاری سے بیان کیا۔

رات مجھے خواب میں یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں عام ہڑتال کرانا چاہیے۔ ستیا گرہ تزکیہ نفس کا نام ہے۔ ہماری لڑائی مقدس

لڑائی ہے اس لیے میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ ہم آغاز تزکیہ نفس کے عمل سے کریں۔ اس لیے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی اپاس کریں۔ اپنا کاروبار موقوف رکھیں اور اپنا وقت عبادت میں بسر کریں۔ مسلمانوں کے یہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ نا جائز ہے۔ اس لیے اپاس چوبیس گھنٹے کا رکھا جائے۔ اس کا اندازہ مشکل ہے کہ سب صوبے ہماری اس التجا کو قبول کریں گے یا نہیں مگر بمبئی مدراس، بہار اور صوبہ سندھ کی طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ میرے خیال میں اگر انہی چار صوبوں میں اچھی ہڑتال ہو جائے تو کافی ہے۔

یہ تجویز راجا گوپال چاری کے دل میں کھب گئی۔ اور دوستوں سے ذکر آیا تو انہوں نے بھی اسے بہت پسند کیا۔ میں نے ایک مختصر سی اپیل کا مسودہ بنایا۔ ہڑتال کے لیے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کی تاریخ رکھی گئی مگر آگے چل کر یہ تاریخ بدل دی گئی اور ۱۶ اپریل مقرر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تیاری کی مہلت بہت کم ملی۔ لیکن ہمیں اس کام میں عجلت مد نظر تھی اس لیے اس سے زیادہ دور کی تاریخ رکھنا مناسب نہ تھا۔

انسان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اتنی جلدی سب انتظام کیونکر ہو گیا۔ اس دن سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر میں ایک ایک گاؤں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ کتنا شاندار تھا وہ منظر!

☆☆☆

وہ یادگار ہفتہ!(۱)

جنوبی ہند میں ایک مختصر سا دورہ کرنے کے بعد میں ۴ اپریل کو بمبئی پہنچ گیا۔ شنکر لال بینکر نے مجھے تار دے دیا تھا کہ ۶ اپریل کے معرکے میں آپ کو بمبئی میں موجود رہنا چاہیے۔

دہلی میں ۳۰ مارچ کو ہڑتال ہو چکی تھی وہاں سوامی شردھانند جی اور حکیم اجمل خان مرحوم کا طوطی بولتا تھا۔ انہیں ہڑتال کے التوا کا تار دیر میں پہنچا اس لیے اس کی تعمیل نہ کر سکے۔ دہلی میں جیسی ہڑتال ہوئی اس سے پہلی کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک ہو گئے۔ سوامی شردھانند جی سے جامع مسجد میں تقریر کرائی گئی۔ بھلا حکام ان باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور ان پر گولی چلائی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے بہت سے مارے گئے۔ دہلی میں جبر و تشدد کا دور دورہ ہو گیا۔ شردھانند جی نے مجھے تار دیا کہ فوراً دہلی پہنچو۔ میں نے تار پر جواب دیا کہ بمبئی میں ۶ اپریل منا کر میں سیدھا دہلی آؤں گا۔

جو واقعہ دہلی میں پیش آیا تھا قریب قریب وہی لاہور اور امرت سر میں گزرا۔ امرت سر سے میرے پاس ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی تاکیدی دعوت آئی۔ میں اس وقت تک دونوں صاحبوں سے بالکل واقف نہیں تھا۔ مگر میں نے ان سے وعدہ کیا کہ دہلی سے امرت سر آؤں گا۔

۶ اپریل کی صبح کو بمبئی والے ہزاروں کی تعداد میں چوپاٹی پر جمع ہو گئے اور انہوں نے سمندر پر اشنان کیا۔ اس کے بعد ان کا جلوس اٹھا کر دوار کی طرف روانہ ہو

گیا۔ اس جلوس میں کچھ عورتیں اور بچے بھی نظر آتے تھے۔ اور مسلمان بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ٹھاکر دوار سے مسلمان بھائی قریب کی ایک مسجد میں لے گئے اور وہاں انہوں نے مجھ سے اور مسٹر نائڈو سے تقریریں کرائیں۔ سیٹھ وٹھل داس جی جیر اجنی نے یہ تجویز پیش کی کہ اسی جگہ لوگوں سے ہندو مسلم اتحاد اور سودیشی کا عہد لیا جائے۔ لیکن میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ عہد کرنے یا عہد لینے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے اس وقت لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کیا کم ہے۔ عہد کرنے کے بعد اس سے پھرنے کا موقع نہیں رہتا اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے لوگ سودیشی کے عہد کے معنی اچھی طرح سمجھ لیں اور ہندو مسلم اتحاد کی پوری ذمہ داری محسوس کر لیں۔ میری رائے میں جو لوگ عہد کرنا چاہتے ہیں وہ کل صبح پھر کسی جگہ پر جمع ہوں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بمبئی میں ہڑتال پوری طرح کامیاب ہوئی سول نافرمانی کی تیاریاں بھی مکمل ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں دو تین تجویزوں پر غور کرنے کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ صرف وہی قوانین سول نافرمانی کے موضوع پر بنائے جائیں جن کی لاف ورزی عام طر پر ممکن ہو۔ لوگ ان دنوں نمک کے محصول کے بہت مخالف تھے اور عرصے سے اسے منسوخ کرانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ لوگ سمندر کے پانی سے اپنے گھروں میں نمک بنائیں اور اس طرح قانون نمک کی خلاف ورزی کریں۔ میری دوسری تجویز ممنوعہ کتابوں کی فروخت سے متعلق تھی۔ میری دو کتابیں ہندو سوراج اور ودیا ۴ ۵ جو ممنوع قرار دی جا چکی ہیں اس مقصد کے لیے بہت موزوں تھیں۔ سول نافرمانی کا سب سے سہل طریقہ یہی نظر آیا کہ یہ دونوں کتابیں چھاپ کر کھلم کھلا بیچی جائیں۔ اس

لیے یہ کتابیں مناسب تعداد میں چھپوائی گئیں اور یہ طے ہوا کہ شام کو فاقہ کشی کے بعد جو عظیم الشان جلسہ ہونے والا ہے اس کے ختم ہونے پر ان کے نسخے فروخت کیے جائیں۔

اس لیے ۶ اپریل کی شام کو والنٹروں نے فوج کی فوج ممنوع کتابوں کو لے کر بیچنے کے لیے نکلی اور مسز نائڈو موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں سب نسخے بک گئے۔ ان کتابوں کی آمدنی سول نافرمانی کے معرکے کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ان کی قیمت چار چار آنے تھی۔ مگر شاید ہی کسی نے مقررہ قیمت دینے پر اکتفا کیا ہو بہت سے لوگوں نے تو اپنی جیبیں جھاڑ کر جو کچھ تھا ایک نسخے کی قیمت میں دے دیا۔ پانچ پانچ اور دس دس روپے کے نوٹ ہر طرف سے برس رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے ایک نسخہ پچاس روپے میں خریدا یہ بات اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کر دی گئی تھیں کہ ممنوع کتابوں کے خریدنے سے وہ گرفتاری اور قید کے مستوجب ہوں گے۔ مگر تھوڑی دیر کے لیے لوگوں نے جیل کا خوف دل سے نکال دیا تھا۔

آگے چل کر معلوم ہوا کہ حکومت نے آسانی کے لحاظ سے یہ قانونی نکتہ نکالا ہے کہ ان کتابوں کا بیچنا ممنوعہ کتابوں کی فروخت کی حد میں نہیں آسکتا۔ ممانعت پہلے ایڈیشن کے بیچنے کی تھی اور یہ نسخے جو بیچے گئے ہیں حکومت کے خیال میں نئے ایڈیشن تھے اس خبر سے سب کو مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو ایک اور جلسہ سودیشی اور ہندو مسلم اتحاد کا عہد لینے کے لیے کیا گیا۔ وٹھل داس جی جیراجنی کو پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی جلسں میں بہت کم لوگ آئے۔ ان میں سے دو چار خواتین کے نام مجھے اب تک یاد

ہیں۔مرد بھی محدود سے تھے۔ میں حلف نامے کا مسودہ اپنے ساتھ لایا تھا۔اس پر دستخط لینے سے پہلے میں نے اس کا مطلب سب لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ حاضرین کی کمی پر مجھے نہ افسوس ہوا اور نہ تعجب۔ میں جانتا ہوں کہ عوام شورش اور ہنگامے کو پسند کرتے ہیں اور خاموش تعمیر کاموں سے گھبراتے ہیں اس کا تجربہ مجھے آج تک ہو رہا ہے۔

غرض ۷ اپریل کی شام کو دہلی اور امرتسر کے قصد سے روانہ ہو گیا۔ ۸ کو متھرا پہنچ کر میں نے یہ چرچا سنا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے والی ہے۔ متھرا کے بعد جس اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی وہاں اچاریا گڈوانی مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی اور کہا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں آپ کو تکلیف دوں گا۔

پلول کا اسٹیشن آنے سے پہلے مجھے ایک حکم نامہ دکھایا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ اپ کو پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت کی جاتی ہے کیونکہ آپ کی موجودگی سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔ پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اگلے اسٹیشن پر اتر جایئے۔ میں نے اترنے سے انکار کر دیا اور کہا ''مجھے پنجاب والوں نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔ میں وہاں شورش بھڑکانے نہیں بلکہ فرو کرنے جا رہا ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں سرکاری حکم کی تعمیل سے معذور رہوں''۔

اتنے میں گاڑی پلول پہنچی۔ مہادیو ڈیسائی میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ دہلی جا کر شردھانند جی کو اس واقعے کی اطلاع دیجیے اور وہاں کے لوگوں سے کہیے کہ سکون سے کام لیں۔ انہیں میری عدول حکمی کی وجوہ سمجھا دیجیے اور اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیجیے کہ ہماری فتح اسی میں ہے کہا گر مجھے سزا بھی ہو

جائے تو وہ پوری طرح امن قائم رکھیں۔

پلول کے اسٹیشن میں گاڑی اتار کر پولیس کی حراست میں دے دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں دہلی سے ایک گاڑی آئی۔ میں اس میں ایک تیسرے درجے پر بٹھایا گیا اور پولیس والے میرے ساتھ بیٹھے۔ متھرا میں یہ لوگ مجھے پولیس اسٹیشن لے گئے مگر وہاں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میرے متعلق کیا صورت اختیار کی جائے اور میں کہاں بھیجا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح چار بجے مجھے سوتے سے اٹھا کر ایک بمبئی جانے والی گاڑی پر سوار کر دیا گیا۔ دوپہر کو سوائی مادھوپور میں پھر اترنا پڑا۔ ڈاک گاڑی سے مسٹر براؤن انسپکٹر پولیس لاہور سے آئے اور انہوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔ اب میں ان کے ساتھ فرسٹ کلاس میں بٹھایا گیا۔ پہلے معمولی قیدی تھا اب جنٹلمین قیدی بن گیا۔ انسپکٹر صاحب نے سر انگل اور ڈائر کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ انہوں نے کہا لاٹ صاحب کا خیال تو آپ کے متعلق خراب نہیں مگر انہیں اندیشہ تھا کہ آپ کے پنجاب آنے سے نقص امن ہوگا۔ اسی قسم کی اور باتیں کرتے رہے آخر میں انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ خود ہی بمبئی واپس چلے جائیے اور یہ وعدہ کر لیجیے کہ پنجاب کی سرحد میں قدم نہ رکھیے گا۔ میں نے کہا کہ میں حکومت پنجاب کے اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں اور اپنی خوشی سے واپس ہرگز نہیں جاؤں گا انسپکٹر صاحب اور کوئی چارہ نہ دیکھا تو کہا کہ مجھے مجبوراً قانونی کارروائی کرنی پڑے گی میں نے پوچھا ”مگر یہ تو بتائیے کہ آخر میرے متعلق آپ کی تجویز کیا ہے؟“

انہوں نے کہا ”یہ تو مجھے خود معلوم نہیں۔ میں مزید احکام کا انتظار کر رہا ہوں۔ فی الحال تو میں آپ کو بمبئی لیے چلتا ہوں“۔

سورت پہنچ کر میں ایک دوسرے پولیس افسر کے سپرد کر دیا گیا بمبئی پہنچ کر اس

نے مجھ سے کہا۔ کہ آپ اب آزاد ہیں۔ مگر مناسب یہ ہے کہ آپ میرین لائن کے قریب اتر جائیں وہاں گاڑی کھڑی کرالوں گا۔ قلابہ اسٹیشن پر تو غالباً بڑی بھیڑ ہوگی میں نے کہا کہ میں خوشی سے آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا اس پر وہ خوش ہو گیا اور اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

غرض میں میرین لائن پر اترا۔ اتفاق سے ایک دوست کی گاڑی ادھر سے گزری تو انہوں نے مجھے ڈاکٹر جوہری کے گھر پہنچا دیا۔ راہ میں ان سے معلوم ہوا کہ میری گرفتاری کی خبر سن کر لوگ بہت برہم ہوئے اور ان کا جوش جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ پائدھونی کے قریب فساد کا اندیشہ ہے اور مجسٹریٹ اور پولیس وہاں پہنچ گئی ہے۔

میں نے ڈاکٹر جوہری کے ہاں قدم ہی رکھا تھا کہ انسویا بین اور عمر سبحانی آ پہنچے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ فوراً ہمارے ساتھ موٹر میں پائدھونی چلیے۔ لوگوں میں بے حد بے چینی پھیل گئی ہے۔ ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ بغیر آپ کے کام نہیں چلے گا۔

میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا پائدھونی کے قریب پہنچ کر آدمیوں کا جنگل نظر آیا۔ لوگ مجھے دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ فوراً ایک جلوس مرتب ہو گیا اور بندے ماترم اور اللہ اکبر کی صدائیں آسمان کی خبر لانے لگیں۔ پائدھونی پر سوار پولیس کا ایک دستہ نظر آیا۔ بالا خانوں سے اینٹیں برس رہی تھیں۔ میں نے لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سکون سے کام لیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اینٹوں کی بوچھاڑ سے بد کر نہیں نکل سکیں گے۔

یہ جلوس عبدالرحمٰن سٹریٹ سے مڑ کر افرڈ مارکیٹ میں جا رہا تھا کہ چوراہے پر پولیس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ جو اس لیے آئی تھی کہ ہمیں فورٹ کی طرف نہ جانے

دے۔ مجمع بہت گھنا تھا۔ لوگ پولیس کی صف توڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ اس ہنگامے میں میری آواز کام نہیں دے سکتی تھی۔ یکایک سواروں کے افسر نے مجمعے کو منتشر کرنے کا حکم دیا اور سواروں نے نیزے تان کر لوگوں پر حملہ کر دیا۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ میں بھی زخمی ہو جاؤں گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ نیزے موٹر کو چھوتے ہوئے نل گئے اور نیزہ بردار تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ مجمع درہم برہم ہو گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ روندے گئے کچھ زخمی ہوئے۔ اس آدمیوں کے جنگل میں نہ تو گھوڑوں کے گزرنے کی جگہ تھی نہ لوگوں کو بھاگنے کی راہ ملتی تھی۔ نیزہ بردار اندھا دھند کچلتے روندتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ عجیب ہولناک منظر تھا۔

مجمع منتشر کر دیا گیا۔ ہمارے موٹر کو آگے بڑھنے کی اجازت ملی۔ میں کمشنر کے دفتر کے سامنے اتر پڑا کہ ان سے پولیس کے ظلم کی شکایت کروں۔

☆☆☆

وہ یادگار ہفتہ! (۲)

میں مسٹر گریفتھ کے دفتر میں داخل ہوا۔ زینے کے دونوں جانب فوجی سپاہی سر سے پیر تک مسلح کھڑے تھے گویا لام پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ برآمدے میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اندر پہنچ کر دیکھا کہ مسٹر گریفتھ کے پاس مسٹر براڈننگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے جو منظر دیکھے تھے ان کی روداد کمشنر کو بیان کی۔ انہوں نے یہ مختصر جواب دیا "میں جلوس کو فورٹ نہیں جانے دینا چاہتا تھا کیونکہ وہاں ضرور فساد ہوتا جب لوگ سمجھانے سے نہیں مانتے تو میں نے مجبوراً پولیس کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔"

میں نے کہا "مگر آپ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا لوگوں کو گھوڑوں سے روندا جانا لازمی تھا۔

آخر سواروں کا دستہ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مسٹر گریفتھ بولے "ان باتوں کو آپ نہیں جانتے۔ ہم پولیس والے آپ سے بہت سمجھتے ہیں کہ آپ کی تعلیم کا لوگوں پر کیا اثر پڑے گا اگر ہم سختی سے کام نہ نکالیں تو معاملہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائے۔ آپ میری بات یاد رکھیے کہ لوگ آپ سے سنبھالے نہیں سنبھل سکتے تو وہ قانون توڑنے پر فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں مگر امن کی تعلیم ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ مانا کہ آپ کے اصول اچھے ہیں مگر عوام تو انہیں نہیں سمجھتے۔ وہ تو اپنی فطرت کے مطابق عمل کریں گے"۔

میں نے جواب دیا "اسی میں تو مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ لوگ فطرتاً تشدد

پسند نہیں بلکہ امن پسند ہیں'' دیر تک یہی بحث ہوتی رہی۔ آخر میں مسٹر گریفتھ نے کہا۔ ''فرض کیجیے آپ کو یقین ہو جائے کہ لوگ آپ کی تعلیم کو مطلق نہیں سمجھتے تو پھر آپ کیا کیجیے گا'' میں نے کہا ''اگر مجھے یہ یقین ہو جائے تو میں سول نافرمانی کو فوراً روک دوں گا''۔

''ہیں! آپ نے تو مسٹر براؤن سے کہا تھا کہ میں رہا ہوتے ہی سیدھا پنجاب جاؤں گا''۔

''ہاں میں سب سے پہلی ٹرین سے جانا چاہتا تھا مگر آج تو یہ ناممکن ہے''۔

''اگر آپ ذرا سا غور کریں تو آپ کو یقین ہو جائے کہ لوگ آپ کے اصول کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امرتسر میں کیا ہوا اور احمد آباد میں کیا ہو رہا ہے؟ جہاں دیکھیے لوگ آپے سے باہر ہیں۔ مجھے ابھی تک پوری خبریں معلوم نہیں ہوئیں۔ بعض جگہ تار کاٹ دیے گئے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے ان بلووں کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے یا کسی اور پر''۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گا۔ اگر احمد آباد کے بلوے کی خبر صحیح نکلی تو مجھے بے حد تعجب اور صدمہ ہو گا۔ اب رہا امرتسر تو وہاں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ نہ میں کبھی پنجاب گیا اور نہ مجھے وہاں کوئی جانتا ہے مگر یہ مجھے یقین ہے کہ اگر حکومت نے مجھے پنجاب جانے سے روکا نہ ہوتا تو میرے سبب سے وہاں امن قائم رکھنے میں بہت آسانی ہو جاتی۔ میرا داخلہ بند کر کے حکومت نے لوگوں کو خواہ مخواہ اشتعال دلایا''۔

غرض اس بحث کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا آخر میں کمشنر سے یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ میں جو پارٹی پر ایک جلسی کر کے لوگوں کو امن قائم کرنے کی ہدایت

کروں گا۔

چوپاٹی کے جلسے میں مس نے بہت دیر تقریر کی جس میں لوگوں کو عدم تشدد کے فرض کا احساس دلایا اور ستیا گرہ کی پابندی سمجھائیں۔ آخر میں میں نے کہا ''ستیا گرہ حق پرستوں کا حربہ ہے۔ ستیا گرہی عدم تشدد کا پابند ہوتا ہے۔ جب تک آپ خیال قول اور فعل سب میں عدم تشدد نہ برتیں گے میں عام ستیا گرہ کو نہیں چلا سکتا''۔

انسویا بین نے بھی احمد آباد کے بلوے کی خبر سنی تھی۔ وہاں کسی نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ انسویا بین گرفتار ہو گئی ہیں۔ کارخانوں کے مزدور یہ افواہ سن کر غصے سے مجنوں ہو گئے۔ انہوں نے کام بند کر دیا اور مار دھاڑ شروع کر دی اس ہنگامے میں ایک پولیس کا سپرنٹنڈنٹ جان سے مارا گیا۔

میں احمد آباد میں پہنچا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ لوگوں نے ندیاد کے اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹڑی اکھاڑ ڈالنے کی کوشش کی، ویرام گام میں ایک سرکاری افسر کو قتل کر دیا گیا اور احمد آباد میں مارشل لاء جاری ہے لوگ خوف سے نیم جان تھے۔ انہوں نے مجنونانہ جوش میں تشدد کیا اور اب وہ اس کی دگنی چوگنی سزا بھگت رہے تھے۔

اسٹیشن پر ایک پولیس کا افسر میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے مسٹر پریٹ کمشنر کے پاس لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ غصے سے بھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے بہت نرمی سے کہا ''مجھے اس بلوے کا بے حد افسوس ہے مگر میرے خیال میں مارشل لاء کی ضرورت نہیں۔ میں امن قائم رکھنے میں ہر قسم کی مدد دینے کو تیار ہوں۔ میں نے ان سے برمتی آشرم میں جلسہ کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۳ اپریل کو اتوار کے دن جلسہ ہوا۔ اسی روز یا اس کے

دوسرے دن مارشل لاء اٹھالیا گیا۔ میں نے جلسے میں لوگوں کو ان کے جرم کا احساس دلایا اور کہا کہ میں اس جرم کے کنارے میں تین دن اپاس کروں گا۔آپ لوگ بھی اپاس کریں اور آپ میں سے جن لوگوں نے تشدد کی حرکتیں کی ہیں وہ اپنے جرم کا اقرار کرلیں''۔

مجھے اپنے فرض کا پورا احساس تھا۔ یہ صدمہ میرے لیے ناقابل برداشت تھا کہ انہی مزدوروں نے جن کے ساتھ میں بہت دن رہا تھا اور جن سے مجھے بہت امیدیں تھیں اس بلوے میں حصہ لیا۔ میں بھی اپنے آپ کو ان کا شریک جرم سمجھتا تھا۔

جس طرح میں نے لوگوں کو نصیحت کی تھی کہ اپنے جرم کا اقرار کرلیں۔اسی طرح حکومت کو مشورہ دیا کہ ان کے جرم سے درگزر کرے۔مگر فریقین میں سے کسی نے میری صلاح نہ مانی۔

سر رامنی بھائی آنجہانی اور احمد آباد کے دوسرے معززین نے آکر مجھ سے کہا کہ ستیا گرہ کو ملتوی کردوانکے کہنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں خود ہی ارادہ کر چکا تھا کہ اس وقت تک ستیا گرہ کو موقوف رکھوں گا جب تک لوگ امن کا سبق نہ سیکھ لیں گے۔ یہ سب دوست خوش واپس آئے۔

مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میرے اس فیصلے سے تکلیف ہوئی۔ان کا یہ خیال تھا کہ اگر میں ان کی جگہ امن کی توقع رکھوں اور ستیا گرہ کو اس پر مشروط کردوں تو پھر عام ستیا گرہ کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ ان کی رائے کی مخالفت کرنا پڑی۔

میں نے کہا کہ اگر وہ لوگ جن کے ساتھ کام کرتا ہوں اور جن سے میں عدم تشدد

اور ملا کشی کی توقع رکھتا ہوں تشدد سے باز نہ رہ سکیں گے۔ تو واقعی ستیا گرہ کا چلانا ناممکن ہے۔ میرا محکم عقیدہ تھا کہ جو لوگ عوام سے ستیا گرہ کرانا چاہتے ہیں انہیں ان پر اتنا قابو ہونا چاہیے کہ انہیں مقررہ حد تک عدم تشدد کا پابند رکھ سکیں۔ اسی عقیدے پر میں آج بھی قائم ہوں۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میری ہمالیہ برابر غلطی

احمد آباد کے جلسے کے بعد میں سیدھا ندیاد گیا۔ وہیں میں نے اپنی تقریر میں ہمالیہ کے برابر غلطی کا فقرہ استعمال کیا جو آگے چل کر اس قدر مشہور ہوا مجھے احمد آباد میں ہی اپنی غلطی کا دھندلا سا احساس ہونے لگا تھا مگر جب ندیاد پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی تو کھیڈا ضلع کے ہزاروں آدمیوں کی گرفتاری کی خبر سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے کھیڈا اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو قبل از وقت ستیا گرہ کی دعوت دینے میں بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے عام جلسے میں اس کا اعتراف کیا۔ اس پر میرا خوب مضحکہ اڑایا گیا لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ جب تک انسان اپنی غلطیوں کو بڑھا کر دوسروں کی غلطیوں کو گھٹا کر نہ دیکھے اسے دونوں میں صحیح تناسب کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اور میرے نزدیک ہر ستیا گرہی کو اس اصول پر سختی سے عمل کرنا چاہیے۔

آیئے اب ذرا یہ دیکھیں کہ اس ہمالیہ برابر غلطی کی حقیقت کیا ہے۔ انسان سول نافرمانی کے قابل تبھی ہوتا ہے جب وہ ادب اور خلوص سے سلطنت کے قوانین کی اطاعت کر چکا ہو۔ ہم زیادہ تر قانون کی پابندی سزا کے خوف سے کرتے ہیں۔ خصوصاً ان ضابطوں کی جن کی بنا پر کسی اخلاقی اصول پر نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک ایماندار شریف آدمی کبھی چوری کا مرتکب نہیں ہوتا خواہ سزا کا خوف ہو یا نہ ہو۔ مگر یہی شخص بے تکلف اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کی رو سے اندھیرا ہو جانے کے بعد بائیسیل بغیر لیمپ کے نہیں چلانا چاہیے اور اسے ذرا بھی ندامت کا

احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر کوئی سمجھائے کہ اس معاملے میں احتیاط کیا کرو تو برا مانتا ہے۔ ہاں اگر یہ خوف ہو کہ میں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جاؤں گا تو وہ چار و ناچار ایسے ضابطوں کی پابندی کرتا ہے اس قسم کی پابندی اس کامل اطاعت کے حکم میں نہیں آتی جو ستیا گرہی سے مطلوب ہے۔ ستیا گرہی اجتماعی قوانین کی پابندی سمجھ بوجھ کر اور دل سے کرتا ہے کیونکہ وہ اسے اپنا پاک فرض سمجھتا ہے جو شخص اس قدر سختی سے اجتماعی قوانین کی پابندی کر چکا ہو وہی یہ فیصلہ کرنے کا اہل ہے کہ کون سے قاعدے اچھے اور منصفانہ ہیں اور کون سے برے اور غیر منصفانہ۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ معینہ صورتوں میں بعض مخصوص قوانین کی نافرمانی کرے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اس ضروری شرط کا خیال نہیں رکھا۔ میں نے لوگوں کو سول نافرمانی کی دعوت دی حالانکہ وہ ابھی تک اس کے اہل نہ تھے۔ یہی خطا مجھے ہمالیہ کے برابر معلوم ہوئی جیسے ہی میرا کھیدا ضلع میں داخل ہوا ہوں وہاں کی پرانی ستای گرہ کے واقعات میری نظروں میں پھر گئے اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوا کہ ایسی کھلی ہوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال اب مجھے یہ اچھی طرح محسوس ہوا کہ جب تک لوگ سول نافرمانی کی باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوں گے وہ اسے برتنے کے قابل نہیں ہوتے۔

یہاں اس اعتراض کی گنجائش ہے کہ جب ہماری قوم اور بہت سی قوموں کی طرح قانون کا حکم ٹالنے کی عادی ہے۔ تو اس سے یہ توقع کیوں کر ہو سکتی ہے کہ دفعتا سول نافرمانی کے اصلی قانونکو سمجھ جائے گی اور اس کے حدود سے باہر قدم نہ رکھے گی اس میں شک نہیں کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے گروہ کے لیے ان شرائط کی پوری پوری پابندی ناممکن ہے۔ اسی لیے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عام سول نافرمانی شروع کرنے سے پہلے آزمائے ہوئے پاک نفس رضاکاروں کی ای جماعت تیار کی

جائے جو ستیا گرہ کے اصولوں کو کما حقہ سمجھتی ہو۔ یہ رضا کار عوام کو ان اصولوں کی تعلیم دیں اور ہر وقت چوکس رہیں کہ لوگ راہ راست سے ہٹنے نہ پائیں۔

ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا میں بمبئی پہنچا۔ یہاں میں نے ستیا گرہ سبھا کے ذریعے رضا کار بھرتی کیے اور ان کی مدد سے لوگوں کو ستیا گرہ کے اصول سمجھانا شروع کر دیے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اس مضمون پر چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر لوگوں کو تقسیم کیے جاتے تھے۔

اس کام کے دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ لوگوں کو با امن ستیا گرہ کا شوق دلانا بہت مشکل ہے۔ رضا کار بہت کم ملے جو ملے بھی ان میں اکثر ایسے تھے جو باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے تھے نئے رنگروٹوں کی تعداد روز بروز کم ہونے لگی۔ مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ سول نافرمانی کی تربیت کے کامیاب ہونے میں میری توقع سے کہیں زیادہ دیر لگے گی۔

☆☆☆

''نوجیون'' اور ''ینگ انڈیا''

ادھر عدم تشدد کی تحریک آہستہ آہستہ ترقی کرتی جا رہی تھی اور ادھر حکومت کے جبر وتشدد کا بازار گرم تھا۔ خصوصاً پنجاب میں تو اس نے ظاہر داری کا پردہ بھی اٹھا دیا تھا۔ لیڈر قید میں تھے 'فوجی قانون (مارشل لاء) جو محض نام کو قانون ہے جاری تھا غیر معمولی عدالتیں قائم تھیں۔ ان عدالتوں کو عدل و انصاف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک مطلق العنان حاکم سے استبداد کا آلہ کار تھیں۔ بغیر کافی شہادت کے سزائیں دی جا رہی تھیں اور انصاف کا خون ہو رہا تھا امرتسر میں بے گناہ مرد اور عورتیں کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کی جا رہی تھیں۔ اس ذلت کے آگے میری نظروں میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام جس نے سارے ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو پنجاب کی طرف متوجہ کر دیا' کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

ایسی صورت میں میرا پنجاب جانا ضروری تھا۔ میں نے وائسرائے سے خط لکھ کر اجازت مانگی تار بھی دیا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں بغیر اجازت کے جاؤں گا تو حکومت مجھے پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے سے روکے گی اور مجھے مجبوراً سول نافرمانی کرنا پڑے گی۔ اس وقت میں عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔ سول نافرمانی کے لیے امن وامان کی فضا ضروری ہے مگر یہاں یہ صورت تھی کہ حکومت نے مظالم نے پنجاب کے لوگوں کے دل میں غصے کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ ایسی حالت میں میرے نزدیک داخلہ پنجاب کے حکم کی خلاف ورزی کرنا سول نافرمانی کے اصول کے خلاف تھا۔ اگر مجھے سول نافرمانی کا موقع بھی ملتا تو یہ خوف تھا کہ لوگوں کا

اشتعال اور بڑھ جائے گا اس لیے باوجود اس کے کہ میرے دوست مجھے پنجاب جانے کی رائے دے رہے تھے میں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ یہ میرے لیے زہر کا گھونٹ تھا مگر مجبوراً پینا پڑا۔ پنجاب سے روز نئے ظلم و جبر کی خبریں آتی تھیں اور میں بے بسی میں تلملا کر رہ جاتا تھا۔

اسی زمانے میں حکومت نے دفعتاً مسٹر ہارنیمین کو جن کی ارادت میں بمبئی کرانیکل نے بڑا زبردست اثر پیدا کر لیا تھا ملک بدر کر دیا۔ حکومت کا یہ فعل میرے نزدیک اس قدر مکروہ تھا کہ آج تک اس خیال سے گھن آتی ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مسٹر ہارنیمین شورش اور فساد کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ پر اعتراض کیا تھا کہ آپ کو ستیا گرہ کمیٹی کی اجازت کے بغیر حکومت پنجاب کے امتناعی حکم کی خلاف ورزی کا کیا حق تھا اور جب میں نے سول نافرمانی کو روکا تو انہوں نے میری تائید کی تھی بلکہ میرے اس فیصلے سے پہلے انہوں نے مجھے خط لکھا تھا جس میں التواء کا مشورہ دیا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان کا خط میرے فیصلے کے بعد پہنچا۔ غرض ان کے یکا یک ملک بدر کر دیے جانے سے مجھے بے حد تعجب اور صدمہ ہوا۔

جب بمبئی کرانیکل مسٹر ہارنیمین کی خدمات سے محروم ہو گیا تو اس کے ڈائریکٹروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ بریلوی صاحب موجود ہی تھے اس لیے میرا کام محض برائے نام تھا۔ پھر بھی میری طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس ذمہ داری کے قبول کر لینے سے میری مصروفیت بڑھ جاتی تھی مگر حکومت نے کرانیکل کو بند کرا کے مجھے اس مشکل سے بچا لیا۔

ان دنوں کرانیکل کا انتظام سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے ہاتھ میں تھا اور ''ینگ انڈیا'' کو بھی وہی چلا رہے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ کرانیکل تو بند ہو گیا

اب آپ ''ینگ انڈیا'' کی ادارت قبول کیجیے اور کرانیکل کی کمی پوری کرنے کے لیے اسے ہفتہ وار کی جگہ سہ روزہ کر دیجیے۔

میں خود یہی چاہتا تھا مجھے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو ستیا گرہ کے حقیقی اصول کو سمجھاؤں اور مجھے امید تھی کہ اس اخبار کے ذریعے میں حکومت پنجاب کی دادرسی پر مجبور کروں گا کیونہ اسے خوب معلوم تھا کہ میری ہر تحریر ستیا گرہ کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے ان دوستوں کی تجویز کو خوشی سے قبول کر لیا۔ مگر یہ بڑی مشکل تھی کہ انگریزی اخبار عام لوگوں کو ستیا گرہ کی تعلیم دینے کے لیے بیکار تھا۔ میرے کام کا خاص میدان گجرات تھا اس لیے مجھے ایک گجراتی اخبار کی ضرورت تھی ۔ ان دنوں اندولال جی یاجگ سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے حلقے میں شامل تھے۔ وہ اپنے دوستوں کی امداد سے گجراتی میں ایک ماہوار رسالہ نوجیون نکال رہے تھے۔ ان دوستوں نے نوجیون میرے حوالہ کر دیا اور راندولال جی میرے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو گئے ۔اس رسالے کو ہم نے ہفتہ وار کر دیا۔

اس عرصے میں کرانیکل پھر جاری ہو گیا۔ اس لیے ینگ انڈیا بدستور ہفتہ وار کر دیا گیا۔ دو ہفتہ وار اخبارات دو مختلف مقامات سے نکالنے میں مجھے بڑی دقت تھی اور مصارف بھی زیادہ تھے۔ نوجیون احمد آباد سے نکلتا تھا میری درخواست پر ینگ انڈیا بھی احمد آباد منتقل کر دیا گیا۔

اس تبدیلی مقام کی اور وجوہ بھی تھیں۔ مجھے انڈین اوپینین سے یہ تجربہ ہوا تھا کہ اس قسم کے اخباروں کے لیے اپنے مطبع کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں مطبع کا قانون اس قدر سخت تھا کہ اگر میں اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرتا تو موجودہ مطبع جو کاروباری اصول پر قائم کیے گئے تھے ان کو شائع کرنے پر آمادہ نہ

ہوتے۔اس لیے اپنا مطبع قائم کرنا اور بھی ضروری تھا۔ایسا مطبع قائم کرنے کے لیے احمد آباد ہی میں آسانی تھی۔اس لیے ینگ انڈیا یہیں لانا پڑا۔

ان اخباروں کے ذریعے میں نے پڑھے لکھے لوگوں کو ستیا گرہ کی تعلیم کی پوری کوشش شروع کر دی۔ان دنوں اخباروں کے خریدار بہت بڑھ گئے اور ایک زمانے میں ہر ایک کی اشاعت کم و بیش چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔مگر نوجیون کی اشاعت ایک دم بڑھی اور ینگ انڈیا کی آہستہ آہستہ میرے قید ہونے کے بعد بہت کم ہو گئی اور اب آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں۔

میں نے شروع ہی سے یہ طے کر لیا کہ ان اخباروں میں اشتہار نہیں چھاپوں گا۔میرے خیال میں اس سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انہیں اپنی آزادی رائے قائم رکھنے میں بہت مدد ملی۔

ان اخباروں سے مجھے بھی یہ ضمنی فائدہ ہوا کہ یہ ایک حد تک میرا سکون قلب قائم رکھنے کا باعث ہوئے۔جب تک ستیا گرہ کا وقت نہیں آیا میں ان کے ذریعے سے اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرتا رہا اور لوگوں کو ہمت دلاتا رہا۔اس طرح میرے خیال میں یہ دونوں اخبار آڑے وقت قوم کے کام آئے اور انہوں نے اپنی بساط بھر مارشل لاء کے مظالم کو روکا۔

☆☆☆

پنجاب میں

سر مائیکل اوڈائر نے مجھے پنجاب کے بلووں کا ذمہ دار ٹھہرایا اور چند غصہ وار نوجوان پنجابیوں کو مارشل لاء کا الزام میرے سر رکھا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ اگر میں سول نافرمانی نی روکتا تو جلیانوالہ کا قتل عام نہ ہوتا۔ بعض تو اتنے خفا تھے کہ انہوں نے مجھے دھمکایا کہ اگر تم نے پنجاب میں قدم رکھا تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔

مگر میرا یہ خیال تھا کہ میرا طرز عمل بالکل درست اور نا قابل اعتراض ہے اور کسی سمجھ دار آدمی وک اس کے متعلق غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

میں پنجاب جانے کے لیے بے چین تھا۔ مجھے اس سے پہلے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے میرا اور بھی جی چاہتا تھا کہ وہاں جا کر اپنی آنکھ سے سب حالات دیکھوں۔ ڈاکٹر ستیہ پال' ڈاکٹر کچلو اور پنڈت رام بھج دت چودھری' جنھوں نے مجھے پنجاب بلایا تھا قید ہو چکے تھے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ حکومت ان لوگوں کو زیادہ دیر قید نہیں رکھ سکتی۔ جب کبھی میں بمبئی جاتا تھا تو بہت سے پنجابی مجھ سے ملتے تھے میں ایسے موقعوں پر ایک آدھ ہمت افزائی کا کلمہ کہہ دیتا تھا جس سے انہیں تقویت ہو جاتی تھی۔ ان دنوں مجھے اپنے اوپر اس قدر بھروسا تھا کہ جس سے ملتا تھا اسے گرما دیتا تھا لیکن مجھے پنجاب جانے کا ارادہ بار بار ملتوی کرنا پڑا۔ جب کبھی میں نے وائسرائے سے اجازت مانگی انہوں نے یہی جواب دیا "ابھی نہیں" اسی طرح بات ٹلتی رہی۔

اسی زمانے میں اعلان ہوا کہ ہنٹر کمیٹی اس کی تحقیقات کرے گی کہ مارشل لاء

کے زمانے میں حکومت پنجاب کا طرز عمل کہاں تک جائز تھا۔ مسٹر سی تف اینڈ ریوز پنجاب پہنچ گئے تھے ان کے خطوں میں جو جانگداز حالات لکھے گئے تھے انہیں پڑھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مارشل لاء کے مظالم کی اصلیت ان خبروں سے کہیں زیادہ ہے جو اخباروں میں آئی ہیں میں نے پھر وائسرائے کو تار دے کر جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ فلاں تاریخ کے بعد جا سکتے ہیں مجھے وہ تاریخ ٹھیک سے یاد نہیں شاید ۱۷ اکتوبر تھی۔

لاہور پہنچ کر میں نے جو منظر دیکھا وہ میرے دل میں نقش رہے گا۔ اسٹیشن پر آدمیوں کا سمندر امنڈ آیا تھا۔ شہر کے سارے باشندے اس اشتیاق اور بیتابی سے گھروں سے نکل پڑے تھے جیسے کسی مدتوں کے بچھڑے عزیز سے ملنے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھیے خوشی سے دیوانہ تھا۔ میں پنڈت رام بھج دت کے بنگلے پر ٹھہرایا گیا اور میری مہمانداری کی زحمت سارلا دیوی چودھرانی کے حصے میں آئی۔ یہ زحمت کوئی معمولی زحمت نہ تھی کیونکہ پہلے بھی یہی صورت تھی جواب ہے کہ جس گھر میں ٹھہرتا ہوں وہ کارواں سرائے بن جاتا ہے۔

پنجاب کے بڑے لیڈر سب جیل میں تھے اس لیے ان کی جگہ مالوی جی، موتی لال جی اور شردھانند جی کام کر رہے تھے اور یہی مناسب تھا۔ مالوی جی اور شردھانند جی کو تو میں پہلے سے اچھی طرح جانتا تھا مگر موتی لال جی سے میرا پہلا سابقہ تھا۔ یہ سب حضرات اور وہ مقامی لیڈر جو جیل جانے سے محروم رہ گئے تھے مجھ سے اس طرح گھل مل گئے کہ مجھے اس صحبت سے مطلق اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

ہمارا یہ متفقہ فیصلہ کہ ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت نہ دی جائے قومی تاریخ کا جزو بن گیا ہے۔ جن وجود کی بنا پر ہم نے فیصلہ کیا تھا۔ وہ اسی زمانے میں ضائع کر دی گئی

تھیں۔ یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اتنے دن غور کرنے کے بعد بھی مجھے کمیٹی کے مقاطعے کا فیصلہ بالکل صحیح اور مناسب نظر آتا ہے۔

ہنٹر کمیٹی کے مقاطعے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کانگرس کی طرف سے ایک غیر سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور مالوی جی نے پنڈت موتی لال نہرو ولیش سندھوسی آر داس آنجہانی 'مسٹر ایم آر جیکار' عباس طیب جی کو اور مجھے اس کمیٹی میں نامزد کیا ہم لوگوں نے مختلف مقامات پر الگ الگ تحقیقات کیں۔ کمیٹی کے سامنے جو شہادتیں پیش ہوئیں انہیں ترتیب دینا میرے ذمے رکھا گیا اور سب سے زیادہ مقامات پر تحقیقات کرنے کا شرف بھی مجھ ہی کو حاصل ہوا اس لیے مجھے پنجاب کے لوگوں اور وہاں کے دیہات کی حالت کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

اپنی تحقیقات کے دوران مجھے پنجاب کی عورتوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئیں جیسے میرا ان کا برسوں کا ساتھ رہا ہو میں جہاں کہیں جاتا تھا یہ دیویاں جوق در جوق آتی تھیں اور میرے سامنے اپنے کاتے ہوئے سوت کا ڈھیر لگا دیتی تھیں۔ اس طرح مجھے اس تحقیقات کے دوران میں یہ بات معلوم ہوئی کہ پنجاب کھدر کے کام کا بہت بڑا مرکز بن سکتا ہے۔

لوگوں پر جو مظالم ہوئے تھے ان کی تحقیقات کے دوران حکومت کے ظلم اور استبداد کے وہ قصے سننے میں آئے جن کا گمان بھی نہ تھا۔ انہیں سن کر مجھے جو اذیت ہوئی اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے تعجب تھا اور آج تک ہے کہ جس صوبے نے جنگ کے زمانے میں حکومت برطانیہ کو سب سے زیادہ سپاہی دیے تھے اس نے ان کے وحشیانہ مظالم کو چپ چاپ کیوں کر سہہ لیا۔

کمیٹی کی رپورٹ لکھنے کا کام بھی میرے ہی ذمے تھا۔ جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگوں پر کیا کیا مظالم توڑے گئے وہ اس رپورٹ کا مطالعہ کریں۔ میں یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اول سے آخر تک کہیں جان بوجھ کر مبالغہ نہیں کیا گیا اور جو کچھ لکھا گیا کافی شہادت کی بنا پر لکھا گیا۔ جتنی شہادتیں شائع کی گئیں وہ ان کا عشر عشیر بھی نہیں جو کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی تھیں۔ جس بیان کے متعلق ذرا سا بھی شبہ تھا وہ رپورٹ میں نہیں آنے دیا گیا۔ اس رپورٹ سے جو محض احقاق حق کے لیے لکھی گئی تھی پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت نے اپنی قوت کو قائم رکھنے کے لیے کیا کیا کر گزرتی ہے اور کیسی کیسی انسانیت سوز اور وحشیانہ حرکتوں کی مرتکب ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس رپورٹ کا ایک فقرہ بھی غلط ثابت نہیں کیا جا سکا۔

☆☆☆

خلافت کے بدلے گئو رکھشا؟

پنجاب کی دردانگیز داستان کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائر شاہی کی تحقیقات ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی جو مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لیے دہلی میں ہو رہی تھی۔ اس دعوت نامے پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ کانفرنس میں سوامی شردھانند جی بھی شریک ہوں گے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے اور اس کا اجلاس نومبر میں قرار پایا تھا۔ اس کانفرنس کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا جو خلافت کے معاملے میں حکومت کی بد عہدی سے پیدا ہو گئی تھی وار یہ طے کرنا تھا کہ ہندو مسلمان صلح میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ دعوت نامے میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئو رکھشا کے مسئلے پر بھی بحث ہو گی اور یہ اس کے طے کرنے کا بہترین موقع ہے۔ مجھے گئو رکھشا کا ذکر اس سلسلے میں پسند نہیں آیا۔ میں نے اس دعوت نامے کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ان دونوں کے متعلق بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجیے جیسے سودا پکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حسن و قبح پر الگ الگ غور کیجیے۔

یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں کانفرنس میں گیا۔ اس میں مجمع بہت کافی تھا

مگر اتنا نہیں جتنا اس کے بعد کے جلسوں میں ہوا۔ میں نے اس مسئلے پر جس کا ذکر آ چکا ہے سوامی شردھانند جی آنجہانی سے گفتگو کی۔ انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجیے۔ میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کیا۔ کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے اور اگر حکومت نے اس معاملے میں صریح بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ ان کے لیے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقعے پر گئو رکھشا کا مسئلہ بیچ میں لے آئیں اور صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلماوں سے سودا چکائیں اور مسلمانوں کے لیے بھی اس شرط پر گاؤ کشی بند کرنا نامناسب ہے کہ ہندو خلافت کے معاملے میں ان کا ساتھ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائیگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤ کشی ترک کر دیں۔ ان کا یہ سلوک بہت خوشنما اور قابل تعریف ہو گا لیکن ظاہر ہے کہ اگر مسلمان گاؤ کشی بند کرنا فرض ہمسائیگی سمجھتے ہیں تو انہیں ہر حال میں بند کر دینا چاہیے۔ ہندو خلافت کے مسئلے میں ان کا ساتھ دیں چاہے نہ دیں۔ ایسی صورت میں مناسب ہے کہ ان دونوں مسئلوں پر استدلال حاضرین کو پسند آیا اور گئو رکھشا کے سوال پر کانفرنس میں بحث نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ''خواہ ہندو ہماری مدد کریں خواہ نہ کریں مسلمانوں کو اپنے برادران وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤ کشی ترک کر دینا چاہیے اور ایک زمانے میں واقعی یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان گاؤ کشی بالکل موقوف کر دیں گے۔

بعض لوگوں کی تجویز تھی کہ پنجاب کا مسئلہ بھی خلافت کے ساتھ نتھی کر دیا جائے

مگر میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے کہا کہ پنجاب کا معاملہ ثقافتی ہے اس لیے اس کا فیصلہ کرنے میں کہ جشن صلح میں شرکت کی جائے یا نہ کی جائے اس کو مدنظر رکھنا مناسب نہیں۔ یہ خلاف مصلحت ہے کہ مامی معاملت کو مسئلہ خلافت ک ساتھ جو براہ راست شرائط صلح سے تعلق رکھتا ہے مخلوط کردیں اسے بھی لوگوں نے مان لیا۔

مولانا حسرت موہانی اس جلسے میں موجود تھے۔ میں انہیں پہلے سے جانتا تھا۔ مگر یہ اس کانفرنس میں معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لڑنے والے ہیں۔ مجھ میں اور ان میں ابتدا میں اختلاف رائے تھا اور بعض مسئلوں میں اب تک ہے۔

منجملہ بہت سے ریزولوشنوں کے جو کانفرنس میں پاس ہوئے ایک یہ بھی تھا کہ ہندو اور مسلمان سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کرلیں اور اس بنا پر بدیشی چیزوں کا مقاطعہ کریں۔ کھدر کی ابھی تک اتنی قدر نہ تھی جتنا ہونا چاہیے تھی۔ یہ ریزولوشن حسرت صاحب کے مزاج کا نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر خلافت کے معاملے میں سلطنت برطانیہ انصاف نہ کرے تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے۔ اس لیے انہوں نے اس کے مقابلہ میں یہ تجویز پیش کی کہ جہاں تک ممکن ہو صرف برطانوی چیزوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ میں نے اصولی اور عملی نقطہ نظر سے اس تجویز کی مخالفت کی اور ان ہی دلیلوں سے کام لیا جن سے اب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ میں نے کانفرنس کے سامنے اپنا عدم تشدد کا اصول بھی پیش کیا۔ میں نے دیکھا کہ حاضرین پر میری دلیلوں کا بہت اثر ہوا۔ مجھ سے پہلے حسرت صاحب کی تقریر پر اس قدر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے تھے ک مجھے خوف تھا کہ میری بات کوئی نہیں سنے گا۔ میں نے محض اس خیال سے زبان کھولنے کی جرات کی کہ اگر میں اپنے خیالات کانفرنس ے سامنے پیش نہ کروں تو یہ ادائے فرض میں کوتاہی ہوگی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ

کر تعجب ہوا اور خوشی ہوئی کہ حاضرین نے میری تقریر بہت توجہ سے سنی اور جو لوگ پلیٹ فارم پر تھے انہوں نے یکے بعد دیگرے میری تقریر کی تائید میں تقریریں کیں۔ لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ برطانوی چیزوں کا مقاطعہ چلنے والا نہیں۔ اس کی کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ مفت میں جگ ہنسائی ہوگی۔ اس مجمع میں شاید ہی کوئی شخص کو جس کے جسم پر برطانوی ساخت کی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو ا لے اکثر حاجری کو یہ محسوس ہوا کہ ایا ریزولوشن پاس کرنے سے جس کی تعمیل خود ووٹ دینے والوں کے لیے ناممکن تھی سراسر نقصان ہوگا۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں کہا ’’محض بدیشی کپڑے کا مقاطعہ ہمارے لیے کافی نہیں۔ خدا جانے کب وہ دن آئے کہ سودیشی کپڑا کافی مقدار میں تیار ہو سکے اور بدیشی کپڑے کا مقاطعہ پوری طرح کامیاب ہو۔ ہمیں تو کسی چیز کی ضرورت ہے جس کا برطانیہ والوں پر فوراً اثر پڑے۔ آپ شوق سے بدیشی کپڑے کا مقاطعہ کیجیے ہمیں اس میں کوئی عذر نہیں مگر اس کے علاوہ کوئی ایسی تجویز بھی ہونا چاہیے جس پر فوراً عمل ہو سکے‘‘۔

جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی ہمیں بدیشی کپڑے کے مقاطعے کے علاوہ اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ بدیشی کپڑے کا فوری مقاطعہ ناممکن ہے۔ اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر ہم چاہیں تو اپنی ضروریات کے لیے کافی کھدر تیار کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت مجھ پر آگے چل کر کھلی مگر اتنا میں جانتا تھا کہ اگر ہم بدیشی کپڑے کے مقاطعے میں ملوں کے پابند رہیں تو دھوکا کھائیں گے۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ مولانا کی تقریر ختم ہو گئی۔

میرے لیے یہ بڑی مشکل تھی کہ اپنا مطلب ہندی یا اردو کے مناسب الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسے مجمعے میں جو زیادہ تر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھا، مدلل تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں نے کلکتہ کی مسلم لیگ میں اردو میں تقریر کی تھی۔ مگر وہاں تو صرف چند الفاظ میں اپنے محبت اور خلوص کا اظہار کر دیا تھا۔ یہاں صورت دوسری تھی یہاں مجھے ایسے مجمع کو اپنا زاویہ نظر سمجھانا پڑا اور اپنا ہم خیال بنانا تھا جس سے اختلاف نہیں تو تنقید کا اندیشہ ضرور تھا۔ مگر میں نے دل میں سوچا کہ چھپنے سے کام نہیں چلے گا میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ دہلی کے مسلمانوں کی فصیح اور شستہ اردو میں تقریر کروں بلکہ اس لیے کہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اپنے خیالات ظاہر کر دوں چنانچہ میں نے یہی کوشش کی اور اس میں مجھے بڑی کامیابی ہوئی۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ اردو ہندوستان کی عام زبان بن سکتی ہے۔ اگر میں انگریزی میں تقریر کرتا تو حاضرین پر اتنا اثر کبھی نہ ہوتا اور مولانا کو چیلنج دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ یا وہ چیلنج دیتے تو میں اس کا موثر جواب نہ دے سکتا۔

میرے ذہن میں جو خیال تھا اسے ظاہر کرنے کے لیے مجھے کوئی مناسب ہندی یا اردو لفظ نہیں ملتا تھا۔ اس سے میں ذرا گھبرایا مگر آخر میں نے اسے انگریزی لفظ ''نان کوآپشن'' ۵۵ کے ذریعے ادا کر دیا۔ یہ لفظ میں نے پہلی بار اس جلسے میں استعمال کیا۔ مولانا کی تقریر کے دوران مجھے یہ خیال آیا کہ جس حکومت کے ساتھ یہ بہت سی باتوں میں اتحاد عمل کر رہے ہیں اس کا مقابلہ کرنے کی ان کے لیے ایک ہی صورت ہے یعنی ہتھیاروں سے کام لینا اور وہ نامناسب یا ناقابل عمل ہے۔ پھر مقابلے کا خیال ہی فضول ہے۔ مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح کہ حکومت سے اتحاد عمل ترک کر دیا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے نان کوآپریشن کا لفظ سوجھا۔ اس وقت اس

تجویز کے کل پہلو میرے پیش نظر نہ تھے اس لیے میں نے اسے بیان کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا۔ میں نے اس کے متعلق صرف یہ الفاظ کہے۔

''آپ حضرات نے ایک نہایت اہم ریزولوشن پاس کیا ہے کہ اگر خدانخواستہ صلح کے شرائط آپ کے خلاف ہوئے تو آپ حکومت سے اتحاد عمل ترک کر دیں گے۔ میرے نزدیک یہ ہر قوم کا خداداد حق ہے۔ کہ وہ ایسی صورت میں حکومت کے ساتھ اتحاد عمل کرنے سے انکار کر دے۔ اگر حکومت ہمارے ساتھ خلافت کے مہتم بالشان مسئلے میں عہد شکنی کرے تو ہمارے لیے نان کوآپریشن کے ماسوا کوئی چارہ نہیں اور ہمارا یہ نان کوآپریشن بالکل ناجائز ہوگا''۔

لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ ''نان کوآپریشن'' کا لفظ سارے ملک میں رائج ہو جائے اس میں کئی مہینے کی دیر تھی۔ اس وقت تو یہ کانفرنس ریزولوشنوں کے انبار میں دب کر رہ گیا۔ بلکہ ایک مہنے کے بعد خود میں نے امرتسر کانگریس میں ''کوآپریشن'' کے ریزولوشن کی تائید کی۔ میں سمجھتا تھا کہ حکومت ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔

☆☆☆

امرتسر کانگریس

حکومت پنجاب ان سینکڑوں پنجابیوں کو جنہیں مارشل لاء کے زمانے میں برائے نام عدالتوں بے بنیاد شہادتوں پر جیل میں بھر دیا گیا تھا کب تک اس قید فرنگ میں رکھ سکتی تھی۔ ان کے اس صریح ظلم پر وہ شور احتجاج بلند ہوا کہ اسے مجبور ہو کر ان لوگوں کو رہا کرنا پا بہت سے لوگ کانگریس کے اجلاس سے پہلے اور لالہ ہرکشن لال اور دوسرے لیڈر دوران اجلاس میں رہا کر دیے گئے۔ علی برادران جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے یہیں آئے۔ لوگ تھے کہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو جنھوں نے اپنی اعلیٰ درجے کی وکالت قربان کر کے پنجاب میں ڈیرہ ڈالا تھا کانگریس کے صدر تھے اور سوامی شردھا نند جی آنجہانی مجلس استقبالیہ کے صدر۔

میں نے اب تک کانگریس میں صرف اتنا حصہ لیا تھا کہ سمندر پار کے ہندوستانیوں کے مطالبات پر ہندی میں ایک تقریر کر کے ہندی کی عملی حمایت کا ثبوت دیا تھا اس کے بعد میں سمجھتا تھا کہ اس سال مجھ سے کوئی اور کام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ پہلے اکثر ہو چکا تھا' دفعتاً مجھ پر بڑی ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا۔

اسی وقت شاہی اعلان نئی اصلاحات کے متعلق شائع ہوا تھا۔ ان اصلاحات سے میں خود پوری طرح مطمئن نہ تھا اور دوسرے تو انہیں بالکل قابل قبول نہیں سمجھتے تھے مگر ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ گو یہ اصلاحات ناقص ہیں پھر بھی ہمیں منظور کر لینا چاہیے تھا مجھے شاہی اعلان کی زبان میں لارڈ سنہا کا قلم کارنظر آتا تھا جس نے مایوسی

کی تاریکی میں ایک امید کا پرتو پیدا کر دیا تھا۔ مگر لوکمانیہ اور دیشبندھو چترنجن داس جیسے پختہ کار اسے فریب نظر سمجھتے تھے۔ مالوی جی غیر جانبدار تھے۔

پنڈت مالوی جی نے مجھے اپنے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ مجھے ہندو یونیورسٹی کے تاسیس (Foundation) کے جلسے میں ان کے طرز زندگی کی سادگی کا تھوڑا سا اندازہ ہوا تھا لیکن اس بار ان کے ساتھ رہ کر ان کے روزمرہ مشاغل کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا جس سے میں بے حد متاثر ہوا ان کے کمرے پر غریبوں کی سرائے کا دھوکا ہوتا تھا۔ لوگوں کے ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گزرنا دشوار تھا ہر شخص کو اجازت تھی کہ وقت ناوقت جب چاہے پہنچ جائے اور جب تک چاہے ان سے باتیں کرے۔ اس جھونپڑے کے ایک کونے میں میری چارپائی اس منظر کی شان کو دوبالا کر رہی تھی۔

غرض مالوی جی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے ان سے روزمرہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور وہ برادراہ شفقت سے مجھے مختلف پارٹیوں کا زاویہ نظر سمجھایا کرتے تھے۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ریفارمس (اصلاحات) کے ریزولوشن کی بحث میں میرا شریک ہونا لازمی ہے۔ کانگریس کی طرف سے پنجاب کے مظالم کے متعلق جو رپورٹ لکھی گئی تھی اس کی ذمہ داری ایک حد تک مجھ پر بھی تھی۔ اس لیے مجھے فکر تھی کہ اس معاملے کو انجام تک پہنچاؤں۔ پھر خلافت کا مسئلہ بھی پیش تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مسٹر مانٹیگو ہندوستان سے بےوفائی نہیں کریں گے اور اس کے حقوق کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ علی برادران اور دوسرے لیڈروں کی رہائی میرے نزدیک بہت اچھی علامت تھی۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر میری یہ رائے تھی کہ کانگریس کے لیے اصلاحات کا رد کرنا مناسب نہیں بلکہ اسے ان کی منظوری کا ریزولوشن پاس کرنا

چاہیے۔مگر ویشند ھو چترنجن داس اس پر اڑے ہوئے تھے کہ اسلاحات کو بالکل ناکافی اور ناقص قرار دے کر رد کر دینا چاہیے۔لوکمانیہ تلک آنجہانی نے اس معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی تھی مگر یہ کہہ دیا تھا کہ جس ریزولوشن کو ویشند ھو پسند کریں گے اس کی میں تائید کروں گا۔

میرے لیے ان آزمودہ سرد وگرم چشیدہ محترم لیڈروں سے اختلاف رائے کرنا بہت تکلیف دہ تھا لیکن میرا ضمیر مجھے اس پر مجبور کر رہا تھا کہ میں نے چاہا کہ کانگریس سے بھاگ جاؤں۔ میں نے پنڈت مالوی جی اور موتی لال جی سے کہا کہ قومی مفاد کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں کانگریس کے بقیہ اجلاسوں سے غیر حاضر رہوں تاکہ مجھے ایسے محترم لیڈروں سے اختلاف کا اظہار نہ کرنا پڑے۔

مگر ان دونوں بزرگوں نے میری تجویز کو پسند نہیں کیا کہ کہیں لالہ کشن لال و میرے اس ارادے کی خبر ہوگئی انہوں نے کہا کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔اس سے پنجابیوں کے جذبا کو بہت سخت صدمہ پہنچے گا۔ میں نے لوکمانیہ' ویشبند ھو اور مسٹر جناح سے گفتگو کی مگر اس مشکل کے حل کی کوئی صورت نہ نکلی۔آخر میں نے مالوی جی سے اپنی پریشانی بیان کی۔ میں نے ان سے کہا ''مصلحت کا کوئی موقع نظر نہیں آتا۔ اگر میں نے ریزولوشن پیش کی تو ووٹ لینا پڑیں گے اور اس کا یہاں کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔کانگریس کے عام جلسے میں اب تک یہ دستور رہا ہے کہ رائے لینے کے لیے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں اور اس میں نمائندوں اور تماشائیوں کی کوئی تفریق نہیں رہتی۔اب رہا تحریری ووٹ لینا اس کی اتنے بڑے مجمع میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔مگر لالہ ہرکشن لال نے اس مشکل میں میری دستگیری کی۔انہوں نے کہا ''جس دن اس ریزولوشن پر رائے لی جائے گی ہم تماشائیوں کو کانگریس کے پنڈال

میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہا ووٹ جمع کرنا اسے میں دیکھ لوں گا مگر آپ کو کانگریس سے غیر حاضر ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب میں ریزولوشن کا مسودہ تیار کر کے پیش کرنے کے لیے چلا تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مالوی جی اور مسٹر جناح میرے موید تھے میں نے یہ دیکھا کہ ہر چند ہمارے باہمی اختلافات میں کسی قسم کی تلخی نہیں تھی اور ہماری تدبیریں محض نفس امر سے متعلق تھیں مگر لوگوں کو ہمارا یہ اختلاف ہی ناگوار تھا ان کے چہروں سے دل صدمہ کا اظہار ہوتا تھا وہ اتفاق رائے کے آرزومند تھے۔

ادھر تقریریں ہو رہی تھیں اور ادھر اس اختلافات کو دور کرنے کی کوشش جاری تھی۔ لیڈر ایک دوسرے کو رقعے بھیج رہے تھے مالوی جی انتہائی سرگرمی سے مصالحت کی سعی میں مصروف تھے۔ اتنے میں جرام داس نے مجھے اپنی ترمیم دکھائی اور اپنی مخصوص دلکش انداز میں کہا کہ نمائندے عجب کشمکش میں پڑ گئے ہیں جیسے بنے انہیں اس مشکل سے بچایئے اور رائے شماری کی نوبت کو نہ آنے دیجیے میں نے ان کی ترمیم پڑھی اور وہ مجھے پسند آئی۔

مالوی جی پہلے ہی چاروں طرف نظر دوڑا رہے تھے کہ شاید کہیں امید کی جھلک دکھائی دے میں نے ان سے کہا کہ جرام داس کی ترمیم دونوں پارٹیوں کے لیے قابل قبول ہے اس کے بعد یہ ترمیم لوکمانیہ کو دکھائی گئی تو انہوں نے کہا کہ اگر داس منظور کر لیں تو مجھے کوئی عذر نہیں بڑی قیل وقال کے بعد ویشبندھو پچھا اور انہوں نے بپن چندر پال جی کی طرف دیکھا۔

مالوی جی کا دل امید سے معمور ہو گیا۔ ابھی ویشبندھو نے پوری طرح رضامندی بھی ظاہر نہیں کی تھی کہ انہوں نے ترمیم کا مسودہ چھین لیا اور چلا اٹھے بھائیوں آپ

یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مصالحت ہو گی'' اس کے بعد جو منظر دیکھنے میں آیا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ سارا پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا اور افسردہ چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔

یہاں ترمیم کا مضمون بیان کرنے کی ضرورت نہیں مجھے تو صرف یہ دکھانا ہے کہ میں نے ان تجربوں کے سلسلے میں جن کا اس کا اب میں ذکر ہے یہ ریزولوشن کس طرح پیش یا۔ اس مصالحت سے میری ذمہ داری اور بڑھ گئی۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

کانگریس کے اندرونی حلقے میں

امرتسر کی کانگریس میں میں نے جو حصہ لیا اسے میں اپنا باقاعدہ داخلہ کانگریس کی سیاست میں نہیں سمجھتا اس سے پہلے کی کانگریسوں میں تو میں محض عہد و وفاداری کی تجدید کے لیے شریک ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک معمولی سپاہی سمجھتا تھا اور اسی پر قانع تھا۔

امرتسر کے تجربے سے معلوم ہوا کہ مجھے بعض ایسے کاموں سے مناسبت ہے جو کانگریس کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوکمانیہ و شپند ھوئی پنڈت موتی لال جی اور دوسرے لیڈروں کو میری خدمات جو میں نے پنجاب کے مظالم کی تحقیقات کے سلسلے میں انجام دی تھیں پسند آئیں وہ مجھے اپنی خاص صحبتوں میں بلانے لگے جہاں سبجیکٹ کمیٹی کے پیچیدہ مسلئے حل ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں صرف وہی لوگ بلائے جاتے تھے جن پر لیڈروں کو خاص طور سے اعتماد ہو اور جن سے انہیں کام لینا ہو مگر کبھی کبھی ناخواندہ مہمان بھی آ پہنچتے تھے۔

آئندہ سال کانگریس کے پیش نظر دو چیزیں ایسی تھیں جن سے مجھے مناسبت اور دلچسپی تھی۔ ان میں سے ایک جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی یادگار تھی۔ کانگریش نے بڑے جوش و خروش سے یہ ریزولوشن پاس کیا تھا کہ شہیدوں کی یادگار قائم کی جائے اس کے لیے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرنا تھا۔ ٹرسٹیوں کی کمیٹی میں میرا نام تھا۔ مالوی جی ان دنوں قومی فقیروں کے بادشاہ کہلاتے تھے مگر میں جانتا تھا کہ میں بھی بھیک مانگنے میں ان سے کم نہیں۔ جنوبی افریقہ میں مجھے اپنے اس کمال کا اندازہ ہو چکا تھا۔ مالوی

جی کا جادو رئیسوں پر خوب چلتا تھا۔ والیان ملک سے شاہانہ عطیے وصول کرنے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جلیانوالہ باغ کی یادگار کے لیے رئیسوں سے چندہ مانگنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اس چندے کی ذمہ داری زیادہ تر مجھ پر عائد کی گئی۔ بمبئی کے بیاض باشندوں نے میری جھولی بھر دی اور یادگار کے لیے معقول سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔ جو اب تک بینک میں جمع ہے مگر آج مل کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ جس زمین پر ہندو مسلمان اور سکھ شہیدوں کے پاک خون کی آمیزش ہوئی تھی وہاں کس شکل میں یادگار تعمیر کیجائے ان تینوں مذہبوں کے پیرو محبت اور اخلاص کے رشتوں کو توڑ کر باہمی جنگ میں مصروف ہیں اور قوم حیران ہے کہ یادگر کے سرمایہ کو کس کام میں صرف کرے۔

چندہ جمع کرنے کے علاوہ مجھ میں مسودے تیار کرنے کی صلاحیت تھی اور یہ بھی کانگریس کے کام آسکتی تھی۔ کانگریس کے لیڈروں نے دیکھا کہ مجھے مختصر اور جامع عبارت لکھنے کا ملکہ ہے۔ یہ بات میں نے مدت کی مشق کے بعد حاصل کی تھی۔ کانگریس کا موجودہ دستور اساسی گوکھلے کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے چند قوائد قلم بند کر دیے تھے۔ جن کے مطابق کانگریش چل رہی تھی۔ ان قواعد کے مرتب کیے جانے کی دلچسپ داستان میں نے خود گوکھلے کی زبان سے سنی تھی مگر کانگریس کا کام روز بروز بڑھتا جارہا تھا اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ موجودہ قواعد اس کی رہنمائی کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ مسئلہ کئی سال سے کانگریس میں پیش ہو رہا تھا۔ ان دنوں کانگریس کے پاس کوئی مستقل عملہ نہیں تھا جو سالانہ اجلاس کے بعد بھی کام کرتا رہے اور نئے سال کے دوران میں جو اتفاقی معاملے پیش آجائیں ان سے عہدہ برا ہو سکے۔ موجودہ قواعد کی رو سے تین سیکرٹری منتخب ہوتے تھے مگر اصل میں صرف ایک شخص

کام کرتا تھا اور وہ بھی اپنا پورا وقت نہیں دیتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اتنا کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں کہ کانگریس کے دفتر کو چلائے' اگلے اجلاس کی فکر کرے اور پچھلے اجلاس کے ریزولوشنوں کی تعمیل کرے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس سال یہ مسئلہ اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ کانگریس کے عام اجلاس میں وہ چپقلش ہوتی تھی کہ قومی معاملات پر بحث کرنا ناممکن تھا۔ نمائندوں کو کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ ہر صوبہ جتنے نمائندے چاہتا بھیج دیتا۔ اس بے ترتیبی کو رفع کرنے کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ملک میں سب سے زیادہ اثر لوکمانیہ اور ویشبند ھو کا ہے اسے میں نے ان سے درخواست کی کہ یہ حضرات رائے عامہ کے نمائندوں کی حیثیت سے میرے ساتھ اس کمیٹی میں کام کریں جو دستور اساسی کو ترتیب دینے کے لیے مقرر کی جا رہی ہے مگر معلوم ہوا کہ ان حضرات کو خود اس کام میں شریک ہونے کی فرصت نہیں اس لیے میں نے یہ تجویز دی کہ کمیٹی تین ممبروں پر مشتمل ہو جن میں سے دو ان دونوں صاحبوں کے معتمد ہوں اور ایک میں خود۔ اس کو لوکمانیہ اور ویشبند ھو نے پسند کیا او سان کی رائے سے لے کیلکر جی اور آئی بی سین بابو ان کے نمائندے مقرر کر دیے گئے۔

اس کمیٹی کا جلسہ ایک بھی نہ ہو سکا۔ مگر ہم تینوں میں خط و کتابت کے ذریعے سے مشورہ ہوتا رہا اور آپس میں ہم نے متفقہ رپورٹ پیش کر دی کہ مجھے ایک حد تک اس دستور اساسی بنانے پر ناز ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اس پر پوری طرح عمل ہو تو یہی ہمیں سوراج دلانے کے لیے کافی ہے۔ جس سے میں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی اس وقت سے میں واقعی کانگریس کی سیاست میں شریک ہو گیا۔

☆☆☆

کھدر کی تحریک کا جنم

۱۹۰۰ء میں جب میں نے ''ہند سوراج'' میں کھدر کو ہندوستان کے روز افزوں افلاس کا علاج قرار دیا' اسوقت تک مجھے بھی چرخہ یا کرگھا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں میں نے یہ بات ایک بدیہی اصول کے طور پر پیش کی کہ جو ہندوستانیوں کو افلاس کی چکی میں پیسنے کے بجائے اس سے گویا سوراج قائم کر دیا۔ ہندوستان کا افلاس دور ہوتے ہی سوراج خود بخود مل جائے گا۔ ۱۹۱۲ء میں جنوبی افریقہ سے واپسی پر مجھے چرخہ دیکھنا نصیب ہوا جب سابرتی میں ستیا گرہ آشرم قائم ہوا تو چند کرگھے بھی منگائے گئے مگر مشکل یہ تھی کہ سب وکیل مختار یا کاروباری لوگ تھے ہم سے کوئی دستکار نہ تھا۔ ایک کاریگر کی ضرورت تھی جو ہمیں بننا سکھائے۔ اس کے بغیر کرگھے بیکار تھے خدا خدا کر کے پالن پور سے ایک شخص لایا گیا۔ مگر اس نے بھی ہمیں اپنا ہنر پوری طرح نہیں بتایا۔ تاہم مگن لال گاندھی سے بچ کر جہاں جا سکتا تھا انہیں دستکاری سے فطری مناسبت تھی اور انہوں نے تھوڑے ہی دن میں اس فن پر عبور حاصل کر لیے آشرم میں یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں نے بنائی کا کام سیکھ لایا۔

ہمارا مقصود یہ تھا کہ ہم سب اپنے ہاتھوں سے تیار کیے ہوئے کپڑے پہنیں اس لیے ہم نے مل کر بنے ہوئے کپڑے پہننا چھوڑ دیے اور یہ عہد کر لیا کہ صرف ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے پہنیں گے اور وہ بھی ہندوستان کے کتے ہوئے سوت کے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے ہمیں بہت سے نئے تجربے حاصل ہوئے۔ ہمیں جلاہوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور یہ معلوم کرنے کا موقع ملا کہ ان کی زندگی کیونکر بسر ہوتی

ہے کارکردگی کتنی ہے انہیں سوت ملنے میں کیا کیا دقتیں ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ کیسی کیسی دغابازیاں کی جاتی ہیں۔ اور وہ کس طرح روز بروز قرض کے جال میں پھنستے جاتے ہیں۔ ہم فی الحال خود اتنا کپڑا بن سکتے تھے جتنا ہمیں درکار تھا۔ اس لیے سوائے اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ جلاہوں سے کپڑا خریدیں مگر ہندوستانی ملوں میں تیار کیا گیا کپڑا بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ یہ جلاہے جتنا باریک کپڑا بنتے تھے سب باہر کے سوت کا تھا۔ کیونکہ ہندوستانی مل باریک سوت تیار نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی ہندوستان کے ملوں میں اوسط درجے کا سوت بہت کم کاتا جاتا ہے اور زیادہ باریک سوت کاتنا تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں بڑی مشکلوں سے چند جلاہے اس پر راضی ہوئے کہ ہمارے لیے سودیشی سوت کا کپڑا بنیں اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ جتنا کپڑا تیار کریں گے آشرم سب خرید لے۔ غرض ہم لوگوں نے خود بھی مل کے سوت کا کپڑا بننا شروع کر دیا۔ اور اپنے دوستوں میں بھی اس کا پرچار کیا۔ اس طرح ہم کتائی کا کام کرنے والے ہندوستانی ملوں کے رضاکار ایجنٹ بن گئے اس ذریعے سے ہمیں ملوں کے انتظامات اور ان کی دقتوں سے بھی واقفیت ہو گئی۔ ہم نے دیکھا کہ ان ملوں کا متصد یہ ہے کہ جتنا سوت کاتیں اسے خود ہی بنا بھی کریں اور وہ اپنی کوشی سے جلاہوں سے اتحاد عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ مجبوری سے اور یہ تعلق محض عارض ہے اور ہمیں یہ فکر پیدا ہوئی کہ ہم اپنے لیے خود سوت کاتا کریں کیونکہ بغیر اس کے ہم ملوں کے محتاج رہیں گے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہم ملوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے اب ہمیں پہلے سے بھی زیادہ مشکولں کا سامنا ہوا نہ کہیں چرخہ دستیاب ہوتا تھا اور نہ کوئی کاتنے والا ملتا تھا جو ہمیں کاتنا سکھائے۔ آشرم میں چند چرخے تھے جن سے ہم لکڑیوں پر سوت چڑھاتے تھے مگر ہمیں یہ خبر نہ

تھی کہ ان سے سوت بھی کاتا جا سکتا ہے۔ ایک بار کالیداس جوہری کو ایک عورت ملی جو بقول ان کے کاتنا سکھانے کے لیے تیار تھی آشرم کا ایک طالب علم بھی جسے نئی چیزیں سیکھنے سے خاص مناسبت تھی اس عورت کے پاس بھیجا گیا مگر وہ بھی اس راز کو معلوم کرنے کے بغیر لوٹ آیا۔

غرض اسی طرح وقت گزرتا رہا اور ہماری بے صبری بڑھتی گئی۔ آشرم کے آنے جانے والوں میں سے جس شخص کی نسبت یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید یہ کتائی سے واقف ہو اس سے میں اس فن کے متعلق سینکڑوں سوال کر ڈالتا۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ یہ فن عورتوں تک محدود ہے اور ان میں بھی قریب قریب معدوم ہو چکا ہے جو اکا دکا کاتنے والیاں رہ گئی ہیں ان کا پتہ کسی عورت ہی سے چلے گا۔

۱۹۱۷ء میں میرے گجراتی دوستوں نے مجھے پڑوچ کا تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ وہاں گنگا بین موزمدار سے ملاقات ہوئی ان خاتون کی ذات عجیب و غریب صفات کا مجموعہ تھی۔ یہ ایک بیوہ عورت تھیں مگر ان کا حوصلہ دیکھ کر مردوں کو رشک آتا تھا۔ وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر ہمت اور جرات اور سمجھ بوجھ میں عام تعلیم یافتہ عورتیں انکا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے چھوت چھات کا تعصب دل سے نکال دیا تھا اور بے تکلف اچھوتوں سے ملتی جلتی تھیں اور ان کی خدمت کرتی تھیں۔ وہ اپنے گھر سے خوش تھیں مگر انکی ضروریات بہت ہی محدود تھیں۔ ان کا جسم خاصہ مضبوط تھا اور جہاں چاہتی تھیں اکیلی چلی جاتی تھیں انہیں گھوڑے کی سواری خاصی مشقک تھی اور مجھے ان سے گودھرا کانفرنس میں زیادہ تفصیل سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ میں نے انہیں بھی اپنے چرخے کا دکھڑا کہہ سنایا انہوں نے وعدہ کیا کہ چرخے کی تلاش میں دل و جان سے کوشش کروں گی۔ اس سے میرے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

مل گیا!

گنگا بہن نے چرخے کی تلاش میں تمام گجرات چھان مارا اور آخرا سے دیجاپور (ریاست بڑودہ) میں ڈھونڈ نالا۔ وہاں اکثر لوگوں کے گھروں میں چرخے تھے مگر مدت ہوئی انہوں نے بے کار سمجھ کر کباڑ کوٹھڑی میں ڈال دیے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پونیاں ملتی رہیں اور کوئی سوت خرید لیا کرے تو ہم پھر کاتنا شروع کر دیں گے۔ گنگا بہن نے یہ خوشخبری مجھے سنائی پونیوں کا انتظام کرنا ہمارے لیے دشوار تھا۔ عمر سبحانی مرحوم سے اس کا ذکر آیا تو انہوں نے فوراً وعدہ کر لیا کہ جتنی پونیوں کی ضرورت ہوگی اپنے مل سے بھیج دیا کریں گے۔ یہ مشکل بھی آسانی سے حل ہوئی عمر سبحانی کے یہاں سے جو پونیاں آتی تھیں وہ گنگا بہن کو بھیج دیا کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں اتنا سوت آنے لگا کہ ہمیں بننا مشکل ہو گیا۔

سیٹھ عمر سبحانی دریا دل آدمی تھے مگر آخر کب تک ان کی فیاضی سے فائدہ اٹھاتے۔ مجھے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ہم ان سے پونیاں لیتے چلے جائیں۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک مل کی پونیاں استعمال کرنا اصولاً ناجائز تھا کیونکہ مل کی پونیوں سے کالینا ایسا ہی تھا جیسا کہ مل کا کتا ہوا سوت استعمال کرنا۔ میں نے سوچا کہ آخر پرانے زمانے میں لوگ چرخا کاتتے تھے تو پونیاں کہاں سے آتی تھیں؟ کیا وہ بھی ملوں سے لیا کرتے تھے؟

ان خیالات کی بنا پر میں نے گنگا بہن سے کہا کہ دھنیے تلاش کیجیے جو پونیاں بنا دیا کریں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے اک

دھنیا پینتیس روپے مہینے پر رکھ لیا اور کئی لڑکوں کو پونیاں بنانا سکھا دیا۔ میں نے بمبئی میں روئی کی بھیک مانگی۔ یشونت پرشاد و دیسائی نے میری جھولی بھر دی۔ گنگا بین کا کام امید سے بڑھ کر سرسبز ہوا۔ انہوں نے دیجاپور کے کتے ہوئے سوت کو بننے کے لیے جلاہے بھی ڈھونڈ نکالے اور تھوڑے دن میں دیجاپور کا کھدر مشہور ہو گیا۔

اس عرصے میں آشرم میں بھی چرخا چلنے لگا۔ مگن لال گاندھی اپنی قوت اختراع سے کام لے کر چرخے میں بہت کچھ اصلاح کی اور چرخے اور ان کے کل لوازمات آشرم میں تیار ہونے لگے۔ کھدر کا پہلا تھان آشرم مین تیار ہا اس پر سترہ آنے فی گز لاگت آئی میں نے بے تامل اپنے دوستوں سے اصرار کیا کہ یہ موٹا بھدا کپڑا ان میں خریدیں انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔

میں بمبئی میں بستر علالت پر پڑا ہوا تھا۔ مگر اتنی طاقت تھی کہ چرخے کی تلاش جاری رکھوں آخر مجھے دو کاتنے والے مل گئے۔ وہ مجھ سے اٹھائی تولے سوت کا ایک روپیہ لیتی تھی۔ میں ان دنوں کھدر کے کاروبار کے پہلو سے ناواقف تھا ہاتھ کا کاتا سوت میرے نزدیک کسی طرح مول منگانا تھا ان کی شرح کا مقابلہ دیجاپور کی شرح سے کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھے ٹھگ رہی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا مگر وہ کسی طرح کمی پر راضی نہ ہوئیں۔ اس لیے مجبوراً انہیں رخصت کرنا پڑا۔ مگر ان سے جو کام لینا تھا وہ لیا جا چکا تھا۔ اونتکا بائی 'رامی بائی' کامدار شنکر لال بینکر کی والدہ اور واسومتی بین نے ان سے چرخا کاتنا سیکھا لیا تھا میرے کمرے میں چرخا چلنے لگا اور میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس کے جانفزا نغمے نے میری شفایابی میں بہت مدد دی۔ میں مانتا ہوں کہ اس کا اثر جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی تھا۔ مگر اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی جسمانی حالت بڑی حد تک اس کی نفسی کیفیت کے تابع ہے۔ میں نے بھی چرخا کاتنا

چاہا مگر اس وقت کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

بمبئی میں پھر وہی پونیوں کی دقت پیش آئی۔ دیوا شنکر جی کے مکان کے قریب سے ایک دھنیا روز اپنی دھنکی بجاتا ہوا گزرتا تھا۔ میں نے اسے بلوایا تو معلوم ہوا کہ تو شکوں میں بھرنے کے لیے روئی دھنکتا ہے وہ پونیوں کے لیے روئی دھنکنے پر راضی ہو گیا مگر اس نے دام بہت مانگے اور مجھے دینا پڑے میں یہ کہتا ہوں کہ سوت بعض ویشنو دوستوں کو دے دیا کرتا تھا کہ وہ پوترا اکاوشی کے تہوار کے لیے اس کے ہار بنوا لیں شیو جی نے بمبئی میں کتائی کی ایک کلاس بھی کھول دی۔ ان سب تجربوں میں خرچ بہت ہو جاتا تھا مگر وطن پرست احباب کھدر پر عقیدہ رکھتے تھے خوشی سے یہ تمام مصارف برداشت کرتے تھے۔ میری ناقص رائے میں یہ روپیہ برباد نہیں ہوا۔ اس سے ہمیں بڑے قیمتی تجربے حاصل ہوئے اور یہ معولم ہوا کہ چرخے کی کامیابی کے لیے کتنا وسیع میدان ہے۔

اب مجھے یہ جوش اٹھا کہ خالص کھدر کا لباس اختیار کروں۔ ابھی تک میں مل کے سوت کی بنی ہوئی دھوتی باندھتا تھا موٹا کھدر کا کپڑا جو آشرم میں یا دیجاپور میں بنا جاتا تھا اس کا عرض صرف ۳۰ انچ تھا میں نے گنگا بین سے کہہ دیا کہ آپ مجھے ایک مہینے کے اندر پینتالیس انچ کے عض کی دھوتی تیار کر کے نہ دی تو میں اسی چھوٹے عرض کے کھدر کی دھوتی باندھنا شروع کر دوں گا۔ وہ اس الٹی میٹم سے بہت گھبرائیں مگر انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو میں چاہتا تھا۔ ایک مہینے سے پہلے ہی انہوں نے ۴۵ انچ عرض کے کھدر کا دھوتیوں کا جوڑا بھیج دیا۔

اسی زمانے میں لکشمی داس جی، راجی کولی اور ان کی بیوی گنگا بین کو لاٹھی گاؤں سے آشرم لائے۔ اب آشرم میں دھوتی بنی جانے لگی۔ ان میاں بیوی کی بدولت

کھدر کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ انہوں نے گجرات میں اور دوسرے مقامات پر بہت سے لوگوں کو ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کا کپڑا بننا سکھا دیا۔ گنگا بہن کو کرگھے پر کام کرتے دیکھ کر لد پر بڑا اثر ہوا ہے جب وہ بننا شروع کرتی ہیں تو اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے انہیں خبر نہیں ہوتی اور ان کی نظر اپنے پیارے کرگھے سے نہیں ہٹتی۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک سبق آموز مکالمہ

ملوں کے مالک پہلے ہی دن سے کھدر کی تحریک سے جو اس زمانے میں سودیشی کی تحریک کہلاتی تھی اختلاف رکھتے تھے عمر سبحانی مرحوم جو خود اپنی مل بڑی قابلیت سے چلاتے تھے مجھے اپنی معلومات اور تجربے سے مدد دیا کرتے تھے اور دوسرے مل والوں کے خیالات مطلع کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے انفد لال کا مجھ پر بہت اثر رہا انہوں نے مجھ سے ملنے پر اصرار کیا۔ میں راضی ہو گیا۔ عمر سبحانی صاحب نے ہم دونوں کی ملاقات کا انتظام بھی کر دیا۔ سیٹھ صاحب نے گفتگو ان الفاظ سے شروع کی ''آپ کو معلوم ہے کہ پہلے بھی سودیشی کی جدوجہد ہو چکی ہے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں معلوم ہے''۔

آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تقسیم بنگال کے زمانے میں ہم مل والوں نے سودیشی کی تحریک سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو خوب لوٹا جب یہ تحریک شباب پر پہنچی تو ہم نے کپڑے کی قیمت بڑھا دی اور اس سے بھی زیادہ شرمناک حرکتیں کیں''۔

''ہاں میں یہ بات سن چکا ہوں اور اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا''

''بے شک آپ کو رنج ہوا ہو گا لیکن میرے نزدیک اس میں رنج کی کوئی بات نہیں ہم اپنا کاروبار کچھ خلق خدا کی خدمت کے لیے تو نہیں چلاتے ہمیں نفع کمانا ہے اور اپنے حصہ داروں کو خوش کرنا ہے۔ چیزوں کی قیمت ان کی مانگ پر موقوف ہے طلب اور رسد (Demand and Supply) کے قانون پر عمل درآمد کو کون روک سکتا ہے؟ بنگالیوں کو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ان سے ایجیٹیشن سے سودیشی کی

مانگ بڑھے گی اور قیمتیں خود بخود چڑھ جائیں گی۔

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا کہ بنگالی بھی میری طرح سادہ دل تھے۔ وہ خوش عقیدگی سے یہ سمجھتے تھے کہ ملوں کے مالک اتنے خودغرض اور بے حمیت بھی کیا ہوں گے کہ اپنے مل کو وقت پر دھوکا دیں اور بے ایمانی سے بدیشی کپڑے کو سودیشی کہہ کر بیچیں"۔

انہوں نے جواب دیا "میں آپ کی سادہ دلی سے واقف ہوں اسی لیے میں نے آپ کو یہاں آنے کی زحمت کی۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ کہیں وہی غلطی نہ کیجیے گا جو ان بھولے بھالے بنگالیوں نے کی تھی"۔

یہ کہہ کر انہوں نے منشی صاحب کو اشارہ کیا اور اس نے ان کے مل کا بنا ہوا کپڑا لا کر مجھے دکھایا سیٹھ صاحب نے کہا "دیکھیے یہ نیا مال ہمارے یہاں تیار ہوا ہے۔ اس کی ہر طرف سے مانگ آ رہی ہے۔ یہ ہم ادنیٰ درجے کی روئی سے بناتے ہیں اس لیے بہت سستا ہوتا ہے ہم اسے شمال میں ہمالیہ کی وادیوں تک بھیجتے ہیں۔ ہماری ایجنسیاں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں ہمارے گماشتے میں ایسے ایسے مقامات موجود ہیں جہاں نہ آپ کی آواز پہنچ سکتی ہے اور نہ آپ کے کارکن۔ ہمیں اور ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں جتنے کپڑے کی کھپت ہے اس سے بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے سودیشی کے مسئلے کا سبب سے اہم پہلو یہ ہے کہ کپڑے کی پیدائش (Production) بڑھا ءجائے۔ جب ہم کافی مقدار میں اچھا کپڑا بنانے لگیں گ تو باہر کا کپڑا آنا خود بخود بند ہو جائے گا۔ اس لیے میں آپ کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جدوجہد اب کر رہے ہیں اسے چھوڑ دیجیے اور نئی ملیں کھلوانے کی کوشش کیجیے ملک کو اس کی ضرورت نہیں کہ جو

مال موجود ہے اس کی مانگ بڑھے بلکہ اور مال کی ضرورت ہے''۔

میں نے کہا ''پھر تو آپ کو میری کوششوں کی قدر کرنی چاہیے۔ میں وہی کر رہا ہوں جو آپ چاہتے ہیں'' انہوں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا یہ کیسے؟ کیا آپ نئی ملیں کھلوانے کی فکر کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً آپ مبارک باد کے مستحق ہیں''۔

میں نے چرخے کی داستان انہیں سنائی اور کہا کہ میں آپ کی رائے سے بالکل متفق ہوں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ میں ملوں کا رضا کار ایجنٹ بن جاؤں بلکہ اس میں ملک کا نقصان ہے۔ ہمارے ملوں کے لیے عرصے تک گاہکوں کی کمی نہیں ہو گی۔ میرا کام یہ ہونا چاہیے اور ہے کہ ہاتھ کا کتا ہاتھ کا بنا کپڑا تیار کراؤں اور اسکی فروخت کا انتظام کروں۔ اس لیے میں اپنی پوری توجہ کھدر کی پیدائش پر صرف کر رہا ہوں۔ میں سودیشی کی اس شکل پر اس لیے جان دیتا ہوں کہ اسکے ذریعے ہندوستان کی عورتوں کا بھلا ہو جنہیں کافی کام نہیں ملتا اور پیٹ بھر روٹی میسر نہیں آتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ عورتیں سوت کاتیں اور اس سے جو کھدر بنا جائے اسے ہندوستان کے لوگ پہنیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہو گی۔ ابھی تو یہ محض ابتدائی حالت ہے۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ میرا ایک دن ضرور پھلے پھولے گی۔ بہر صورت اس میں کسی نقصان کا اندیشہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے ملک کے کپڑے کی پیدائش میں خفیف سا اضافہ بھی ہو جائے تو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو گا۔ اب تو غالباً آپ یہ تسلیم کریں گے کہ میں وہ کمزوریاں نہیں ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا تھا''۔

انہوں نے جواب دیا ''اگر اس تحریک کے چلانے سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ

کپڑے کی پیدائش بڑھے اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں رہا یہ کہ مشینوں کے زمانے میں چرخا چل سکتا ہے یا نہیں یہ دوسرا سوال ہے بہر حال میری یہی تمنا ہے کہ آپ کی تحریک کامیاب ہو۔''

☆☆☆

میں یہاں کھدر کی مزید نشو ونما کا ذکر نہیں کر سکتا۔ اس کتاب میں مختلف تحریکوں کی پوری پوری گنجائش نہیں۔ خصوصاً کھدر کی داستان کی داستان بیان کرنے کے لیے تو ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مجھے ان اوراق میں صرف یہ دکھانا ہے کہ تلاش حق کے سلسلے میں کس طرح بعض نکتے خود بخود سوجھ گئے۔

اس لیے میں اس ذکر کو چھوڑ کر ترک موالات کی کہانی پوری کرتا ہوں۔ علی برادران کی شروع کی ہوئی تحریک خلافت شباب پر تھی۔ مجھ سے مولانا عبدالباری مرحوم اور دوسرے علماء سے اس کے متعلق طویل طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ خصوصاً یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ایک مسلمان کس حد تک عدم تشدد کا پابند رہ سکتا ہے۔ آخر سب علماء اس بات پر متفق ہو گئے کہ اسلام میں عدم تشدد پالیسی کے طور پر اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ جتنے عرصے میں مسلمان اس پالیسی کو برتنے کا عہد کریں اتنے دنوں اس کی پابندی ان پر فرض ہے بہت غور وتامل کے بعد پاس ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار تو الہ آباد میں کمیٹی رات بھر اس مسئلے پر غور کرتی رہ۔ ابتدا میں حکیم صاحب مرحوم کو عدم تشدد پر مبنی ترک موالات کے قابل عمل ہونے میں شبہ تھا لیکن جب ان کا یہ شبہ رفع ہو گیا تو وہ دل و جان سے اس تحریک میں شرک ہو گئے اور ان کی شرکت سے اسے بے حد اذیت پہنچی۔

اس کے کچھ دن بعد میں نے ترک موالات کا ریزولوشن گجرات کی پولیٹکل کانفرنس میں پیش کیا۔ مخالف پارٹی نے پہلا اعتراض یہ کیا کہ ایک صوبے کی

کانفرنس اس کی مجاز نہیں کہ کانگریس پر سبقت کر کے کوئی ریزولوشن پاس کرے میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ قید صرف پیچھے ہٹنے کے معاملے میں ہے۔ آگے قدم بڑھانے کا ماتحت انجمنوں کو ہر وقت اختیار رہے بلکہ اگر ان میں ہمت اور حوصلہ ہو تو ان کا فرض ہے اگر ماتحت انجمن کانگریس کا اقتدار بڑھانے کے لیے کوئی تدبیر عمل میں لانا چاہے تو اجازت کی ضرورت نہیں بشرطیکہ وہ جو کچھ کرے اپنی ذمہ داری پر کرے اس کے بعد نفس تجویز پر غور کیا جانے لگا۔ دونوں طرف سے بحث میں بڑی گرماگرمی رہی مگر تحمل اور معقولیت کے ساتھ ووٹ لیے گئے تو منافقین کی تعداد بہت زیادہ نکلی اور ریزولوشن کثرت رائے سے پا ہو گیا۔ یہ کامیابی زیادہ تر ڈلبھ بھائی اور عباس طیب جی کی ذات سے ہوئے طیب جی صدر تھے اور ان کا رجحان ترک موالات کے ریزولوشن کی طرف تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ستمبر ۱۹۲۱ء میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے جلسہ خاص منعقد کیا جئے۔ لالہ لاجپت رائے صدر منتخب ہوئے کانگریس کی تیاریاں بہت بڑے پیانے پر ہوئیں۔ بمبئی سے کانگریس اور خلافت کی اس ؛ بلیں چھوٹیں۔ غرض کلکتہ میں نمائندوں اور تماشائیوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔

مولانا شوکت علی کی فرمائش سے میں نے ترک موالات ریزولوشن کا مسودہ مرتب کیا۔ اب تک میں نے اپنے مسودوں میں Non Violent کا لفظ لانے سے پرہیز کیا تھا مگر اپنی تقریر میں یہ لفظ بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ اس موضوع کے متعلق سے میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ مکمل نہی ہوا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کے مجمعے میں Non Voilent کا مترادف سنسکرت کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو لوگ میرا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اس لیے مولانا عبدالکلام سے کہا

کہ اس کے لیے کوئی اردو کالفظ بتائیے ۔انہوں نے اس کا ترجمہ ''با امان' اور ''نان کوآپریشن کا''ترک موالات'' تجویز کیا۔

غرض میں ہنوز نان کوآپریشن ک لیے ہندی گجراتی اور اردو کی مناسب اصلاحیں ڈھونڈنے میں مصروف تھا کہ مجھے اس معرکے میں کانگریس میں ترک موالات کا ریزولوشن پیش کرنا تھا۔اصل مسودے میں Non-violent کالفظ رہ گیا تھا۔ رات کو مجھے اس غلطی کا خیال آیا۔صبح اٹھتے ہی میں نے مہادیو کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ مسودے کو اخباروں میں بھیجنے سے پہلے یہ غلطی درست کی جائے مگر مجھے خیال پڑتاہ کہ مسودہ پہلے ہی چھپ چکا تھا۔اسی دن شام کو سبجیکٹس کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا۔ مجھے چھپی ہوئی کاپیوں میں اپنے قلم س یہ ترمیم کرنا پڑی آگے چل کر معلوم ہوا کہ اگر میرا مسودہ تیار نہ ہوتا تو بڑی مشکل پڑ جاتی۔

اب بھی میری حالت قابل رحم تھی ۔مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کون ریزولوشن کی تائید کرے گا اور کون مخالفت کرے گا یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ لالہ جی کا رویہ یا ہو گا البتہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس معرکے کے لیے بڑے برے تجربہ کار نبرد آزما کلکتہ میں صف آرا ہیں جیسے ڈاکٹر مییت پنڈت مالوی وجیارا گھوچاری جی' پنڈت موتی لال' ویشبند ھوداس۔

میں نے اپنے ریزولوشن میں ترک موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ بات وجیارا گھوچاری جی کو پسند آئی انہوں نے کہا'''اگر ترک موالات کرنا ہی ہے تو کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرانے کے لیے کیوں کیا جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ سوراج سے محروم ہ۔اسی کی چارہ جوئی کیلیے ترک موالات کرنا چاہیے۔

پنڈت موتی لال جی بھی یہی چاہتے تھے کہ ریزولوشن میں سوراج کا مطالبہ بھی شامل کرلیا۔ کانگریس میں اس کے ہر پہلو پر نہایت سرگرمی سے بحث ہوئی اور جس میں کبھی کبھی تندی اور تلخی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر ریزولوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔

سب سے پہلے پنڈت موتی لال ہی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اس معاملے میں مجھ سے ان سے جو دوستانہ بحث ہوئی تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ انہوں نے بعض اصلاحوں میں ترمیمیں تجویز کیں انہیں میں نے قبول کرلیا۔ انہوں نے بیڑا اٹھایا کہ میں دیشبندھو کو بھی اس تحریک میں کھینچ لاؤں گا دیشبندھو کا دل کود اس طرف کھنچتا تھا مگر انہیں یقین نہ تھا کہ لوگ اس پروگرام پر عمل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اصل میں وہ لالہ جی ناگ پور کی کانگریس میں اس تحریک میں دل سے شامل ہوئے۔

کانگریس کے اجلاس میں میرا دل لوکمانیہ کی یاد میں تڑپتا تھا مجھے آج تک یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس وقت مجھے آشیرباد دیتے اور اگر وہ مخالفت بھی کرتے تو میں انکی مخالفت کو اپنے لیے باعث عزت سمجھتا اور اس سے سبق حاصل کرتا۔ ہم دونوں میں بعض باتوں میں اختلاف بھی تھا مگر اس کی وجہ سے کبھی ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ دوستی اور محبت کا رہا۔ ان سطروں کو لکھتے وقت ان کی موت کے واقعات میری آنکھوں میں پھر رہے ہیں۔ آدھی رات کو پٹوردھن نے جو ان دنوں میرے رفیق تھے ٹیلی فون سے ان کے انتقال کی خبر سنائی۔ میں اس وقت اپنے ساتھیوں کے حلقے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری زبان پر خود بخود یہ الفاظ جاری

ہو گئے۔ میرا پشت و پناہ دنیا سے اٹھ گیا۔

ترک موالات کی تحریک پورے شباب پر تھی اور میں ان سے تقویت اور فیضان کا متوقع تھا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا رویہ ترک موالات کی آخری کل کے متعلق کیا ہوتا مگر یہ یقینی ہے کہ ان کے انتقال سے کلکتہ میں عام اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور ہر شخص افسردہ نظر آتا تھا۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قومی تاریخ کے اس نازک موقعے پر ان کی ہدایت اور رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی۔

☆☆☆

ناگ پور میں

کلکتہ میں کانگریس کے جلسہ خاص میں جو ریزولوشن پاس ہوئے تھے وہ ناگ پور کی کانگریس میں منظوری کے لیے پیش ہوئے یہاں کلکتہ کی طرح نمائندوں اور تماشائیوں کا بڑا ہجوم تھا ابھی تک نمائندوں کی تعداد محدود نہیں ہوئی تھی چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے اس موقع پر چودہ ہزار نمائندے موجود تھے لالہ جی میرے ریزولوشن کے اس حصے میں جو سکولوں کے مقاطعے کے متعلق تھا کچھ خفیف سی ترمیم چاہتے تھے جسے میں نے قبول کرلیا۔ اسی طرح دیشبندھو کی رائے سے کچھ ترمیمیں ہوئیں۔ اس کے بعد ترک موالات کا ریزولوشن اتفاق رائے سے پاس ہوگیا۔

اسی اجلاس میں کانگریس کے دستور اساسی کی ترمیم و تنسیخ کا ریزولوشن پیش ہونے والا تھا۔ کلکتہ کے جلسہ خاص میں سب کمیٹی کے مرتب کیے ہوئے مسودے پر بحث ہوچکی تھی۔ اور اس کے ہر پہلو پر سے غور کرلیا گیا تھا۔ ناگ پور میں وجیا راگھو چاری جی کے زیر صدارت سبجیکٹس کمیٹی نے ایک اہم تبدیلی کرنے کے بعد اسے پاس کردیا۔ وہ تبدیلی یہ تھی کہ میرے مسودے میں غالباً نمائندوں کی تعداد 1500 تھی اور اب 6000 کردی گئی۔ مری رائے میں یہ اضافہ ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا۔ اس کے بعد کے اجلاسوں میں جو تجربے ہوئے ان سے میری رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ محض خیال ہی خیال ہے کہ نمائندوں کی تعداد زیادہ ہونے سے کام میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ محض خیال ہی خیال ہے کہ نمائندوں کی تعداد زیادہ ہونے سے کام میں آسانی ہوتی ہے یا جمہوریت کے اصولوں پر عمل ہوتا ہے۔ پندرہ مخلص اور

روشن خیال نمائندے جنہیں دل سے قوم کی بہبود کی فکر ہو ان چھ ہزار غیر ذمہ دار آدمیوں سے جو اٹکل پچو منتخب کر دیے جائیں کہیں زیادہ جمہوریت کے ضامن ہوں گے جمہوریت کی اصلی ضمانت یہ ہے کہ لوگوں میں آزادی، خودداری اور قومی اتحاد کا گہرا احساس ہو اور وہ انہیں ہو گوں کو اپنا نمائندہ بنائیں جو نیک اور سچے ہوں لیکن سبجیکٹس کمیٹی کے دماغ پر تعداد کی زیادتی کا خیال اس قدر مسلط تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ نمائندہ رکھنا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے چھ ہزار پر سمجھوتہ ہوا۔

کانگریس کے نصب العین کے سوال پر بڑی گرما گرمی سے بحث ہوئی۔ میں نے اپنے دستور اساسی میں کانگریس کا نصب العین یہ رکھا تھا کہ سوراج حاصل کرنا اگر ممکن ہو تو سلطنت برطانیہ کے اندر ورنہ اس کے باہر'' کانگریس کی ایک پارٹی یہ چاہتی تھی کہ اس کا نصب العین سلطنت برطانیہ کے اندر سوراج حاصل کرنے تک محدود کر دیا جائے اس پارٹی کے خیالات پنڈت مولویہ جی اور مسٹر جناح نے کانگریس کے سامنے پیش کیے مگر انہیں زیادہ ووٹ نہ مل سکے۔ میرے مسودے میں یہ شرط تھی کہ سوراج حاصل کرنے کیلیے با امن اور جائز ذریعے استعمال کیے جائیں۔ بعض لوگوں نے اس شرط کی مخالفت کی اور کہا کہ ذرائع محدود کر دینا مناسب نہیں لیکن کانگریس نے بہت کچھ بحث و مباحثے کے بعد اصل مسودے کو پاس کر دیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر لوگ اس دستور پر سمجھ بوجھ کر دیانت داری اور خلوص سے عمل کرتے تو عوام کی تعلیم اور تنظیم میں بڑی کامیابی ہوئی اور یہ بجائے خود ہمیں سوراج دلانے کے لیے کافی تھا۔

اسی کانگریس میں ہندو مسلم اتحاد اور کھدر کی حمایت اور اچھوت کی اصلاح کے ریزولوشن بھی پاس ہوئے۔ اسی دن سے کانگریس کے ہندو ممبروں نے اپنے سر یہ

ذمہ داری لے لی کہ ملک کو اچھوت چھات کی لعنت سے پاک کر دیں گے اور کانگریس نے کھدر کے ذریعے سے ہندوستان کے فاقہ کش غریبوں سے ہمدردی اور محبت کا مضبوط رشتہ قائم کر لیا۔ یہ خلافت کی تائید میں ترک موالات کی تحریک شروع کر کے ناگپور کی کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد کی عملی بنیاد بھی ڈال دی۔

☆☆☆

خدا حافظ

اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں ان اوراق کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد میری زندگی کے جتنے واقعات بھی ہیں ان سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ پھر ایک اور وجہ بھی ہے جو مجھے خاموشی پر مجبور کرتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مجھ سے کانگریس کے لیڈروں سے اس قدر ربط ضبط رہا کہ اگر میں نے اس کے بعد کا کوئی واقعہ اپنی زندگی کا بیان کروں تو اپنے اور ان کے تعلقات کا ذکر کرنا پڑے کیونکہ گو آج ٹر دھا نند جی ویشبند ھو حکیم صاحب اور لالہ جی دنیا میں نہیں ہیں مگر ہماری خوش نصیبی ہے اور بہت سے پختہ کار کانگریس لیڈر ابھی موجود ہیں۔ کانگریس کی تاریخ میں ان تبدیلیوں کے بعد جن کا میں نے ذکر کیا ایک اہم دور آیا ہے جس کے اثرات ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے پچھلے سات سال میں میں نے جتنے قابل ذکر تجربے کیے سب کانگریس کے ذریعے سے کیے۔ اس لیے اگر ان تجربوں کی داستان چھیڑوں تو ان معاملات کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جو میرے اور ان لیڈروں کے درمیان پیش آئے اور یہ کم سے کم اس وقت کسی طرح مناسب نہیں علاوہ اس کے جو تجربے میں نے حال میں کیے ہیں ان سے ابھی کوئی قطعی نتیجے نہیں نکالے جا سکتے اس لیے میں اپنا صریح فرض سمجھتا ہوں کہ اس داستان کو یہیں پر ختم کردوں سچ پوچھیے تو میرا قلم آگے بڑھتا ہی نہیں۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں سے رخصت ہونا مجھ پر بہت شاق ہے۔ میں اپنے ان تجربوں کو بہت قیمتی سمجھتا ہوں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں ان کے

بیان کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہوں۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کی سچی تصویر پیش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میری اول سے آخر تک یہی کوشش رہی ہے کہ حق کا جو جلوہ مجھے نظر آیا اور جس طرح نظر آیا اسے بے کم و کاست بیان کردوں۔ اس مشق میں مجھے بڑا اطمینان قلب نصیب ہوا کیونکہ میرے دل میں ہمیشہ یہ امید رہی کہ شاید یہ کتاب ست اعتقادوں کے دل میں حق اور اہمسا کے عقیدے کو مستحکم کردے۔ اگر اکا ہر ورق پڑھنے والوں سے پکار پکار کر نہ کہے کہ حق کی معرفت کا لجز کے اہمسا کے کوئی رسیلہ نہیں تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری ساری محنت اکارت گئی۔ فرض کیجیے میری سعی تلاش حق میں ناکامیاب رہا ثابت ہو تو اس میں مطلوب کا قصور نہیں طالب کی کوتاہی ہے۔ میری طلب کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو پھر بھی ناتمام اور ناکافی ہے مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھی نظر آ گئے ان سے اس نور محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرہ بے نور ہے سچ پوچھیے تو میں نے جو کچھ دیکھا وہ فروغ تجلی کا ایک خفیف سا پرتو ہے مگر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جو اہمسا کی تکمیل کر چکا ہو۔

حق وہ روح کلیے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے انسان اس کے جلوے کی تاب تبھی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ درجے سے مخلوق کو اپنی جان سے برابر عزیز رکھتا ہو۔ جسے اس کا حوصلہ ہو وہ زندگی کے کسی شعبے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ حق کی جستجو مجھے سیاست کے میدان مین کھینچ لائی۔ ہے میری ناچیز رائے میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں وہ مذہت کے مفہوم کو ناآشنا ہیں ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیہ نفس کے ناممکن ہے جب تک نفس آرائشوں سے پاک نہ ہو۔ جائے اہمسا کے قانون کی پابندی محض

خیال خام ہے جو شخص عفت سے محروم ہے اسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تزکیہ نفس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عفت برتی جائے پاک نفسی میں خدا نے بڑی تاثیر دی ہے اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مگر تزکیہ نف کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل غفلت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خیال قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہو جائے محبت اور عداوت رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کر لے مجھے معلوم ہے کہ میں مسلسل سعی کے باوجود عفت کی یہ تینوں شرطیں اب تک پوری نہیں کر سکا ہوں اسی لیے دنیا کی تعریف میرے کانوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ اکثر میرے دل پر تیر کی طرح لگتی ہے۔ میرے نزدیک روحانی قوت سے بہ روز جذبات کو مغلوب کرنا مشکل ہے اور جسمانی قوت سے دنیا کو فتح کرنا سہل ہے۔ جب سے میں ہندوستان میں واپس آیا ہوں میرے دل میں جذبات کی دبی ہوئی آگ سلگتی رہتی ہے اس احساس سے مجھے ندامت ہوتی ہے مگر مایوسی نہیں ہوتی میرے روحانی تجربے میرے لیے تقویت اور مسرت کا باعث ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی مجھے بڑی کٹھن منزلوں سے گزرنا ہے جب تک میں خودی کو بالکل مٹا نہ دوں مجھے چین نہیں آئے گا۔ انسان کی نجات اسی پر موقوف ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر ذی حیات سے کم تر سمجھنے لگے۔ اہمسا عاجزی و انکساری کی آخری حد کا نام ہے۔

بالمفصل میں قارئین سے رخصت ہوتا ہوں اور ان سے اس دعا میں شرکت کا طالب ہوں کہ حق تعالی مجھے خیال قول اور فعل میں اہمسا کی توفیق عطا کرے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ انگریزی میں جس کا ترجمہ خدا ترس کرنا چاہیے مگر مہاتما جی جب اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو قطعی پرہیز گار کی جگہ یا خدا کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس لیے ہم نے بھی یہی لفظ رکھا۔

۲۔ ہفتہ میں ایک دن دوشنبہ کو مہاتما جی کسی سے بات نہیں کرتے تھے اور یہ دن ینگ انڈیا اور نوجیون کے لیے مضمون لکھنے میں صرف کرتے ہیں۔ (ع)

۳۔ لفظی معنی پیدائش اور موت سے چھٹکارا (م) اردو میں نجات ابدی کو کہتے ہیں (ع) (م) سے مراد ہیں مہادیو ڈیسائی جنہوں نے اکا گجراتی سے ہندی میں ترجمہ کیا اور (ع) سے مترجم اردو مراد ہے۔

۴۔ ہم نے اختصار کے خیال سے اردو ترجمے کا نام "تلاش حق" رکھا ہے۔ (ع)

۵۔ لفظی معنی چار مہینے کا زمانہ اس نذر کو کہتے ہیں جس کی رو سے برسات کے چار مہینوں میں برابر پورے آدھے روزے رکھے جاتے ہیں۔ (ع)

۶۔ ایک طرح کا روزہ جس میں کھانے کی مقدار چاند کے گھٹنے بڑھنے کے حساب سے گھٹتی بڑھتی ہے۔ (م)

۷۔ انگریزی میں تبلیغ کو کہتے ہیں۔ (ع)

۸۔ استبدی سے مراد ہے ہندو دولہا دلہن کا مل کر سات قدم چلنا اور چلنے میں ایک دوسرے سے محبت اور وفاداری کا عہد و پیمان کرنا۔ جس کے بعد دونوں کا عقد

کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

۹۔ کلر گیہوں سے بنتا ہے۔عقد کے بعد اسے دولہا دلہن ساتھ کھاتے ہیں۔

۱۰۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں کاٹھیاوار کے ہائی سکول میں آٹھ درکے ہوتے تھے ورآٹھوں انٹرنس تھا۔

۱۱۔ اہمسا کے لفظی معنی میں عصمت عدم تشدد۔(ع)

۱۲۔ ''برہمچاریہ'' کے لفظی معنی ہیں وہ کام جس سے انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی ہیں ''ضبط نفس'' خصوصاً شہوانی خواہش کو قابو رکھنا۔(م)

۱۳۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ گیارہویں باب میں لکھا ہے کہ انٹرنس 1887ء میں پاس کیا گیا اور اس وقت حسات سے اٹھارہ برس کی عمر ہوتی ہے۔

۱۴۔ رامچندر جی کے مختلف ناموں کا وظیفہ۔(ع)

۱۵۔ چاند مہینے کی گیارہویں تاریخ بندی تقویم میں مہینے کے دو حصے ہوتے ہیں (روشن اور تاریک) دونوں میں تاریخیں ایک سے چودہ یا پندرہ تک گنی جاتی ہیں۔ (ع)

۱۶۔ منو کے قانون۔منو ایک ہندو واضع قانون تھے اور ان کے قانون کو مذہبی اہمیت رکھتے ہیں۔(م)

۱۷۔ اونچی ٹوپی جولندن میں مہذب طبقے کے لوگ رسمی لباس کے ساتھ پہنتے ہیں۔

۱۸۔ ان صاحب کا نام گاندھی نے نہیں لکھا۔مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے یہ بھی کوئی ہندوستان طالب علم تھے۔

۱۹۔ لفظی معنی یہ عقیدہ کے سوائے نباتات کے کوئی چیز نہ کھانا چاہیے مگر اس

عقیدے کے لوگ دودھ ویرہ اور بعض انڈا اور مچھلی بھی استعمال کرتے ہیں البتہ گوشت سے سب پرہیز کرتے ہیں۔

۲۰۔۲۱۔۲۲۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں پاؤنڈ اور روپے کی شرح مبادلہ معین کردی گئی پاؤنڈ پندرہ روپے کا شلنگ بارہ آنے کا اور پنیس ایک آنے کا ہوتا تھا۔ اس سے پہلے شرح مختلف رہا کرتی تھی۔

۲۳۔ جیسے چاول آلو وغیرہ۔

۲۴۔ لوہے کا کارخانہ

۲۵۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کے پیرو کار اخلاق کے امور میں بہت تشدد کرتے ہیں۔

۲۶۔امید اردو میں حمل کو بھی کہتے ہیں انگریزی Conciwe کا لفظ ہے جس میں یہی ابہام ہے اس کے معنی خیال کرنے کے بھی ہیں اور حمل سے ہونے کے بھی ۔

۲۷۔ سورداس کے مشہور بھجن کی ٹیپ جو ہر بند کے آخر میں آتی ہے اللہ ہے حامی بیکس کا واللہ سہارا بیکس کا''۔

۲۸۔ وہ شخص جو ایک وقت میں سو باتیں یاد رکھتا ہے یا و کاموں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

۲۹۔ ہالینڈ کا رہنے والا۔ڈچ

۳۰۔ عیسائیوں کا ایک فرقہ جو زیادہ تر امریکہ میں پایا جاتا ہے۔

۳۱۔ پرتھ انگلستان کے جنوب مغرب میں ایک بندرگاہ ہے یہ فرقہ اسی مقام سے منسوب ہے۔

۳۲۔ غالباً یوسف کی خرابی ہے۔

۳۳۔ ڈچ۔ہالینڈ کی۔

۳۴۔ برطانیہ کا قومی گیت جس میں بادشاہ کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے۔

۳۵۔ ہندو فلسفے کی مشہور اصطلاح جس کا صحیح ترجمہ مشکل ہے عموماً اس کا ترجمہ ''فریب خیال'' ''نیرنگ نظر'' سے کیا جاتا ہے۔

۳۶۔ ایک ہلکی سی گاڑی جسے آدمی کھینچتا ہے۔

۳۷۔ اخبار کا نام ہے۔

۳۸۔ تجرد۔عصمت کی زندگی۔

۳۹۔ رضا کاروں کا دستہ جو زخمیوں اور بیماروں کی خدمت کے لیے فوج کے ساتھ رہتا ہے۔

۴۰۔ ہندو سماج کی چاروں تقسیمیں اور ان کے فرائض۔

۴۱۔ پوربندر کے قریب ایک گاؤں جس کا موٹا اونی کپڑا گردونواح میں مشہور ہے۔

۴۲۔ پھیپھڑے کا ورم۔

۴۳۔ رضا کاروں کا دستہ ملک کی حفاظت کے لیے۔

۴۴۔ اس عرصے میں یہ ترجمہ آئیں گنیش نے ''اڑپلیکین'' مدراس سے History of satyagraha in South Africa کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

۴۵۔ صبح سے شام تک کا برت۔

۴۶۔ Ambulance مقتولوں کو اٹھا کر لانے اور زخمیوں کی خدمت کا کام۔

۴۷۔ Malted Milk دودھ اور آب کا مرکب۔

۴۸۔ کاٹھیاوار کا ایک مقام۔

۴۹۔ گنگا کے پل کا نام۔

۵۰۔ یہ انگریزی ترجمہ اب دیس کیسن نے ترپلیکین مدراس سے شائع کر دیا ہے۔

۵۱۔ گجرات میں تحصیل کو ''تعلقہ'' اور تحصیلدار کو ''معالت دار'' کہتے ہیں۔

۵۲۔ بازو میں سوئی چبھو کر پچکاری کے ذریعے جسم میں دوا پہنچانے کو انجکشن کہتے ہیں۔

۵۳۔ یہ رم جانوروں کے جسم میں وبائی جراثیم داخل کر کے ان کے خون سے بنتا ہے اور چیچک ہیضہ وغیرہ کے ٹیکے میں استعمال ہوتا ہے۔

۵۴۔ رسکن کی مشہور کتاب Units this last کا آزاد ترجمہ گجراتی زبان میں۔

۵۵۔ ترک موالات۔

اختتام------------------------The End